سلسلة احياء التراث العلمي
للإمام
النواب محمد صديق حسن خان القنوجي رحمه الله
مجموعہ رسائل عقیدہ
www.KitaboSunnat.com
نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ
(۱۸۳۲ء-۱۸۹۰ء)
تسہیل و تخریج
حافظ عبد اللہ سلیم ، حافظ شاہد محمود
دار ابی الطیب
للنشر و التوزیع

سلسلة إحياء التراث العلمي

للإمام

النواب محمد صديق حسن خان القنوجي رحمه الله

مجموعہ رسائلِ عقیدہ

(جلد سوم)

نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ

(۱۸۳۲ء — ۱۸۹۰ء)

تسہیل و تخریج

حافظ عبداللہ سلیم — حافظ شاہد محمود

دار أبي الطيب

للنشر والتوزيع

مجموعہ رسائلِ عقیدہ

تسہیل و تخریج

حافظ عبداللہ سلیم　　حافظ شاہد محمود

کمپوزنگ .... نقیب الرحمن

سیٹنگ .... ابوسفیان عزیزی
0321-6487621

طبع اول .... جولائی 2013ء

قیمت ....

5 ... 055-3823990 / 0321-6466422

Contact us: hasanshahid85@hotmail.com

فہرست

⑫ التفكيك عن أنحاء التشريك

فصل دوم

⑬ عقيدة السني

⑭ الاحتواء علی مسألة الاستواء

پہلی فصل

دوسری فصل

تیسری فصل

چوتھی فصل

پانچویں فصل

چھٹی فصل

ساتویں فصل

آٹھویں فصل

نویں فصل

دسویں فصل

گیارھویں فصل

بارھویں فصل

⑮ المعتقد المنتقد

پہلی فصل

دوسری فصل

تیسری فصل

چوتھی فصل

پانچویں فصل

چھٹی فصل

ساتویں فصل

آٹھویں فصل

نویں فصل

دسویں فصل

گیارھویں فصل

بارھویں فصل

تیرھویں فصل

چودھویں فصل

پندرھویں فصل

سولھویں فصل

❁ شیخ محمد فاخر زائر عباسی الہ آبادی ثم المکی رحمہ اللہ کے ''رسالہ نجاتیہ'' کے مطابق

سترھویں فصل

اٹھارھویں فصل

انیسویں فصل

التفكيك
عن
أنحاء التشريك

تالیف

امام العصر علامہ نواب محمد صدیق حسن خان حسینی بھوپالی رحمہ اللہ
(۱۲۴۸ھ-۱۳۰۷ھ)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمد لله الذي لا يغفر أن يشرك به، ويغفر ما دون ذلك لمن يشاء من عباده، والصلاة والسلام على خير خلقه، محمد وآله و صحبه، الذين جاهدوا في الله حق جهاده. أما بعد:

اس مختصر تحریر اور کتاب سے پہلے اِثباتِ توحید اور ردِ شرک کے عنوان پر اردو زبان میں چند رسائل و کتب تحریر کیے گئے ہیں۔[1] ان میں سے ہر کتاب اور رسالہ اپنے موضوع میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو خطیب کی منبر پر ہوتی ہے۔ اگرچہ ان کے مضامین ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، کیونکہ ان سب میں ایک ہی مسئلے پر کلام کیا گیا ہے، لہٰذا مسائل کے دلائل تو مشترک ہوتے ہیں، صرف خاتمے اور عناوین کی تقسیم اور ان کے طرزِ بیان میں اختلاف ہوتا ہے یا دلائل کی قلت و کثرت کے اعتبار سے ان میں فرق ہوتا ہے۔

اس کتاب میں صرف شرک کی اصغر و اکبر میں تقسیم اور قیامت کے دن مسئلہ شفاعت کا تذکرہ کرنا مقصود ہے۔ اس لیے اس کتاب کا نام "التفكيك عن أنحاء التشريك" رکھا گیا ہے۔ وبالله التوفيق.

[1] مولف رحمہ اللہ کے یہ تمام رسائل زیرِ نظر مجموعے میں شامل ہیں۔

فصل اول

شرک کی اقسام

شرک کی دو قسمیں ہیں:

① شرک اکبر۔ ② شرک اصغر۔

① شرک اکبر:

اللہ تعالیٰ شرک اکبر کو توبہ کے بغیر معاف نہیں فرماتے ہیں۔ شرک اکبر یہ ہے کہ کوئی شخص کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کا ہمسر اور اس کا شریک بنائے۔ جس طرح اللہ کو دوست رکھتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے، اسی طرح اس شریک کو دوست رکھے اور اس سے محبت کرے۔ اس شرک میں غیر اللہ کو اللہ کے برابر ٹھہرایا جاتا ہے، جس طرح مشرکوں نے اپنے معبودوں کو اللہ کے برابر ٹھہرایا تھا۔ چنانچہ وہ دوزخ میں جانے کے بعد اپنے خداؤں سے یہ بات کہیں گے:

﴿ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾
[الشعراء: ۹۷۔ ۹۸]

[اللہ کی قسم! بے شک ہم یقیناً کھلی گمراہی میں تھے۔ جب ہم تمھیں جہانوں کے رب کے برابر ٹھہراتے تھے]

حالانکہ وہ اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ اکیلا اللہ ہی خالق، رب، ہر چیز کا مالک ہے اور ان کے معبود کچھ پیدا کرتے ہیں، رزق دیتے ہیں، کسی کو موت دیتے ہیں اور نہ کسی کو زندہ کرتے ہیں۔ ان کا شرک تسویہ ہی تھا۔ یعنی محبت، تعظیم اور عبادت میں اپنے معبودوں کو اللہ کے برابر ٹھہرانے اور شریک بنانے کا شرک۔

زمانۂ جاہلیت اور دورِ حاضر کے مشرکوں میں قدرِ مشترک:

یہی حال ساری دنیا کے مشرکوں کا ہے کہ وہ سب اپنے معبودوں سے محبت کرتے، ان کی

تعظیم کرتے، انھیں دوست رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر معبودان باطلہ کے دوست بنے ہوئے ہیں۔ بلکہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ انھیں اپنے معبودوں سے اتنی محبت ہے جتنی اللہ سے بھی نہیں ہے۔ وہ اللہ کے ذکر سے اتنا خوش نہیں ہوتے جتنی خوشی انھیں معبودان باطلہ کے ذکر سے ہوتی ہے۔ اگر کوئی ان کے معبودوں کی توہین کرے، جو ان کے خدا اور مشائخ ہیں تو اس قدر غصے اور غضب میں آتے ہیں کہ رب العالمین کی تنقیص سے اتنے خفا نہیں ہوتے۔ جب ان کے خداؤں اور معبودوں کی حرمت میں کچھ کمی ہوتی ہے تو شیر وسگ کی طرح غضب میں آ جاتے ہیں، لیکن اگر اللہ کی حرمتوں کو پامال کیا جائے تو انھیں بالکل غصہ نہیں آتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہتک کرنے والا اگر انھیں کچھ کھلا پلا دیتا ہے تو اس سے راضی ہو جاتے ہیں اور ان کے دل اس ہتک کی مخالفت کرتے ہیں نہ اس کو برا جانتے ہیں۔ ہم نے اور دیگر لوگوں نے اس کا سر عام مشاہدہ کیا ہے۔

بلکہ آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ یہ مشرک لوگ اٹھتے بیٹھتے، ٹھوکر کھاتے اور بیمار ہوتے وقت اپنے باطل معبود کا نام لیتے ہیں۔ ان کی زبان پر اسی کا ذکر آتا ہے اور یہی ذکر ان کے دل پر بھی غالب رہتا ہے۔ وہ اس کا انکار کرتے ہیں نہ اس کام کو برا جانتے ہیں۔ وہ اس کام کو برا کیونکر جانیں، ان کا تو عقیدہ یہ ہے کہ یہ ذکر اللہ کے پاس حاجت وضرورت کو لے جانے کا ایک دروازہ اور ذریعہ ہے اور یہ معبود اللہ کے ہاں ان کے سفارشی اور اس تک پہنچنے کا ایک وسیلہ ہیں۔

بت پرست بھی بلا فرق اسی طرح تھے۔ وہ لات وعزیٰ اور دیگر بتوں کا نام لیتے تھے اور یہ ''یا علی''، ''یا حسین'' اور ''یا عبدالقادر'' کہتے ہیں۔ وہی شرک اِن کے دلوں میں بھی بھرا ہوا ہے، جسے مشرکوں نے ایک دوسرے سے بطور ورثہ معبودوں کے فرق و اختلاف کے ساتھ اخذ کیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے معبود حجر (پتھر) ہیں اور ان کے معبود بشر ہیں!!

اللہ تعالیٰ نے ان مشرکوں کے اسلاف کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾ [الزمر: ٣]

[اور وہ لوگ جنھوں نے اس کے سوا اور حمایتی بنا رکھے ہیں (وہ کہتے ہیں) ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں، اچھی طرح قریب کرنا یقیناً اللہ ان کے درمیان اس کے بارے میں فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں]

یعنی جن لوگوں نے اللہ کے سوا اپنے کارساز بنا لیے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ہم ان کی پوجا صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہماری رسائی کرا دیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس اختلاف کا فیصلہ تو قیامت کے دن ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر اور جھوٹ کی گواہی دی اور فرمایا کہ ہم کبھی انھیں راہِ راست پر نہیں لائیں گے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ﴾ [الزمر: ۳]

یہ اس شخص کا حال ہے جس نے اللہ کے سوا کسی کو کارساز، دوست اور مددگار بنایا ہے اور وہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ ولی اس کو اللہ کے قریب کر دے گا۔ ایسا شخص بڑا نایاب ہے جو اس مصیبت سے بچ گیا ہو، بلکہ اس سے زیادہ کم یاب وہ شخص ہے جو اس کام سے روکنے والے کا دشمن نہ ہو۔

موجودہ دور کے مشرکوں کے دلوں میں اور ان کے اسلاف کے دلوں میں یہی بات تھی کہ ہمارے یہ معبود اللہ کے پاس ہماری سفارش و شفاعت کریں گے، اسی لیے انھوں نے ان معبودوں کو اپنا سفارشی سمجھا تھا اور یہ عین شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس کا رد کیا ہے اور یہ خبر دی ہے کہ ساری شفاعت صرف اللہ کے لیے ہے، اس کے پاس کوئی کسی کی شفاعت نہیں کرے گا، مگر وہ شخص جس کو خود اللہ اس بات کی اجازت دے کہ ہاں تو اس فلاں شخص کی شفاعت کر اور یہ شفاعت کی اجازت اس شخص کے حق میں ہوگی جس کے قول و عمل کو اللہ تعالیٰ پسند کرے گا، لہٰذا ایسے لوگ یہی اہلِ توحید ہوں گے جنھوں نے اللہ کے سوا کسی کو اپنا سفارشی نہیں سمجھا تھا۔ وہ صرف اللہ کی عبادت کرنے والے تھے اور اللہ اکیلا ان کا معبود تھا۔

مشرک اور موحد کی مثال:

ایسے لوگوں کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِیْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ [الزمر: ۲۹]

[اللہ نے ایک آدمی کی مثال بیان کی جس میں ایک دوسرے سے جھگڑنے والے کئی شریک ہیں اور ایک آدمی کی جو سالم ایک ہی آدمی کا ہے، کیا دونوں مثال میں برابر ہیں؟ سب تعریف اللہ کے لیے ہے، بلکہ ان کے اکثر نہیں جانتے]

یعنی اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص (غلام) کے متعلق یہ بیان کیا ہے جس کے کئی مالک ہیں اور ان

کی طبیعتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ایک وہ شخص ہے جو پورے کا پورا ایک ہی شخص کی ملکیت میں ہے۔ کیا وہ دونوں ایک جیسے ہو سکتے ہیں؟ سب تعریف اللہ کے لیے ہے، بہت سے لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔ یہ ان لوگوں کی مثال ہے جو ایک رب کے بندے ہیں اور جو کئی ارباب کے بندے ہیں۔ اس مثال سے یہ بھی معلوم ہوا کہ موحد و مشرک برابر نہیں ہوتے۔ شفاعت کا سب سے بڑا مستحق اور اس سے بہرہ مند وہ شخص ہو گا جس کے حق میں اللہ تعالیٰ شفاعت کی اجازت دے گا اور یہ وہ صاحبِ توحید ہو گا جس نے اللہ کے سوا کسی کو اپنا شفیع نہیں بنایا ہو گا۔ وہ شفاعت جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس کے رسول ﷺ سے ثابت ہے، وہ وہی شفاعت ہے جو صرف اللہ کے حکم سے صادر ہو گی۔ جس شفاعت کی اللہ تعالیٰ نے نفی فرما دی ہے، یہ وہ شرکیہ شفاعت ہے جو ان مشرکوں کے دلوں میں ہے جنھوں نے اللہ کے سوا اور سفارشی بنائے ہیں، لہٰذا ان کے ساتھ شفاعت کا معاملہ ان کے قصد و گمان کے خلاف ہو گا، جبکہ موحد لوگ شفاعت سے بہرہ مند ہوں گے۔

موحد ہی سب سے زیادہ شفاعت کا مستحق ہے:

اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان پر غور کرنا چاہیے جو آپ ﷺ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا تھا۔ آپ ﷺ سے سوال کیا گیا:

« مَنْ أَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ؟ قَالَ: أَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِي مَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ »[1]

[اے اللہ کے رسول ﷺ! لوگوں میں کون سب سے زیادہ آپ ﷺ کی سفارش کی سعادت حاصل کرے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں میں سے سب سے زیادہ میری شفاعت کا مستحق اور اس سے سعادت مند ہونے والا وہ شخص ہے جس نے ''لا إله إلا الله'' پڑھا]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے حصولِ شفاعت کے اسباب میں سے توحید کو سب سے بڑا سبب قرار دیا ہے۔

مشرکین کا تصورِ شفاعت اور اس کا رد:

یہ تصورِ شفاعت اس تصور کا عکس ہے جو مشرکوں نے بنا رکھا ہے۔ ان کے نزدیک شفاعت

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٩)

سفارشی مقرر کرنے، ان کی عبادت کرنے اور اللہ کو چھوڑ کر ان سے دوستی رکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے ان کے اس زعم باطل کی تردید کی اور فرمایا کہ شفاعت کا سبب صرف توحید ہے۔ اللہ تعالیٰ سفارش کرنے والے کو اجازت بخشے گا کہ تو شفاعت کر، تب کہیں وہ شفاعت کرے گا۔

مشرک کا یہ اعتقاد کہ جس نے کسی کو اپنا ولی اور سفارشی مقرر کیا ہے، وہ اس کی شفاعت کرے گا اور اللہ کے ہاں یہ شفاعت فائدہ دے گی، جس طرح بادشاہوں اور اصحابِ اقتدار کے خاص لوگ اپنے دوستوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں، محض جہالت ہے۔ ان کو یہ علم نہیں ہے کہ اللہ کے پاس اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہیں کر سکتا اور اللہ صرف اس شخص کے لیے شفاعت کی اجازت دیتا ہے جس کے قول و عمل کو وہ پسند فرماتا ہے۔

شفاعت کا صحیح تصور:

اللہ تعالیٰ نے فصل اول میں یوں فرمایا ہے:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ﴾ [البقرة: ٢٥٥]

[کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے؟]

اور دوسری فصل میں یوں کہا ہے:

﴿ وَ لَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی﴾ [الأنبياء: ٢٨]

[اور وہ سفارش نہیں کرتے مگر اسی کے لیے جسے وہ پسند کرے]

اور تیسری فصل یہ ہے کہ وہ توحید اور اتباعِ رسول ﷺ کے سوا کسی کے قول و عمل کو پسند نہیں کرتا۔

یہاں دو کلمے ذکر کیے جاتے ہیں، جن کے متعلق تمام پہلے اور بعد میں آنے والوں سے سوال ہو گا۔

ابو العالیہ کہتے ہیں:

”كلمتان يسئل عنهما الأولون والآخرون: ماذا كنتم تعبدون؟ وماذا أجبتم المرسلين؟“[1]

[اول و آخر تمام لوگوں سے دو باتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا، ایک یہ کہ تم کس کی عبادت کرتے تھے اور دوسرے تم نے رسولوں کو (ان کی دعوت کا) کیا جواب دیا؟]

[1] مدارج السالكين لابن القيم (٣٤١/١)

ان تین فصول کو جو شخص سمجھ لے اور یاد کر لے، یہ اس کے دل سے شرک کی جڑیں اکھاڑیں گی۔ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

① اللہ ہی کی اجازت ہی سے شفاعت ہوگی۔

② شفاعت کی اجازت اس شخص کے لیے ہوگی جس کے قول وعمل کو اللہ تعالیٰ پسند فرمائے گا۔

③ توحید اور اتباعِ رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی کا قول وعمل اللہ کو پسند نہیں۔

شرک تسویہ معاف نہیں ہوگا:

جو لوگ غیر اللہ کو اللہ کے برابر قرار دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں ہرگز معاف نہیں کرے گا۔

جیسا کہ اس کا فرمان ہے:

﴿ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ﴾ [الأنعام: ١]

[پھر (بھی) وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، اپنے رب کے ساتھ برابر ٹھہراتے ہیں]

صحیح قول کے مطابق اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو غیر اللہ کو عبادت، دوستی اور محبت میں اللہ کے برابر ٹھہراتے ہیں، جس طرح دوسری آیت میں فرمایا:

﴿ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

[الشعرآء: ٩٧۔ ٩٨]

[اللہ کی قسم! بے شک ہم یقیناً کھلی گمراہی میں تھے۔ جب ہم تمھیں جہانوں کے رب کے برابر ٹھہراتے تھے]

سورت بقرہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ﴾ [البقرة: ١٦٥]

[وہ ان سے اللہ کی محبت جیسی محبت کرتے ہیں]

مشرک کے قول وفعل میں تضاد:

اگر آپ کسی مشرک کو دیکھیں تو اس کا حال اس کے عمل کو جھٹلاتا ہے، کیونکہ اس کا قول تو یہ ہے کہ میں ان (معبودانِ باطلہ) کو اللہ کے برابر دوست رکھتا ہوں نہ انھیں اللہ کے برابر سمجھتا ہوں، لیکن جب ان کی بے حرمتی کی جائے تو غضب ناک ہوتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی بے حرمتی سے بھی زیادہ ان

کی ہتکِ حرمت پر غضب آلود ہوتا ہے اور جب ان کا ذکر کیا جائے تو ہشاس بشاس ہوتا ہے۔

﴿وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ﴾ [الزمر: ٤٥]

[اور جب ان کا ذکر ہوتا ہے جو اس کے سوا ہیں تو اچانک وہ بہت خوش ہو جاتے ہیں]

خصوصاً جب یہ ذکر کیا جائے کہ وہ (اس کے بنائے ہوئے شریک) پریشان کی غم خواری اور حاجت مند کی حاجت روائی کرتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان ایک دروازے کی حیثیت رکھتے ہیں تو آپ دیکھتے نہیں کہ مشرک ان کے نام لینے سے کتنا شاداں وفرحاں ہوتا ہے؟ اس کا دل ان کی طرف فریاد کناں ہو جاتا ہے اور تعظیم وخضوع کے جذبات اور محبت وموالات کے احساسات میں ایک ہیجان برپا ہو جاتا ہے۔

جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور توحید کے ذریعے شرک کی نفی کی جاتی ہے تو ان مشرکین پر ایک وحشت طاری ہو جاتی ہے، انھیں سخت تنگی اور شدید حرج لاحق ہو جاتا ہے۔ جبکہ اپنے معبودوں کی تنقیص سن کر تم پر ہر طرح کی تہمت لگاتے، بلکہ تمھارے دشمن بن جاتے ہیں۔ واللہ ہم نے ان کی اس صورت حال کا مشاہدہ کیا ہے کہ انھوں نے ہم پر الزام تراشی کی۔ اللہ انھیں دنیا وآخرت میں ذلیل وخوار کرے۔

موحدین پر اولیا کی گستاخی کا الزام:

آج کے مشرکین کی اپنے معبودوں سے محبت کا یہ عالم ہے کہ جو بات ان کے بھائیوں اور زمانہ جاہلیت کے مشرکوں نے کہی تھی کہ یہ شخص ہمارے خداؤں کی عیب گیری کرتا ہے، وہی بات یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ شخص ہمارے مشائخ کی گستاخی کرتا ہے، حالانکہ وہ اللہ کے حضور ہماری حاجات وضروریات پیش کرنے کے ذرائع اور ابواب ہیں۔ یہی بات نصاریٰ نے کی تھی۔ چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ نے انھیں کہا کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے بندے ہیں تو انھوں نے جواب میں کہا:

"تَنَقَّصْتَ الْمَسِيحَ وَعِبْتَهُ"[1]

[آپ ﷺ نے تو مسیح علیہ السلام کی گستاخی اور عیب گیری کی ہے]

اسی طرح آج کے دور میں جب کوئی شخص ان مشرک نما لوگوں سے کہتا ہے کہ قبروں کو بت کدہ

---

[1] مدارج السالکین (۱/۳٤۲)

اور سجدہ گاہ نہ بناؤ اور قبروں کی زیارت اسی طرح کرو جس طرح اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اجازت دی ہے تو یہ جواب دیتے ہیں کہ ''ناصح صاحب! تم نے ان قبر والوں کی تنقیص اور گستاخی کی ہے۔'' نئے اور پرانے دور کے مشرکین کی آپس میں مماثلت اور مشابہت کو دیکھ کہ یوں لگتا ہے کہ ہر پہلے نے دوسرے کو اس شرک کی وصیت کر رکھی ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا﴾

[الكهف: ١٧]

[جسے اللہ ہدایت دے سو وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے گمراہ کر دے، پھر تو اس کے لیے ہرگز کوئی راہنمائی کرنے والا دوست نہ پائے گا]

اسبابِ شرک کی تردید:

اہلِ شرک جن اسبابِ شرک کے ساتھ وابستہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان تمام کی نفی کر دی ہے۔ جو شخص ادنی سا تامل کرتا ہے، وہ یہ جانتا اور اس بات کو بھی بہ خوبی پہچانتا ہے کہ جس نے اللہ کے سوا کسی کو ولی اور سفارشی ٹھہرایا، اس کی مثال اس مکڑی کی ہے جس نے ایک گھر بنایا، حالانکہ سب سے زیادہ کمزور اور بودا گھر مکڑی کا ہوتا ہے۔ فرمانِ خداوندی ہے:

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّ مَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ۝وَ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ﴾ [سبا: ٢٢۔ ٢٣]

[کہہ دے پکارو ان کو جنھیں تم نے اللہ کے سوا گمان کر رکھا ہے، وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کے مالک ہیں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا ان دونوں میں کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہے۔ اور نہ سفارش ان کے ہاں نفع دیتی ہے مگر جس کے لیے وہ اجازت دے]

مذکورہ بالا آیت میں شرک فی التصرف کا رد کیا گیا ہے اور اس بات کو ثابت کیا گیا ہے کہ کسی کی شفاعت فائدہ نہ دے گی۔ نیز یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر سفارش نہ ہو گی۔ مشرک جس کو اپنا معبود بناتا ہے تو یہ سمجھتا ہے کہ وہ نفع کا مالک ہے، لیکن یاد رہے نفع کا مالک وہ ہوتا ہے جس میں مندرجہ ذیل چار خوبیوں میں سے کوئی ایک خوبی پائی جائے:

① وہ معبود اس چیز کا مالک ہو جو عابد کو اس سے مطلوب ہے۔

② اگر وہ کلی مالک نہیں تو مالک کا شریک ہو۔

③ اگر وہ مالک کا شریک بھی نہیں ہے تو اس کا معاون و مددگار ہو۔

④ اگر وہ معاون و مددگار بھی نہیں ہے تو مالک کے پاس اس کا سفارشی ہو۔

مگر اللہ تعالیٰ نے ان تمام مراتب اور خوبیوں کی نفی کی ہے۔ مِلک اور شرکت کی نفی کی اور اسی طرح معاونت اور شفاعت کی بھی نفی فرما دی، جو مشرک کا مطلوب و مقصود ہے۔ صرف اسی شفاعت کا اثبات کیا جس میں مشرک کا کوئی حصہ نہیں ہے اور یہ وہ شفاعت ہے جو اللہ تعالیٰ کی اجازت کے ساتھ ہو گی۔ لہٰذا مذکورہ بالا آیت ایک نور، برہان، نجات اور تجرید توحید کی دلیل ہے اور شرک کے اصول اور مواد کی بیخ کنی کرتی ہے۔ جو سمجھنے والا ہے وہ اسے بہ خوبی سمجھتا ہے۔ یہی ایک آیت نہیں بلکہ قرآن مجید تو اس طرح کی آیتوں اور اس کے نظائر، اَشباہ اور اَمثال سے بھرا پڑا ہے، لیکن اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان آیات کا موجودہ دور کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ:

آج کے لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ جس نوع اور قوم کے متعلق مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تھی، اس قوم کے لوگ چل بسے اور انھوں نے اپنا کوئی وارث نہیں چھوڑا۔ یہی وہ باطل گمان ہے جو انسان کے دل اور قرآن فہمی کے درمیان حائل ہوتا ہے۔

زمانۂ جاہلیت سے ناواقفیت شرک کا سبب ہے:

ہم قسم اٹھا کر کہتے ہیں کہ اگرچہ وہ لوگ چل بسے ہیں، مگر ان جیسے یا ان سے بھی بدتر اور کمتر ان کے وارث موجود ہیں اور قرآنی آیات ان کو اسی طرح شامل ہیں جس طرح پہلے مشرکوں کو شامل تھیں۔ لیکن اصل بات وہ ہے جو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہی تھی:

"إنما تنقض عرى الإسلام عروة عروة إذا نشأ في الإسلام من لم يعرف الجاهلية"①

[جب اسلام میں وہ لوگ پیدا ہو جائیں گے جو زمانہ جاہلیت (کے حالات) سے ناواقف

① تيسير العزيز الحميد في شرح كتاب التوحيد (١/ ٩٠)

ہوں گے تو اسلام کی کڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹ جائیں گی]

جب ایک شخص جاہلیت کو پہچانتا ہے نہ اس چیز کو جس کی برائی بیان کرتے ہوئے قرآن نے اس کی مذمت کی ہے تو وہ اس عیب ناک امر جاہلیت اور قابل مذمت کام میں گرفتار ہو جاتا ہے، پھر اس کو ثابت شدہ کہہ کر لوگوں کو اس کی طرف دعوت دیتا ہے اور اسے درست اور مستحسن بتاتا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ یہ وہی کام ہے جو زمانہ جاہلیت کے لوگ کیا کرتے تھے یا یہ کام اسی کی طرح یا اس سے بھی بدتر یا اس سے کمتر ہے، اسی وجہ سے اسلام کی رسی ٹوٹتی چلی جا رہی ہے اور تھوڑی تھوڑی ہو کر ختم ہوتی جا رہی ہے۔ معروف منکر اور منکر معروف بن رہا ہے، بدعت سنت اور سنت بدعت بن رہی ہے اور آدمی کے خالص توحید پر ایمان کی وجہ سے اس کی تکفیر ہونے لگتی ہے، اس پر کفر کے فتوے لگتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرنے اور بدعات و خرافات چھوڑنے کی وجہ سے اس کو بدعتی گردانا جاتا ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے بصیرت دے رکھی ہے اور اس کا دل زندہ و سلامت ہے، وہ اس امر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔

② شرک اصغر:

شرک اصغر بہت عام ہے، جیسے ریا کاری، تصنع اور غیر اللہ کی قسم کھانا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ أَشْرَكَ» [1]

[جس شخص نے غیر اللہ کی قسم اٹھائی تو یقیناً اس نے شرک کیا]

یا جیسے یہ کہنا کہ "ماشاء الله و شئت" [جو اللہ چاہے اور تو چاہے] یا یہ کہنا: "هذا من الله ومنك" [یہ اللہ کی طرف سے اور تیری طرف سے ہے] یا یہ کہنا: "أنا بالله، وبك" [میرا اللہ ہے اور تو ہے] یا یہ کہنا: "ما لي إلا الله وأنت" [اللہ کے اور تیرے سوا میرا کوئی نہیں ہے] یا یہ کہنا: "أنا متكل على الله و عليك" [میرا بھروسا اللہ پر اور تجھ پر ہے] یا یہ کہنا: "لو لا أنت لم يكن كذا و كذا" [اگر تم نہ ہوتے تو ایسا ایسا نہ ہوتا] یا یہ کہنا: اوپر اللہ ہے اور نیچے تو ہے۔

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۲۵۱) سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۵۳۵) سنن ترمذی کے الفاظ حدیث یوں ہیں: «من حلف بغير الله فقد كفر أو أشرك»

شرک اصغر کا شرک اکبر بننا:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قائل کے حسبِ حال اور حسبِ مقصد شرک اصغر شرک اکبر ہو جاتا ہے۔

صحیح حدیث میں موجود ہے کہ ایک شخص نے رسول ﷺ سے کہا تھا: "ما شاء الله و شئت" [وہی کچھ ہوگا جو اللہ چاہے اور آپ ﷺ چاہیں] آپ ﷺ نے اسے کہا: «أَجَعَلْتَنِي لِلّٰهِ نِدًّا؟» [کیا تو نے مجھے اللہ کا شریک اور ہمسر ٹھہرا دیا ہے؟] پھر آپ ﷺ نے اسے کہا: «قُلْ: مَا شَآءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ»[1] [یہ کہہ کہ جو اکیلا اللہ چاہے وہی ہوگا] حالانکہ یہ لفظ مذکورہ بالا الفاظ کی نسبت بہت خفیف اور حقیقت پر مبنی ہے۔

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢١٧) الأدب المفرد (٧٨٣) مسند أحمد (١/ ٤١٢)

شرک کی مزید اقسام

پہلی قسم:

شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ مرید پیر کو سجدہ کرے یا اس کے ہاتھ پر توبہ کرے، یہ شرک عظیم ہے۔ میں کہتا ہوں: تصورِ شیخ، ربطِ قلب بالشیخ اور تعظیمِ شیخ کا بھی یہی حکم ہے۔ ایک جہان اس مصیبت میں گرفتار ہے۔

دوسری قسم:

شرک کی ایک قسم غیر اللہ پر متوکل ہونا ہے، وہ اس طرح کہ غیر اللہ کے لیے عمل کرنا اور اس کے سامنے اِنابت، رجوع، خضوع، خواری اور خاکساری بجا لانا یا اس سے رزق کی جستجو کرنا اور اللہ کی دی ہوئی نعمت کو کسی دوسرے کی طرف منسوب کرنا۔

تیسری قسم:

شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ آدمی غیر اللہ کی نذر مانے۔ یہ شرک غیر اللہ کی قسم کھانے سے بھی بڑا شرک ہے۔ جب غیر اللہ کی قسم اٹھانے والا مشرک ٹھہرا تو غیر اللہ کی نذر ماننے والا بالاولی مشرک ٹھہرے گا۔ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث میں مروی ہے:

«اَلنَّذْرُ حِلْفَةٌ»[1] [نذر اور منت ماننا حلف ہے]

چوتھی قسم:

شرک کی چوتھی قسم یہ ہے کہ آدمی مُردوں سے حاجتیں طلب کرے، ان سے مدد چاہے اور ان کی طرف متوجہ ہو۔

---

[1] عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت بایں الفاظ مروی ہے: « النذر يمين، وكفارته كفارة اليمين » [مسند أحمد (٤/١٤٨)]

دنیا بھر میں ہونے والے شرک کی بنیاد:

مذکورہ بالا اقسام میں سے چوتھی قسم کا شرک حقیقت میں دنیا بھر کے شرک کی بنیاد اور اصل ہے۔ کیونکہ میت کا عمل تو منقطع ہو چکا ہے، اب وہ اپنی جان کے نفع ونقصان کا مالک نہیں رہا تو وہ دوسرے کسی ایسے شخص کو جو اس سے استغاثہ کرتا ہے یا اس سے کسی حاجت وضرورت کا طالب ہے یا اس کو اللہ کے ہاں سفارشی ٹھہراتا ہے، کیا نفع ونقصان پہنچائے گا؟ اس کا سبب اس مشرک کا اللہ کے ہاں شافع اور مشفوع کی حالت سے ناواقف ہونا ہے، جیسا کہ اوپر گزرا ہے کہ اس سفارشی کو یہ قدرت حاصل نہیں ہے کہ وہ اللہ کے ہاں اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کرے۔ جبکہ اللہ نے اس مشرک کے استغاثے، استعانت اور سوال کو اذنِ شفاعت کا سبب نہیں قرار دیا ہے۔ اللہ کے ہاں اذنِ شفاعت کا سبب یہی کمالِ توحید ہے، بلکہ اس مشرک نے وہ کام کر دکھایا ہے کہ پہلے اگر اس کی شفاعت کی اجازت بھی ہوتی تو اب اس کی اجازت نہیں رہی ہے، بلکہ اس مشرک کی حالت تو اس شخص جیسی ہے جو اپنا کام نکالنے کی خاطر ایسا کام کر بیٹھتا ہے جو الٹی رکاوٹ پیدا کر دیتا ہے، کیونکہ میت تو خود اس بات کی محتاج ہے کہ یہ شخص اس کے لیے دعا کرے اور اس پر مہربانی کرتے ہوئے اللہ سے اس کے لیے مغفرت طلب کرے۔

رسول اللہ ﷺ کی ایک وصیت کی خلاف ورزی:

رسول اللہ ﷺ نے ہمیں وصیت فرمائی ہے کہ جب ہم قبروں کی زیارت کریں تو ہمیں چاہیے کہ ہم مردوں پر ترس کھائیں اور ان کے لیے اللہ سے عافیت ومغفرت کا سوال کریں، مگر مشرکوں نے آپ ﷺ کی اس وصیت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قبروں کی زیارت کو عبادت بنا دیا ہے، تاکہ وہ وہاں جا کر ان سے اپنی حاجات طلب کریں اور ان سے استعانت چاہیں۔ ان لوگوں نے ان قبروں کو بت بنا کے رکھ دیا ہے جن کی پوجا و پرستش کی جاتی ہے۔

قبروں پر عبادت گاہیں:

دورِ حاضر کے مشرکوں نے قبروں کی زیارتِ شرکیہ کا نام حج رکھا، وہاں جا کر ٹھہرنا اور سر منڈوانا مقرر کیا اور پیرزادوں اور مریدوں نے قبر کے پاس بیٹھ کر مراقبہ کرنا شروع کیا اور اس کا نام استفاضہ روحانی رکھا۔ اسی طرح اپنے دل کا صاحبِ قبر کی روح کے ساتھ ربط وتعلق کا اعتقاد رکھا۔

بزرگوں کی گستاخی کا طعنہ دینے والے خود اللہ کے گستاخ ہیں:

ایسا کر کے انھوں نے ایک ساتھ دو کام کیے ہیں۔ ایک معبودِ حقیقی کے ساتھ شرک اور دین کا حلیہ بگاڑنے کا کام اور دوسرے اہلِ توحید سے دشمنی رکھنا اور اہلِ اسلام کو تنقیصِ اموات (بزرگوں کی گستاخی) کا طعنہ دینا۔ حالانکہ یہ خود شرک کر کے اللہ تعالیٰ کی تنقیص کرتے ہیں، نیز یہ ان اولیا کی، جو خالص موحد تھے اور انھوں نے کبھی کسی کو اللہ کا شریک نہیں بنایا تھا، مذمت کرتے ہیں اور ان کی عیب جوئی کرنے والے دشمن بن گئے ہیں، لہٰذا انھوں نے جن کے ساتھ یہ شرک کیا ہے، خاص طور پر انھی کی انتہائی درجے کی تنقیص کرتے ہیں۔

گور و پیر پرست انبیا کے دشمن ہیں:

قبر پرست قبروں میں پڑے ہوئے مردوں کے متعلق یہ گمان رکھتے ہیں کہ وہ ان کے مذکورہ افعال و حرکات سے راضی اور خوش ہوتے ہیں یا ان کا گمان ہے کہ ان قبر نشینوں نے انھیں حکم دیا ہے کہ تم یہ کام کرو اور ان افعال کی بدولت وہ ان قبر پرستوں کے کارساز بن گئے ہیں، حالانکہ یہ سارے گور پرست اور پیر پرست ہر جگہ اور ہر دور میں توحید اور رسولوں کے دشمن رہے ہیں اور ان کے پیروکاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے خلیل جلیل ابراہیم علیہ السلام کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے یہ دعا کی تھی:

﴿وَ اجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ أَنْ نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ ۝ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ﴾
[إبراهيم: ٣٤۔٣٥]

[اور مجھے اور میرے بیٹوں کو بچا کہ ہم بتوں کی عبادت کریں۔ اے میرے رب! بے شک انھوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا]

شرک سے بچنے والا:

اس شرک اکبر سے وہی شخص بچا جس نے توحیدِ خالص کو سینے سے لگایا، اللہ کے لیے مشرکوں سے دشمنی کی اور ان کی دشمنی کو اللہ کے قرب کا ذریعہ سمجھا، اس نے اکیلے اللہ کو اپنا ولی اور معبود ٹھہرایا، اللہ کا دوست بنا اور اس کا ڈر رکھا، اسی کا امیدوار بنا اور اسی کے سامنے عجز وانکسار اختیار کیا، اسی سے استعانت چاہی اور اس کی طرف التجا کی، اسی سے مستغیث ہوا اور اپنی نیت و ارادے کو اللہ کے لیے خالص کیا اور اسی کے

حکم کا تابع و متبع بنا، اسی کی رضا مندی کا طالب بنا، جب مانگا اللہ ہی سے مانگا، جب استعانت کی تو اسی سے کی اور جب عمل کیا تو اسی کے لیے خالص عمل کیا، فھو للہ و باللہ و مع اللہ. انتھیٰ کلام المنازل.[1]

شرک اکبر کے مرتکب قابل نفرت و عداوت ہیں:

امام شوکانی رحمہ اللہ نے مذکورہ عبارت نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ دیکھو مذکورہ عبارت میں کس طرح اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ گور پرست جو یہ کام کرتے ہیں، وہ شرک اکبر ہے، بلکہ روے زمین پر ہونے والے تمام شرک کی بنیاد یہی ہے۔ اس عبارت میں یہ جو کہا گیا ہے کہ ان گور پرستوں سے عداوت رکھنا چاہیے، یہ ٹھیک ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ [المجادلة: ٢٢]

[تو ان لوگوں کو جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نہیں پائے گا کہ وہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں جنھوں نے اللہ اور رسول کی مخالفت کی]

مزید فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝ اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ۝ لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ

[1] رسالے کی ابتدا سے لے کر یہاں تک یہ مبحث امام ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب "مدارج السالکین في شرح منازل السائرین بین إیاك نعبد وإیاك نستعین" (١/ ٣٤٨۔٣٥٤) سے ماخوذ ہے۔

﴿وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ﴾

[الممتحنة: ١-٤]

[اے لوگو جو ایمان لائے ہو! میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ، تم ان کی طرف دوستی کا پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ یقیناً انھوں نے اس حق سے انکار کیا جو تمھارے پاس آیا ہے، وہ رسول کو اور خود تمھیں اس لیے نکالتے ہیں کہ تم اللہ پر ایمان لائے ہو، جو تمھارا رب ہے، اگر تم میرے راستے میں جہاد کے لیے اور میری رضا تلاش کرنے کے لیے نکلے ہو۔ تم ان کی طرف چھپا کر دوستی کے پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ میں زیادہ جاننے والا ہوں جو کچھ تم نے چھپایا اور جو تم نے ظاہر کیا اور تم میں سے جو کوئی ایسا کرے تو یقیناً وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔ اگر وہ تمھیں پائیں تو تمھارے دشمن ہوں گے اور اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں تمھاری طرف برائی کے ساتھ بڑھائیں گے اور چاہیں گے کاش! تم کفر کرو۔ قیامت کے دن ہرگز نہ تمھاری رشتے داریاں تمھیں فائدہ دیں گی اور نہ تمھاری اولاد، وہ تمھارے درمیان فیصلہ کرے گا اور اللہ اسے جو تم کرتے ہو خوب دیکھنے والا ہے۔ یقیناً تمھارے لیے ابراہیم اور ان لوگوں میں جو اس کے ساتھ تھے ایک اچھا نمونہ تھا، جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ بے شک ہم تم سے اور ان تمام چیزوں سے بری ہیں جنھیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، ہم تمھیں نہیں مانتے اور ہمارے درمیان اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بغض ظاہر ہو گیا، یہاں تک کہ تم اس اکیلے اللہ پر ایمان لاؤ] انتھی۔[1]

میں کہتا ہوں کہ شرک اکبر کے سوا شرک کی جتنی اقسام ہیں، وہ شرک اصغر ہیں، إلا ماشاء اللہ.

گور و پیر پرستی شرک اکبر ہے:

تمام علما محققین کے نزدیک قبر پرستی اور پیر پرستی شرک اکبر ہے، اصغر نہیں۔ اسی طرح دور دراز علاقوں میں واقع قبروں کی زیارت کے لیے سفر اختیار کرنا، وہ قبر خواہ کسی پیغمبر کی ہو یا کسی ولی یا پیر یا شہید کی، نیز اولیا اور صلحا کو اللہ کے ہاں تقرب اور شفاعت کا ذریعہ سمجھنا بھی شرک اکبر ہے۔

"كُفرٌ دُونَ كُفرٍ" (کفر اصغر) کا مطلب اور اس کے شرک اکبر میں بدلنے کی صورتیں:

"كُفرٌ دُونَ كُفرٍ" سے مراد شرک اصغر ہے، لیکن تھوڑی سی غفلت اور جہالت کی بنا پر یہی

[1] الدر النضيد ضمن الفتح الرباني من فتاوى الإمام الشوكاني (١/ ٣٧٣)

شرک اصغر شرکِ اکبر میں تبدیل ہو جاتا ہے، جیسے ریا کاری اور شہرت طلبی کو شرکِ خفی فرمایا گیا ہے۔ جب خلوص جاتا رہے اور صرف ریا کاری اور شہرت طلبی باقی رہ جائے تو ریا کار مشرک بن جاتا ہے یا جیسے شیخ کا تصور شرک اکبر پر منتج ہوتا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ شرک کے ستر (۷۰) دروازے ہیں[1] اور بدعت کے بہتر (۷۲) ہیں۔ قرآن وسنت نے شرک و بدعت کو ہر معصیت و نافرمانی کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ جب کسی آدمی کے عقیدے میں خلل پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے دل میں گناہ کا کوئی ڈر باقی نہیں رہتا۔

قبر پرستی اور پیر پرستی کے شرک کی ترویج کے لیے شیطان کا دھوکا:

گور پرستوں کو شیطان نے سب سے بڑا دھوکا یہی دیا ہے کہ تم تو اللہ کے اولیا اور صلحا کی تعظیم کرتے اور ان سے محبت کرتے ہو۔ ان کی نذر و نیاز دینے اور منت ماننے سے قیامت کے دن وہ تمھارے سفارشی بن جائیں گے۔ یہ تو بالکل شرک نہیں ہے، شرک تو تب ہوتا جب تم ان کو آسمان و زمین کی تخلیق میں اللہ کا شریک سمجھتے۔ اس طرح ان احمقوں کے دل نے ابلیس کے اس مشورے کو پسند کر کے قبول کر لیا اور شیطان کے تابع بن کر ایمان جیسی نعمت کو مال خرچ کر کے برباد کر بیٹھے اور یہ نہ سمجھا کہ قرآن وسنت کے احکام صرف انھی لوگوں کے لیے خاص نہیں تھے جن کے متعلق قرآن اترا تھا یا حدیث میں کچھ بیان ہوا تھا، بلکہ یہ احکام تا قیامِ قیامت ہر مسلمان کے حق میں عام ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو قرآن کا معجزہ باقیہ ہونا بے اصل ہو جائے گا، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں، جب تک تم ان کو پکڑے رکھو گے گمراہ نہ ہو گے: ایک اللہ کی کتاب اور دوسری رسول کی سنت۔[2]

دورِ حاضر کے لوگوں کا قرآن وحدیث سے عجیب سلوک:

امت کے لوگوں نے قرآن وحدیث کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ قرآن کے عوض شرک اور سنت کے بدلے میں بدعت پسند کر لی۔ ان کے نزدیک قرآن فقط اس لیے ہے کہ اسے گھر کے طاق یا الماری یا صندوق میں "محفوظ" کر کے رکھا جائے اور لوگوں کے سامنے یہ بیان کیا جائے کہ ہمارے

[1] مسند البزار (۳۱۸/۵)

[2] المستدرك للحاكم (۱۷۲/۱)

پاس جو قرآن کا نسخہ ہے وہ بہت عمدہ، خوش خط، طلائی پانی سے لکھا ہوا، کم خواب یا اطلس یا مخمل کے جزدان میں بہت قیمتی جلد سے مجلد ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کرتے ہیں کہ گاہے گاہے اسے نکال کر چوم چاٹ لیا اور پھر واپس رکھ دیا۔ ان کے ہاں یہ قرآن مجید اس لیے نہیں ہے کہ اس کی تلاوت کی جائے، اس پر غور و تدبر کر کے عمل کیا جائے اور اپنے ہر قول و عمل کو اس سے ملا کر دیکھا جائے کہ ہماری کونسی بات ظاہراً یا باطناً قرآن کے موافق ہے اور کون سی حالت شکلاً اور معناً اس کے مخالف ہے، حالانکہ کتاب اللہ کی تلاوت اور تعلیم سے یہی مقصود ہے نہ کہ صرف اسے دیکھنا اور چومنا۔

ملا کا قرآن و سنت سے سلوک:

جو مشرک اور بدعتی عربی و فارسی سمجھتے ہیں اور ملا اور مولوی کہلاتے ہیں، ان کا قرآن کے ساتھ صرف اس قدر تعلق رہتا ہے کہ کسی طرح کوئی لفظ یا آیت ایسی ہاتھ آ جائے جس سے کسی قسم کے شرک یا بدعت کے جواز پر استدلال ہو سکے، چاہے تاویل بعید اور غلط توجیہ کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو، ہر چند دلالت تضمنی یا التزامی کے ساتھ ان کا مدعا پورا ہو جائے، گو اس کے مقابلے میں کتنی ہی آیات بینات اور واضح دلائل موجود کیوں نہ ہوں۔ جہاں تک سنتِ مطہرہ اور حدیث کا تعلق ہے، اول تو اہلِ شرک و بدعت، خصوصاً گور پرست و پیر پرست اور مقلدینِ مذاہب کے دل اس سے نفرت کرتے ہیں، کیونکہ کتبِ احادیث میں اس شرک اور لوگوں کے قیل وقال کی واضح مخالفت موجود ہے۔ اگر ہزار میں سے کوئی ایک دو، وہ بھی بطور دکھلاوے اور فخر کے، علمِ حدیث کی طرف توجہ کرتے بھی ہیں تو حدیث کی کتاب مشکات شریف سے آگے نہیں بڑھتے۔ اگر بالفرض کسی نے صحاح ستہ کو پڑھ لیا یا سن لیا تو اس کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ کسی طرح اپنی بدعت کو ثابت کرے اور سنن اربعہ (ابو داود، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ) کی احادیث کو صحیحین (بخاری و مسلم) کی احادیث پر ترجیح دیتے ہوئے اپنے مذہب اور امام کی حمایت کرے، چنانچہ مقلدینِ مذاہب کے اقوال سے یہ بات بہ خوبی ثابت ہے اور اہلِ تقلید کی ہر کتاب ہمارے اس دعوے پر شاہد ہے۔

قرآن وحدیث میں گمراہ فرقوں کی تردید:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی احادیث مبارکہ میں اہلِ قبور، معتقدینِ اموات اور مقلدینِ مذاہب کے سارے اصول اور مواد کو جڑ سے اکھاڑ دیا ہے۔ یہ الگ بات

ہے کہ کوئی یہ سمجھ لے کہ یہ آیات اور احادیث ہم پر صادق نہیں آتی ہیں، ان کے مصداق زمانہ نبوت کے مشرک، مقلد اور اہلِ جاہلیت تھے، لیکن اس اعتقاد میں شریعت اسلامیہ کا ابطال اور دین حق کے قبول کرنے سے صریح انکار ہے۔ جو شخص بھی اس قسم کا گمان رکھتا ہے، وہ مسلمان نہیں بلکہ مشرک، بے دین اور زندیق و مرتد ہے۔

اللہ کے مقرب اور جنت کے مستحق کون ہیں؟

اس سے بڑا شرک کیا ہو گا کہ لوگ بعض افرادِ امت کو، چاہے وہ ولی ہوں یا پیر و شہید (بزعم خود) اپنا سفارشی اور اللہ تعالیٰ کا مقرب سمجھ لیں، جبکہ ہم تو انبیا اور ان کے اصحاب و اہل بیت کے سوا، جن کے جنتی ہونے کی رسول اللہ ﷺ نے گواہی دی ہے، کسی کے لیے قطعی طور پر جنتی ہونے کا حکم نہیں لگا سکتے۔

ہمیں یہ علم غیب بھی نہیں ہے کہ کس کا خاتمہ بالخیر ہوا اور کس کا خاتمہ بالخیر نہیں ہوا۔ ہاں جس شخص کو ہم نے صالح اور متقی پایا اور وہ اسی حالت پر فوت ہوا، اس کے حق میں ہم حسن ظن تو رکھتے ہیں، مگر اس کے حق میں ہمارے حسن ظن سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اسے اللہ کے ہاں اپنا سفارشی اور اس کے قریب کرنے والا قرار دیں۔

مشرک اور بدعتی حقیقی اولیا کی سفارش سے محروم ہیں:

اگر ہمیں بعض اولیا و اتقیا کے حسنِ خاتمہ اور ان کی مغفرت و بخشش کا یقین کامل بھی ہو جائے تب بھی ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ اللہ کے ہاں کسی مشرک اور بدعتی کی سفارش نہیں کریں گے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہیں تو پھر وہ اولیاء اللہ نہ ہوئے، بلکہ اعداء اللہ ہوئے کہ اس کی مرضی کے خلاف جرأت کرنے کو تیار ہیں۔

لے سانس بھی آہستہ:

اولیا اور صلحا کا یہاں ذکر کرنا اور اللہ کے قریب کرنے اور شفاعت کرنے کے فعل کو انجام دینے کے لیے ان کا نام لینا سرے ہی سے غلط ہے، کیوں کہ ایک نبی و رسول سے بڑھ کر کوئی انسان و بشر اللہ کے ہاں بزرگ تر اور مقرب تر نہیں ہوتا ہے۔ ملائکہ بھی مقربین بزرگ ہیں، لہٰذا جب رسل و ملائکہ اللہ کی مرضی اور اجازت کے بغیر کسی کی سفارش نہیں کریں گے تو کسی دوسرے کی کیا وقعت اور ہستی ہے کہ وہ یہ کام سرانجام دے سکے؟!

اولیا قیامت کے دن گور پرستوں اور پیر پرستوں کے دشمن ہوں گے:

مذکورہ صورت حال کے پیش نظر قیامت کے دن اولیا اور صلحاے اموات ان قبر پرستوں اور پیر پرستوں کے دشمن ہو جائیں گے۔ وہ اس بات سے ڈر رہے ہوں گے کہ کہیں ہم سے یہ سوال نہ ہو کہ ان لوگوں نے جو تمھاری نذر و نیاز کی، تمھاری قبروں پر چراغ جلائے، گنبد بنائے، چادریں چڑھائیں، پردے لٹکائے، قبروں کا طواف کیا، بڑی بڑی پختہ اور بلند قبریں تیار کیں اور انھوں نے تمھیں اپنا مقرب اور سفارشی ٹھہرایا، کیا تم نے انھیں یہ کام کرنے کا حکم دیا تھا یا تم ان کے ان کاموں سے راضی تھے کہ وہ دور دور سے چل کر تمھاری زیارت کے لیے آئیں؟ تمھاری وفات کے دن عرس منائیں؟ تمھارے نام کے جانور ذبح کریں؟ سختی کے وقت تمھیں پکاریں؟ مصیبت میں تمھارے نام کی دہائی دیں اور تم سے مریض کی شفا، گم شدہ کی واپسی، رزق کی کشادگی اور اولاد کا سوال کریں؟

مجاورینِ قبور کو رشوت دینا قیامت کے دن بے سود ہوگا:

قیامت کے دن اولیا اور صلحا کے مذکورہ سوال سے ڈر کی وجہ یہ ہوگی کہ قرآن مجید میں مسیح علیہ السلام سے اس طرح کا سوال پوچھا جانا مذکور ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ [المائدة: ١١٦]

[کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود بنا لو؟]

حالانکہ اللہ تعالیٰ کو اس بات کا بہ خوبی علم ہے کہ مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ کا دامن اس سے بالکل پاک ہے، اس کے باوجود قیامت کے دن ان سے جو یہ سوال ہوگا، وہ اسی لیے ہے کہ اس امت کے قبر پرست اور پیر پرست خوب سمجھ لیں کہ ان اہلِ قبور کو اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اس کے ہاں سفارشی مقرر کرنا خالص شرک اور ہلاکت خیز بدعت ہے اور اہلِ قبور اور مجاورینِ قبور کو رشوت دینا کچھ سود مند نہ ہوگا، بلکہ اس کا وبال انھیں پر ہوگا۔

فصل دوم

مسئلہ شفاعت سے متعلق لوگوں کی غلط فہمیاں

شافع اور مشفوع کا باہمی تعلق شفاعت کے لیے کافی نہیں ہے:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بعض رسائل میں لکھا ہے کہ شفاعت کے حوالے سے لوگوں میں کئی طرح کی گمراہیاں پائی جاتی ہیں، جن کو ہم نے دوسری جگہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بہت سے گور پرستوں اور پیر پرستوں کا یہ گمان ہے کہ شافع اور مشفوع لہ کے درمیان جو اتصال اور تعلق ہے، اس کے سبب سے قیامت کے دن شفاعت ہوگی، جیسا کہ ابو حامد وغیرہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ پر کثرت سے درود بھیجتا ہے، وہ کسی بھی دوسرے شخص کی نسبت شفاعت کا زیادہ حق دار ہے۔ اسی طرح جس شخص کو کسی کے متعلق زیادہ حسنِ ظن ہوتا ہے اور اس بنا پر وہ اس کی بہت زیادہ تعظیم کرتا ہے، اس شخص کی نسبت جو یہ کام نہیں کرتا، وہ شفاعت کا زیادہ حق دار ہے۔

لیکن یہ غلط ہے، بلکہ یہ تو مشرکوں جیسی بات ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ہم فرشتوں کو اسی لیے دوست رکھتے ہیں کہ وہ ہماری شفاعت کریں۔

شفاعت کا سبب توحید خالص ہے:

مشرکین یہ گمان کرتے تھے کہ جو کوئی کسی فرشتے یا نبی یا کسی صالح انسان کو دوست رکھتا ہے تو یہ ان کی شفاعت حاصل کرنے کا ایک سبب اور ذریعہ ہے، حالانکہ بات یوں نہیں ہے، بلکہ شفاعت کا سبب اللہ کی توحید اور دین میں اللہ کے لیے اخلاص ہے، لہٰذا جو شخص جتنا زیادہ اخلاص رکھتا ہوگا، اتنا ہی وہ شفاعت کا حق دار ٹھہرے گا، جس طرح وہ دیگر انواع و اقسام کی رحمت کا مستحق ہوگا۔

اللہ عزوجل شفاعت کا واحد منبع ہے:

شفاعت کی ابتدا اور انتہا اللہ کی طرف سے ہے۔ اللہ کے ہاں اس کے اذن و اجازت کے بغیر

کوئی کسی کا سفارشی نہیں بن سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی شفاعت کرنے والے کو اس کی اجازت دے گا، تب کہیں وہ شفاعت کے لیے زبان کھولے گا اور شفاعت قبول کرنے والا بھی اللہ ہی ہے۔

شفاعت حصولِ رحمت کا ذریعہ ہے:

یہ شفاعت رحمتِ الٰہی کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے گا یہ رحمت کرے گا۔

اللہ تعالیٰ کی اس رحمتِ شفاعت کے سب سے بڑے مستحق اہلِ توحید اور اہلِ اخلاص ہیں۔ جو شخص اخلاص میں اکمل ہوگا، وہی اس رحمت کا حق دار ٹھہرے گا اور جن گناہ گاروں کے گناہ ان کی نیکیوں پر راجح اور غالب ہوں گے اور ان کی نیکیوں والے ترازو ہلکے پڑ جائیں گے، وہ دوزخ کی آگ کے مستحق ہوں گے۔ پھر ان میں سے جو ''لا الٰہ الا اللہ'' پڑھنے والے ہوں گے، ان کے گناہوں کے سبب انھیں آگ ملے گی اور اللہ ان کو ایک طرح کی موت دے گا۔ جہنم کی آگ انھیں جلا ڈالے گی، مگر سجود والی جگہوں کو نہیں جلائے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ انھیں شفاعت کے سبب آگ سے نکال کر جنت میں داخل کرے گا۔ یہ بات احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔[1]

اس سے ثابت ہوا کہ شفاعت کا سارا دار و مدار کلمہ اخلاص پر ہے اور وہ کلمہ یہ ہے: ''لا إله إلا الله'' شفاعت کا انحصار شرک پر نہیں ہے، جس طرح یہ جاہل بلکہ اَجہل گمان کرتے ہیں۔[2] انتھی.

کیا حصولِ شفاعت کے لیے کسی قسم کے شرک کا مرتکب نہ ہونا شرط ہے؟

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ آیا شفاعت کی یہ کارروائی صرف اسی مسلمان کے حق میں ہو گی جس سے شرک کا بالکل ارتکاب نہ ہوا ہو؟ تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مومن سے جو شرک اصغر سر زد ہو جاتا ہے اور اللہ و رسول کے حکم کی اطاعت کی کوشش کے باوجود اپنے کسی کام کے متعلق یہ نہیں جانتا کہ یہ شرک ہے تو امید ہے کہ اس کا یہ معاملہ اسے وعدۂ مغفرت سے خارج نہیں کرے گا، کیوں کہ اس طرح کی اشیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے صادر ہو گئی تھیں، جیسے باپ دادوں یا کعبہ کی قسم کھانے کا کام یا یہ کہنا کہ ''ما شاء الله و شئت'' [جو اللہ چاہے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) چاہیں] یا یہ کہنا: ''ما شاء محمد''

---

[1] دیکھیں: صحیح البخاري، رقم الحديث (٦٢٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٢)

[2] مجموع الفتاویٰ لابن تیمیة (١٤/٤١٤)

[جو کچھ محمد ﷺ چاہیں] یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ کہنا: ''ہمارے لیے بھی ایک ذاتِ انواط مقرر کر دو۔''

مگر جونہی ان پر حق ظاہر ہوا تو وہ حق کے متبع بن گئے اور انھوں نے کسی قسم کا جھگڑا اور کٹ حجتی نہیں کی، جس طرح اہلِ جاہلیت اپنے آبا کے مذہب اور اجداد کی رسوم و عادات پر کٹ حجتیوں اور حمیت وتعصب کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ لیکن جو شخص مسلمان ہونے کا دعوی کرتا ہے، مگر اس کے باوجود بڑے بڑے شرکیہ اعمال کرتا ہے اور جب اس کو اللہ تعالیٰ کی آیات سنائی جائیں تو تکبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے انکار کر دیتا ہے تو وہ مسلمان نہیں ہے۔

مگر جو شخص جہالت کے سبب یہ کام کرتا رہا اور کوئی ناصح اور مرشد اس کو میسر نہ آیا اور اس نے خود علم حاصل کیا، بلکہ ایک ہی جگہ جما رہا اور خواہشِ نفس کی پیروی کرتا رہا تو ہمیں نہیں معلوم کہ اس کا کیا حال ہوگا۔ انتھیٰ.

شرک اصغر قابلِ معافی ہے:

مذکورہ بالا عبارت سے ثابت ہوا کہ شرک اکبر کے ارتکاب میں جہل عذر نہیں بنتا۔ ہاں جو کفر ایسا ہے کہ وہ ایمان کے منافی اور اس کے متضاد نہیں ہے اور ایک شخص سے جہالت اور ناواقفیت کی بنا پر اس کا ارتکاب ہو گیا ہے تو اس کے لیے معافی اور درگزر کی امید کی جا سکتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ عورتوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿ يَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ ﴾[1] [وہ خاوند کی نافرمانی کرتی ہیں] مگر اس جگہ ''کفر'' ناشکری اور ناسپاسی کے معنی میں ہے۔ یہ وہ کفر نہیں ہے جس سے ایمان بالکل جاتا رہے۔

اسی طرح زنا اور شراب نوشی کے متعلق فرمایا ہے کہ جب کوئی شخص زنا کرتا ہے اور شراب پیتا ہے تو زانی اور شرابی وغیرہ سے ایمان جدا ہو جاتا ہے،[2] کیوں کہ یہ اعمال کفر کی وہ قسمیں ہیں جو ایمان کی ضد نہیں ہیں اور ''کفر دُونَ کفرٍ'' (کفر اصغر) کا لفظ اعمال کی انھی اقسام پر بولا جاتا ہے۔ بہت سے ایسے کبیرہ گناہ ہیں جن پر کفر کا اطلاق اور لعنت کا ورود ہوا ہے، مگر ان کی سزا کے متعلق دخولِ نار تو فرمایا ہے، مگر خلودِ نار کا حکم نہیں لگایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کبیرہ گناہوں

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٨٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٧)

کے ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ کچھ ایمان باقی رہ جاتا ہے، اگرچہ وہ تھوڑی مقدار ہی میں کیوں نہ ہو، جیسے ایک دینار یا نصف دینار یا ایک ذرہ یا ایک رائی کے دانے کے برابر۔

شرکِ اصغر پر اصرار کرنا شرکِ اکبر کا موجب ہے:

جہالت اور نادانی کی بنا پر شرک اصغر اور "کفرٌ دُونَ کُفرٍ" کا ارتکاب قابلِ معافی اور قابلِ قبول عذر ہے، لیکن یہ عذرِ جہالت وہاں تک چل سکتا ہے جب تک دلیل کے واضح ہونے کے بعد قبولِ حق سے انکار و استکبار نہ ہو۔ اگر حق واضح ہونے کے بعد اس قول وعمل پر اصرار جاری رہے اور طبعی حجاب یا قوم وملت کے رسوم و رواج وغیرہ رکاوٹ بنیں تو پھر یہ کفر ایمان کی ضد شمار ہوتا ہے اور یہ شرکِ اصغر اپنے فاعل کو شرکِ اکبر تک پہنچا دیتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾

[البقرة: ٢٠٦]

[اور جب اس سے کہا جاتا ہے اللہ سے ڈر تو اس کی عزت اسے گناہ میں پکڑے رکھتی ہے، سو اسے جہنم ہی کافی ہے اور یقیناً وہ برا ٹھکانا ہے]

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ﴾

[المؤمن: ٦٠]

[بے شک وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں، عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے]

لہٰذا کفر و شرک سے بدتر اس پر اصرار کرنا ہے۔ جہنم کے سات درجے اور طبقے ہیں کفار اور مشرکین کو ان کے کفر و شرک کے کم یا زیادہ اور کمزور یا قوی ہونے کے پیشِ نظر ان مختلف طبقات و درجات میں داخل کیا جائے گا۔ العیاذ باللہ۔

حق واضح ہونے کے بعد باطل کی بیخ کنی:

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "زاد المعاد" میں لکھا ہے کہ باطل کا قلع قمع کرنے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ان مقاماتِ معصیت کو جلا دیا جائے اور ڈھا دیا جائے جہاں اللہ اور اس کے

رسول ﷺ کی نافرمانی ہوتی ہے یا کی گئی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد ضرار کو جلا دیا اور حکم دیا تھا کہ جلانے کے بعد جو باقی بچ گئی ہے اسے ڈھا دو۔ مسجد ضرار وہ مسجد تھی جس میں نماز پڑھی جاتی تھی اور اللہ کا نام بلند کیا جاتا تھا، لیکن چونکہ وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور ان میں تفریق ڈالنے کی غرض سے اور منافقین کی جائے پناہ کے طور پر بنائی گئی تھی اور جب کوئی جگہ اس طرح کی ہو تو مسلمانوں کے امام اور خلیفہ پر واجب ہے کہ وہ اس جگہ کو بیکار اور مسمار کر دے، اسے آگ سے جلا دے یا اس کی شکل وصورت بدل کر کسی اور استعمال میں لے آئے، جس کام کے لیے وہ جگہ تعمیر کی گئی تھی، اس کام کے لیے اسے باقی نہ چھوڑے۔

جب مسجد ضرار مسمار کی جا سکتی ہے تو مشاہدِ شرک کو باقی کیوں رکھا جائے؟

جب مسجد ضرار کے ساتھ یہ سلوک ہو تو مشاہدِ شرک جہاں قبروں کے مجاور اور پجاری لوگوں کو بلا کر اللہ کے ہمسر ٹھہراتے ہیں، وہ تو بالاولیٰ اس لائق ہیں کہ انھیں مسمار کیا جائے اور جلا کر ان کو نیست ونابود کر دیا جائے، بلکہ ان کا قلع قمع کرنا واجب تر ہے۔

برائی کے اڈے گرائے جانے کے لائق ہیں:

ایسے ہی وہ محلات اور جگہیں جہاں معاصی اور فسق و فجور کا ارتکاب ہوتا ہو، وہ بھی اس لائق ہیں کہ انھیں مسمار کر دیا جائے۔

دیکھو! عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک پوری بستی کو، جہاں شراب بکتی تھی، آگ سے جلا دیا، رویشد ثقفی کی دکان جلا دی اور اس کا نام فویسق رکھا اور سعد رضی اللہ عنہ کا وہ محل جلا دیا جس میں وہ بیٹھتے تھے اور عوام کی ان تک رسائی نہیں ہوتی تھی۔

خود رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کے گھروں کو آگ لگانے کا ارادہ کیا جو لوگ باجماعت نماز اور جمعہ میں شرکت نہیں کرتے،[1] لیکن پھر ان مستورات اور بچوں کے خیال سے جن پر جمعہ اور جماعت واجب نہیں ہے، اس قصد وارادے سے باز رہے۔

اسی طرح وہ درخت جس کے نیچے بیعت رضوان ہوئی تھی، اس بیعت اور درخت کا ذکر قرآن میں آیا ہے، جب لوگوں نے اس درخت کی تعظیم کرنا شروع کر دی اور اسے مبارک سمجھنے لگے تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ

[1] صحيح البخاري (٢/ ١٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٥١)

نے اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ غور فرمائیں! اگر صحابہ یہ کام نہ کرتے اور شرک کے ذرائع بند کرنے کا اہتمام نہ کرتے تو یقیناً آج زمین کے کسی علاقے میں اسلام کا نام بھی نہ سنا جاتا۔

شرک و بدعت پر لوگوں کے اصرار اور جمود کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ امتِ اسلام کے اکثر لوگ شرک و بدعت کو دین و ایمان سمجھنے لگے ہیں اور قرآن و حدیث کے اتباع کو بدعت و ضلالت سمجھ کر موحدین کی جان و آبرو اور ان کے مال اور نام کے جانی دشمن بن گئے ہیں۔

شارع علیہ السلام نے یہ جو فرمایا تھا کہ اسلام غریب شروع ہوا اور غربت کی طرف لوٹ جائے گا تو اس کا مصداق تو سیکڑوں سال سے دنیا میں موجود دکھائی دیتا ہے۔ مسلمان قبروں میں چلے گئے اور مسلمانی صرف کتابوں میں باقی رہ گئی ہے۔ اب کس کی مجال ہے کہ وہ ان شرکیہ افعال کا رد کرے اور پھر اسے کوئی مسلمان سمجھے؟ فإنا لله وإنا اليه راجعون.

قبر پر بنی ہوئی مسجد گرانا اور مسجد میں دفن کیے ہوئے مردے کو اکھاڑنا واجب ہے:

ایک بات یہ بھی یاد رکھنے والی ہے کہ کسی ایسی چیز پر کچھ وقف کرنا جو نیکی اور قربتِ الٰہی کا ذریعہ نہ ہو، جائز اور درست نہیں ہے، مثلاً اس مسجد پر کچھ مال وقف کرنا درست نہیں ہے جو مسجد قبر پر یا قبر کے پاس بنی ہو، بلکہ اس مسجد کو گرانا واجب ہے۔

مسجد اور قبر اکٹھے نہیں ہو سکتے:

اسی طرح اگر مسجد کے اندر کوئی مردہ دفن ہو تو اسے کھود کر نکال ڈالا جائے۔ امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کی صراحت کی ہے۔ دینِ اسلام میں قبر اور مسجد کو جمع کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ جو چیز ان میں سے بعد میں بنائی جائے، اسے مٹا دیا جائے اور ختم کر دیا جائے اور جو چیز پہلے کی بنی ہوئی ہے، اس کو باقی رکھا جائے۔ دونوں چیزیں اکٹھی بنائی جائیں تو یہ قطعاً جائز نہیں ہے اور نہ ایسی جگہ وقف کرنی درست ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی مسجد میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے اور جو شخص قبر کو مسجد اور عبادت گاہ بنائے اس پر لعنت فرمائی ہے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کے پاس مجاورت اختیار کرنے سے بھی منع فرمایا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ مجاورت عرس وغیرہ کے دیگر اجتماعات کو بھی شامل و عام ہے۔ یہ ہے وہ دینِ اسلام جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا اور اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ انتھی.[1]

[1] زاد المعاد (۳/۵۷)

مے خانوں کی نسبت بت خانے گرانا زیادہ بہتر ہے:

امام احمد رحمہ اللہ نے ایک دوسری جگہ فرمایا ہے: ''یہی حکم ان جگہوں کا ہے جن کو اہلِ شرک نے بت خانے بنا رکھا ہے، انھیں منہدم کرنا، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو انتہائی زیادہ محبوب و مرغوب ہے۔ ان جگہوں کو مسمار کرنا اسلام اور مسلمانوں کے لیے مے خانوں اور برائی کے اڈوں کو گرانے کی نسبت بہت زیادہ نفع مند ہے۔ یہ مشاہد و مزار جو قبروں پر بنائے گئے ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر ان کی پرستش کی جاتی ہے اور قبروں والوں کے ساتھ طرح طرح کا شرک کیا جاتا ہے، ان مشاہد و مزارات کا باقی رکھنا اسلام میں حلال نہیں ہے، بلکہ ان کا گرانا اور مسمار کرنا واجب ہے اور ان کو وقف کرنا اور ان پر کچھ وقف کرنا درست نہیں ہے۔

مزارات کے لیے وقف شدہ اموال کے مصارف:

امامِ وقت کو چاہیے کہ وہ مشاہد اور مزارات کو ختم کرے اور ان کے لیے وقف شدہ اموال لشکرِ اسلام اور مسلمانوں کے مصالح میں خرچ کرے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ بت خانوں کے اندر موجود آلات، ساز و سامان اور نذرانوں کے اموال کو، جو ان تحائف سے مشابہت رکھتے ہیں جو امام کے گھر میں آتے ہیں، مسلمانوں کے مصالح اور ان کی ضروریات پر خرچ کر دیتے تھے۔ چنانچہ بت خانوں اور مے خانوں میں جمع شدہ وہ سارا مال دینِ اسلام کے مصالح پر خرچ ہوا۔[1]

بت خانوں اور مشاہد و قبور میں مماثلت:

رسول اللہ ﷺ نے جن بت خانوں کو گرایا اور ان کے اموال اسلام کے لیے خرچ کیے، ان بت خانوں کے پاس وہی کام ہوتے تھے، جو اب مشاہد اور قبور کے پاس ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے۔ یہی نذر و نیاز، انھیں بہ قصدِ تبرک چھونا، ان کو چومنا اور استلام کرنا، وہاں بھی تھا اور یہاں بھی یہی ہوتا ہے۔

دورِ حاضر اور زمانۂ جاہلیت کے مشرک ایک جیسے شرک میں مبتلا تھے:

زمانہ جاہلیت کے لوگوں کا شرک اسی نوعیت کا تھا جو آج کے مشرکوں میں موجود ہے۔ دورِ جاہلیت کے لوگ اس بات کے معتقد نہیں تھے کہ ہمارے معبود زمین و آسمان کے خالق ہیں، بلکہ اُن کا شرک بعینہٖ انھیں اربابِ مشاہد و قبور کے شرک کی طرح تھا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اس دور کے جاہل اور

---

[1] زاد المعاد (٣/٤٤٣)

گمراہ لوگوں نے اللہ کی عبادت تو چھوڑ دی اور جس مخلوق کی یہ تعظیم کرتے تھے اس کو اللہ کی عبادت میں شریک ٹھہرا لیا۔ غیر اللہ کے لیے رکوع، سجدہ، قیام، ان کے نام کی قسم، ان کی نذر و نیاز، ان کا طواف، ان کے پاس بال مونڈنا، ان سے محبت، انھی سے امیدیں وابستہ کرنا اور انھی کی اطاعت بجا لانا؛ یہ سب کچھ کرنے لگے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر جس مخلوق کو یہ پوجتے تھے، اس مخلوق کو انھوں نے رب العالمین کے برابر ٹھہرا دیا۔

لہٰذا یہی وہ لوگ ہیں جو رسولوں کی دعوت کے خلاف ہیں اور غیر اللہ کو اللہ کے برابر ٹھہراتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو جہنم میں شرکِ تسویہ کی بابت اپنی گمراہی کا اقرار کریں گے۔ انھی لوگوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ [البقرة: ١٦٥]

[اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو غیر اللہ میں سے کچھ شریک بنا لیتے ہیں، وہ ان سے اللہ کی محبت جیسی محبت کرتے ہیں، اور وہ لوگ جو ایمان لائے، اللہ سے محبت میں کہیں زیادہ ہیں]

یہ سب شرک ہے اور اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں کرتا۔

ایک آیت کا شانِ نزول:

امام ابو الفرج نے کہا ہے کہ یہ آیت ﴿وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ [الزخرف: ٨٦] اس وقت نازل ہوئی جب نضر بن حارث اور اس کے ساتھ کچھ اور لوگوں نے یہ بات کہی کہ اگر محمد ﷺ کا کہنا اور ان کی دعوت درست ہے تو ہم ملائکہ کو اس کائنات کے کارکن اور کارندے سمجھتے اور مانتے ہیں اور وہ محمد ﷺ کی نسبت شفاعت کے زیادہ حق دار ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ قاله مقاتل۔[1]

فرشتے بھی شفاعت کے مالک نہیں ہیں:

مشرکین کے مذکورہ اعتقاد کی تفصیل یہ ہے کہ وہ فرشتے جن کے متعلق وہ شفاعت کا عقیدہ

---

[1] زاد المسير (٧/٣٣٣) تفسير القرطبي (١٦/١٠٦)

رکھتے تھے، وہ شفاعت کے قطعاً مالک نہیں ہیں۔ فرشتوں کو دوست رکھنا، ان کا کائنات کے کارکن ہونا اور ان سے طالبِ شفاعت ہونا، یہ ساری چیزیں فرشتوں کی شفاعت کی موجب نہیں ہیں، کیوں کہ اللہ کے سوا کوئی بھی شفاعت کا مالک نہیں ہے۔ ہاں جس نے حق کی گواہی دی اور اس کو علم ہو، اس کے لیے اگر کوئی شفاعت کرے گا تو اس کے لیے وہ شفاعت شہادتِ حق کے قائم مقام ہوگی، اور وہ شہادتِ حق ''لا الہ الا اللہ'' ہے۔

ملائکہ یا انبیا و صلحا سے محبت موجبِ شفاعت نہیں ہے:

غیر اللہ کے ساتھ محبت اور دوستی شفاعت کا سبب نہیں، خواہ وہ غیر اللہ ملائکہ ہوں یا انبیا و صلحا۔ کیوں کہ جو شخص ان میں سے کسی کو کارساز سمجھ کر اس سے دوستی اور محبت رکھتا ہے، اس کو پکارتا ہے، اس کی قبر یا مزار کا حج اور طواف کرتا ہے، اس کی منت مانتا ہے یا اس کی قسم کھاتا ہے یا اس کے لیے نذر پیش کرتا ہے، تاکہ وہ اس کا سفارشی بن جائے تو اللہ کے ہاں یہ اس کے کسی کام نہیں آسکے گا۔ بلکہ وہ شفاعت سے بہت دور چلا جائے گا، اللہ اس کا شفیع ہوگا اور نہ کوئی غیر اللہ۔ کیونکہ شفاعت کے حق دار تو صرف اہلِ توحید اور اہلِ اخلاص ہیں۔

جس کسی نے دوسرے کو اپنا کارساز ٹھہرایا تو وہ مشرک ہے۔ یہ قول وعبادت جس سے حصولِ شفاعت کا قصد و ارادہ کیا گیا ہے، وہ اس سے محروم رہے گا، جیسے ملائکہ اور انبیا و صالحین کو شفاعت کی امید پر پوجنے والوں کا پوجنا اور انھیں شریک ٹھہرانا، ان کے لیے شفاعت سے محرومی کا سبب بن جائے گا اور وہ اپنی امید کے برخلاف مبتلائے عذاب بھی ہوں گے۔ کیوں کہ انھوں نے اللہ کے ساتھ اس چیز کو شریک کیا جس کے شریک ہونے کی اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے۔

گمراہ لوگوں کا شفاعت کے متعلق غلط تصور:

بہت سے گمراہ لوگ اس بدگمانی میں مبتلا ہیں کہ مذکورہ شرکیہ اعمال کے بجا لانے سے شفاعت حاصل ہوتی ہے۔ مشرکین اور نصاریٰ کا بھی یہی گمان تھا اور گمراہ مسلمانوں کا بھی یہی گمان ہے کہ جو غیر اللہ کو پکارتے ہیں یا کسی قبر کا حج کرتے ہیں یا کسی مکان و استھان اور چلہ گاہ پر ان کے لیے منت مانتے ہیں، وہ ان کاموں کی وجہ سے ہماری شفاعت کریں گے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَ

لَا تَحْوِيْلًا ۞ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَ يَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا﴾

[بني إسرائيل: ٥٦۔٥٧]

[کہہ! پکارو ان کو جنھیں تم نے اس کے سوا گمان کر رکھا ہے، پس وہ نہ تم سے تکلیف دور کرنے کے مالک ہیں اور نہ بدلنے کے۔ وہ لوگ جنھیں یہ پکارتے ہیں، وہ (خود) اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں، جو ان میں سے زیادہ قریب ہیں اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تیرے رب کا عذاب وہ ہے جس سے ہمیشہ ڈرا جاتا ہے]

سلف کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ ایک قوم کے لوگ مسیح، عزیر علیہ السلام اور فرشتوں کو پوجتے تھے، اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں یہ بات کھول کر بیان کر دی کہ وہ تکلیف دور کرنے اور بلا ٹالنے کے مالک نہیں ہیں، اگرچہ اللہ ان کی دعا قبول کرتا ہے، مگر بلا کا ٹالنا اور مصیبت کا دور کرنا ان کے اختیار میں نہیں ہے، اسی طرح وہ شفاعت کے بھی مالک نہیں ہیں۔ مذکورہ آیت میں کوئی استثنا نہیں ہے۔

جن سے شفاعت کی امید کی جاتی ہے، وہ خود رحمتِ الٰہی کے امیدوار ہیں:

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی بھی صراحت کر دی کہ یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر جنھیں پکارتے ہیں، وہ خود دیگر مومنوں کی طرح اللہ کی رحمت کے امیدوار، اس کے عذاب سے خائف اور اعمال صالحہ کے ذریعے اس کے قرب کے متلاشی ہیں۔ وہ کسی کو شرک کا حکم نہیں دیتے۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَ النَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ [آل عمران: ٨٠]

[اور نہ یہ (حق) کہ تمھیں حکم دے کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بنالو، کیا وہ تمھیں کفر کا حکم دے گا، اس کے بعد کہ تم مسلم ہو؟]

معلوم ہوا کہ اللہ کے سوا کسی اور کو مربی اور کارساز ٹھہرانا کفر ہے اور یہ کفر اسلام کی ضد ہے۔

زیارتِ قبور کی دو قسمیں:

امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ قبروں کی زیارت دو طرح سے ہوتی ہے:

① زیارتِ شرعیہ۔ ② زیارتِ بدعیہ۔

① زیارتِ شرعیہ:

قبروں کی شرعی زیارت یہ ہے کہ میت کو وہاں لے جا کر اس کی نمازِ جنازہ ادا کی جائے اور مقصد اس نماز کا حاضر میت کے لیے دعا و استغفار کرنا ہوتا ہے۔

② زیارتِ بدعیہ:

قبروں کی بدعی زیارت وہ ہے جو اہلِ شرک کیا کرتے ہیں۔ یہ اسی قبیل کی زیارت ہے جو نصاریٰ کرتے ہیں، چنانچہ وہ دعا، استغاثہ اور طلبِ حاجت کے لیے قبر کے پاس جاتے ہیں اور قبر کے پاس نماز ادا کر کے میت کو پکارتے ہیں۔ اس طرح کی زیارت کسی صحابی نے کی نہ رسول اللہ ﷺ نے ایسی زیارت کا حکم دیا اور نہ ائمہ سلف میں سے کسی نے اس کو مستحب کہا ہے، بلکہ آپ ﷺ نے من جملہ مذکورہ شرک کے ہر قسم کے شرک کا دروازہ بند کر دیا۔

پہلی قسم کی زیارتِ قبور اللہ کی عبادت اور اللہ کی مخلوق پر احسان کرنے کی جنس سے ہے اور شریعت کی طرف سے ایسی زیارت کا حکم دیا گیا ہے، جبکہ دوسری قسم کی زیارتِ قبور اللہ کے ساتھ شرک کرنے اور اس کے حق میں اور اس کے بندوں کے حق میں ظلم کرنے کی قبیل سے ہے۔

شرک سب سے بڑا ظلم ہے:

صحیح حدیث میں موجود ہے کہ جب یہ آیت اتری:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ﴾ [الأنعام: ٨٢]

[وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو بڑے ظلم کے ساتھ نہیں ملایا]

تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر اس کا نزول بہت گراں گزرا۔ انھوں نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کی: ہم میں سے ایسا کون ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم نہیں کیا؟ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: اس آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے۔ تم نے اللہ کے نیک بندے لقمان علیہ السلام کا یہ قول نہیں سنا کہ انھوں نے کہا تھا:

﴿ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴾ [لقمان: ۱۳]

[بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے][1]

نیز رسول اللہ ﷺ نے شرک کا دروازہ بند کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی:

« اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا يُّعْبَدُ »[2]

[اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنانا کہ اس کی عبادت ہونے لگے]

بت پرستی کا آغاز وارتقا:

دنیا میں بت پرستی کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قوم نوح علیہ السلام کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ انھوں نے کہا:

﴿ وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ﴾

[نوح: ۲۳]

[اور انھوں نے کہا تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ کبھی ودّ کو چھوڑنا اور نہ سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو]

سلف کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ودّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر قومِ نوح علیہ السلام کے کچھ نیک لوگ تھے، جب وہ فوت ہو گئے تو قوم نے ان کی قبروں پر اعتکاف ومجاورت کی اور ان کی تصویریں بنا کر اپنی مجلسوں میں اس جگہ رکھیں جہاں وہ بزرگ اپنی زندگی میں بیٹھا کرتے تھے۔ اس طرح ان کے ہاں بت پرستی کا آغاز ہوا۔ یہ بت پرستی اور قبر پرستی نصاریٰ کے دین سے ہے، ورنہ صحابہ کرام اور تابعین عظام رضی اللہ عنہم نے کبھی کسی قبر کے پاس دعا کرنے کا قصد وارادہ نہیں کیا، وہ قبر کسی نبی کی ہو یا کسی غیر نبی کی۔

رسول اللہ ﷺ کی قبر کے پاس دعا کرنے کے لیے کھڑا ہونا مکروہ اور بدعت ہے:

ائمہ اسلام نے رسول اللہ ﷺ کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر آپ ﷺ کے لیے دعا کرنے کو مکروہ اور بدعت کہا ہے، کیونکہ صحابہ کرام اور تابعین عظام رضی اللہ عنہم نے یہ کام نہیں کیا ہے، بلکہ وہ لوگ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۲) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۲٤)

[2] موطأ الإمام مالك (۱/۱۷۲)

آپ ﷺ اور ابو بکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما پر سلام کر کے چل دیتے تھے۔

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما جو بڑے متبع سنت صحابی تھے، جب وہ [سفر سے] مسجد نبوی میں آتے تو کہتے:

"السلام عليك يا رسول اللهﷺ، السلام عليك يا أبابكر، السلام عليك يا أبت"[1]

[اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ پر سلامتی ہو۔ اے ابو بکر رضی اللہ عنہ! آپ پر سلام ہو۔ اے میرے ابا جان! آپ پر سلامتی ہو]

یہ کہنے کے بعد وہ چل دیتے تھے، زیادہ دیر تک قبروں کے پاس نہیں رکتے تھے۔

مخلوق کے وسیلے سے دعا کرنا جائز نہیں ہے:

امام مالک رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ کرام رحمہم اللہ نے مذکورہ مسئلے کی صراحت کی ہے۔ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ وغیرہ علما کا قول یہ ہے کہ کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی مخلوق کے وسیلے کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے سوال کرے، وہ مخلوق انبیا ہوں یا ملائکہ یا ان کے علاوہ کوئی دوسرا ہو۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ایک دفعہ مسلمان قحط سالی کا شکار ہو کر سخت مشقت میں مبتلا ہوئے تو وہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگنے لگے اور بارش طلب کرنا شروع کی اور انھوں نے دشمنوں کو بد دعا دی۔

نیک لوگوں کی دعا کا وسیلہ جائز ہے:

مذکورہ بالا قحط سالی کے دوران میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے صالحین کی دعا سے استفادہ کیا اور اسے وسیلہ بنایا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿وَهَلْ تُنصَرُوْنَ وَ تُرْزَقُوْنَ إِلَّا بِضُعَفَائِكُمْ وَ بِدُعَائِهِمْ وَصَلَاتِهِمْ وَ إِخْلَاصِهِمْ﴾[2]

[اور تم اپنے میں سے کمزور لوگوں، ان کی دعا، ان کی نماز اور ان کے اخلاص کی وجہ سے مدد کیے جاتے اور رزق دیے جاتے ہو]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کبھی یہ کام نہیں کیا کہ وہ دعا کرنے کے لیے کسی نبی یا کسی صالح آدمی کی قبر پر گئے ہوں یا کسی قبر کے پاس نماز پڑھی ہو یا کسی مردے سے کوئی حاجت و ضرورت طلب کی ہو یا

---

[1] سنن البيهقي (٥/٢٤٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٣٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٣١٧٨)

اللہ کو اس کی قسم دی ہو جس طرح کہ بعض لوگ کہتے ہیں:

"أسألك بحق فلان و فلان"

[میں تجھ سے فلاں فلاں کے وسیلے اور حق کے ساتھ سوال کرتا ہوں]

بلکہ ایسا کرنا بدعات میں شمار ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«خَيْرُ أُمَّتِي الْقَرْنُ الَّذِي بُعِثْتُ فِيهِمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ»[1]

[میری امت میں سے بہتر وہ ہے جس میں میں (نبی اور رسول) مبعوث ہوا ہوں، پھر ان لوگوں کا دور جو اس دور کے بعد آئے اور پھر ان کا دور سب سے بہتر ہے جو اُن کے بعد آئے]

تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس ملت کے طبقات میں سب سے بہتر طبقے کے لوگ تھے۔ انتہی[2]

توحید کا سرچشمہ:

میں کہتا ہوں کہ جو شخص اخلاصِ توحید کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید کے مبانی اور معانی پر زیادہ تدبر، تفکر اور تامل کرنے کی فرصت نہیں پاتا، وہ سورت فاتحہ کے مطالعے کے بعد سورۃ الکافرون اور اخلاص یعنی سورت "قل يأيها الكافرون" اور سورت "قل هو الله احد" کا بغور مطالعہ کرے تو توحید خالص کو جاننے کے لیے اس کو یہی کچھ کافی ہو گا۔

ہر موافق اور مخالف کے ہاں یہ بات مسلم اور متفق علیہ ہے کہ وہ زمانہ جس کے بہتر ہونے کی گواہی رسول اللہ ﷺ نے دی ہے، قطعی طور پر عقیدہ وعمل میں بہتر تھا، لہٰذا جو بات اس زمانے کے لوگوں سے ثابت نہیں ہے اور وہ ان میں معروف و مروج نہیں تھی یا جس چیز کو انھوں نے برا خیال کیا یا جو ان کی سیرت و سنت کے خلاف ہے، وہ بلا شک و شبہہ کسی قسم کے شرک یا بدعت یا معصیت یا حرمت یا کراہت سے خالی نہیں ہو سکتی۔

"فتوحاتِ مکیہ" کے باب نمبر (۱۹۸) میں کہا گیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شرک اکبر کے حق میں نازل ہونے والی آیت کی تفسیر اس طرح کرتے تھے کہ وہ شرک اصغر کو بھی اپنے اندر شامل کر لے۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٥٧)

[2] الفتاوىٰ الكبرى لابن تيمية (٣٩/٣)

اگر کوئی شخص غیر اللہ کی سچی قسم بھی کھائے تو وہ معصیت اور گناہ میں یمین غموس (گناہ میں ڈبو دینے والی قسم) سے بڑھ کر ہے۔

تعویذ گنڈے:

''تمائم'' [تعویذ گنڈے وغیرہ] اس چیز کو کہتے ہیں جو نظرِ بد سے محفوظ رکھنے کی غرض سے بچوں کے گلے میں لٹکائی جائے۔ اگر تو تعویذ میں قرآن کی کوئی آیت لکھ کر لٹکائی گئی ہے تو بعض سلف اس کی رخصت دیتے ہیں اور بعض اس سے بھی منع کرتے ہیں، سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔[1]

''رقی'' [جھاڑ پھونک اور دم وغیرہ] کو ''عزائم'' کہتے ہیں جو شرک نہ ہو اور وہ دلیل کے لحاظ سے تعویذ سے مخصوص ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر بد اور زہریلی چیز کے ڈنگ وغیرہ سے دم کرنے کروانے کی رخصت دی ہے۔[2]

تعویذِ محبت جو بیوی خاوند کو اپنا اسیرِ محبت کرنے کے لیے اور خاوند بیوی کی محبت کیشی کے لیے پہنتا ہے، شرک ہے، اسی طرح مصیبتوں کو ٹالنے کے لیے چھلا پہننا اور دھاگا وغیرہ باندھنا شرک ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ﴾ [الزمر: ٣٨]

[کہہ! تو کیا تم نے دیکھا کہ وہ ہستیاں جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے تو کیا وہ اس کے نقصان کو ہٹانے والی ہیں؟ یا وہ مجھ پر کوئی مہربانی کرنا چاہے تو کیا وہ اس رحمت کو روکنے والی ہیں؟ کہہ دے مجھے اللہ ہی کافی ہے، اسی پر بھروسا کرنے والے بھروسا کرتے ہیں]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیتل کا چھلا اور گھونگا پہننے سے منع فرمایا ہے۔[3] سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٥٣٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٩١)

[3] مسند أحمد (٤/٤٤٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٥٣١) اس کی سند میں امام حسن بصری رحمہ اللہ اور صحابیِ رسول عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کے درمیان انقطاع ہے، لہٰذا یہ حدیث ضعیف ہے۔

شخص کے ہاتھ میں دھاگا بندھا ہوا دیکھا، جو بخار دور کرنے کے لیے باندھا گیا تھا تو انھوں نے وہ دھاگا پکڑ کر توڑ ڈالا اور فرمایا:

﴿وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾ [يوسف: ١٠٦]

[اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، مگر اس حال میں کہ وہ شریک بنانے والے ہوتے ہیں][1]

اللہ کی دی ہوئی نعمت کو دوسرے کی طرف منسوب کرنا بھی شرک ہے:

یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمت کو کسی غیر کی طرف منسوب کرنا بھی شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا ﴾ [النحل: ٨٣]

[وہ اللہ کی نعمت کو پہچانتے ہیں، پھر اس کا انکار کرتے ہیں]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جیسے یہ کہنا کہ یہ مال میرا ہے، میں نے اپنے باپ کی میراث میں حاصل کیا ہے۔

"منتقیٰ الأخبار" کی شرح "نیل الأوطار" میں امام شوکانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قبے اور مشاہد بھی دلائل کی رو سے قبروں کو بلند کرنے کی ممانعت کے حکم میں داخل ہیں اور قبروں کو مسجد ٹھہرانے کے مترادف ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ آج کے قبر پرستوں نے وہی کچھ کیا اور کہا ہے جو کچھ اہلِ جاہلیت بتوں کے ساتھ کیا کرتے اور ان کے متعلق کہا کرتے تھے۔ فإنا للہ. اس بدترین منکر اور قطعی کفر کے باوجود کوئی شخص ایسا نہیں ملتا جو اللہ کے لیے غضب ناک ہو اور دین حنیف کا حامی بنے، نہ کوئی عالم اور نہ کوئی متعلم، نہ کوئی امیر و وزیر اور نہ کوئی بادشاہ۔

علمائے دین اور مسلمانوں کے بادشاہو! اسلام کے لیے کفر سے زیادہ سخت مصیبت کون سی ہے؟ اس دین کے لیے غیر اللہ کی عبادت سے زیادہ ضرر رساں بلا و آزمائش کون سی ہے؟ مسلمانوں کو وہ کون سی مصیبت پہنچے گی جو اس مصیبت کے برابر ہو؟ اگر اس واضح شرک کا انکار واجب نہیں تو آخر کس منکر کا انکار واجب ہوگا؟[2]

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٢٢٠٨/٧) تفسير ابن كثير (٥١٢/٢) فتح المجيد (ص: ١١٤)

[2] نيل الأوطار (١٣١/٤)

لقد أسمعت لو ناديت حيا
ولكن لا حياة لمن تنادي

[اگر تو کسی زندہ کو ندا کرتا تو اسے سنا لیتا، لیکن جسے تو پکار رہا ہے اس میں زندگی نام کی کوئی چیز نہیں ہے]

ولو نارا نفخت لها أضاءت
ولكن أنت تنفخ في رماد

[اگر تو آگ میں پھونک مارتا تو وہ روشن ہو جاتی، لیکن تو تو راکھ میں پھونکیں مار رہا ہے]

خاتمہ:

آج بروز بدھ ۱۶ شوال ۱۳۰۵ھ کو یہ رسالہ ایک دن میں مکمل ہوا۔

والحمد لله الذي بنعمته تتم الصالحات.

فہرست رسائل اردو

١٩ـ ترجمان وهابيه

٢٠ـ تعليم الإيمان

٢١ـ تعليم الصلاة

٢٢ـ تفريج الكروب بالتوبة عن الذنوب

٢٣ـ توزيع العباد إلى الدرجات في يوم المعاد

٢٤ـ تعليم الصيام

٢٥ـ تعليم الزكاة

٢٦ـ تعليم الحج

٢٧ـ تعليم الذكر والدعا

٢٨ـ تحريم الخمر والزنا واللواط

٢٩ـ التفكيك عن أنحاء التشريك

٣٠ـ تحصيل الكمال بالخصال الموجبة للظلال

٣١ـ تبشير العاصي بتكفير المعاصي

٣٢ـ تسلية المصاب

٣٣ـ تذكير الكل بتفسير الفاتحة وأربع قل

٣٤ـ حديث الغاشية

٣٥ـ حسن المساعي إلى إصلاح الرعية والراعي

٣٦ـ خيرة الخيرة

٣٧ـ دعوة الداع إلى إيثار الاتباع على الابتداع

٣٨ـ دعاية الإيمان إلى توحيد الرحمن

٣٩ـ دواء القلب القاسي بتذكير الموت للناسي

٤٠ـ رفو الخرقة بشرف الحرفة

٤١ـ زيادة الإيمان

٤٢ـ سعة المجال

٤٣۔ سبيل الرشاد

٤٤۔ صلاح ذات البين

٤٥۔ صدق اللجأ إلى الخوف والرجا

٤٦۔ ضوء الشمس من شرح حديث بني الإسلام على خمس

٤٧۔ طراز الخمرة في أحكام الحج والعمرة

٤٨۔ عاقبة المتقين

٤٩۔ غنية القاري بشرح ثلاثيات البخاري

٥٠۔ غراس الجنة في الأذكار والأدعية

٥١۔ فتح المغيث بفقه الحديث

٥٢۔ فتح الخلاق بلطائف المنن والأخلاق

٥٣۔ فتح الباب في عقايد أولي الألباب

٥٤۔ فصل الخطاب في فضل الكتاب

٥٥۔ فتنة الإنسان من تلقاء أبناء الزمان

٥٦۔ قوارع الإنسان عن اتباع خطوات الشيطان

عقيدة السنّي

تالیف

امام العصر علامہ نواب محمد صدیق حسن خان حسینی بھوپالی رحمہ اللہ

(۱۲۴۸ھ-۱۳۰۷ھ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله الذي يسبح له أهل السماوات والأرض ومن فيهن، لا يبغون عنه حولا، ولا به بدلا، والصلاة والسلام على خير خلقه محمد وآله و صحبه الذين آمنوا و عملوا الصالحات، و كانت لهم جنات الفردوس نزلا.

اللہ تعالیٰ، فرشتوں، جن وانس، آسمان وزمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کو میں گواہ بناتا ہوں کہ تہ دل سے میرا عقیدہ یہ ہے:

خالقِ کائنات:

اس جہانِ فانی کا ایک بنانے والا موجود ہے جس نے اس جہان کو عدم سے ایجاد کیا اور قانونِ حکمت پر اس کی ترتیب رکھی۔ اس عالم کا وہ موجد اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے، جیسا کہ اس کا فرمان ہے:

﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ [الأعراف: ٥٤]

[بے شک تمھارا رب اللہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا]

مزید فرمایا:

﴿اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ﴾ [الزمر: ٦٢]

[اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے]

نیز فرمایا:

﴿اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ [إبراهيم: ١٠]

[کیا اللہ کے بارے میں کوئی شک ہے، جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے؟]

قرآن مجید میں مزید پانچ سو آیات موجود ہیں جو اس کائنات کے بنانے والے کے ثبوت اور اس کی صفات پر دلالت کرتی ہیں، بلکہ فطرتِ انسانی اس دعوے پر برہان و حجت قائم کرنے سے مستغنی ہے۔

تنزیہ باری تعالیٰ:

وہ کبیر، عظیم، بہت بلند اور ساری صفاتِ کمال جیسے علم، قدرت، حیات، سمع، بصر، ارادہ، تکوین، کلام، ترزیق، تخلیق اور اسی جیسی دیگر صفات کے ساتھ متصف ہے۔ وہ نقص و زوال والی تمام صفات جیسے عجز، جہل، کذب اور موت سے منزہ اور پاک ہے۔

صفتِ خلق:

عالم ملک و اشباح ہوں یا عالم ملکوت و ارواح، جتنی بھی مخلوقات ہیں، سبھی کو اس نے پیدا کیا ہے۔ ''خلق'' کا مطلب ہے کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا۔ اسی خلق کے باوصف وہ خالق ہے۔

علمِ الٰہی:

جتنی بھی معلومات ہیں، وہ جزئیات وکلیات ہوں یا ممکنات و مستحیلات، وہ ان سب کو جانتا ہے۔ زمین کی تہ سے لے کر آسمانوں کی چوٹی تک جو کچھ ہوتا ہے، وہ سب اس کو معلوم ہے۔ کیا مجال ہے کہ سارے آسمانوں اور زمینوں میں ایک ذرہ بھی اس سے چھپا رہ جائے۔ اندھیری رات میں کالے پتھر پر اگر کالی چیونٹی چلتی ہے تو اسے بھی وہ جانتا ہے۔ ہوا میں اگر ایک ذرہ حرکت کرتا ہے تو وہ بھی اس کو معلوم ہے۔ نیز وہ دلوں میں پیدا ہونے والے خیالات، طبیعتوں کے رجحانات اور پوشیدہ باتوں پر مطلع ہے۔ وہ خود ہی فرماتا ہے:

﴿ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ﴾ [الملك: ١٤]

[کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے اور وہی تو ہے جو نہایت باریک بین ہے، کامل خبر رکھنے والا ہے]

نیز اس کا فرمان ہے:

﴿ وَ ھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ [البقرة: ٢٩، الأنعام: ١٠١]

[اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے]

مزید فرمایا:

﴿ وَاَنَّ اللّٰہَ قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا﴾ [الطلاق: ١٢]

[اور یہ کہ بے شک اللہ نے یقیناً ہر چیز کو علم سے گھیر رکھا ہے]

اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم اس کی دیگر بڑی صفات میں سے سب سے بڑی صفت ہے، اس لیے اس نے فرمایا ہے:

﴿ وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ﴾ [الأنعام: ٥٩]

[اور اسی کے پاس غیب کی چابیاں ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا]

اس عقیدے سے ''شرک فی العلم'' کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

قدرت:

جتنی بھی ممکنات ہیں، وہ ان سب پر قادر ہے۔ کوئی چیز اس کی قدرت سے باہر نہیں۔ قدرت سے مراد یہ ہے کہ وہ عالم کو ایجاد کرے یا نہ کرے، وہ قادر ہی ہے۔ اس کا فرمان ہے:

﴿ اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ﴾ [یٰس: ٨١]

[اور کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس پر قادر نہیں کہ ان جیسے اور پیدا کر دے؟ کیوں نہیں اور وہی سب کچھ پیدا کرنے والا ہے، سب کچھ جاننے والا ہے]

ارادہ:

ساری کائنات اس کے ارادے کے ساتھ ہے۔ یہ ارادہ دو طرح کا ہے۔ ایک قدریہ کونیہ خلقیہ جو تمام موجودات کو شامل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَ مَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ﴾ [الأنعام: ١٢٦]

[تو وہ شخص جسے اللہ چاہتا ہے کہ اسے ہدایت دے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ اسے گمراہ کرے، اس کا سینہ تنگ، نہایت گھٹا ہوا کر دیتا ہے، گویا وہ مشکل سے آسمان میں چڑھ رہا ہے]

دوسرا ارادہ دینیہ امریہ شرعیہ ہے، جو محبت و رضا کو متضمن ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ [البقرة: ١٨٥]

[اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمھارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا]

شرعی امر اسی دوسرے ارادے کو مستلزم ہوتا ہے نہ کہ پہلے ارادے کو۔

غرض کہ سارے ملک وملکوت میں جو کچھ جاری ہوتا ہے، تھوڑا ہو یا زیادہ، نیک ہو یا بد، نفع ہو یا نقصان، شیریں ہو یا تلخ، ایمان ہو یا کفر، معروف ہو یا منکر، کامیابی ہو یا ناکامی، زیادتی ہو یا نقصان، اطاعت ہو یا نافرمانی؛ وہ سب اس کے ارادے سے ہے اور اس کی حکمت و تقدیر کے مطابق ہے۔ جو وہ چاہتا ہے، ہو جاتا ہے اور جو وہ نہیں چاہتا، نہیں ہوتا۔ کیا مجال ہے کہ ساری کائنات جمع ہو کر ایک ذرے کو حرکت دے یا متحرک کو ساکن کر دے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [التكوير: ٢٩]

[اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، جو سب جہانوں کا رب ہے]

اس عقیدے سے ''شرک فی التصرف'' کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ وللہ الحمد.

سمع وبصر:

اللہ تعالیٰ تمام آوازیں، حروف اور کلمے سنتا ہے۔ ساری شکلیں اور رنگتیں دیکھتا ہے۔ اس کے سمع و بصر سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، خواہ وہ کتنی ہی باریک کیوں نہ ہو۔ بُعد اور دوری اس کے سمع کے لیے رکاوٹ نہیں ہے اور تاریکی اس کے بصر کو دور نہیں کرتی ہے۔ سمع و بصر دونوں صفتیں صفتِ علم سے علاحدہ ہیں۔ قرآن مجید کا تتبع اور مطالعہ کرنے سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

تشبیہ و تعطیل کی نفی:

اللہ کا کوئی شبیہ، ضد، ند اور مثل نہیں۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی مخلوق کو تشبیہ دی، وہ اللہ کی ذات یا صفت یا فعل کا منکر ہوا۔ سلف صالحین اللہ تعالیٰ کی صفات کو ان کے ظاہر پر جاری کرتے تھے اور ان کو کسی سے تشبیہ نہیں دیتے تھے۔ وہ تاویل و تعطیل و تکییف سے بچتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ﴾ [الأنبياء: ٢٢]

[اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے]

یہ ضد کی نفی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ''ضد'' نہیں ہے۔ نیز اس نے فرمایا:

﴿ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾ [البقرة: ٢٢] [پس اللہ کے لیے کسی قسم کے شریک نہ بناؤ]

یہ اللہ تعالیٰ کے ''ند'' کی نفی ہے۔ مزید فرمایا:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ [الشورىٰ: ١١] [اس کی مثل کوئی چیز نہیں]

یہ اجمالی کلمہ ہر تمثیل و تشبیہ کا علاج ہے۔

استحقاقِ عبودیت:

وجوبِ وجود، استحقاقِ عبادت اور خلق و تدبیر میں کوئی اللہ تعالیٰ کا شریک نہیں ہے۔ بقا اسی کو ہے، باقی سب فانی ہیں۔ وہی معبود برحق ہے، باقی سب باطل ہیں۔ خالق و مدبر وہی ہے، باقی سب مخلوق و عاجز ہیں۔ عبادت کا معنی ہے غایت درجہ کی تعظیم بجا لانا اور اس کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس صفت سے غیر اللہ کی عبادت کی جڑ کٹ گئی۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ [الفاتحة: ٥]

[ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں]

شفا اور رزق:

بیمار کو شفا دینا محتاج کو رزق دینا اور بلا و آزمایش کا ٹالنا اسی کا کام ہے۔ اس کے ایک حرف ''کُنْ'' (ہو جا) کہنے سے ہر کام ہو جاتا ہے۔ اس نے ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے حکایت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ﴾ [الشعرآء: ٨٠]

[اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے]

نیز فرمایا:

﴿ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ﴾ [النمل: ٦٢]

[یا وہ جو لاچار کی دعا قبول کرتا ہے، جب اسے پکارتا ہے اور تکلیف دور کرتا ہے]

مزید فرمایا:

﴿ وَ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ [البقرۃ: ۱۱۷]

[اور جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو اسے بس یہی کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے]

یہ کہنا کہ طبیب اور ڈاکٹر نے شفا دی یا امیر اور بادشاہ نے رزق دیا لفظ کا اشتباہ ہے۔ یہ تسببِ عادی یہاں مراد نہیں ہے، کیوں کہ ان کاموں میں اللہ تعالیٰ کا کوئی وزیر اور مددگار نہیں ہے۔

وحدت الوجود کی مذمت:

وہ اپنے غیر میں حلول نہیں کرتا۔ وہ اس عالم کائنات سے جدا عرش کے اوپر ہے۔ کوئی غیر اس میں حلول کرتا ہے اور نہ وہ ہی کسی غیر کے ساتھ متحد ہوتا ہے، بلکہ وہ اپنی ذات و صفات اور افعال میں یکتا ہے۔ اس اعتقاد سے وحدتِ وجود کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

حدوث:

اس کی ذات کے ساتھ کوئی حادث قائم ہے نہ اس کی ذات میں کوئی اور حدوث ہے، بلکہ یہ حدوث تعلقِ صفات میں متعلقات کے ساتھ ہے، جبکہ ارادہ اس کے وقوع کے ساتھ متعلق ہوتا ہے، یہاں تک کہ وقتاً فوقتاً اس کے افعال ظاہر ہوتے ہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ تعلق بھی حادث نہیں ہے۔ تعلق کے ظہور میں احکام کا تفاوت و فرق متعلقات کے تفاوت و فرق کی وجہ سے ہوا کرتا ہے۔ وگرنہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہر طرح کے حدوث و تجدد اور تغیر و تبدل سے بری ہے۔

اللہ تعالیٰ کا تعارف:

قرآن مجید میں ذاتِ باری تعالیٰ کے تعارف کے لیے استعمال ہونے والے کلماتِ طیبات ہیں:

﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ ﴾ [سورۃ الإخلاص]

[کہہ دے! وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ ہی بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا۔ اور نہ کبھی کوئی ایک اس کے برابر کا ہے]

یہ کلمات اہلِ کلام کی اس خود ساختہ عبارت سے بہتر ہیں کہ اللہ تعالیٰ جوہر ہے نہ عرض، جسم ہے نہ متحیز، وہ کسی جہت میں ہے نہ قرب و بعد کے ساتھ مشار الیہ، اس کے لیے نقل و حرکت صحیح ہے نہ

اس کی ذات وصفات میں تبدل ہوتا اور نہ اس میں جہل وکذب جیسے نقائص ہیں۔

ہم مانتے ہیں کہ مذکورہ الفاظ کے معانی درست ہیں، لیکن ذاتِ الٰہیہ کے لیے کتاب وسنت میں استعمال ہونے والے الفاظ کے سامنے ان لفظوں کی کوئی حاجت اور حیثیت نہیں ہے۔

استوا علی العرش:

اللہ تعالیٰ عرش پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کا ذکر قرآن مجید میں سات جگہ پر آیا ہے اور احادیث میں بے شمار جگہ یہ صفت مذکور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو اپنا وصف استوا علی العرش بیان کیا ہے، ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ ہمیں اس کی کیفیت جاننے اور اس کی تاویل کرنے سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کے علو وتفوق اور اس علي واعلی کے عرش عظیم پر مستوی ہونے کے ثبوت پر قرآن وحدیث میں بہت سے دلائل موجود ہیں۔ ان دلائل کا ایک خاطر خواہ حصہ رسالہ "الانتقاد الرجیح بشرح الاعتقاد الصحیح" میں ذکر کیا گیا ہے۔ سارے سلف صالحین یعنی صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین رضی اللہ عنہم اسی کے قائل تھے۔

اللہ تعالیٰ کے تفوق اور استوا کی کنہ (حقیقت) اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہے۔ جو لوگ علم میں پختہ ہیں، وہ تو اس کے متعلق یہ کہتے ہیں:

﴿ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ﴾ [آل عمران: ٧]

[ہم اس پر ایمان لائے، سب ہمارے رب کی طرف سے ہے]

قواعدِ عربیت کے مطابق یہی قول آیت کے ظاہر کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔

سیدنا انس، ابو امامہ اور ابو الدرداء رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ "راسخین فی العلم" کون لوگ ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ بَرَّتْ يَمِينُهٗ، وَصَدَقَ لِسَانُهٗ، وَاسْتَقَامَ قَلْبُهٗ، وَعَفَّ بَطْنُهٗ وَفَرْجُهٗ، فَذٰلِكَ مِنَ الرَّاسِخِينَ فِي الْعِلْمِ »[1]

[وہ جو قسم اور بات میں سچا، دل کا سیدھا اور شکم وشرمگاہ کا پارسا ہے، وہ "راسخین فی العلم" میں سے ہے]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/٥٩٩) المعجم الکبیر للطبراني (٨/١٥٢) اس کی سند میں "عبداللہ بن یزید بن آدم" ضعیف ہے۔

رویتِ باری تعالیٰ:

قیامت کے دن جنت میں جانے سے پہلے اور جنت میں جانے کے بعد مومن اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے، جس طرح وہ چودھویں رات کے چاند کو دیکھتے ہیں، جس کے دیکھنے میں کوئی دھوکا اور شک وشبہہ نہیں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ دیدار دو طرح سے ہو سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ مومن بندے نے اللہ تعالیٰ کی عقل سے جو تصدیق کی تھی، اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کا اس سے زیادہ مکمل طور پر انکشاف ہوگا، گویا وہ آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔ مگر اس دیکھنے میں اللہ کے رو در رو، آمنے سامنے، کسی جہت میں اس کے رنگ اور شکل وصورت کا دیکھنا کچھ بھی نہیں ہوگا، معتزلہ اسی کے قائل ہیں۔ معتزلہ کے اس موقف میں غلطی یہ ہے کہ انھوں نے رویت کو اسی ایک صورت میں منحصر سمجھ لیا ہے۔

دوسرا دیکھنا اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت سی صورتوں میں مخلوق کے سامنے ظاہر ہوگا، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ يَتَجَلّٰى بِصُوَرٍ كَثِيرَةٍ لِأَهْلِ الْمَوْقِفِ»

[یقیناً اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) محشر والوں کے لیے مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوگا]

ایک حدیث میں یوں فرمایا:

«أَدْخُلُ عَلٰى رَبِّي وَهُوَ عَلٰى كُرْسِيِّهٖ»

[میں اپنے رب کے پاس اس وقت آؤں گا، جب وہ اپنی کرسی پر جلوہ افروز ہوگا]

ایک حدیث میں اس طرح فرمایا ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ يُكَلِّمُ ابْنَ آدَمَ شِفَاهاً»[1]

[یقیناً اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) ابن آدم سے بالمشافہہ کلام کرے گا]

اس صورت میں دیدارِ الٰہی ذاتِ الٰہی کی صورت اور اس کا رنگ بالمشافہہ دیکھنے کے ساتھ ہوگا، جس طرح خواب میں اتفاق ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "واستفاض في الحديث أن اللّٰه تعالىٰ يتجلىٰ بصور كثيرة لأهل الموقف، وأن النبي ﷺ يدخل على ربه وهو على كرسيه، وأن اللّٰه تعالىٰ يكلم ابن آدم شفاها" (حجة اللّٰه البالغة: ١/ ٤٤)

«رَأَيْتُ رَبِّي فِي أَحْسَنِ صُوْرَةٍ»[1]

[میں نے (خواب میں) اپنے رب تعالیٰ کو حسین تر صورت میں دیکھا]

اس کے علاوہ بہت سے صلحا نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا ہے اور بار ہا دیکھا ہے۔ غرض کہ دنیا میں جو کچھ خواب میں دیکھتے ہیں، وہاں قیامت کے دن اسے بالمشافہہ رو در رو دیکھیں گے۔

ہماری سمجھ میں رویتِ باری تعالیٰ کی یہی دو صورتیں آئی ہیں۔ اگر اللہ و رسول کی مراد اس رویت سے کچھ اور ہو تو ہم اس پر ایمان لائے ہیں، گو بعینہٖ ہمیں یہ معلوم نہ ہو۔

مشیتِ الٰہی:

حدیث میں آیا ہے کہ جو اللہ نے چاہا وہ ہوا اور جو اس نے نہ چاہا وہ نہ ہوا۔ لہٰذا کفر و شرک اور سب گناہ، خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، اسی کی خلق و ارادے سے ہیں، اگرچہ وہ کفر و معصیت کے ارتکاب سے ناراض اور اطاعت و ایمان سے راضی ہوتا ہے، کیونکہ ارادہ اور چیز ہے اور رضا اور چیز۔ وہ اپنی ذات و صفات میں سارے جہاں سے بے نیاز ہے، اس پر کوئی حاکم نہیں ہے، سب پر اسی کا حکم چلتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ﴾ [الحج: ١٨] [بے شک اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے]

اور سورت مائدہ میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ﴾ [المائدة: ١]

[بے شک اللہ فیصلہ کرتا ہے جو چاہتا ہے]

مزید فرمایا:

﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾ [الأنبياء: ٢٣]

[اس سے نہیں پوچھا جاتا اس کے متعلق جو وہ کرے اور ان سے پوچھا جاتا ہے]

دعائے قنوت میں یہ الفاظ مروی ہیں:

«فَإِنَّكَ تَقْضِيْ وَلَا يُقْضٰى عَلَيْكَ»[2]

[تو یقیناً تو ہی فیصلہ کرتا ہے تیرے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کیا جاتا ہے]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٣٤)

[2] سنن أبي داوٗد (١٤٢٥) سنن الترمذي (٤٦٤) سنن النسائي (١٧٤٥) سنن ابن ماجه (١١٧٨)

ایفائے عہد:

کسی کے واجب اور لازم کرنے سے اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ براہِ کرم و فضل خود کوئی وعدہ کرے، پھر اس وعدے کو پورا کرے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ»[1]

''یقیناً اللہ نے اپنے اوپر رحمت کو لکھ (کر فرض کر) دیا ہے۔''

اس کا مطلب اللہ کی طرف سے سچا وعدہ ہے، اس سے اس کے ذمے کچھ واجب اور لازم کر دینا مقصود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تمام افعال پُر حکمت ہیں اور وہ ہمیشہ سے ہمیشہ تک حکیم و علیم ہے۔

اس کا فرمان ہے:

﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ﴾ [المؤمنون: ١١٥]

[تو کیا تم نے گمان کر لیا کہ ہم نے تمھیں بے مقصد ہی پیدا کیا ہے اور یہ کہ بے شک تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے؟]

مگر اپنی حکمت کی مصلحت کلیہ کو وہ خود ہی جانتا ہے۔ کوئی اور اسے کیا جانے؟

حاکم مطلق:

اللہ پر نہ لطف جزئی خاص واجب ہے نہ اصلح خاص اور نہ اس سے کوئی قبیح امر سرزد ہوتا ہے۔

«اَلشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ»[2] [شر و برائی تیری طرف نہیں ہے]

وہ اپنے فعل و حکم میں جور و ظلم کا مرتکب نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنے خلق و امر میں حکمت کی رعایت تو رکھتا ہے، مگر اس سے وہ اپنے نفس و صفات کو کامل کرتا ہے، نہ اس کی کوئی حاجت و غرض کسی سے اٹکی ہوئی ہے، بلکہ اس کے سوا کوئی حاکم ہی نہیں ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ﴾ [یوسف: ٤٠] [حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں]

اشیا کا حسن و قبح:

اشیا کے حسن و قبح میں عقل کا کچھ دخل ہے نہ اس بات میں کہ فلاں فعل ثواب کا سبب ہے اور

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٢٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٧١)

فلاں امر عذاب کا سبب ہے، بلکہ ہر چیز کی خوبی اور عیب اللہ کے قضا و قدر اور اس کے حکم و امر سے ہے، اسی نے لوگوں کو اس کا مکلّف ٹھہرایا ہے۔ اگرچہ بعض اشیا کے ثواب و عقاب کی مصلحت اور مناسبت عقل سے معلوم ہو جائے، وگرنہ بعض علل کا ادراک رسول اللہ ﷺ کے بتائے بغیر معلوم نہیں ہوتا ہے۔

صفاتِ باری تعالیٰ:

اللہ کی ہر صفتِ ذات جیسے علم، قدرت، حیات، کلام، سمع، بصر، ارادہ اور مشیت ہو یا ہر صفتِ فعل جیسے تخلیق، ترزیق، ابداع، احیا، اماتت، انبات، انما، تصویرِ اشیا اور اس جیسی دیگر صفات ہوں، ان میں سے ہر صفت واحد بالذات ہے نہ متکرر ہے نہ متعدد۔ وہ ایک ہی فعل سے سارے مفعولات کو ادا کرتا ہے، جس طرح وہ ایک ہی سمع سے سارے مسموعات کو سنتا ہے۔ اور ایک کلام سے سارے کلمات کے ساتھ تکلم فرماتا ہے، اور ایک ہی حیات کے ساتھ حیی و قیوم ہے، یہی حال اس کی باقی صفات کا ہے۔ جو تکثر و تعدد سمجھ میں آتا ہے، اس کا اثر نہ اسماے صفات میں ہے اور نہ نفسِ صفات ہی میں۔

فرشتے:

اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں جن کا مسکن بلند و بالا آسمان ہیں۔ ان فرشتوں کو ملأ اعلیٰ کہتے ہیں۔ وہ اللہ کے بے حد مقرب ہیں۔ وہ دو دو، تین تین اور چار چار پر رکھتے ہیں۔ وہ لطیف ہوائی جسم رکھتے ہیں اور مختلف شکلوں میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ ان کا نر یا مادہ ہونا کسی نقلی یا عقلی دلیل کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔ بت پرستوں نے انھیں اللہ کی بیٹیاں قرار دیا، مگر یہ محال باطل ہے اور ان کی شان میں افراط ہے۔ سچ تو یہ ہے:

﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ﴾ [الأنبياء: ٢٦] [بلکہ وہ بندے ہیں جنھیں عزت دی گئی ہے]

وہ ہر گناہ سے معصوم ہیں۔ وہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں۔ وہ وحی پہنچانے کی ذمہ داری ادا کرتے ہیں۔ وہ عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں، پھر باوجود اس قرب اور قدر و منزلت کے تمام مخلوقات کی طرح علم رکھتے ہیں نہ قدرت۔ علم ہے تو وہ ہی جو اللہ نے بتا دیا ہے اور قدرت ہے تو صرف اتنی جتنی اللہ نے عطا کر دی ہے۔ وہ ہماری طرح اللہ کی ذات و صفات پر ایمان رکھتے ہیں۔

اللہ کی صفات واجبیہ میں یا عبادت میں کسی بندہ خاص کو، خواہ وہ فرشتہ ہو یا رسول، شریک

ٹھہرانا کفر ہے۔ کچھ فرشتے بندوں کے اعمال لکھنے پر مقرر ہیں۔ وہ بندے کو ہلاکت میں پڑنے سے بچاتے ہیں، نیکیوں کی طرف دعوت دیتے ہیں، دل میں خیر و بھلائی کی فکر ڈالتے ہیں۔ ہر فرشتے کی ایک الگ معلوم جگہ مقرر ہے۔ فرشتوں کا دلی خیالات پر اثر یہ ہوتا ہے کہ بندے کو خیر و بھلائی کے ساتھ انس اور اس کی طرف رغبت ہوتی ہے اور شیاطین کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دل میں وحشت محسوس ہوتی ہے اور شر و برائی کی طرف رغبت پیدا ہوتی ہے۔

فرشتے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے۔ انھیں جو حکم ہوتا ہے، وہی کرتے ہیں۔ شیاطین ابن آدم کے دل میں شر ڈالتے اور خون کی طرح رگوں میں دوڑتے پھرتے ہیں اور وسوسہ انگیز ہوتے ہیں۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ﴾ [الفاطر: ٦]

[بے شک شیطان تمھارا دشمن ہے تو اسے دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو اپنے گروہ والوں کو صرف اس لیے بلاتا ہے کہ وہ بھڑکتی آگ والوں سے ہو جائیں]

فرشتے اور شیاطین کے وجود کا انکار صریح کفر ہے۔ ابلیس جن تھا۔ فرشتے نور سے اور جن و شیاطین آگ سے پیدا ہوئے ہیں اور آدمی مٹی سے۔

قرآن مجید کلام الٰہی ہے:

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اس نے محمد ﷺ پر نازل کیا ہے۔ صحیح حدیث میں قرآن مجید پر حرف اور صوت (آواز) کے اطلاق کا ذکر موجود ہے۔[1] قرآن مجید کو کلام نفسی کہنا بے دلیل ہے۔ قرآن مجید پڑھی جانے والی، تلاوت کی جانے والی، سنی جانے والی، لکھی جانے والی اور حفظ کی جانے والی کتاب ہے۔

قرآن مجید میں وحی کی حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ﴾ [الشورىٰ: ٥١]

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩١٠)

[اور کسی بشر کے لیے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے، یا پردے کے پیچھے سے، یا یہ کہ وہ کوئی رسول بھیجے، پھر اپنے حکم کے ساتھ وحی کرے جو چاہے]

اسما و صفاتِ باری تعالیٰ توقیفی ہیں:

اللہ تعالیٰ کے اسما و صفات میں الحاد کا مظاہرہ کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ سب اسما و صفات توقیفی ہیں۔ ان کا اطلاق شریعت پر موقوف ہے۔ کوئی شخص اللہ کے کسی نام اور صفت میں کمی بیشی کرے نہ اپنی طرف سے کوئی نام و صفت مقرر کرے، خواہ اس کے معنی اچھے ہوں۔ ان کے اطلاق و استعمال کے محل کو بھی تبدیل کرنے سے گریز کرے اور صرف ان کے مورد پر اکتفا کرے۔ ہر اسم وصفت کو جوں کا توں بولے اور تلفظ کرے۔

حشر ونشر:

معادِ جسمانی (اخروی زندگی) حق ہے۔ انسانی جسموں کو اکٹھا کیا جائے گا اور ان میں روح ڈالی جائے گی۔ شرعاً اور عرفاً جو بدن یہاں ہیں، یہی بدن وہاں ہوں گے، چاہے لمبے ہوں یا پستہ قد۔ کافر کا ایک دانت احد پہاڑ کے برابر ہو جائے گا۔ جنت والوں کے جسم نہایت لطیف اور جُرد مُرد ہوں گے۔ دیکھو! بچہ جوان اور پھر بوڑھا ہو جاتا ہے، اس کے اجزاے بدن خواہ ہزار بار تبدیل ہو جائیں، مگر وہ وہی بچہ ہوتا ہے جو پہلے تھا۔

سزا و جزا:

قیامت کے دن جزا ملنا، حساب ہونا، پل صراط سے گزرنا، نامۂ اعمال کا ملنا اور اعمال کا ترازو میں وزن کیا جانا؛ یہ سب حق ہے۔ جنت اور جہنم اس وقت موجود ہیں اور جنتیوں اور جہنمیوں کے ساتھ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رہیں گی۔ جہنم اور جنت میں سے کسی کو فنا نہیں ہے، البتہ کسی نص میں ان کی جگہ کی صراحت نہیں آئی ہے کہ اب وہ کہاں ہیں؟ اگرچہ جنت کو آسمان میں اور جہنم کو زمین کے نیچے بتاتے ہیں، مگر درست بات یہ ہے کہ جہاں اللہ نے چاہا، وہاں یہ دونوں موجود ہیں۔ ہم اللہ کی مخلوق کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ جنت، جہنم اور معادِ جسمانی کا وجود تورات و انجیل سے بھی ثابت ہے۔ وللہ الحمد.

مرتکبِ کبیرہ کا انجام:

کبیرہ گناہ کا مرتکب کوئی مسلمان ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا، بشرطیکہ وہ شرک خفی وجلی سے

بچا رہا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ إِن تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ ﴾ [النسآء: ۳۱]

[اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچو گے جن سے تمھیں منع کیا جاتا ہے تو ہم تم سے تمھاری چھوٹی برائیاں دور کر دیں گے]

مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ چاہے تو نماز پنج گانہ اور اس طرح کی دیگر نیکیوں سے صغیرہ گناہوں کا کفارہ ہوتا رہتا ہے، جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ذَٰلِكَ ذِكْرَىٰ لِلذَّاكِرِينَ ﴾ [هود: ۱۱٤]

[بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔ یہ یاد کرنے والوں کے لیے یاد دہانی ہے]

جب کبیرہ گناہوں کو حلال اور جائز سمجھ کر ان کا ارتکاب نہ کیا گیا ہو تو ان سے درگزر جائز ہے، جب کہ گناہ کو حلال جاننا کفر ہے۔ دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کے افعال دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو اللہ کی اس سنت کے موافق جو عباد و خلق کے درمیان جاری ہے اور دوسرے جو خرقِ عادات کے طور پر ہوں۔ کبیرہ گناہ کا مرتکب جو شخص توبہ کے بغیر مر گیا، اس کو معاف کرنا خرقِ عادات کے باب سے ہو گا۔ جو نصوص سرسری رائے میں متعارض نظر آتی ہیں، ان کی تطبیق کا طریقہ وہی ہے جو ابھی بیان کیا گیا ہے۔

شفاعت:

شفاعت حق ہے، جو کبیرہ گناہ کے مرتکب موحد کے لیے ہو گی نہ کہ مومن مشرک کے لیے، جیسے قبر پرست، پیر پرست اور امام پرست وغیرہ۔ شفاعت چھے قسم کی ہے:

1. سب سے بڑی شفاعت، جو ''شفاعت کبریٰ'' کے نام سے معروف ہے، وہ ہے جس کے ذریعے بندوں کا حساب کتاب شروع کروایا جائے گا، ان کے حق میں آخری فیصلہ اور حکم دلوایا جائے گا، ان کو لمبا عرصہ کھڑا رہنے سے چھٹکارا اور رہائی ملے گی۔ یہ شفاعت ہمارے رسول ﷺ کے ساتھ خاص ہو گی۔ جب لوگ تمام پیغمبروں کی طرف سے مایوس ہو کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں گے تو آپ ﷺ شفاعت کبریٰ کے لیے تیار ہوں گے۔

2. دوسری قسم کی شفاعت یہ ہو گی کہ شفاعت کرنے والے ایک قوم کو حساب کے بغیر جنت میں داخل کرائیں گے۔

③ تیسری شفاعت یہ ہوگی کہ ایک قوم جہنم میں جانے کی مستحق ہوگی، مگر اس شفاعت کی وجہ سے وہ بچ جائے گی۔

④ چوتھی شفاعت یہ ہوگی کہ جو موحد آگ میں گئے ہیں، وہ اس شفاعت کے ساتھ آگ سے باہر نکالے جائیں گے۔ یہ شفاعت کرنے میں انبیا، ملائکہ اور مومن شریک ہوں گے۔

⑤ پانچویں شفاعت یہ ہوگی کہ اس کے ذریعے جنت میں بلند درجات میسر آئیں گے۔

⑥ چھٹی شفاعت ان لوگوں سے عذاب میں تخفیف کی غرض سے ہوگی، جن کے حق میں ہمیشہ جہنم میں رہنے کا فیصلہ ہو چکا ہوگا، جیسے ابو طالب کے لیے سفارش ہوگی۔

یاد رہے کہ ہمہ قسم کی شفاعت اللہ کی اجازت سے ہوگی۔ وہی شفاعت کرے گا جسے اللہ تعالیٰ اجازت دیں گے اور اسی کے حق میں سب شفاعت کرنے والے شفاعت کریں گے، جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ہوگی۔ پھر جو مومن بچ جائیں گے اور کوئی ان کی شفاعت نہیں کرے گا تو ان کو خود اللہ تعالیٰ آگ سے باہر نکالے گا۔ غرض کہ کوئی مومن جس کے دل میں ایک ذرے کے برابر بھی ایمان ہوا، وہ ہمیشہ آگ میں نہیں رہے گا۔ وللہ الحمد.

کبیرہ گناہوں کے مرتکب موحدین کے حق میں یہ شفاعت نصوص واحادیث مستفیضہ سے ثابت ہے۔ اس شفاعت کی اجازت اور حد بندی کی قید کتاب وسنت میں کئی جگہ موجود ہے، جس کا انکار کرنا نری جہالت اور تکبر ہے۔

مرتکبِ کبیرہ کی شفاعت:

رسول اللہ ﷺ کا امتِ اسلام کے اہلِ کبائر کے لیے شفاعت کرنا حق ہے۔ آپ ﷺ قیامت کے دن پہلے شفاعت کرنے والے ہوں گے اور آپ ﷺ ہی وہ پہلے شخص ہوں گے جن کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ جن نصوص میں شفاعت کی نفی بیان ہوئی ہے تو اس سے مراد وہ شفاعت ہے جو اللہ تعالیٰ کی اجازت ورضا کے بغیر ہے۔

آپ ﷺ کی اس شفاعت کا مستحق وہ گناہ گار شخص ہوگا جس نے سچے دل سے اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے اور محمد ﷺ کے رسول ہونے کی گواہی دی ہے اور شرک، کفر اور بدعات مکفرہ کی تمام اقسام سے بچا رہا ہے۔ رہا وہ شخص جس نے قولاً یا فعلاً یا عقیدتاً ایمان کے ساتھ ساتھ شرک بھی کیا

تو اس کی شفاعت نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴾ [النساء: ١١٦]

[بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے جسے چاہے گا اور جو اللہ کے ساتھ شریک بنائے تو یقیناً وہ بھٹک گیا، بہت دور بھٹکنا]

ریا کاری، تصورِ شیخ، ربط القلب بالشیخ، غیر اللہ سے استغاثہ اور استعانت بغیر اللہ وغیرہ سب شرک خفی کی اقسام ہیں، جن کا مرتکب آپ ﷺ کی مذکورہ شفاعت کا مستحق نہ ہوگا۔

احوالِ قبر:

قبر میں عذاب و تنعیم کا ہونا، منکر اور نکیر کا سوال کرنا اور قبر کا دبانا حق ہے، جو دلائل سمعیہ اور براہین نقلیہ سے ثابت ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ:

﴿ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا﴾ [الغافر: ٤٦]

[جو آگ ہے، وہ اس پر صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں]

عذابِ قبر ہی کے متعلق ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ﴾ [السجدة: ٢١]

[اور یقیناً ہم انھیں قریب ترین عذاب کا کچھ حصہ سب سے بڑے عذاب سے پہلے ضرور چکھائیں گے]

اس آیت میں عذاب ادنا سے عذابِ قبر اور عذابِ اکبر سے عذابِ آخرت مراد ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے:

«اَلْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ أَوْ حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النَّارِ»[1]

[قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا آگ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے]

پھر یہ کہ رسول اللہ ﷺ اور سلف صالحین کا عذابِ قبر سے پناہ طلب کرنا مشہور و مستفیض

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٦٠) اس کی سند میں ''عبیداللہ بن ولید'' اور ''عطیہ'' دو راوی ضعیف ہیں۔ نیز یہ روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ دیکھیں: المعجم الأوسط (٨/٢٧٢) لیکن اس کی سند بھی سخت ضعیف ہے، کیونکہ اس کی سند میں ''محمد بن ایوب'' متروک ہے۔

ہے۔[1] آپ ﷺ نے فرمایا: قبر کے دبانے سے اگر کوئی شخص نجات پاتا تو وہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ہوتے، جن کے لیے (ان کی موت کے وقت) رحمان کا عرش ہل گیا۔[2]

قبر مردے کو پکڑ کر دبوچتی ہے جسے ''ضغطہ'' یعنی دبانا اور دبوچنا کہتے ہیں۔ لیکن مومن موحد کے ساتھ قبر کا یہ ضغطہ ایسے ہوگا جیسے ماں اپنے بچے سے معانقہ کرتی ہے۔ وللہ الحمد.

اسی طرح قبر میں روح کا لوٹایا جانا بھی حق ہے۔ مومن قبر کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے:

«رَبِّيَ اللّٰهُ وَدِيْنِيَ الْإِسْلَامُ وَ نَبِيِّ مُحَمَّدٌ ﷺ»[3]

[میرا رب اللہ ہے، میرا دین اسلام ہے اور میرے نبی محمد ﷺ ہیں]

جبکہ کافر کہتا ہے:

«هَاه هَاه لَا أَدْرِيْ»[4] [ہائے افسوس! میں نہیں جانتا] (اس کی اصل صحیحین میں ہے)[5]

موت کے بعد ہر روح کا اپنے جسم کے ساتھ ایک طرح کا تعلق و اتصال ہوتا ہے، جس کے سبب روح مع بدن راحت یا تکلیف محسوس کرتی ہے۔ مومن موحدین کی روحیں علیین میں اور کفار و منافقین کی روحیں سجین میں رہتی ہیں، جب کہ شہدا کی روحیں عرشِ الٰہی کے زیر سایہ رہتی ہیں اور پھر جنت میں چرتی پھرتی ہیں۔

بعثتِ انبیا:

اللہ تعالیٰ کا مخلوق کی طرف رسولوں کو بھیجنا اور بندوں کو انبیا و رسل کی زبانی اوامر و نواہی کا مکلف ٹھہرانا، حق اور سچ ہے۔ انبیا و رسل کا کام یہ ہے کہ بندے دین و دنیا کے جس کام میں راہنمائی کے محتاج ہوں، یہ اس کی وضاحت فرمائیں، انھیں جنت کی بشارت سنائیں اور جہنم سے خبردار کریں۔

اللہ کے رسول کئی امور میں دیگر لوگوں سے ممتاز ہوتے ہیں اور وہ امور دوسرے لوگوں میں بر سبیل اجتماع نہیں پائے جاتے۔ وہی امور ان کے نبی اور رسول ہونے کی دلیل ہوتے ہیں۔ ایک قسم کے امور خارق عادات معجزات اور دوسرے سلامتِ فطرت، کمالِ اخلاق حسنہ اور اس طرح کے دیگر امور ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٠٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٨٦)

[2] مسند أحمد (٦/ ٥٥)

[3] سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٧٥٣)

[4] سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٧٥٣)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٠)

عصمتِ انبیا:

تمام انبیا کفر اور کفر پر اصرار سے معصوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ تین طرح سے ان کی عصمت فرماتا ہے: ① ایک تو یہ کہ ان کو سلامتِ فطرت اور کمال اعتدالِ اخلاق کے کمال پر پیدا کرتا ہے۔ وہ معاصی میں رغبت نہیں کرتے، بلکہ اصل فطرت کے اعتبار سے گناہوں سے متنفر ہوتے ہیں۔ ② دوسرے یہ کہ ان کو وحی آتی ہے کہ نافرمانیوں پر عذاب اور اطاعتیں بجا لانے پر ثواب ہوگا، چنانچہ یہ وحی انھیں معاصی سے باز رکھتی ہے۔ ③ تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کے اور معاصی کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور کوئی ایسا لطیفہ غیبیہ پیدا کر دیتا ہے جس کے سبب وہ گناہ کرنے سے بچ جاتے ہیں، جس طرح یوسف علیہ السلام کے ساتھ اتفاق ہوا تھا۔

چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ [يوسف: ٢٤]

[اور بلاشبہ یقیناً وہ اس کے ساتھ ارادہ کر چکی تھی اور وہ بھی اس عورت کے ساتھ ارادہ کر لیتا اگر یہ نہ ہوتا کہ اس نے اپنے رب کی دلیل دیکھ لی]

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل وخصائص:

ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور گذشتہ تمام شریعتوں کو منسوخ کرنے والے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور پاک صاف ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت ملنے سے پہلے اور نبوت ملنے کے بعد کبھی بت پوجا اور نہ کبھی شرک کیا اور کبھی صغیرہ گناہ کے مرتکب ہوئے نہ کبیرہ گناہ کے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت تمام جن وانس کے لیے عام ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا﴾ [الفرقان: ١] [تاکہ وہ جہانوں کے لیے ڈرانے والا ہو]

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

((بُعِثْتُ إِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً)) (رواه مسلم)[1]

[مجھے ساری مخلوق کی طرف معبوث کیا گیا ہے]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحديث (٥٢٣) صحیح مسلم میں ((بعثت إلى الخلق كافة)) کے بجائے ((أرسلت إلى الخلق كافة)) کے الفاظ مروی ہیں۔

آپ ﷺ کئی ایک خصوصیات کی وجہ سے تمام انبیا سے افضل ہیں، جیسے آپ ﷺ کی دعوت کا ساری کائنات کے لیے عام ہونا، آپ ﷺ کو جوامع الکلم کا عطا کیا جانا، رعب کے ساتھ آپ ﷺ کی مدد کیا جانا، آپ ﷺ کے لیے غنیموں کا حلال کیا جانا، ساری روے زمین کو (نماز کے لیے) مسجد اور (تیمم کے لیے) طہور بنایا جانا، آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کا ساری مخلوق کے لیے عام ہونا،[1] جس کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

« خُتِمَ بِيَ النَّبِيُّوْنَ » (رواه الترمذي و صححه)[2]

[میرے آنے کے بعد انبیا کا سلسلہ منقطع ہو گیا]

ساری اولادِ آدم کا سردار ہونا،[3] آپ ﷺ کو قیامت کے دن حمد کا جھنڈا عطا ہونا،[4] آپ ﷺ کا مقام محمود[5] اور عرش الٰہی کی دائیں جانب کھڑا ہونا[6] اور اس طرح کی دیگر خصوصیات۔

اللہ تعالیٰ کے اجمالی فرمان: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ [البقرة: ۲۵۳] [یہ رسول، ہم نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت دی] کے مطابق بعض انبیا کی بعض پر فضیلت قطعی ہے۔

نیز فرمایا:

﴿لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ﴾ [الإسراء: ۵۵]

[بلاشبہہ یقیناً ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت بخشی]

مگر تفصیلی حکم کے مطابق ان کی ایک دوسرے پر فضیلت ظنی امر ہے۔ صحیح عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے نبی محمد ﷺ تمام مخلوق سے افضل ہیں۔ بعض نے تو اس پر اجماع کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ انبیا میں

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٣)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٣)، سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٥٣)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٧٨)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٤٨)، سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٠٨)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٠٥)

[6] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦١١) یہ روایت مرفوعاً ضعیف ہے، البتہ صحیح سند سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً مروی ہے: "ويكسى محمد ﷺ بردة حبرة وهو عن يمين العرش" (مسند أبي يعلى: ١/ ٤٢٧)

سب سے پہلے آدم علیہ السلام ہیں اور سب سے آخری محمد ﷺ ہیں۔ انبیا میں سے پانچ نبی اولوالعزم ہیں اور وہ ہیں: نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد علیہم السلام۔ انبیا پر ایمان لانے میں ان کی تعداد کا لحاظ نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ﴾ [الغافر: ٧٨]

[ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا حال ہم نے تجھے سنایا اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا حال ہم نے تجھے نہیں سنایا]

رہی وہ روایت جس میں انبیا علیہم السلام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بیان کی گئی ہے تو وہ ضعیف ہے۔[1]

کراماتِ اولیا:

کراماتِ اولیا حق ہیں۔ اولیا ان مومنوں کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کی شناخت رکھتے ہیں اور وہ اپنے ایمان میں محسن یعنی مخلص ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، کرامات سے اس کی عزت افزائی کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے، اپنی رحمت کے ساتھ خاص کرتا ہے۔

ولی کی کرامت دراصل نبی کا معجزہ ہے جو اس کے ہاتھ پر صادر فرمایا گیا ہے۔ ولی وہی ہوتا ہے جو اپنی دیانت داری میں سچا ہو، اور دیانت یہ ہے کہ وہ زبان و دل سے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار کرے اور اوامر و نواہی میں رسول اللہ ﷺ کا مطیع اور سنتوں کا متبع ہو۔ اگر وہ اپنے نفس کے لیے حق خود اختیاریت کا دعویٰ کر کے متبع نہیں بنے گا تو وہ ولی نہیں ہے اور اگر ولی ہے تو شیطان کا ولی ہے، رحمان کا ولی نہیں ہے اور اس کی کرامت استدراج، مکروفریب اور شعبدہ بازی ہے۔

ولی کے اوصاف:

اولیا مباح امور میں سے کسی بات میں دوسرے لوگوں سے ممتاز نہیں ہوتے ہیں، لباس میں نہ طعام میں، نہ سواری میں نہ مکان میں، نہ حرفہ میں نہ صنعت میں، بلکہ یہ ساری اصناف امتِ اسلام میں پائی جاتی ہیں، بشرطیکہ وہ اولیا مبینہ طور پر واضح بدعات کو اختیار کرنے والے اور فاسق و فاجر نہ ہوں۔ ولایت اہلِ قرآن، اہلِ علم، اہلِ جہاد، اہلِ تلوار اور اہلِ قلم سب میں ہوتی ہے اور اولیا تاجروں، کاریگروں، کسانوں اور سوار و پیادہ سب میں پائے جاتے ہیں۔ سلف صالحین اہلِ دین اور اہلِ علم کو ''قراء'' کے نام سے پکارتے تھے۔ ان میں علما اور عبادت گزار سب ہی داخل تھے۔ پھر ان کے لیے

[1] کثرتِ طرق کی بنا پر یہ روایت صحیح ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الصحيحة (٢٦٦٨)

"صوفی" اور "فقیر" کا لفظ ایجاد ہوا، مگر اولیا کا یہ عرف اور پہچان حادث ہے۔

ان جملہ اصناف میں جو شخص اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے، وہی اللہ کے ہاں بڑا بزرگوار ہے۔ جب دو شخص تقوے میں برابر ہوں تو وہ اللہ کے نزدیک بھی درجے میں برابر ہوں گے۔ ولایت پیری مریدی پر موقوف نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے تقوی و طہارت درکار ہے۔ اولیا پر واجب ہے کہ وہ کتاب و سنت کا اتباع کریں اور ہر بدعت سے گریز کریں، ورنہ ان کی ولایت میں نقص پیدا ہوگا۔ اولیا میں سے کوئی معصوم نہیں ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہے یا کرے، کتاب و سنت کا اعتبار کیے بغیر اس کی پیروی کی جائے۔ اس عقیدے پر سارے اولیا کا اتفاق ہے۔ جس نے اس کے خلاف کوئی بات کہی، وہ اللہ کا ولی نہیں ہے بلکہ وہ کافر ہے یا جہالت کی وجہ سے کوتاہی کا مرتکب۔ اولیاے رحمان اور اولیاے شیطان کی شناخت کے لیے کتاب "الفرقان"[1] کا مطالعہ کافی وافی ثابت ہوگا۔

علمِ دین کی فضیلت:

علمِ دین کو عبادت پر کلی فضیلت حاصل ہے اور کثرتِ علم کثرتِ عبادت سے بہتر ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّماً»[2] [مجھے تو صرف معلم بنا کر معبوث کیا گیا ہے]

آپ ﷺ یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

﴿رَّبِّ زِدْنِي عِلْماً﴾ [اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما]

وہ آفات و بلیات جو علم پر طاری ہوتی ہیں، وہ ان آفات کی نسبت بہت کم ہیں جو آفات زہد و عبادت میں لاحق ہوتی ہیں۔

چنانچہ حدیث میں آیا ہے:

"ایک فقیہ ہزار عابد سے زیادہ شیطان پر بھاری ہوتا ہے۔"[3]

اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے:

---

[1] امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب "الفرقان بين أولياء الرحمان وأولياء الشيطان" مراد ہے۔

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۲۹) اس کی سند میں داؤد بن زبرقان، بکر بن خنیس اور عبد الرحمن بن زیاد؛ تینوں راوی ضعیف ہیں، لہٰذا یہ حدیث ضعیف ہے۔

[3] سنن ابن ماجه (۲۲۲) اس کی سند میں "ابو سعد روح بن جناح" راوی متہم ہے، لہٰذا یہ روایت موضوع ہے۔

﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ [الزمر: ۹]

[کیا برابر ہیں وہ لوگ جو جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے؟]

اس لفظ ﴿لَا يَعْلَمُونَ﴾ کے عموم میں جاہل عبادت گزار بھی داخل ہیں۔

علم صرف ترجمہ سازی اور حرف شناسی کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ ایک نور ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے دل میں ڈال دیتا ہے، جس سے اس کا سینہ کشادہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہر قاری و مقری عالم نہیں ہوتا، اگرچہ وہ قرآن و حدیث رٹا کرتا ہو۔

مقامِ صحابہ:

ہم عشرہ مبشرہ، فاطمہ، خدیجہ، عائشہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کے جنتی ہونے اور ان کے لیے خیر و بھلائی کی گواہی دیتے ہیں، اس لیے کہ احادیث صحیحہ میں انھیں جنتی قرار دیا گیا ہے۔ نیز ہم دیگر صحابہ کرام اور اہلِ بیتِ عظام کی توقیر و تعظیم کرتے ہیں اور اسلام میں ان کا بہت بڑا مقام جانتے ہیں۔ اسی طرح اہلِ بدر اور اہلِ بیعتِ رضوان کو ہم جنتی کہتے ہیں۔ اہلِ بدر تین سو تیرہ آدمی تھے۔ ان کے سوا ہم کسی ولی اللہ کے لیے جنت کی گواہی نہیں دے سکتے ہیں، اگرچہ اس کے حق میں اچھا گمان کرنے والے ایسا کہتے ہیں۔

فضیلتِ صحابہ:

اہلِ سنت اس بات کے قائل ہیں کہ افضل صحابہ خلفاے راشدین ہیں، پھر باقی عشرہ مبشرہ، پھر اہلِ بدر، پھر باقی اہلِ احد، پھر اہلِ بیعت رضوان اور پھر باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔

غرض کہ انصار و مہاجرین رضی اللہ عنہم میں سے سابقین اولین دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے افضل ہیں۔ رہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اولاد تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد اگر کسی کو کوئی فضیلت حاصل ہے تو وہ صرف اس کے علم اور تقوے کے ساتھ ہے۔ اس بارے میں صحیح موقف یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بیٹوں کی فضیلت ان کے باپوں کی ترتیب وار فضیلت کے ساتھ ہے سوائے فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد کے، کیونکہ ان کی اولاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب کے سبب خلفا کی اولاد پر فضیلت رکھتی ہیں۔ (وہ یہ فضیلت کیوں نہ رکھیں) آخر کار وہ پاک کنبہ اور پاکیزہ اولاد ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ متبع سنت ہوں اور بدعتی نہ ہوں، ورنہ وہ اس آیت کے مصداق ہوں گے:

﴿ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ﴾ [هود: ٤٦]

[بے شک وہ تیرے گھر والوں سے نہیں، بے شک یہ ایسا کام ہے جو اچھا نہیں]

نیز رسول اللہ ﷺ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا تھا:

«اِعْمَلِي فَإِنِّي لَا أُغْنِي عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا»[1]

[(اے فاطمہ!) عمل کرو، کیونکہ میں اللہ کے پاس تجھ سے کچھ کفایت نہیں کر سکتا]

مدتِ خلافت:

رسول اللہ ﷺ کے بعد ابو بکر، پھر عمر، پھر عثمان، پھر علی رضی اللہ عنہم برحق امام ہیں، اس کے بعد خلافت کا دور ختم ہو گیا اور مسلمانوں کو پارہ پارہ کرنے والی بادشاہت کا دور شروع ہو گیا۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ دو برس تین مہینے خلیفہ رہے، عمر رضی اللہ عنہ ساڑھے دس برس، عثمان رضی اللہ عنہ بارہ برس، علی رضی اللہ عنہ چار برس نو مہینے اور حسن رضی اللہ عنہ چھے مہینے خلیفہ رہے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد علی رضی اللہ عنہ کی شہادت ۳۰ھ کے شروع میں ہوئی، لہٰذا معاویہ رضی اللہ عنہ اور وہ لوگ جو ان کے بعد ہوئے ہیں، وہ سب ملوک اور امرا تھے، خلفا نہیں تھے۔

فضیلتِ شیخین:

رسول اللہ ﷺ کے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ سب سے افضل انسان ہیں۔ یہاں ہر لحاظ سے افضلیت مراد نہیں ہے کہ یہ نسب و شجاعت اور قوت و علم وغیرہ کو بھی شامل ہو، بلکہ اسلام میں نفع عظیم کے معنی میں افضلیت ہے۔ یہ بات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما میں دوسروں کی نسبت زیادہ پائی جاتی ہے، لہٰذا علی رضی اللہ عنہ کو شیخین (ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما) پر مطلقاً مقدم کرنا جمہور کے مختار مذہب کے خلاف ہے۔

ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما اشاعتِ حق میں ہمتِ بالغہ رکھنے کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کے دو امیر اور وزیر تھے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ دو جہتیں رکھتے تھے۔ ایک جہت اللہ تعالیٰ سے حاصل کرنے کی تھی اور

---

[1] مسند البزار (۷/ ۳۲۰) امام بزار رحمہ اللہ یہ روایت ذکر کرنے کے بعد فرماتے: "وهذان الحديثان لا نعلمهما يرويان عن حذيفة إلا بهذا الإسناد، ولا نعلم لحذيفة ابنا يقال له: سماك إلا في هذا الحديث" امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه البزار من رواية قطري ... و قطري لم أعرفه" (مجمع الزوائد: ۱/ ۲۰۷) البتہ صحیحین میں یہ روایت بایں الفاظ "يا فاطمة بنت رسول الله سليني بما شئت لا أغني عنك من الله شيئاً" مروی ہے۔ دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٩٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٦)

دوسری جہت مخلوق کو دینے کی۔ بنا بریں شیخین کو عطائے خلق، لوگوں کی تالیف، ان کو اکٹھا کرنے اور جنگ کی تدبیر کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا، اس اعتبار سے گویا وہ دو وزیرِ نبوت تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعن کرنا کفر ہے:

ہم خیر و بھلائی کے علاوہ کسی چیز کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر کرنے سے اپنی زبانوں کو روکتے ہیں، کیونکہ وہ دین میں ہمارے امام و پیشوا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کی ثنا اور تعریف کی ہے اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچا کون ہو سکتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا کہنا حرام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا تَسُبُّوا أَصْحَابِي» (رواه الشيخان)[1] [میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو گالی مت دو]

جمہور کا موقف ہے کہ صحابہ کی بدگوئی کرنے والا اس لائق ہے کہ اسے تعزیر لگائی جائے اور بعض مالکیہ کا مذہب ہے کہ اس کی سزا قتل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا ہے:

﴿لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ [الفتح: ٢٩] [تاکہ وہ ان کے ذریعے کافروں کو غصہ دلائے]

اس آیت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض رکھنے والے اہلِ غیظ پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے۔

تفتازانی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر کیا ہوا دشنام اور طعن اگر ادلہ قطعیہ کے خلاف ہے تو کفر ہے، جیسے عائشہ رضی اللہ عنہا پر بدکاری کی تہمت لگانا، ورنہ بدعت اور فسق ہے۔[2] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعظیم کرنا اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کو واجب کرنے کی وجہ سے امت مرحومہ پر واجب اور لازم ہے۔ یہ وجوب کتاب و سنت سے مفہوم ہوتا ہے۔

مسئلہ تکفیر:

ہم کسی اہلِ قبلہ کو کافر نہیں کہتے۔ اہلِ قبلہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو ضروریاتِ دین پر متفق ہیں، جیسے: حدوثِ عالم، حشرِ اجساد اور اللہ تعالیٰ کو تمام کلیات اور جزئیات کا علم ہونا وغیرہ۔ اب جو شخص عمر بھر طاعات و عبادات پر ہمیشہ کاربند رہے، مگر قِدمِ عالم، نفیِ حشر یا اللہ تعالیٰ کو تمام جزئیات کے علم کی نفی کا معتقد ہو، وہ اہلِ قبلہ نہیں ہے۔ ان کی عدمِ تکفیر سے مراد یہ ہے کہ جب تک ان کی طرف سے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤٠)

[2] شرح العقائد النسفية للتفتازاني (ص: ١٦٢، ١٦٣) مكتبه حقانيه، ملتان.

کفر کی کوئی امارت و علامت نہ پائی جائے گی اور ان سے کوئی موجباتِ کفر چیز صادر نہ ہوگی، تب تک ہم ان پر کفر کا حکم نہیں لگائیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ کے صانع، قدیر، علیم ومختار ہونے کی نفی یا غیر اللہ کی عبادت یا انکارِ معاد یا انکارِ نبی یا تمام ضروریاتِ دین اور امہاتِ شرع مبین کا انکار۔ جو اس کے علاوہ ہے اس کا قائل مبتدع ہے نہ کہ کافر۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر:

نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا واجب ہے۔ یہ دین کا ایک مضبوط ستون ہے جو افرادِ امت میں سے ہر شخص پر واجب ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ فتنہ برپا نہ ہو، کیونکہ جب برائی سے منع کرنے پر برائی کا بڑھ جانا لازم آتا ہو تو پھر اس سے انکار جائز نہیں ہے، جیسے ملوک، روسا اور امرا کے خلاف خروج کر کے برائی کا انکار کرنا، کیونکہ یہ ہر شر اور برائی کی جڑ ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے ان امرا کے خلاف قتال کرنے کی رخصت طلب کی جو تاخیر سے نماز ادا کرتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، جب تک وہ نماز ادا کریں، تب تک ان سے مت لڑو۔[1]

نیز آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم اپنے امیر میں کوئی مکروہ امر دیکھو تو صبر کرو اور اس کی اطاعت سے دست کش نہ ہو جاؤ۔[2] رسول اللہ ﷺ ہجرت سے قبل مکے میں کئی طرح کی منکرات کا مشاہدہ کرتے تھے، مگر انھیں بدل نہ پاتے تھے، حتی کہ جب مکہ فتح ہو کر دار الاسلام بھی بن گیا اور آپ ﷺ نے یہ چاہا کہ بیت اللہ کو اصل بنیادوں پر تعمیر کر دیں، لیکن محض فتنے کے ڈر سے آپ ﷺ نے یہ کام نہ کیا۔[3]

غرض کہ جب یہ گمان ہو کہ امر و نہی مقبول ہوگا، تب ہی اس کو بجا لائے، ورنہ سکوت کرنا اولیٰ اور خاموشی اختیار کرنا ہی مستحسن ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انکارِ منکر کے چار درجے ہیں۔ ایک یہ کہ منکر دور ہو کر اس کی جگہ معروف آ جائے۔ دوسرے یہ کہ بندہ انکار کر سکے، گو اس انکار سے منکر امر دور نہ ہو۔ تیسرے

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٥٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٤٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨١٦)

یہ کہ وہ منکر دور ہو، مگر اس کی جگہ ویسا ہی منکر آ جائے۔ چوتھے یہ کہ اس سے بدتر منکر آ جائے۔ سو پہلے دو درجے مشروع ہیں اور تیسرا درجہ محلِ اجتہاد ہے اور چوتھا حرام، مثلاً اگر وہ اہلِ فسق و فجور کو دیکھے کہ وہ شطرنج کھیلتے ہیں اور اسے یہ معلوم ہو کہ وہ لوگ میرے انکار سے شطرنج بازی چھوڑ کر تیراندازی اور گھوڑے دوڑانے کے کام میں مشغول ہو جائیں گے تو اس کا انکار کرنا ٹھیک اور درست ہے، اور اگر ان کے اس شطرنج بازی سے باز آ کر شراب نوشی اور زنا کاری میں ملوث ہونے کا ڈر ہو تو پھر ان پر انکار کرنا ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح اگر ایک قوم لہو ولعب میں یا موسیقی سننے میں مصروف ہے اور دعوت دینے والا یہ سمجھے کہ اس برائی کا انکار کرنے سے وہ قوم اللہ کی اطاعت کی طرف آ جائے گی تو اسے منع کرے، ورنہ ان کے کسی بڑے منکر میں مبتلا ہونے کے خدشے کے پیشِ نظر اس کو ترک کر دے۔ یا اگر ایک شخص قصے کہانیوں کی کتابوں کے مطالعے میں مشغول ہے اور اس پر انکار کرنے سے ڈر ہے کہ وہ ان قصوں اور کہانیوں کو چھوڑ کر بدعات اور ضلالات پر مشتمل کتابوں کا مطالعہ شروع کر دے گا تو ایسی جگہ ترکِ نہی بہتر ہے۔

تاتاریوں کے دور میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا ایک ایسی قوم پر گزر ہوا جو شراب نوشی میں مصروف تھے، شیخ کے ہمراہیوں میں سے کسی نے ان پر انکار کیا تو شیخ نے فرمایا: انھیں مت چھیڑو۔ شراب کے حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اللہ کے ذکر اور نماز ادا کرنے سے روکتی ہے، مگر ان لوگوں کو شراب قتلِ نفوس سے روکتی ہے۔ یہ اگر شراب نہ پئیں گے تو ابھی مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیں گے، ان کی اولاد کو قیدی بنائیں گے اور ان کا مال لوٹیں گے۔

صفاتِ الٰہیہ میں تفویض اور تاویل:

صفاتِ الٰہیہ کے مسئلے میں صرف دو قول ہیں۔ ایک قول ہے تفویض کے ساتھ تسلیم کرنا۔[1] یہ

---

[1] صفاتِ باری تعالیٰ کے ضمن میں تفویض کا اطلاق دو معانی پر ہوتا ہے:

① تفويض المعنى والكيفية: یعنی صفاتِ باری تعالیٰ کے اثبات میں قرآن و حدیث میں جو الفاظ مذکور ہیں (جیسے استواء، وجہ، ید، سمع، بصر وغیرہ) ہم ان کا معنی جانتے ہیں نہ اس کی کیفیت ہی کا علم رکھتے ہیں۔

② تفويض الكيفية دون المعنى: یعنی صفاتِ باری تعالیٰ کے لیے استعمال کیے گئے الفاظ کا معنی و مفہوم تو واضح اور معلوم ہے، لیکن ہم ان کی کیفیت سے ناواقف ہیں، جیسے امام مالک رحمہ اللہ کا فرمان ہے کہ "الاستواء معلوم، والكيف مجهول" یعنی استوا کا معنی و مفہوم تو معلوم اور واضح ہے، لیکن اس کی کیفیت و ماہیت مجہول ہے۔ ←

مذہب سلف کا ہے اور یہی حق، سچ اور راجح ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا تھا: اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا معلوم ہے، اس کی کیفیت مجہول ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔

دوسرا قول تاویل ہے۔ یہ طریقہ خلف کا ہے، جس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ تاویل تکذیب کی ایک شاخ اور فرع ہے۔ ایک جماعت نے اللہ تعالیٰ کے قرب و معیت کی تاویل علم، قدرت اور احاطے کے ساتھ کی ہے۔ سو یہ آیات متشابہ ہیں، ان میں غور و خوض کرنا بے سود ہے، جب کہ آیاتِ استوا محکمات ہیں۔ لہٰذا ایک مومن کے لائق یہ ہے کہ وہ سب صفاتِ الٰہیہ پر ایمان لائے اور ان کی کیفیت میں غور وفکر کرنے سے احتراز کرے اور سلف کے منہج سے تجاوز کرنے کو جائز نہ سمجھے۔

عہدِ میثاق:

کتاب وسنت سے عہدِ میثاق ثابت ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ﴾ [الأعراف: ۱۷۲]

[اور جب تیرے رب نے آدم کے بیٹوں سے ان کی پشتوں میں سے ان کی اولاد کو نکالا]

اور مصابیح میں موجود حدیث میں بھی ہے۔[1] مگر معتزلہ نے اس آیت وحدیث کو مجازی معنی پر

← اول الذکر معنی کے اعتبار سے تفویض کا عقیدہ ائمہ سلف اور اہلِ سنت کا عقیدہ نہیں، بلکہ یہ اشاعرہ اور اہلِ بدعت کا عقیدہ ہے، کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صفات کے ضمن میں جو الفاظ ذکر کیے ہیں، کوئی بھی ان کے معنی سے آگاہ نہیں، نہ رسول اللہ ﷺ، نہ صحابہ کرام اور نہ سلفِ امت۔ گویا یہ الفاظ عبث اور بے فائدہ ہی ذکر کیے گئے ہیں، جن کا کوئی معنی و مطلب مقصود نہ تھا۔ اس بیان وتوضیح ہی سے اس نظریے کا بدیہی البطلان ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔
مزید برآں ائمہ سلف سے صفاتِ باری تعالیٰ کے معانی سے متعلق صریح نصوص وارد ہوئی ہیں، جیسے استوا کا معنی ارتفاع اور علو ثابت ہے، لیکن ان کی کیفیت کا علم نہیں۔ اہلِ سنت اگرچہ صفاتِ باری تعالیٰ کا اثبات کرتے ہیں، لیکن وہ تشبیہ کا کلیتاً انکار کرتے ہیں، کیونکہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ [الشوریٰ: ۱۱] اس آیت کریمہ میں جہاں تشبیہ وتمثیل کی نفی کی گئی ہے، وہاں اللہ تعالیٰ کے لیے صفاتِ سمع وبصر کا اثبات بھی کیا گیا ہے، جس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ صفات کے اثبات سے تشبیہ اور تمثیل لازم نہیں آتی۔
الغرض اول الذکر معنی کے اعتبار سے تفویض کو ائمہ سلف کا عقیدہ قرار دینا درست نہیں، البتہ ثانی الذکر معنی کے اعتبار سے عقیدہ سلف پر تفویض کا اطلاق درست ہے، لیکن بہتر یہی ہے کہ ایسے مشتبہ الفاظ کے استعمال سے گریز کیا جائے۔

[1] مسند أحمد (۱/ ۲۷۲) مشكاة المصابيح (۱/ ۲٦)

محول کیا ہے اور یہ ان کی غلطی ہے۔ اس میثاق کے بعد جو شخص ایمان لایا، وہ تو تصدیق کرنے والا ہوا اور اپنے قول وقرار پر قائم و دائم رہا، اور جس نے کفر کیا، وہ اس میثاق کو بدلنے والا شمار ہوا۔

ہدایت وضلالت:

اللہ تعالیٰ نے جس کسی کو گمراہ کیا تو یہ اس کا عدل ہے اور جس کو ہدایت دی تو یہ اس کا فضل ہے۔

ایمان:

ایمان دل سے سچا ماننے، زبان سے سچا کہنے اور جوارح سے عمل کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ اطاعت کرنے سے بڑھتا ہے اور گناہ کرنے سے کم ہو جاتا ہے۔ بوقتِ ضرورت زبان کی تصدیق ساقط بھی ہو جاتی ہے۔ جس شخص نے دل سے تصدیق کی اور زبان سے اقرار نہ کیا تو وہ اللہ کے نزدیک مومن ہے،[1] گو احکامِ دنیا میں مومن نہ ہو، اور جس نے زبان سے اقرار کیا اور دل سے تصدیق نہ کی جیسے منافق ہے تو وہ مذکورہ شخص کے برعکس ہے۔

ایمان واسلام ایک ہی چیز ہے:

ایمان و اسلام ایک ہی چیز ہے، کیونکہ یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص مومن تو ہو مگر مسلمان نہ ہو یا مسلمان تو ہو مگر مومن نہ ہو۔ اسلام انقیاد یعنی عمل کرنے اور اطاعت بجا لانے کا نام ہے۔ ایمان تصدیقِ دل وغیرہ کا نام ہے اور احسان اخلاصِ باطن کا نام ہے۔ حدیثِ جبریل میں اسلام و ایمان کے درمیان جو فرق ہے، وہی قابلِ اعتماد ہے۔

کیا ایمان مخلوق ہے؟

خواب وغفلت، بے ہوشی اور موت کے ساتھ ایمان باقی رہتا ہے، اگرچہ یہ حالت معرفت وتصدیق کی ضد ہے۔ اہلِ ثمرقند نے کہا ہے کہ ایمان مخلوق ہے۔ اہلِ بخارا نے کہا ہے کہ یہ مخلوق نہیں ہے، لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ بندوں کے افعال و اعمال سب کے سب مخلوق ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ

[1] جو شخص زبان سے ایمان کا اقرار واظہار نہیں کرتا، وہ مومن نہیں، کیونکہ ایمان کے لیے مذکورہ بالا تینوں چیزوں کا وجود واجتماع ناگزیر ہے۔ اگر زبان سے اظہار واقرار کے بغیر ایمان کا وجود ہوتا تو بادشاہِ روم ہرقل اور ابو طالب بھی مومن شمار ہوں گے، لیکن معلوم ہے کہ یہ مومن نہیں تھے، کیوں کہ انھوں نے دل سے تصدیق کے باوجود اپنی زبان اور عملی اعتبار سے آپ ﷺ کو رسول برحق تسلیم نہیں کیا تھا۔

اور جماعت اہلِ حدیث کا کہنا ہے کہ ایمان غیر مخلوق ہے۔ ایمان کے کم اور زیادہ ہونے کی بحث لفظی نزاع کی طرف راجع ہوتی ہے۔

بندوں کے افعال مخلوق ہیں:

بندے کے سارے اختیاری افعال اللہ کی مخلوق ہیں۔ اللہ کی سنت جاریہ ہے کہ جب بندہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس فعل کو ایجاد فرما دیتا ہے۔ اسی صورت و قدرت کی بنیاد پر بندے کو کاسب کہتے ہیں اور اس پر مدح و ذم اور ثواب و عقاب مرتب ہوتا ہے۔ حرکتِ جماد اور حرکتِ انسان کے درمیان فرق کرنا کفر، خلافِ شرع اور بداہتِ عقل کے خلاف ہے۔ غیر اللہ کو کسی چیز کا خالق ماننا اور اعتقاد کرنا کفر ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرقہ قدریہ کو اس امت کا مجوسی فرقہ قرار دیا ہے۔[1] بندے کو اپنے اختیاری افعال میں کچھ اختیار نہیں ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی پتھر پھینکنے کا ارادہ کرے، اب اگر وہ قادر حکیم ہوتا تو پتھر کے اندر حرکتِ اختیار بھی پیدا کر دیتا۔

مرتکبِ کبیرہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا:

کبیرہ گناہ انسان کو ایمان سے خارج نہیں کرتا، جس طرح معتزلہ نے کہا ہے، کیوں کہ کبیرہ گناہ کے ارتکاب کے باوجود تصدیق باقی ہے۔ کبیرہ گناہ سے آدمی کافر نہیں ہو جاتا، جس طرح خوارج کہتے ہیں، بلکہ وہ نافرمان مومن، بدعمل مسلمان اور اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے۔

گناہ گار مسلمان جہنم سے نکال لیے جائیں گے:

کفار جہنم کی آگ میں ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہیں گے اور گناہ گار مسلمان اگر جہنم میں جائیں گے تو جلد یا بدیر اس سے باہر نکل آئیں گے، پھر ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔

اتباعِ رسول ﷺ:

اتباع صرف رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص ہے، لہٰذا بندۂ مومن آپ ﷺ کی دی ہوئی خبر پر ایمان لائے، اس پر عمل کرے اور جس چیز سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے، اس سے باز رہے۔ جس شخص کا قول و فعل رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل سے بال برابر بھی خلاف ہو، اسے رد کر دے۔ نیت و ارادے میں تفاوت اور فرق کے حسبِ حال تقلید شرک ہے یا کم از کم حرام ہے۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٩١)

ہر شخص اپنا مقرر رزق کھا کر فوت ہوتا ہے:

ہر شخص دنیا میں اپنا رزق پورا کرتا ہے اور کوئی شخص کسی غیر کا رزق نہیں کھا سکتا۔ رزق حرام کھانے پر عذاب، رزقِ حلال پر حساب اور شبہے والے رزق پر عتاب ہوگا۔

قتل مقدر کی موت ہے:

قتل ہونے والا اپنی مقدر کی ہوئی موت ہی سے مرا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾ [الأعراف: ٣٤]

[پھر جب ان کا وقت آ جاتا ہے تو ایک گھڑی نہ پیچھے رہتے ہیں اور نہ آگے بڑھتے ہیں]

نیز یہ کہ موت میت کے ساتھ قائم ہے اور اللہ کی مخلوق ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ [الملك: ٢]

[موت اور زندگی کو پیدا کیا، تا کہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے]

موت اور اجل ایک ہی چیز ہے۔

موزوں پر مسح کرنا:

سفر وحضر میں موزوں پر مسح کرنا مقیم کے لیے ایک دن اور رات، جب کہ مسافر کے لیے تین دن اور راتیں سنت صحیحہ متواترہ سے ثابت ہے۔

قیام رمضان:

رمضان کی راتوں کا قیام، جسے عرفِ عام میں تراویح کہا جاتا ہے، رکعات کی تعداد متعین کیے بغیر سنتِ صحیحہ سے ثابت ہے اور نفل نماز با جماعت ادا کرنا جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے رمضان اور غیر رمضان میں تیرہ رکعت سے زیادہ قیام نہیں کیا تھا جن میں وتر بھی شامل تھا۔ رسول اللہ ﷺ یہ رکعات لمبی لمبی ادا کرتے تھے۔ پھر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اُبی بن کعب سے تخفیف کے ساتھ بیس رکعتیں پڑھوائیں۔[1]

سلف میں بعض لوگ چالیس اور بعض چھتیس رکعتیں پڑھتے تھے اور یہ بات ان میں عام وشائع

[1] موطأ الإمام مالك (١١٥/١) میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے حکم سے ابی بن کعب ←

تھی۔ اب جو شخص جس طرح بھی قیامِ رمضان کرے گا، وہی بہتر ہے۔ ومن زاد الله في حسناته.

رہی افضلیت تو یہ قیام کرنے والوں کے مختلف احوال کے پیش نظر مختلف ہے۔ جو لوگ لمبے قیام کے متحمل ہوں، وہ دس رکعت مع تین رکعت وتر پڑھیں، جس طرح رمضان اور غیر رمضان میں رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا اور یہی افضل ہے۔ اگر وہ لمبے قیام کی استطاعت نہ رکھے تو بیس رکعت افضل ہیں، اکثر مسلمانوں کا عمل اسی پر ہے۔ رکعات کی یہی تعداد دس اور چالیس کے عدد کے درمیان ہے۔ اگر چالیس یا اس سے بھی زیادہ پڑھے تو بھی جائز ہے۔[1]

فاجر کی امامت:

ہر نیک و بد اور فاجر و صالح مومن کے پیچھے نماز ادا کرنا جائز ہے۔ اکثر علما کے نزدیک اس نماز کا تارک بدعتی ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ نے ولید بن عقبہ کے پیچھے نماز ادا کی تھی، حالانکہ وہ شراب پیتا تھا۔ ہاں سلف نے مبتدع کے پیچھے نماز ادا کرنے کو مکروہ کہا ہے۔ اسی طرح ہر نیک و بد کی نماز جنازہ ادا کرے سوائے اس کے جسے شریعت نے خاص کر دیا ہے، جیسے غال یعنی مالِ غنیمت میں سے خیانت کرنے والا، قاتل نفس یعنی خودکشی کرنے والا، کافر اور شہید[2] نیز قبر پر اور غائبانہ نماز جنازہ ادا کرنا درست ہے۔

ولایت و نبوت:

مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ کوئی ولی نبی کے درجے کو نہیں پہنچتا ہے۔ بعض صوفیہ کا یہ قول کہ ولایت نبوت سے افضل ہے، مردود ہے۔ اس طرح یہ قول بھی مردود ہے کہ خاتمِ اولیا افضل اولیا ہے۔

← اور تمیم داری رضی اللہ عنہ لوگوں کو رمضان میں گیارہ رکعات پڑھایا کرتے تھے۔ بیس رکعت والی روایت ضعیف ہے، کیونکہ اس کی سند میں انقطاع ہے۔

[1] مگر راجح بات وہی ہے جو صحیح البخاری اور صحیح مسلم کی متفق علیہ حدیث سے ثابت ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: «ما كان رسول الله يزيد في رمضان ولا في غيره على إحدى عشرة ركعةً» صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٩٦)، صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٣٨)

[2] قاتلِ نفس وغیرہ کبیرہ گناہ کے مرتکب کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی، کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو ان کی نماز جنازہ پڑھنے کا حکم دیا تھا، اگرچہ بطورِ تہدید خود نمازِ جنازہ پڑھانے سے گریز فرمایا۔

عصمتِ اولیا:

ولی کا معصوم ہونا شرط نہیں ہے، بلکہ اس سے غلطی ہوتی ہے۔ شریعت کے بعض علوم اس پر مخفی رہتے ہیں اور بعض امورِ دین اس پر مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض خوارق کو وہ کرامات سمجھے، جب کہ وہ شیطان کی طرف سے ہوں، تا کہ شیطان اس کا مقام و مرتبہ کم کر دے۔

کشف والہام حجت شرعیہ نہیں ہیں:

الہام، کشف اور خواب حجت شرعیہ ہے نہ ان سے کوئی حکمِ شرع ثابت ہوتا ہے۔ کشفِ اولیا میں اکثر خطا ہوتی ہے اور جو الہام و منام حدیث کے خلاف ہو، وہ مردود ہے، اس پر تمام سلف و خلف کا اجماع ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا قول اور بات ہی قطعی حجت ہے اور روایت و حدیث میں کذب اور نسیان کا احتمال ضعیف ہے۔

شرعی خطاب:

جب تک انسان عاقل و بالغ رہتا ہے، اس سے امر و نہی ساقط نہیں ہوتا، کیوں کہ خطاباتِ تکالیف عام ہیں اور مجتہدین کا اس پر اجماع ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ [الحجر: ۹۹]

[اور اپنے رب کی عبادت کر، یہاں تک کہ تیرے پاس یقین آ جائے]

اللہ تعالیٰ سے مایوس یا مامون ہونا دونوں کفر ہیں۔ پہلے فعل کی دلیل فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿ اِنَّهٗ لَا يَاْيْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ [یوسف: ۸۷] [بے شک حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی رحمت سے نا امید نہیں ہوتے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں] ہے اور دوسرے فعل کی دلیل ارشادِ الٰہی: ﴿ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ [الأعراف: ۹۹] ہے۔ مومن کا ایمان خوف و امید کے درمیان ہوتا ہے۔ صرف رجا و امید مرجیہ کا مذہب ہے اور صرف خوف خوارج کا مشرب و مذہب ہے۔ اہلِ سنت امیدوار اور اندیشہ دار ہیں اور یہی حق و سچ ہے۔

کاہن کی تصدیق کرنا کفر ہے:

کاہن کی دی ہوئی غیبی خبر کی تصدیق کرنا کفر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [النمل: ٦٥]

[اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے، غیب نہیں جانتا]

ایک حدیث میں آیا ہے:

«مَنْ أَتٰى كَاهِناً فَصَدَّقَهُ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ ﷺ» [1]

[جو شخص کسی کاہن کے پاس گیا اور اس کی (بتائی ہوئی غیبی خبر کی) تصدیق کی تو اس نے محمد ﷺ پر اتاری گئی شریعت کے ساتھ کفر کیا]

یہی حکم رمّال، جفار اور فال نکالنے والے کا ہے۔ نیز یہ کہنا کہ اولیا کو علمِ غیب ہے، کفر ہے۔

قبولیتِ دعا:

زندوں کا مردوں کے حق میں دعا کرنا اور ان کی طرف سے صدقہ کرنا مفید ہے۔ اللہ تعالیٰ دعاؤں کو قبول کرنے والا اور حاجات کو پورا کرنے والا ہے۔ البتہ کافر کی دعا کی قبولیت میں اختلاف ہے۔

جنوں کو عذاب وثواب ہوگا:

اس بات پر اتفاق ہے کہ جنوں میں سے جو کافر ہیں، انھیں بھی آگ کا عذاب دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ [هود: ١١٩]

[میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے ضرور ہی بھروں گا]

اسی طرح مومن جن جنت میں جائیں گے۔ امام محمد اور قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔

قدر کا غلبہ:

سعادت مند مومن کبھی انجام کار مرتد ہو کر بد بخت بن جاتا ہے اور اسی طرح افعالِ سعادت سرانجام دینے کے ساتھ بد بخت کبھی نیک بخت بن جاتا ہے۔

علاماتِ قیامت حق ہیں:

قیامت کی وہ نشانیاں جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے، سب حق ہیں، جیسے: غربتِ اسلام، قلتِ علم، کثرتِ جہل، ہرج و مرج، خروجِ دجال، خروجِ دابۃ الارض، خروجِ یاجوج ماجوج، نزولِ عیسیٰ علیہ السلام اور طلوعِ آفتاب از طرف مغرب وغیرہ آیات صغریٰ وفتن کبریٰ۔

[1] سنن أبي داود (٣٩٠٤) سنن الترمذي (١٣٥) سنن ابن ماجه (٦٣٩)

حشر ونشر:

مرنے کے بعد قیامت کے دن دوبارہ اٹھنا، لوگوں کو مارنے اور دوبارہ زندہ کرنے کے لیے پہلی اور دوسری مرتبہ صور پھونکنا، آسمانوں کا پھٹ جانا، ستاروں کا بکھر جانا، پہاڑوں کا دھنی ہوئی روئی کی طرح اڑ جانا، زمین کا ویران ہو جانا، اس جہانِ دنیا کے ختم ہونے کے بعد جہانِ آخرت کا برپا ہونا، انوع واقسام کے عذاب اور نعمتوں کا ہونا، جہنم اور جنت کا ہونا، جنت میں حور وقصور کا ملنا اور دوزخ میں سانپ، بچھو، بیڑیوں، اطواق واغلال، گرم پانیوں، تھوہر اور غسلین کا ہونا؛ سب کچھ حق ہے۔

بشر وملائکہ کی افضلیت:

رسلِ بشر رسلِ ملائکہ سے افضل ہیں اور رسلِ ملائکہ بالاجماع بلکہ بالضرورۃ عامۂ بشر سے افضل ہیں اور عامۂ بشر، عامۂ ملائکہ سے افضل ہیں۔

معراج نبوی:

رسول اللہ ﷺ کا معراج حالت بیداری میں اسی بدن عنصری کے ساتھ آسمانِ دنیا تک اور پھر جہاں تک اللہ تعالیٰ نے چاہا، وہاں تک حق ہے۔ یہ صحیح اور مشہور حدیث سے کئی سندوں کے ساتھ متواتراً ثابت ہے اور ان کا منکر بدعتی اور گمراہ ہے۔ آپ ﷺ کا مسجد حرام سے بیت المقدس تک جانا قطعی اور قرآن سے ثابت ہے اور اس کا انکار کفر ہے۔ آپ ﷺ کا زمین سے آسمان تک جانا نصِ مستفیض سے ثابت ہے اور اس کا منکر مبتدع ہے۔ آسمان سے جنت وعرش تک جانا اخبار آحاد سے ثابت ہے اور خبر واحد حجت ہوتی ہے۔ عرش سے اوپر تک جانا مختلف فیہ ہے اور یہی وہ مقام ہے جسے قرآن مجید میں ﴿قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ﴾ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، علما، فقہا، محدثین اور مفسرین رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں کہ آپ ﷺ کو یہ اسرا ومعراج جسدِ اطہر کے ساتھ بیداری کی حالت میں ہوا تھا۔

شبِ معراج رویتِ باری تعالیٰ:

معراج کی رات رسول اللہ ﷺ کے رب تعالیٰ کو دیکھنے میں اختلاف ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو سر کی آنکھ سے دیکھا تھا یا دل کی آنکھ سے؟ سلف کی ایک جماعت یہ دونوں موقف رکھتی ہے۔ بہر حال آپ ﷺ کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا راجح ہے۔ وہ دیکھنا کسی طرح سے بھی ہو اور یہ رویت

دنیا میں نہیں آسمانوں کے اوپر ہوئی تھی۔[1]

معدوم اور شے کی تحقیق:

محققین کے نزدیک معدوم کوئی چیز نہیں ہے اور شے سے مراد امرِ ثابت و متحقق ہے۔ رہی یہ بات کہ معدوم کا نام شے نہیں ہے، یہ ایک لغوی بحث ہے۔

دنیا میں رویتِ باری تعالیٰ ممکن نہیں:

اہلِ سنت کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رویت عینِ بصر کے ساتھ دنیا و آخرت میں عقلاً جائز ہے اور عقبیٰ میں سمعاً و نقلاً ثابت ہے، لیکن دنیا میں کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو اس آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا ہے، ہاں خواب میں کیفیت کے بغیر دیکھنا ممکن ہے اور یہ ایک طرح کا دلی مشاہدہ ہے۔

روح:

روح محدث ہے اور یہ بات دینِ اسلام میں ضرورتاً معلوم ہے۔ سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام اسی کے قائل تھے۔ اہلِ علم نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ جسم اور بدن مر جاتا ہے، مگر روح نہیں مرتی اور اس کو جسدِ خاکی سے جدا ہونے کے بعد نعمتیں ملتی ہیں یا عذاب ہوتا ہے۔

[1] شبِ معراج رویتِ باری تعالیٰ کے سلسلے میں صحابہ کرام اور ائمہ تابعین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض مطلقاً رویت کی نفی کرتے ہیں، جیسے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور بعض صحابہ کرام صرف قلبی رویت کا اثبات کرتے ہیں۔ حالتِ بیداری میں آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو شبِ معراج دیکھنا؛ یہ کسی صحابی کا قول نہیں ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے رویتِ باری تعالیٰ کے اثبات کے سلسلے میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے، لیکن دوسری روایت میں ان سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دل سے دیکھا ہے۔ (صحیح مسلم: ۳/۸) یہ نص صریح ہے کہ نبی کریم ﷺ کو قلبی رویت حاصل ہوئی تھی، آپ ﷺ نے بیداری کی حالت میں آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ فرمایا: میں نے نور دیکھا ہے۔ (صحیح مسلم: ۳/۱۵) ایک دوسری روایت میں صراحت ہے کہ «حِجَابُهُ النُّوْرُ» اللہ تعالیٰ کا پردہ نور ہے۔ (صحیح مسلم: ۱۷۹) یعنی آپ ﷺ نے نور کا پردہ دیکھا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس دنیا میں آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو بیداری کی حالت میں نہیں دیکھا۔ البتہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا اور تمام مومن اس رویت سے مشرف ہوں گے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جن صحابہ کرام نے رویت کی نفی کی ہے، اس سے مراد آنکھوں سے دیکھنے کی نفی ہے اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جو اثباتِ رویت کا قول مروی ہے، اس سے قلبی رویت مراد ہے، جیسا کہ ان ہی سے ایک دوسری روایت میں مروی ہے۔ امام ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن ابی العز، ابن کثیر اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا متعارض روایات میں اسی طرح جمع و تطبیق دی ہے۔

کافر کی دنیوی نعمتیں:

کافر کو دنیا میں نعمت دی جاتی ہے، جیسا کہ فرمانِ رسول ﷺ ہے:

«اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْکَافِرِ»[1]

[دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کی جنت ہے]

لیکن کافر کے لیے دنیا کی یہ نعمت قیامت کے دن نقمت و عذاب بن جائے گی۔

معرفتِ الٰہی:

اللہ تعالیٰ کی شناخت و معرفت حاصل کرنا اور اس کی اطاعت بجا لانا، اللہ تعالیٰ کے اور شرع کے واجب کرنے کے ساتھ، نہ کہ براہِ عقل، واجب ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عقل آلۂ معرفت ہے اور موجب اس کا اللہ تعالیٰ ہے اور ایمان لانا عقلاً واجب ہے، لیکن پہلا قول ہی راجح ہے۔

وسعت سے زیادہ کسی کو مکلف نہیں بنایا جاتا:

صحیح ترین موقف یہ ہے کہ کسی کو وسعت و طاقت سے زیادہ مکلف نہیں بنایا جاتا۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرة: ٢٨٦]

[اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجایش کے مطابق]

ممتنع بالغیر[2] کا مکلف ٹھہرانا شرعاً جائز اور واقع ہے، جیسے فرعون سے یہ کہنا کہ ایمان لاؤ، حالانکہ یہ معلوم تھا کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔

جادو اور نظر حق ہے:

جادو اور نظر کا لگنا حق ہے۔ فرمانِ رسول ﷺ ہے:

«اَلْعَیْنُ حَقٌّ» (رواه الشیخان)[3] [نظر کا لگنا برحق ہے]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩٥٦)

[2] "الممتنع: هو الذي یکون عدمه في الخارج ضروریا، فإن اقتضاه الذات فهو الممتنع بالذات (کشریك الباريء تعالیٰ) وإن اقتضاه الغیر فهو الممتنع بالغیر" (دستور العلماء: ٢٣١/٣)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٤٠٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢١٨٧)

رسول اللہ ﷺ پر بھی جادو کا اثر ہوا تھا۔

سنت کی حقیقت:

سنت حقیقت میں کسی خاص مذہب کا نام نہیں ہے، بلکہ کتاب وسنت کا وہ منطوق ومفہوم، جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ، گزرے ہیں، وہی سنت ہے، جیسے سوالِ قبر، وزنِ اعمال اور پل صراط پر سے گزرنا وغیرہ۔ اس سب کا بیان قرآن وحدیث میں آیا ہے۔ ایک دوسری قوم نے اس کی تاویل کی ہے جو اہلِ بدعت ہیں۔

مجدد:

زمین پر ہر وقت ایک شخص موجود رہتا ہے جو اللہ کی حجت وشریعت پر قائم ہوتا ہے۔ کوئی دور اور زمانہ مجتہد مجدد سے خالی نہیں ہوتا۔ حدیث میں آیا ہے:

«لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي ظَاهِرِينَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللّٰهِ»[1]

[اس امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا، کوئی خاذل اور مخالف اس کو نقصان نہ پہنچا سکے گا، یہاں تک کہ قیامت آ جائے]

اس گروہ سے مراد جماعتِ اہلِ حدیث وقرآن ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اہلِ غلو کی تحریف، اہلِ جہل کی تاویل اور اہلِ باطل کے انتحال کو دور کرتے رہتے ہیں۔[2] ان ہی سے مردہ سنت کا احیا ہوتا ہے اور بدعت محدثہ ختم ہوتی ہے۔ حدیث میں مجدد عالم کو کہا ہے۔[3]

تقلید کا حکم:

اہلِ علم کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ مسائل شرعیہ فرعیہ میں تقلید کرنا جائز نہیں ہے۔ امام مالک اور جمہور علما کا یہی موقف ہے۔ یہ لوگ تقلید کو باطل اور اجتہاد کو واجب کہتے ہیں۔ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے تقلید کی ممانعت پر اجماع نقل کیا ہے اور چاروں مجتہدین ائمہ نے تقلید سے منع

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٠)

[2] سنن البيهقي الكبرى (١٠/٢٠٩)

[3] سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٢٩١)

کیا ہے۔ بہر حال اگر تقلید کی ممانعت پر اجماع نہ بھی ہو تو جمہور کا مذہب تو ضرور ہے اور تقلید کے عدمِ جواز پر اجماع کی حکایت اس مذہب کی تائید کرتی ہے۔ مجتہد اپنی رائے پر تب عمل کر سکتا ہے جب دلیل موجود نہ ہو۔ کسی دوسرے کو اس کے اجتہاد پر چلنا روا اور جائز نہیں ہے۔

”فهذان الإجماعان يجتثان التقليد من أصله“[1] ولله الحمد.

[پس یہ دونوں اجماع تقلید کو جڑ سے اکھاڑ دیتے ہیں]

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جا بجا دین و رسم کے مقلدین کی مذمت فرمائی ہے۔

عامی کے لیے تقلید شخصی کا حکم:

عامی پر ہر واقعے میں معین مذہب کا التزام واجب ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق دو قول ہیں اور دونوں قولوں کی ایک جماعت قائل ہے۔ راجح قول یہ ہے کہ اس پر واجب نہیں ہے۔ ابن برہان اور نووی رحمہ اللہ اسی طرف گئے ہیں اور یہی حق ہے۔

مقلد کا ایمان:

ایسے مقلد کا ایمان، جس کے پاس دلیل نہیں ہے، صحیح ہے اور بعض فقہا نے اس پر اجماع نقل کیا ہے اور یہی حق ہے۔ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مجمل ایمان پر اکتفا کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں معرفتِ دلیل کا مکلّف نہیں ٹھہرایا تھا۔

اجماع:

نفس الامر میں اجماع ممکن ہے، لیکن اس کا وجود مشکل ہے۔ فقہا کی یہ سہل انگاری اور کاہلی ہے کہ وہ جس جگہ اختلاف نہیں پاتے، اجماع کا دعویٰ کر دیتے ہیں، اسی لیے امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ اہلِ علم، اہلِ دین اور اہلِ تحقیق کی ایک جماعت نے وجودِ اجماع کا انکار کیا ہے۔ پھر اجماع کی بنیاد کتاب و سنت ہوتی ہے اور مجتہدینِ امت کا اجماع معتبر ہوتا ہے نہ کہ عامۂ امت کا، پھر اگر ایک بھی مجتہد نے اختلاف کر دیا تو اجماع نہ رہا۔

قیاس:

ہر قیاس کرنے والے کا قیاس معتبر نہیں، بلکہ صرف مجتہد عالم کا قیاسِ جلی ہی معتبر ہوتا ہے اور

[1] إرشاد الفحول (٢/٢٤٤)

وہ بھی اس وقت جب کتاب وسنت کی کوئی متصادم دلیل نہ ہو اور وہ محض رائے ہونے سے مبرا ہو، کیوں کہ قیاس کرنا تو مجتہد کا کام ہے نہ کہ ہر عامی و عالم کا۔ شریعت میں رائے کا دخل اس کی تحریف کرنے کے مترادف ہے، صرف قضا میں رائے قابل قدر ہے۔

علم تین چیزوں سے عبارت ہے: آیت محکمہ، سنتِ قائمہ اور فریضہ عادلہ؛ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ فضول اور بے سود ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے "حجة الله البالغة" میں کہا ہے:

"هذا ضبط و تحديد لما يجب عليهم بالكفاية"[1] انتهى.

[یہ وہ ضبط وتحدید ہے جو ان پر واجب کفائی ہے]

قرآن وحدیث کی نصوص اپنے ظاہر پر محمول ہیں:

قرآن و حدیث کی نصوص اپنے ظاہر پر محمول ہیں، جب تک کوئی قطعی دلیل ان کو ظاہر سے نہ پھیر دے، خواہ وہ نصوص جہت اور جسمیت ہی کو کیوں نہ بتاتی اور ثابت کرتی ہوں۔ اس سلسلے میں فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [الشورىٰ: ١١] [اس کی مثل کوئی چیز نہیں] فوری طور پر ذہن میں پیدا ہونے والے وہم کو دور کرنے کے لیے کافی ہے۔ صوفیہ کی وہ تفسیر جو جمہور مفسرین کے خلاف ہو غیر مقبول ہے۔ اس مقام پر اولیاے کاملین اور علماے عاملین کی تصریح کے مطابق قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جس مسئلے میں علما و مشائخ کا اختلاف ہوتا ہے، اس جگہ حق وہ ہے جس پر علماے دین گامزن ہیں۔ اسی طرح جس مسئلے میں اہلِ رائے فقہا اور محدثین کا اختلاف ہوتا ہے، وہاں حق اہلِ حدیث کے ساتھ ہوا کرتا ہے، کیونکہ یہ لوگ اہلِ رسول اللہ اور قدوۂ امت ہیں۔

قیامِ خلافت:

مسلمانوں کے لیے ایک امام اور خلیفہ کا ہونا ضروری ہے۔ امام کا کام یہ ہے کہ وہ احکام جاری کرے، حدود قائم کرے، سرحدوں کی حفاظت کرے، لشکرِ اسلام تیار کرے، صدقات وصول کرے، بے فیض اور زبردستی قابض لوگوں کو زیر کر کے رکھے، راہزنوں کو سزا دے، جمعہ، جماعات اور عیدوں کو قائم کرے، لڑائیوں کو ختم اور جھگڑوں کا فیصلہ کیا کرے، حقوق کی بابت گواہیوں کی سماعت کرے، لا وارث لڑکے لڑکیوں کی شادی کر دے، غنائم کی تقسیم کرے اور اس طرح کے دیگر انتظامی امور انجام

[1] حجة الله البالغة (١/ ٣٦٢)

دے۔ امام کا قائم کرنا واجب ہے اور یہ وجوب مخلوق پر سمعاً ثابت ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے امام بنانے کو ایک اہم کام سمجھا تھا، حتی کہ اس کام کو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین پر بھی مقدم کیا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی حدیث میں ہے:

«مَنْ مَاتَ وَ لَيْسَ فِيْ عُنُقِهِ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً» (رواہ مسلم)[1]

[اپنی گردن میں بیعت کا پٹا ڈالے بغیر مرنے والا شخص جاہلیت کی موت مرا]

مطلب یہ ہے کہ امام کے ہوتے ہوئے جو شخص اس کی بیعت کیے بغیر مرے گا، اس کا یہی حکم ہے کہ وہ جاہلیت کی موت مرا۔ اگر وقت اس طرح کا ہو کہ امام و خلیفہ موجود نہیں ہے تو پھر امید ہے کہ اس پر یہ حکم نہیں لگے گا۔

شروطِ امامت:

امام و خلیفہ آزاد، مذکر اور عاقل و بالغ ہو نہ کہ عورت، بچہ اور مجنون۔ وہ امام اپنی رائے اور رویے کی قوت اور رعب و دبدبے سے سیاست کرے، نیز وہ احکام کے نفاذ، اسلامی حدود کی حفاظت اور مظلوم کو ظالم سے حق لے کر دینے پر قادر ہو۔ بہادر، صاحبِ رائے، صاحبِ سمع و بصر و نطق ہو۔ اس کا تعلق قریش خاندان سے ہو، کیونکہ اہلِ حل وعقد کے اختیار کے ساتھ غیر قریشی کی امامت و خلافت صحیح نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی زورِ بازو اور زورِ تلوار سے حاکم بن بیٹھے، اگر ایسا ہو تو اس وقت اس کی اطاعت واجب ہوتی ہے، اگرچہ وہ قریشی نہ ہو، کیوں کہ اس کو برخاست کرنے میں اصلاح و فائدے کی نسبت فساد و نقصان زیادہ ہے۔

خلافت کا انعقاد:

خلافت کا انعقاد اہلِ حل وعقد کی بیعت سے ہوتا ہے۔ یعنی جس شخص کو اس ملک کے علما، شرفا، امرا اور معززینِ شہر امام بنا دیں، وہ امام بن جاتا ہے، چنانچہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت اسی طرح قائم ہوئی تھی۔ یا اس کا طریقہ یہ ہے کہ خلیفہ خود وصیت کر جائے کہ میرے بعد فلاں شخص امام ہو جس طرح ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے متعلق وصیت کر گئے تھے۔ یا خلیفہ مسئلہ امارت کو بعد والے لوگوں

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۸۵۱)

کے مشورے پر موقوف کر جائے جس طرح عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا اور عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت اسی طرح قائم ہوئی تھی، بلکہ علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی ایسے ہی قائم ہوئی تھی۔ باوجود عدمِ لیاقت و قابلیت کے اپنی اولاد کو ولی عہد بنانا بدعت ہے، کیونکہ خلافت و امامت وراثت نہیں ہے، بلکہ یہ قابلیت و لیاقت اور اہلِ حل و عقد کی رضا پر موقوف ہے۔

خلیفہ سے کب قتال کرنا جائز ہے؟

جب خلیفہ ضروریاتِ دین میں سے کسی ضروری چیز کا انکار کر کے کافر ہو جائے تو اس کے ساتھ قتال کرنا نہ صرف حلال بلکہ واجب ہے، لیکن اس کے ظلم و فسق کی وجہ سے اس کو اس منصب سے معزول نہیں کیا جائے گا۔ سلفِ امت کا اہلِ جور و فسق کی امامت پر گویا اجماع تھا اور یہی حکم ہر قاضی اور امیر کا ہے، مگر امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک فسق و جور کی بدولت امام معزول ہو جاتا ہے، لیکن پہلا قول راجح ہے۔

خلیفہ کے خلاف بغاوت کی سزا:

جب ایک شخص خلیفہ مقرر ہو چکا تو اب کوئی دوسرا شخص اٹھ کر اس سے جھگڑا کھڑا کر کے خلافت چھیننا چاہے تو وہ واجب القتل ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ خلیفہ کے مددگار بن کر اس باغی کو سزا دیں، یہاں تک کہ وہ اپنے اس جھگڑے سے باز آ جائے، لیکن اس معاملے میں اتنی احتیاط کریں کہ کسی بھاگنے والے اور قیدی کو قتل نہ کریں، کسی زخمی کو ہلاک نہ کریں اور نہ اس کا مال ہی لوٹیں، کیونکہ اس میں دفعِ شر اور باغی شخص کی جماعت کو منتشر کرنا مقصود ہے، سو وہ حاصل ہو چکا، ورنہ ان کا حکم محارب کا حکم ہو گا۔

فاسق کی قضا:

علمائے ثلاثہ کے نزدیک فاسق آدمی کو قاضی بنانا درست نہیں ہے اور اس نے رشوت لے کر جو حکم جاری کیا ہے، وہ حکم نافذ نہیں ہو گا۔

افضل التابعین:

اہلِ مدینہ کے نزدیک تابعین رحمہم اللہ میں سے افضل تابعی سعید بن المسیب رحمہ اللہ ہیں۔ اہلِ بصرہ کے نزدیک حسن بصری رحمہ اللہ اور اہلِ کوفہ کے نزدیک اویس قرنی رحمہ اللہ ہیں اور یہی موقف درست ہے،

اس لیے کہ عمر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ان کو ''خیر التابعین'' فرمایا گیا ہے۔ (رواہ مسلم)[1]

تابعین کی فضیلت:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین رحمہ اللہ امت کے افضل ترین افراد ہیں اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

«خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ»[2]

[زمانوں میں سے بہترین زمانہ میرا ہے، پھر ان لوگوں کا جو ان کے بعد آئیں اور پھر ان لوگوں کا جو ان کے بعد آئیں گے]

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ احناف کے نزدیک تابعی ہیں اور دوسرے لوگوں کے نزدیک وہ امام مالک رحمہ اللہ کی طرح تبع تابعی ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ امام مالک رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں۔ اسی طرح صحاح ستہ کے مولفین خیر القرون میں داخل ہیں۔ صحیح مسلم میں مروی حدیث میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چوتھی صدی کو بھی بہتر قرار دینے کا ذکر آیا ہے۔[3] ان صدیوں اور زمانوں کی فضیلت علم، تقویٰ اور خیر القرون کے ساتھ قرب کی بنا پر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علماے حدیث کی تعدیل فرمائی ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهُ»[4]

[اس علم کو پچھلے طبقے میں سے وہ لوگ اٹھائیں گے جو عادل ہوں گے]

اس اعتبار سے علماے حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معنوی اصحاب ہیں رحمہم اللہ۔ وللہ الحمد.

زمانوں کی فضیلت ہر جہت سے ممکن نہیں:

بعض زمانوں کی بعض پر فضیلت، فضیلت کی ہر ایک جہت سے ممکن نہیں ہے، جس کی دلیل یہ حدیث ہے:

«مَثَلُ أُمَّتِيْ مَثَلُ الْمَطَرِ لَا يُدْرٰى أَوَّلُهُ خَيْرٌ أَمْ آخِرُهُ» (رواه الترمذي)[5]

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤٢)

[2] التلخيص الحبير (٤/ ٢٠٤)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٥)

[4] مسند الشاميين (١/ ٣٤٤) مشكاة المصابيح (١/ ٥٣)

[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٦٩)

[میری امت کی مثال بارش کی مثال ہے، جس کے متعلق یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا اول حصہ بہتر ہے یا آخری]

اس فضیلت کا انداز کچھ یوں ہوگا کہ جمہور قرنِ اوّل جمہور قرنِ ثانی سے افضل ہیں، کیونکہ قرنِ اوّل میں بعض فاسق و منافق بھی تھے، جیسے حجاج، یزید اور مختار۔ اور اس کے مابعد قرن میں بڑے بڑے علما و صلحا ہوئے، جیسے حفاظ حدیث، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، شیخ عبدالقادر جیلانی اور قاضی شوکانی رحمہم اللہ۔

ہر بدعت گمراہی ہے:

حدیثِ صحیح: «كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»[1] [ہر بدعت گمراہی ہے] کے مطابق ہر بدعت مطلق طور پر ضلالت اور گمراہی ہے۔ بدعت کو بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ وغیرہ میں تقسیم کرنا بلا دلیل ہے، کتاب و سنت سے اس کی بو تک محسوس و مشموم نہیں ہوتی۔ شیخ عبدالحق دہلوی حنفی رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ اعتصام بالسنہ اگرچہ قلیل ہو، احداثِ بدعت سے بہر صورت بہتر ہے، اگرچہ وہ حسنہ ہو، کیونکہ اتباعِ سنت سے نور پیدا ہوتا ہے اور بدعت سے ظلمت و اندھیرا آتا ہے، مثلاً سنت کے مطابق خلا و استنجا کے آداب بجا لانا، رباط و مدرسہ بنانے سے بہتر ہے۔ سنت پر چلنے والا آدابِ سنت کی رعایت کی وجہ سے مقامِ قرب تک ترقی کر جاتا ہے اور مذکورہ آداب کا ترک کرنا ترکِ افضل تک پہنچا دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ قساوتِ قلب کے مرتبے تک پہنچ جاتا ہے، جسے کتاب اللہ میں "رین" (زنگ) "طبع" (مہر) اور "ختم" (مہر لگ جانا) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انتھیٰ۔

اسی سے ملتے جلتے الفاظ و مفہوم کے ساتھ ملا علی قاری نے "مرقاۃ المفاتیح" میں کلام کیا ہے۔[2] وللہ الحمد. تفہیمات میں فرمایا ہے کہ بدعت تین قسم کی ہے۔ ایک وہ جس پر رسول اللہ ﷺ نے بلا عزم کے برانگیخت فرمایا، اس کو تو وہ خوب مضبوطی سے تھام لے، جیسے تراویح کہ یہ بدعت حسنہ ہے۔ دوسری ان مباح عادات کا اختیار کرنا جو سلف میں رائج نہیں تھیں، یہ آسان کام ہے۔ تیسری وہ جس میں کسی سنت کا ترک یا مشروع کی تحریف لازم آتی ہے، یہ ضلالت اور گمراہی ہے۔ انتھی۔

مذکورہ بالا اقسامِ بدعت میں سے پہلی قسم درحقیقت سنت حکمیہ ہے، اس کو بدعت کہنا لغوی

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٦٧)

[2] مرقاۃ المفاتیح (١/ ٤٩٠)

اعتبار سے ہے نہ کہ اصلاحی طور پر۔

توبہ کی ترغیب:

بندے کو ہمیشہ اللہ کے سامنے توبہ بجا لانے کا حکم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَتُوبُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ جَمِيعًا ﴾ [النور: ٣١] [اور تم سب اللہ کی طرف توبہ کرو]

صحیح بخاری میں آیا ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ ہر روز ستر مرتبہ سے زیادہ توبہ و استغفار کیا کرتے تھے۔[1] جس شخص کو یہ گمان ہے کہ گناہ پر اصرار مضر نہیں ہے، وہ گمراہ ہے اور کتاب و سنت اور سلفِ امت و ائمہ ملت کے اجماع کا مخالف ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُۥ ﴾ [الزلزال: ٨]

[اور جو شخص ایک ذرہ برابر برائی کرے گا اسے دیکھ لے گا]

اور جس شخص نے یہ خیال کیا کہ گناہ گاروں کے لیے تقدیر حجت ہے، وہ مشرک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:

﴿ سَيَقُولُ ٱلَّذِينَ أَشْرَكُوا۟ لَوْ شَآءَ ٱللَّهُ مَآ أَشْرَكْنَا وَلَآ ءَابَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِن شَىْءٍ ﴾ [الأنعام: ١٤٩]

[عنقریب وہ لوگ کہیں گے جنھوں نے شریک بنائے ہیں، اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شریک بناتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام ٹھہراتے]

اگر تقدیر گناہوں کے لیے حجت و دلیل ہوتی تو جن قوموں نے رسولوں کی تکذیب کی تھی، جیسے قومِ نوح، قومِ عاد اور قومِ ثمود وغیرہ تو اللہ تعالیٰ ان کو عذاب میں مبتلا کرتا نہ حد سے تجاوز کرنے والوں پر اقامتِ حدود کا حکم دیتا۔

توبہ کی قبولیت:

توبہ کرنے والے سے گناہ کی سزا کا ساقط کر دینا اللہ تعالیٰ پر عقلاً واجب نہیں ہے، بلکہ معاف کر دینا تو محض اس کا فضل و کرم ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ توبہ کا قبول کرنا شرعاً واقع ہوتا ہے یا نہیں؟

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٤٨) جبکہ صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٠٢) میں یہ الفاظ ہیں:
« وإني لأستغفر الله في اليوم مائة مرة » [بلا شبہہ میں دن میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں]

تو جس شخص نے کسی کبیرہ گناہ سے توبہ کی ہے، اس کی توبہ صحیح ہے، اگر چہ وہ کسی دوسرے کبیرہ گناہ پر اصرار کیوں نہ کر رہا ہو، اسے اس گناہِ کبیرہ پر، جس سے وہ تائب ہو چکا ہے، عذاب نہیں ہو گا۔ جس شخص نے کبائر سے توبہ کی تو وہ شخص صغائر سے توبہ کرنے سے مستغنی نہیں ہے اور جائز ہے کہ اسے صغائر پر عذاب کیا جائے۔ اہلِ سنت و جماعت کا قطعی طور پر کسی شک وشبہہ کے بغیر یہی قول ہے۔

امام کرمانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب کوئی شخص صحیح توبہ کر لے تو اب وہ توبہ مقبول اور غیر مردود ہو گی، کیونکہ نص قرآنی کا حکم یہی ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ﴾ [الشوری: ۲۵]

[اور وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے]

یہ کہنا درست نہیں ہے کہ توبہ صحیح کا قبول کرنا اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہے۔ یہ نری جہالت ہے اور اس کے قائل پر کفر ثابت ہونے کا خدشہ ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے بلاشک وشبہہ قطعی طور پر توبہ قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اور وہ وعدے کا سچا ہے، اس کے وعدے کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ جو تائب شخص صحیح توبہ کے قبول ہونے میں شک کرتا ہے، وہ اس اعتقاد کے سبب سے سخت گناہ گار ہے، بلکہ اس کا یہ گناہ پہلے گناہ سے بڑا ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب توبہ کی شرائط جمع ہو جاتی ہیں تو وہ ضرور ہی قبول ہوتی ہے۔[1]

''مالا بد منہ'' میں کہا ہے کہ جس نے اخلاص کے ساتھ توبہ کی تو حسبِ وعدۂ الٰہی اس کا گناہ معاف ہو جاتا ہے۔[2] انتہیٰ.

جو شخص یہ بات چاہے کہ وہ تمام طوائفِ اسلام کے نزدیک مسلمان ٹھہرے تو اس پر لازم ہے کہ وہ چھوٹے بڑے تمام گناہوں سے تائب ہو، خواہ گناہ اعمالِ ظاہرہ کے متعلق ہوں یا اخلاق باطنہ کے۔ پھر وہ سارے اقوال و افعال و احوال میں ارتداد میں واقع ہونے سے اپنے نفس کی حفاظت کرے، کیونکہ ارتداد اعمال کو برباد کرنے والا، لوگوں کے برے خاتمے کا سبب بننے والا اور حال و مآل کے اعتبار سے خسران ونقصان کا باعث ہوتا ہے۔ اگر اللہ نے ارتداد اس کے مقدر میں کیا ہے اور اس سے ارتداد کا ارتکاب ہو گیا ہے تو وہ فی الفور اس سے تائب ہو اور دوبارہ اس کا ارتکاب نہ کرنے کا

[1] إحیاء علوم الدین (۱۳/٤)

[1] ما لا بد منه للقاضي ثناء الله (ص: ۱۱)

عزم بالجزم کرے، تا کہ اس کی کھوئی ہوئی سعادت واپس لوٹ سکے۔

فرقہ ناجیہ:

اہلِ علم کا اختلاف ہے کہ فرقۂ ناجیہ کون سا فرقہ ہے؟ درآں حالیکہ ہر فرقہ اپنے آپ کو ناجی خیال کرتا ہے۔ اس مسئلے میں "إذا جاء نهر الله بطل نهر معقل"[1] کے مصداق تفسیر نبوی سب اقوال پر مقدم ہے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے خود اس فرقے کو معین فرما دیا ہے۔ اب کسی کے بیان کی حاجت وضرورت نہیں ہے۔ وہ تفسیرِ نبوت یہ ہے کہ فرقہ ناجیہ وہ ہے:

«مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي» (رواه أهل السنن)[2]

[جو اس طریقے پر گامزن ہے جو میرا اور میرے اصحاب کا طریقہ ہے]

چنانچہ سنتِ مطہرہ کی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال، افعال، احوال اور ان کی سیر جمع ہیں، یہاں تک کہ کھانے پینے، سونے، جاگنے اور اٹھنے بیٹھنے کی کیفیت بھی بیان ہوئی ہے تو عبادات و معاملات کا بیان کیسے چھوٹ سکتا ہے؟

کتبِ احادیث میں ان چیزوں کا بیان اس طرح سے ہوا ہے، گویا ہم ان کے ان اعمال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جس کو سمجھ عطا کی ہو، اس پر اپنے نفس کا حال مخفی نہیں ہے۔ وہ تھوڑی سی توجہ کے ساتھ یہ معلوم کر سکتا ہے کہ وہ سنن و آثار کا متبع ہے یا نہیں؟ اگر وہ ان کا متبع ہے تو یقیناً وہ فرقہ ناجیہ کا ایک فرد ہے اور اگر وہ ایسا نہیں تو یقیناً وہ فرقہ ناجیہ میں داخل بھی نہیں۔

پھر اسی طرح دوسرے فرقوں کا حال بھی اس پر پوشیدہ نہیں رہ سکتا ہے کہ وہ مبتدع ہیں یا متبع؟ جو شخص اتباع کا دعوے دار ہے اور اپنے آپ کو سنتوں کی اقتدا کرنے والا کہتا ہے تو اس کے افعال و اقوال ہی اس کی تصدیق یا تکذیب کر سکتے ہیں۔ یہ بات جاننا کچھ مشکل نہیں ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا جو حال تھا وہ ہر انسان پر ظاہر ہے۔ متبع کا مبتدع کے ساتھ التباس نہیں ہو سکتا ہے۔ نیز حدیث: «طُوبَى لِلْغُرَبَاءِ»[3] [غربا کے لیے خیر و بھلائی ہے] اور حدیث:

---

[1] جب اللہ تعالیٰ کی نہر (بارش) چلتی ہے تو معقل کی نہر بے کار ہو جاتی ہے۔

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٥)

«يَفِرُّوْنَ بِدِيْنِهِمْ مِنَ الْفِتَنِ»[1] [وہ اپنے دین کو بچا کر فتنوں سے بھاگتے ہیں] اور حدیث:

«لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰى يَأْتِيَ أَمْرُ اللّٰهِ»[2]

[میری امت کی ایک جماعت قیامت تک ہمیشہ حق پر قائم رہے گی، ان کی مخالفت کرنے والا ان کا کچھ نقصان نہیں کر سکے گا]

مذکورہ دعوے کی شاہد ہیں۔

فرقہ ناجیہ سے کوئی خاص فرقہ جیسے اشعریہ یا ماتریدیہ یا معتزلہ یا مقلدہ مراد نہیں ہے، بلکہ «هُمُ النُّزَّاعُ مِنَ الْقَبَائِلِ»[3] [وہ مختلف قبائل اور فرقوں سے نکلے لوگ ہوں گے] جیسے کہ حدیث میں اس کا بیان ہے۔ یہ وہ فرقہ ہے جو اپنے قول و فعل میں متبع رسول ﷺ ہو، وہ کوئی ہو اور کہیں ہو۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے "حجة الله البالغه" میں کہا ہے:

"فرقہ ناجیہ وہ ہے جو عقیدے و عمل میں کتاب و سنت کے ظاہر اور جمہور صحابہ و تابعین رحمہم اللہ کے طریقے کے موافق ہو، اگرچہ اس کے درمیان کسی امرِ غیر منصوص میں کچھ اختلاف ہو، اور غیر ناجیہ ہر وہ فرقہ ہے جس نے عقیدہ سلف کے خلاف کوئی عقیدہ یا ان کے اعمال کے خلاف کوئی عمل اختیار کیا ہو۔ واللہ أعلم[4] انتهى.

اب میں کہتا ہوں:

"هذه عقيدتي بل عقيدة جميع أهل السنة و الجماعة، أدين الله تعالىٰ بها، و أعتمد في الدين عليها ظاهرا إقرارا باللسان و باطنا تصديقا بالجنان، فإن كل ذلك مما وردت به الآيات والأخبار، و شهدت به النصوص والآثار، فمن اعتقد جميع ذلك كان من أهل الحق و عصابة السنة، و فارق أهل الضلالة و حزب البدعة"

---

(1) دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٠)

(3) مسند أحمد (١/ ٣٩٨)

(4) حجة الله البالغة (١/ ٣٥٩)

[یہ میرا بلکہ تمام اہلِ سنت و جماعت کا عقیدہ ہے اور میں اس کے ساتھ اللہ کی فرماں برداری اختیار کرتا ہوں اور دین میں ظاہراً زبان سے اقرار کر کے اور باطناً دیگر اعضا سے تصدیق کر کے، جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کے ثبوت پر آیات و احادیث وارد ہوئی ہیں اور نصوص و آثار اس کی گواہی دیتے ہیں، میں اسی پر اعتماد اور بھروسا کرتا ہوں۔ جس شخص نے مذکورہ چیزوں پر اعتقاد رکھا، وہ اہلِ حق اور اہلِ سنت میں شمار ہوا اور اس نے اہلِ بدعت اور گمراہوں سے اپنے آپ کو بچا لیا]

نسأل الله تعالىٰ كمال اليقين و حسن الثبات في الدين لنا ولجميع المسلمين والحمد لله أولاً و آخراً.

خاتمہ:

آج بروز منگل بہ تاریخ ۲۶ شعبان ۱۳۰۵ھ کو یہ رسالہ دو دن میں ختم ہوا۔

ختم الله لنا بالحسنىٰ و زيادة، و رزقنا في الدارين حسن السعادة.

الاحتواء

علی

مسألۃ الاستواء

تالیف

امام العصر علامہ نواب محمد صدیق حسن خان حسینی بھوپالی رحمہ اللہ

(۱۲۴۸ھ-۱۳۰۷ھ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

الحمد لله على ما أرشد وهدى، وأظهر من أسمائه الحسنى وصفاته العليا، والصلاة والسلام على المصطفى، محمد خاتم الأنبياء، وعلى آله وأصحابه ما طلع نجم و بدى. أما بعد:

چاروں فقہی مذاہب ایک مذہب کیسے بن سکتے ہیں؟

یہ بات کسی پر مخفی اور پوشیدہ نہ رہے کہ فرقہ ناجیہ اہلِ سنت و جماعت فروع میں چار گروہ ہیں: حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی۔ ان کا آپس میں ایک دوسرے کی تکفیر اور تضلیل کیے بغیر تین سو اور کچھ مسائل سے زیادہ میں اختلاف نہیں ہے۔ ان مذاہب میں سے ہر مذہب میں جیسے اکثر مسائل حدیث کے موافق ہیں، اسی طرح بعض مسائل حدیث کے مخالف بھی ہیں، جو فقہی مسائل کو کتبِ احادیث پر پیش کرنے سے معلوم ہوتے ہیں۔ جب ان حدیث کے مخالف مسائل کو حدیث کے موافق کر لیا جائے تو چاروں مذہب ایک مذہب میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور کسی طرح کا اختلاف باقی نہیں رہتا ہے۔ وہ ایک مذہب جو باقی رہتا ہے وہ محدثین کا مذہب ہے اور اس فرقہ ناجیہ کا مصداقِ کامل ٹھہرتا ہے جس کا وصف ﴿مَا أَنَا عَلَيْهِ وَ أَصْحَابِي﴾[1] ہے۔

اصولِ عقائد میں تین گروہ:

فقہی مذاہب کے فروع میں چار گروہوں کی طرح اصولِ عقائد میں تین گروہ ہیں:

① حنابلہ۔

② ماتریدیہ۔

③ اشعریہ۔

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١)

① حنابلہ:

اس گروہ کے لوگ امام اجل احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہیں اور جمہور ظاہریہ اور اہلِ حدیث انھیں کے عقائد کے موافق ہیں۔

② ماتریدیہ:

اس گروہ کے لوگ امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کی طرف نسبت رکھتے ہیں جو تین واسطوں سے امام اعظم ابو حنیفہ کوفی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں۔ ماترید سمرقند کا ایک گاؤں ہے۔ ماوراء النہر وغیرہ علاقوں میں انھیں کے عقائد مشہور ہیں اور جمہور حنفیہ عقائد میں انھی کے پیروکار ہیں اور ماتریدیہ کہلاتے ہیں۔

③ اشعریہ:

اس گروہ کے لوگ امام ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہیں جو دس واسطوں سے ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند ہیں۔ خراسان اور عراق وغیرہ میں انھیں کے عقائد کا رواج ہے اور مالکیہ، شافعیہ اور حنبلیہ انھی کے پیروکار ہیں۔ ماتریدیہ اور اشعریہ میں کل بارہ مسائل میں اختلاف ہے اور باقی مسائل میں اتفاق ہے۔ اسی طرح حنابلہ اور اشعریہ میں صرف دو چار متفرعات میں اختلاف ہے۔ محققین کے نزدیک یہ سب اختلاف لفظی اور نزاع حرفی ہیں، اس لیے یہ گروہ ایک دوسرے کی تکفیر و تضلیل نہیں کرتے۔

سنی وہ ہوتا ہے جو ان عقائد کے موافق ہے، ان کے دائرے سے باہر نہیں ہے اور ان میں سے بھی بہتر وہ شخص ہے جو محدثین کے طریقے کے مطابق ظاہر قرآن و حدیث کے موافق اعتقاد رکھتا ہے، خواہ وہ طریقہ ماتریدیہ کے موافق ہو یا اشعریہ یا حنابلہ کے، پھر وہ شخص ان متکلمین اور مجادلین کے طریقے کے موافق اعتقاد نہیں رکھتا جو دلائل عقلیہ اور براہین فلسفیہ کے خوگر ہیں۔

سببِ تالیف:

ہندوستان میں حنفی مذہب کے رواج کی وجہ سے یہاں عقائد ماتریدیہ رائج ہیں، اس لیے بعض متبعینِ سنت نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اردو زبان میں ایک مختصر رسالہ لکھا جائے جو اہلِ حدیث کے طریقے کے موافق ہو اور اس سے اہلِ سنت و جماعت رحمہم اللہ کے عقائد سے متعلق ضروری باتیں بہ خوبی

دریافت ہوسکیں اور اہلِ اتباع ان کی اقتدا کریں۔ ان کی حسبِ فرمائش میں نے یہ رسالہ لکھا ہے۔ چونکہ اس شہر میں مسئلہ فوق واستوا کی تحقیق اہلِ حدیث کے مختار مذہب کے موافق درپیش تھی، اس لیے پہلے اسی مسئلے کے چند دلائل چند فصلوں میں لکھے۔ اس کے بعد آخری فصل میں اہل حدیث کے بقیہ عقائد کو دلائل ذکر کیے بغیر تحریر کیا۔ جو شخص ان عقائد کے دلائل بھی معلوم کرنا چاہتا ہو وہ عربی زبان میں لکھے گئے ہمارے رسالے "الانتقاد في شرح الاعتقاد"[1] کا، جو اسی سال ۱۲۸۳ ہجری میں لکھا گیا ہے، مطالعہ کرے، ان شاء اللہ اسے دل جمعی اور اطمینان حاصل ہو جائے گا۔

زیرِ تحریر رسالے کو میں نے ''ترجمہ ثلاثیات بخاری'' اور ''چہل حدیث ثنائی'' کے بعد لکھا اور اس کا نام "الاحتواء علی مسئلة الاستواء" رکھا ہے، وباللہ التوفیق.

اس رسالے کی تحریر کے بعد ۱۳۰۲ ہجری میں مَیں نے ایک رسالہ "فتح الباب بعقائد أولي الألباب" کے نام سے تحریر کیا ہے جس میں عقائد کو دلیل وتفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، اس کا مطالعہ کرنے سے اہلِ سنت کے جملہ عقائد پر اطلاع حاصل ہوتی ہے۔ اس رسالے پر بعض اہلِ علم کی فرمائش پر سرسری طور پر نظرِ ثانی بھی کی گئی ہے۔ واللہ المستعان.

[1] اس سے مراد مولف رحمہ اللہ کا رسالہ "الانتقاد الرجیح في شرح الاعتقاد الصحیح" ہے، جو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے رسالے "الاعتقاد الصحیح" کی شرح پر مشتمل ہے۔

پہلی فصل:

اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کے قرآنی دلائل

پہلی آیت:

﴿ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴾ [الأعراف: ٥٤]

[بے شک تمھارا رب اللہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھے دن میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا]

دوسری آیت:

﴿ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴾ [یونس: ٣]

[بے شک تمھارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھے دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا]

موضح القرآن میں ہے کہ اس ملک کا دربار عرش پر ٹھہرا اور تمام کاموں کی تدبیر وہیں سے ہوتی ہے۔ انتھیٰ.

تیسری آیت:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴾ [الرعد: ٢]

[اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ستونوں کے، جنھیں تم دیکھتے ہو، پھر وہ عرش پر بلند ہوا]

چوتھی آیت:

﴿ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْأَرْضَ وَ السَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [طٰہٰ: ٤۔٥]

[اس کی طرف سے اتارا ہوا ہے جس نے زمین کو اور اونچے آسمانوں کو پیدا کیا۔ وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا]

اس آیت سے جس طرح استوا ثابت ہوا، اسی طرح جہتِ فوق بھی ثابت ہوئی، کیونکہ اوپر سے نیچے کی طرف اتارنا فوق سے تحت کی جانب ہوتا ہے۔

پانچویں آیت:

﴿ اَلَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ [الفرقان: ٥٩]

[وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، چھے دنوں میں پیدا کیا، پھر عرش پر بلند ہوا]

چھٹی آیت:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ [السجدة: ٤]

[اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی ہر چیز کو چھے دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا]

ساتویں آیت:

﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾

[الحديد: ٤]

[وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھے دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا، وہ جانتا ہے جو چیز زمین میں داخل ہوتی ہے اور جو اس سے نکلتی ہے اور جو آسمان سے اترتی ہے اور جو اس میں چڑھتی ہے اور وہ تمھارے ساتھ ہے، جہاں بھی تم ہو اور اللہ اسے جو تم کرتے ہو، خوب دیکھنے والا ہے]

مندرجہ بالا آیات محکم ہیں:

مندرجہ بالا سات آیات سے اللہ تعالیٰ کا عرش پر استوا پوری صراحت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے۔ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے دو جگہ پر ان آیات کا ترجمہ یوں کیا ہے: ''پھر بیٹھا عرش پر'' اور چار جگہ یوں کیا ہے: ''پھر قائم ہوا تخت پر''۔ مولوی رفیع الدین دہلوی رحمہ اللہ نے یوں ترجمہ کیا ہے: ''پھر قرار پکڑا اوپر عرش کے'' ان کے والد محترم شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے یوں ترجمہ کیا ہے: ''باز مستقر شد بر عرش'' [پھر قرار پکڑا عرش پر] صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی ترجمہ منقول ہے۔ یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ یہ آیات لفظاً محکم اور کیفیتاً متشابہ ہیں۔ لغتاً ان کا ترجمہ کرنا درست ہے۔ ان پر ایمان لانا واجب ہے اور ان کی کیفیت سے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔ ''مالا بد منہ'' میں فرمایا ہے:

''نصوص کا انکار کرنا کفر اور ان کی تاویل کرنا جہل مرکب ہے۔''[1] انتہیٰ.

اللہ تعالیٰ کی بندوں کے ساتھ علمی معیت کا ثبوت:

جس طرح مذکورہ آیات سے اللہ تعالیٰ کا وصفِ استوا ثابت ہوتا ہے، اسی طرح یہ بات ثابت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کی بندوں کے ساتھ معیت علمی ہے، ذاتی نہیں ہے، کیونکہ پہلے تو عمومی علم کا ذکر کیا، پھر معیت کا اور پھر بصارت کا۔ جس آیت میں علم کی معیت کے ساتھ قید ذکر نہیں ہوئی ہے، وہ اصولِ فقہ کے قاعدے کے مطابق مقید آیت پر محمول ہے۔ اسی ثبوت کے پیش نظر روے زمین کے تمام مفسرین، کیا حنفی کیا مالکی کیا شافعی کیا حنبلی، نے معیت کو علمی قرار دیا ہے اور ایسا کہنا ان کے نزدیک اس آیت کی تفسیر ہے، تاویل نہیں ہے۔ اسی طرح آیاتِ احاطہ وقرب وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے۔

[1] ما لا بد منہ للقاضي ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ (ص: ٦، ٧) طبع مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاهور

ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا علم اور قدرت و سلطان ہر مکان میں ہے اور وہ بذاتہ عرش کے اوپر مستوی ہے، جیسے اس نے قرآن مجید میں اس کی صراحت کی ہے۔ ساری اولادِ آدم اسی بات پر متفق ہے کہ اللہ تعالیٰ تحتِ عالم نہیں ہے اور سوائے عرش کے کسی چیز پر مستوی نہیں ہے۔

پھر جس کسی محقق نے قرب و معیت وغیرہ کی تاویل و تفسیر نہیں کی اور نہ اسے علم و عون پر محمول کیا تو یہ طریقہ بھی بہت اچھا ہے، کیونکہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی ہر صفت پر ایمان لانا واجب ہے۔ استوا کا اقرار کر لینے کے بعد متشابہ صفت کی تاویل کرنا ہم پر واجب نہیں ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کو اپنے ہمراہ اور اپنے قریب تو جانتے ہیں، لیکن اس معیت اور قرب کی کیفیت کو نہیں جانتے۔ ہاں ہم یہ مانتے ہیں کہ وہ اپنی ذات پاک کے اعتبار سے بالائے عرش، مخلوق سے جدا اور جہان سے الگ ہے، واللہ أعلم.

دوسری فصل

ان حدیثوں کا بیان جن سے اللہ کا عرش پر استوا ثابت ہوتا ہے

پہلی حدیث:

«لَمَّا قَضَی اللّٰهُ الْخَلْقَ فَهُوَ عِنْدَهُ فَوْقَ الْعَرْشِ إِنَّ رَحْمَتِي غَلَبَتْ غَضَبِي»[1]

(رواہ البخاري و مسلم)

[جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو بنایا تو اس نے اپنے پاس عرش کے اوپر موجود اپنی کتاب میں یہ لکھ دیا کہ یقیناً میری رحمت میرے غضب پر غلبہ پا گئی]

دوسری حدیث:

«زَوَّجَنِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی مِنْ فَوْقِ سَبْعِ سَمٰوَاتٍ»[2] (رواہ البخاري)

[(زینب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں) میرا نکاح اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کے اوپر سے کیا]

تیسری حدیث:

«أَدْخُلُ عَلٰی رَبِّيْ وَ هُوَ عَلٰی عَرْشِهٖ» (رواہ البخاري)

[میں اپنے رب کے پاس گیا، جبکہ وہ اپنے عرش پر تھا]

چوتھی حدیث:

«فَأَسْتَأْذِنُ عَلٰی رَبِّيْ فِيْ دَارِهٖ»[3] (رواہ البخاري)

[پھر میں اپنے رب سے اُس کے گھر میں اجازت مانگوں گا]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٨٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٠٢)

اس حدیث میں حدیث سابق کے قرینے سے گھر سے مراد عرش ہے۔ ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ یہاں اور وہاں دونوں جگہ استوا ثابت ہے۔

پانچویں حدیث:

جمعہ کے دن کی فضیلت سے متعلق مروی ہے:

«هُوَ الْيَوْمُ الَّذِي اسْتَوىٰ فِيهِ رَبُّكَ تَبَارَكَ وَ تَعَالىٰ عَلَى الْعَرْشِ»

(رواه الشافعي في مسنده)[1]

[یہ (جمعہ) وہی دن ہے جس دن تیرا برکت والا رب عرش پر بلند ہوا]

اس حدیث میں استوا کی کمال صراحت ہے، بلکہ اس میں استوا کے دن کی قید بھی مذکور ہے۔

چھٹی حدیث:

« وَيُحَكَ أَتَدْرِي مَا اللّٰهُ؟ إِنَّ عَرْشَهُ عَلىٰ سَمَاوَاتِهِ لَهٰكَذَا، وَقَالَ بِأَصَابِعِهِ مِثْلَ الْقُبَّةِ عَلَيْهِ، وَإِنَّهُ لَيَئِطُّ بِهِ أَطِيطَ الرَّحْلِ بِالرَّاكِبِ» (رواه أبو داوٗد)[2]

[تجھ پر افسوس ہے! کیا تو جانتا ہے کہ اللہ کی کیا شان ہے؟ بلاشبہہ اس کا عرش اس کے آسمانوں پر اس طرح ہے، پھر آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں سے قبے کی سی شکل بنائی اور فرمایا: بے شک عرشِ الٰہی چرچرا رہا ہے جیسے پالان اپنے سوار سے چرچراتا ہے]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عرشِ الٰہی تمام آسمانوں کو محیط ہے اور اللہ تعالیٰ عرش پر ہے۔ یہ حدیث گویا آیتِ استوا کی تفسیر ہے۔

ساتویں حدیث:

جس میں ان بکریوں کا ذکر ہے جس پر عرش پر رکھا گیا ہے، اس حدیث میں آسمانوں کی گنتی اور مسافت بیان کرنے کے بعد یوں فرمایا:

«ثُمَّ اللّٰهُ فَوْقَ ذٰلِكَ» (رواه الترمذي و أبو داوٗد)[3]

[پھر اللہ اس سے اوپر ہے]

---

① مسند الشافعي (١/ ٧٠) اس کی سند میں ''ابراہیم بن محمد'' راوی سخت ضعیف ہے۔

② سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٧٢٦) اس کی سند میں ''جبیر بن محمد'' مستور اور ضعیف ہے۔

③ سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٧٢٣) سنن الترمذي (٣٣٢٠) اس کی سند میں ''عبداللہ بن عمیرہ'' ضعیف ہے اور سلسلہ سند میں انقطاع ہے۔ نیز اس کی سند میں ''سماک بن حرب'' بھی مختلط ہے، لہٰذا یہ حدیث ضعیف ہے۔

اس حدیث میں بھی جہتِ فوق اور استوا کی کمال صراحت ہے، جسے ہر جاہل، عالم، دیہاتی، شہری، لڑکا، بوڑھا، موافق اور مخالف بے تکلف سمجھتا ہے۔ رہے تاویل کرنے والے، جو بہ ظاہر تنزیہ کے دعوے دار اور حقیقت میں معطلہ ہیں، اگر اسے نہ سمجھیں تو کچھ بعید نہیں ہے۔

عاشق نشدی لذت حرماں نچشیدی

کس پیش تو غم نامۂ ہجراں چہ کشاید

[تو عاشق نہ ہوا اور محرومی کا مزا نہ چکھا، تیرے سامنے کوئی جدائی کی داستانِ غم کیا بیان کرے؟]

تیسری فصل

اللہ تعالیٰ کے عرش پر استوا سے متعلق اہلِ علم کے اقوال

اگر چہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے بیان کے بعد ان اقوال کے بیان کی ضرورت تو نہیں ہے، لیکن اہلِ تقلید کی تسلیِ خاطر کے لیے اس سلسلے میں بعض معتبر روایات لکھی جاتی ہیں۔

پہلا قول:

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اپنی وصیت میں فرمایا ہے:

''ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے بغیر اس کے کہ اس کو حاجت اور قرار ہو۔''[1] اس قول سے حنفیہ پر حجت تمام ہے۔

دوسرا قول:

امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ استوا معلوم ہے، اس کی کیفیت نامعلوم ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کی کیفیت کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔[2] اس قول سے مالکیہ پر حجت تمام ہے۔

تیسرا قول:

امام طبری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ استوا کے قائل ہیں۔[3] اس قول سے شافعیہ پر حجت تمام ہے۔

چوتھا قول:

امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرمان کے مطابق عرش پر

---

[1] الوصية لأبي حنيفة ضمن مجموعة الرسائل العشرة لأبي حنيفة (ص: ٧) كتاب العلو للذهبي (١٣٦/١) نیز دیکھیں: شرح الفقه الأكبر (ص: ٦١)

[2] كتاب العلو (١٣٩/١)

[3] كتاب العلو (١٦٥/١)

مستوی ہے۔[1] اس قول سے حنابلہ پر حجت تمام ہے۔

نیز استقرا سے بھی معلوم ہے کہ اصحابِ مذاہب اربعہ میں بالاتفاق سب کا یہی مذہب ہے، وللہ الحمد. کسی سے بھی صفتِ استوا کا انکار ہرگز منقول نہیں۔ اس کی کیفیت سب کے نزدیک مجہول ہے اور اس سے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔

پانچواں قول:

امام ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ نے کتاب "اختلاف المصلین" میں لکھا ہے:

اگر کوئی پوچھے کہ تم استوا سے متعلق کیا کہتے ہو تو ہم یہ کہیں گے کہ بے شک اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے، جیسے اس کا فرمان ہے کہ رحمٰن نے تخت پر قرار پکڑا۔[2] انتھی.

چھٹا قول:

امام علی بن مہدی طبری رحمہ اللہ نے کتاب "مشکل الآیات"[3] میں فرمایا ہے:

"جان لو! اللہ تعالیٰ آسمان پر ہے اور وہ ہر چیز پر قائم اور اپنے تخت پر ہے۔ استوا کے معنی "اعتلا" ہیں، جس طرح عرب نے کہا ہے کہ میں جانور کی پشت پر مستوی ہوا یا مکان کی چھت پر یا آفتاب میرے سر پر مستوی ہوا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے عرش پر عالی ہے اور اپنی مخلوقات سے جدا ہے۔ مندرجہ ذیل آیات اس پر دلیل ہیں: ﴿ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ﴾ [الملك: ١٦] [کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے] ﴿وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ﴾ [آل عمران: ٥٥] [اور تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں] اور ﴿ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ﴾ [السجدة: ٥] [پھر وہ (معاملہ) اس کی طرف اوپر جاتا ہے]۔" انتھی.

اس قول سے جس طرح استوا ثابت ہوا، اسی طرح جہتِ فوق بھی ثابت ہوتی ہے۔

ساتواں قول:

حافظ ابو بکر محمد بن حسین آجری رحمہ اللہ نے کتاب "الشریعة" کے "باب التحذیر من

---

[1] کتاب العلو (١/ ١٧٧)

[2] مقالات الإسلاميين واختلاف المصلين (١/ ٢١١، ٢٩٠)

[3] اس سے امام ابو الحسن علی بن محمد بن مہدی الطبری کی کتاب "تأويل الآيات المشكلة الموضحة بالحجج والبراهين" مراد ہے۔

مذاهب الحلولية" میں لکھا ہے: ''اہلِ علم اس طرف گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کے اوپر عرش پر ہے، اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے اور اعمال اسی کی طرف بلند ہوتے ہیں۔''[1]

اس قول سے بھی استوا اور جہتِ فوق دونوں ثابت ہوتے ہیں۔

آٹھواں قول:

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ حجاز ہو یا عراق، شام ہو یا یمن؛ تمام ملکوں کے علما کو ہم نے جس مذہب پر پایا، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے جدا، کیفیت معلوم ہوئے بغیر عرش کے اوپر ہے، جس طرح اس کا فرمان ہے: ''اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو علم کے ساتھ گھیرا ہوا ہے۔''[2]

نواں قول:

حافظ ابو القاسم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ اپنی مخلوق سے جدا اپنے عرش پر ہے، اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔[3] انتهیٰ.

دسواں قول:

امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: ''جو کوئی اس بات کا اقرار نہ کرے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے جدا ساتوں آسمانوں کے اوپر اپنے عرش پر ہے تو وہ کافر ہے، اس سے توبہ کروائیں، اگر وہ توبہ کر لے تو بہت اچھا، ورنہ اس کی گردن مار دیں۔''[4] انتهیٰ.

گیارھواں قول:

امام محمد بن موصلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خوب کھول کر بیان کیا ہے کہ وہ آسمانوں کے اوپر عرش پر مستوی ہے۔[5]

بارھواں قول:

امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ سنت کہتے ہیں کہ بلا کیف عرش پر قائم ہونا اللہ تعالیٰ کی

---

1. الشريعة للآجري (١/ ٢٧٤)
2. كتاب العلو للذهبي (١/ ١٨٨)
3. شرح أصول اعتقاد أهل السنة والجماعة للالكائي (١/ ٣٢١)
4. كتاب العلو للإمام الذهبي (١/ ٢٠٧)
5. مختصر الصواعق المرسلة لابن الموصلي (ص: ٤٧٧)

صفت ہے۔ آدمی پر اس کے ساتھ ایمان لانا اور اس کا حتمی علم اللہ کے سپرد کرنا واجب ہے۔[1]

تیرھواں قول:

''غنیۃ الطالبین'' میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے حدیں ثابت کرنا جائز نہیں ہے، مگر وہ جو ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ عرش پر مستوی ہے۔[2] یعنی یہ تحدید جائز ہے۔

چودھواں قول:

''کتاب البھجۃ'' میں ہے کہ ہمارا رب عرش پر مستوی ہے اور ملک پر محتوی ہے۔ اس کی دلیل قرآن مجید میں موجود سات آیات ہیں۔ اس مقدمے میں جاہل کی جہالت اور اس کی رعونت و سرکشی کے سبب میں ان کا ذکر نہیں کروں گا۔[3] انتھی.

یہ دونوں کتابیں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی تصانیف ہیں۔

پندرھواں قول:

امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کے ثبوت میں یہ آیتیں پڑھتا ہوں: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [طٰہٰ: ٥] [وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا] ﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ [الفاطر: ١٠] [اسی کی طرف ہر پاکیزہ بات چڑھتی ہے] اور اس کی کیفیت کی نفی میں یہ آیتیں تلاوت کرتا ہوں: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ [الشوریٰ: ١١] [اس کی مثل کوئی چیز نہیں] اور ﴿وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ﴾ [طٰہٰ: ١١٠] [اور وہ اس کا احاطہ نہیں کر سکتے] اور جو شخص ان آیتوں کو میرے سمجھنے کی طرح سمجھے گا تو وہ میرے پہچاننے کی طرح پہچان لے گا۔[4]

اس قول میں صفتِ استوا اور جہتِ فوق دونوں کا اثبات ہے۔

سولھواں قول:

امام غزالی رحمہ اللہ نے ''احیاء العلوم''، ''کیمیاے سعادت'' اور ''اربعین فی اصول الدین''

---

[1] العلو للإمام الذهبي (١/ ٢٦١)

[2] الغنية لطالبي طريق الحق للجيلاني (١/ ١١٨)

[3] العلو للذهبي (١/ ٢٦٥)

[4] دیکھیں: كتاب العلو للإمام الذهبي (١/ ١٨٧۔١٨٩)

میں لکھا ہے کہ اللہ عرش پر مستوی ہے اور وہ عرش کے اوپر بلکہ ہر چیز کے اوپر ہے، جس طرح اس نے بیان کیا ہے۔①

سترھواں قول:

امام محمد بن محسن عطاس رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "تنزیه الذات و الصفات" میں کہا ہے کہ مسلمانوں پر اس آیت کے ساتھ ایمان لانا واجب ہے: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [طٰه: ٥] [وہ (ہے اللہ) رحمٰن جو عرش (بریں) پر متمکن ہے]②

اٹھارواں قول:

امام شوکانی رحمہ اللہ نے تفسیر "فتح القدیر" میں لکھا ہے کہ اس مسئلے میں چودہ قول ہیں، ان میں سے سلف کا مذہب حق اور درست ہے کہ اللہ تعالیٰ بلا کیف جس طرح اس کے لائق ہے، عرش پر مستوی ہے۔③

انیسواں قول:

امام شوکانی رحمہ اللہ نے "رسالہ صفات" میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کی قرآن مجید کی کئی جگہوں میں صراحت ہوئی ہے۔④

بیسواں قول:

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ محدث دہلوی نے رسالہ "حسن العقیدہ" میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہے جس طرح اس نے اپنی ذات کو اس کے ساتھ متصف کیا ہے، لیکن تحیز و جہت کے معنی میں نہیں، بلکہ اس تفوق اور استوا کی کنہ کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا یا وہ پختہ علم والے لوگ جانتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی جناب سے علم عطا کیا ہے۔⑤ انتہیٰ.

---

① إحيا علوم الدين للغزالي (١/ ٩٠)

② تنزيه الذات والصفات من درن الإلحاد والشبهات للعطاس (ص: ٥٧) امام محمد بن محسن عطاس رحمہ اللہ نے یہ قول امام ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ کی کتاب "الإبانة" (ص: ١٠٥) سے نقل کیا ہے۔

③ فتح القدير (٣/ ٨٨)

④ التحف في مذاهب السلف (ص: ١٧)

⑤ دیکھیں: الانتقاد الرجيح في شرح الاعتقاد الصحيح للمؤلف رحمہ اللہ (ص: ٦٠)

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے اثباتِ جہت میں مفصل قول کا بیان آگے آئے گا، یہاں صرف استوا و فوق کا ثابت کرنا مقصود ہے۔

اکیسواں قول:

سید محمد یوسف بلگرامی رحمہ اللہ نے "الفرع النابت من الأصل الثابت" میں لکھا ہے:

''حق تعالیٰ بذات خود فوق عرش است، چنانچہ مذہب جمہور محدثین ہمیں ست'' انتھیٰ.

[اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ عرش پر ہے، یہی جمہور محدثین کا مذہب ہے]

مذکورہ بالا اقوال کی عربی عبارتیں رسالہ ''انتقاد فی شرح الاعتقاد'' میں موجود ہیں۔ اس باب میں بہت سے اقوال ہیں، مگر جمہور صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین، مذاہب اربعہ کے جمیع مقلدین اور سارے محدثین و مفسرین کا یہی مذہب ہے۔ کیا مجال ہے کہ کوئی ان سے اس کے خلاف ایک حرف بھی نقل کر سکے۔ ہاں کچھ دیگر فرقے جہمیہ اور معتزلہ اس صفت کے منکر ہیں، لہٰذا وہ اہلِ سنت و جماعت میں داخل نہیں ہیں۔ وباللہ التوفیق.

چوتھی فصل

ان آیتوں کا بیان جن سے جہتِ فوق اور اللہ تعالیٰ کا مخلوق پر علو ثابت ہوتا ہے

پہلی آیت:

﴿قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ﴾ [البقرة: ١٤٤]

[یقیناً ہم تیرے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف پھرنا دیکھ رہے ہیں]

"جلالین" وغیرہ میں ﴿فِي السَّمَآءِ﴾ کی تفسیر یوں کی گئی ہے: "في جهة السماء". "فتح الرحمٰن" میں ہے کہ "درجانب آسمان" [آسمان کی طرف میں]۔ "موضح القرآن" میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں آسمان کی طرف نگاہ کرتے کہ شاید فرشتہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم لاتا ہو۔ انتھیٰ. طرف، جانب اور جہت کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں۔

دوسری آیت:

﴿إِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسٰى إِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ إِلَيَّ﴾ [آل عمران: ٥٥]

[جب اللہ نے فرمایا اے عیسیٰ! بے شک میں تجھے قبض کرنے والا ہوں اور تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں]

"فتح الرحمٰن" میں ہے: "بر دارندۂ توام بسوئے خود" [تمھیں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں] اس تفسیر میں آنے والے لفظ "سوئے" اور لفظ جہت کے ایک معنی ہیں، فرق صرف عربی اور فارسی کا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ معراج کی رات رسول اللہ ﷺ نے عیسیٰ علیہ السلام کو دوسرے آسمان پر پایا۔[1] یہ حدیث اس آیت کی تصدیق کرتی ہے جس سے جہتِ فوق ثابت ہوتی ہے، کیونکہ باتفاق

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٧٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٣)

عقل ونقل وحس آسمان زمین کے اوپر ہے، نیچے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا﴾ [النبأ: ١٢]

[اور ہم نے تمھارے اوپر سات مضبوط (آسمان) بنائے]

تیسری آیت:

﴿بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ﴾ [النسآء: ١٥٨] [بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا]

تفسیر "فتح الرحمٰن" میں ہے کہ "بلکہ برداشت او را خدا بسوئے خوذ" [بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا] انتھی. حدیث مذکور سے ثابت ہوا کہ یہ اٹھانا فوق کی طرف تھا، جو تحت کے مقابلے میں ہے نہ کہ کسی اور طرف۔ "رفع" لغتِ عرب میں "خفض" کے بالمقابل اوپر کی طرف اٹھانے کو کہتے ہیں۔

چوتھی آیت:

﴿وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَ يُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً﴾ [الأنعام: ٦١]

[اور وہی اپنے بندوں پر غالب ہے اور وہ تم پر نگہبان بھیجتا ہے]

تفسیر "فتح الرحمٰن" میں اس آیت کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے: "اوست غالب بالائے بندگان میفرستد برشما ملائکہ نگاہبان" [وہ اپنے بندوں پر غالب ہے تم پر نگران فرشتے بھیجتا ہے] انتھی. اس آیت میں "فوق" جہت کے معنی میں ہے نہ کہ "علی" کے معنی میں، اس لیے کہ اگر یہ "علی" کے معنی میں ہوتا تو اس کا ترجمہ "بر" ہوتا نہ کہ "بالا"۔ دوسرے یہ کہ فرشتوں کا بھیجنا بھی اسی مدعا پر دلالت کرتا ہے۔ یہ آیت اس سورت میں دو بار آئی ہے۔

پانچویں آیت:

﴿ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَيْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآئِلِهِمْ﴾ [الأعراف: ١٧]

[پھر میں ہر صورت ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کی دائیں طرفوں سے اور ان کی بائیں طرفوں سے آؤں گا]

یعنی جہتِ فوق کے سوا میں ہر جہت سے ان کے پاس آؤں گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: شیطان نے بندوں کو بہکانے کے لیے چار جہتوں کو ذکر کیا، یہ نہیں کہا کہ میں ان کے اوپر

سے آؤں گا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اوپر ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: شیطان ہر طرف سے تمھارے پاس آتا ہے، مگر اوپر کی طرف سے نہیں آتا، اس کو یہ قدرت حاصل نہیں ہے کہ تمھارے اور اللہ کی رحمت کے درمیان حائل ہو سکے۔[1] انتھیٰ.

چھٹی آیت:

﴿ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ﴾ [النحل: ٥٠]

[وہ اپنے رب سے، جو ان کے اوپر ہے، ڈرتے ہیں]

تفسیر ''موضح القرآن'' میں ہے کہ ہر بندے کے دل میں ہے کہ میرے اوپر اللہ ہے اور یہ کہ بندہ اپنے آپ کو نیچے سمجھتا ہے۔ انتھیٰ.

ساتویں آیت:

﴿ وَ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴾ [مریم: ٥٧] [اور ہم نے اسے بہت اونچے مقام پر بلند کیا]

تفسیر ''فتح الرحمن'' میں ہے: ''یعنی بر آسمان'' [یعنی آسمان پر] انتھی. تفسیر ''موضح القرآن'' میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کی رات آسمان پر ملے تھے۔ انتھیٰ. تفسیر ''جلالین'' میں ہے کہ وہ چوتھے یا چھٹے یا ساتویں آسمان پر یا جنت میں زندہ ہیں۔ انتھیٰ. جنت بھی سدرۃ المنتھیٰ کے قریب آسمان پر ہے۔

آٹھویں آیت:

﴿ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴾ [السجدة: ٥]

[وہ آسمان سے زمین تک (ہر) معاملے کی تدبیر کرتا ہے، پھر وہ (معاملہ) اس کی طرف ایسے دن میں اوپر جاتا ہے جس کی مقدار ہزار سال ہے، اس (حساب) سے جو تم شمار کرتے ہو]

تفسیر ''موضح القرآن'' میں ہے کہ عرش سے بڑے بڑے کام مقرر ہو کر ان کا حکم نیچے اترتا ہے، اس کے سب اسباب آسمان سے جمع ہو کر بن جاتے ہیں، پھر ایک مدت تک وہ حکم جاری رہتا

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/٢٧٣)

ہے، پھر وہ اللہ کی طرف اٹھ جاتا ہے۔ پھر دوسرا رنگ اترتا ہے۔ انتھی.

نویں آیت:

﴿ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا الْحَقَّ وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ﴾ [سبا: ۲۳]

[یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور کی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں تمھارے رب نے کیا فرمایا؟ وہ کہتے ہیں حق (فرمایا) اور وہی سب سے بلند، بہت بڑا ہے]

تفسیر ''موضح القرآن'' میں ہے کہ جب اوپر سے اللہ کا حکم اترتا ہے تو یوں آواز آتی ہے جیسے پتھر پر زنجیر لگنے کی آواز تو فرشتے مارے ڈر کے تھرتھرانے لگتے ہیں، انتھی. اصل میں یہ ایک حدیث کا مضمون ہے۔[1]

دسویں آیت:

﴿ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ﴾ [الفاطر: ۱۰]

[اسی کی طرف ہر پاکیزہ بات چڑھتی ہے اور نیک عمل اسے بلند کرتا ہے]

تفسیر ''فتح الرحمٰن'' میں ہے: ''بسوئے او بالا میرود سخن پاک وعمل صالح بلند میگرداندش خدا''

[پاک کلمہ اسی کی طرف بلند ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ عمل صالح کو بلند کرتا ہے] انتھی.

''صعود'' اور ''رفع'' اوپر کی طرف کو جسے جہت فوق اور علو کہتے ہیں، ہوتا ہے نہ کہ کسی اور طرف۔

گیارھویں آیت:

﴿ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا﴾ [الغافر: ۳۶۔۳۷]

[میرے لیے ایک بلند عمارت بنا، تاکہ میں راستوں پر پہنچ جاؤں۔ آسمانوں کے راستوں پر، پس موسیٰ کے معبود کی طرف جھانکوں اور بے شک میں اسے یقیناً جھوٹا گمان کرتا ہوں]

کتاب ''تنزیہ الذات والصفات''، ''فرع ثابت'' اور ''اعلام الموقعین'' میں لکھا ہے کہ فرعون نے یہ اس وقت کہا تھا جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ میرا رب آسمان پر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٤٢٤) نیز دیکھیں: تفسیر ابن جریر (۳۷۲/۱۰)

پہلے پیغمبر بھی یہی کہتے تھے کہ اللہ آسمان پر ہے نہ کہ زمین پر اور نہ زمین کے نیچے، اور پہلی شریعتوں میں یہی بات مقرر تھی، لہٰذا جو کوئی اللہ تعالیٰ کے اوپر ہونے کا عقیدہ نہیں رکھتا، وہ فرعون کا بھائی ہے۔[1]

بارھویں آیت:

﴿ ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ﴾ [الملك: ١٦]

[کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تمھیں زمین میں دھنسا دے؟]

تفسیر "فتح الرحمن" میں ہے: "آیا ایمن شدہ اید از کسی کہ در آسمان ست از آنکہ فرو برد شمارا بزمین" [کیا تم آسمان والے (اللہ) سے بے خوف ہو گئے ہو کہ وہ تمھیں زمین میں دھنسا دے] انتہیٰ.

یہ آیت سورت ملک میں ان الفاظ سے مکرر ہے:

﴿ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا﴾ [الملك: ١٧]

[یا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تم پر پتھراؤ والی آندھی بھیج دے؟]

لہٰذا کسی چیز کا اوپر کی طرف سے ڈالنا نیچے کی طرف کو ہوتا ہے۔

تیرھویں آیت:

﴿ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ﴾

[المعارج: ٤]

[فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں، (وہ عذاب) ایک ایسے دن میں (ہوگا) جس کا اندازہ پچاس ہزار سال ہے]

قاضی عیاض رحمہ اللہ کی کتاب "الشفاء" کی شرح "نسیم الریاض" میں ہے کہ عروج کا معنی جہتِ علو میں چڑھنا ہے۔ انتہیٰ. علاوہ ازیں خود اس سورت کا نام "المعارج" جہتِ فوق پر دلالت کرتا ہے۔

مذکورہ بالا تیرہ آیات سے اللہ تعالیٰ کے لیے جہتِ فوق اور علو پوری صراحت کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔ متکلمہ، فرعونیہ، جہمیہ اور معتزلہ فرقوں کے لوگ صفتِ استوا اور جہتِ فوق کے منکر ہیں اور ان آیات کی تاویل کرتے ہیں، مگر ان کا اللہ تعالیٰ کی صفتِ استوا اور جہتِ فوق سے انکار کرنا بے جہت ہے۔

[1] تنزيه الذات والصفات لابن العطاس (ص: ٥٧) إعلام الموقعين لابن القيم (٢/ ٣٠٢)

پانچویں فصل

ان حدیثوں کا بیان جن سے اللہ تعالیٰ کے لیے جہتِ فوق اور علو ثابت ہوتا ہے

پہلی حدیث:

«فَعَلَا بِهِ إِلَى الْجَبَّارِ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى، فَقَالَ وَهُوَ مَكَانَهُ» (رواه البخاري)[1]

[پس وہ (جبریل) آپ کو اللہ تعالیٰ کے پاس لے گئے، آپ ﷺ نے عرض کی اور وہ اپنی جگہ پر تھا]

اس حدیث میں جگہ سے مراد عرش ہے، لہٰذا اس حدیث سے علو اور استوا دونوں ثابت ہوئے۔

دوسری حدیث:

«اِرْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ» (رواه البخاري)[2] [تم اپنے رب کی طرف لوٹو]

اس حدیث میں لوٹنا عرش کی جانب جہتِ فوق میں تھا۔

تیسری حدیث:

«أَنَا أَمِيْنُ مَنْ فِي السَّمَاءِ» (متفق عليه)[3] [میں آسمان والے کا امین ہوں]

اس حدیث میں بہ طریقِ مجاز آسمان سے مراد عرش ہے۔

چوتھی حدیث:

چوتھی حدیث لونڈی والی ہے:

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٧٩)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢)

(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤)

«فَقَالَ لَهَا: أَيْنَ اللّٰهُ؟ قَالَتْ: فِي السَّمَاءِ. قَالَ: مَنْ أَنَا؟ قَالَتْ: أَنْتَ رَسُولُ اللّٰهِ، قَالَ: أَعْتِقْهَا فَإِنَّهَا مُؤْمِنَةٌ» (رواه مسلم)[1]

[آپ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ اللہ کہاں ہے؟ اس لونڈی نے کہا: آسمان میں۔ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: میں کون ہوں؟ اس لونڈی نے جواب دیا کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ ﷺ نے اس لونڈی کے مالک سے فرمایا: اسے آزاد کر دے، کیونکہ یہ لونڈی مومنہ ہے]

دوسری روایت میں یوں آیا ہے کہ اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔[2] یہ حدیث کئی سندوں سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ان الفاظ میں اس لونڈی سے سوال کرنا کہ ''اللہ کہاں ہے؟'' اور اس کا جواب دینا کہ ''اللہ آسمان میں ہے۔'' اللہ تعالیٰ کے لیے جہتِ فوق و علو کی تعیین پر صریح دلالت کرتا ہے۔

پانچویں حدیث:

«رَبُّنَا اللّٰهُ الَّذِي فِي السَّمَآءِ» (رواه أبو داوٗد)[3]

[ہمارا رب وہ ہے جو آسمانوں میں ہے]

اس حدیث میں بھی جہتِ فوق کی کمال صراحت ہے اور مفہوم مخالف کے پیش نظر جہتِ تحت کی نفی ہے۔

چھٹی حدیث:

«اِرْحَمُوا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ» (رواه الترمذي)[4]

[رحم کرو اُس شخص پر جو زمین میں ہے، رحم کرے گا تم پر وہ جو آسمان میں ہے]

یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٧)

[2] سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٣٢٨٤) اس کی سند میں ''عبدالرحمٰن بن عبداللہ مسعودی'' راوی مختلط ہے، لہٰذا یہ اشارے والی سند ضعیف ہے۔

[3] سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٣٨٩٢)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٢٤)

ساتویں حدیث:

اہلِ جنت کے دیدارِ الٰہی کے متعلق بیان ہے:

«فَإِذَا الرَّبُّ قَدْ أَشْرَفَ عَلَيْهِمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ» (رواہ ابن ماجہ)[1]

[یکا یک ان کے رب نے ان کے اوپر سے ان پر جھانکا]

کیونکہ جنت عرشِ الٰہی کے نیچے ہو گی اور جنت کی چھت اللہ تعالیٰ کا عرش ہو گا۔ اس حدیث کے لفظ "فَوق" کو "فُوق" فا کے ضمے سے بھی پڑھا گیا ہے، جس کا معنی سقف یعنی چھت ہے۔ مطلب دونوں الفاظ کا ایک ہی ہے۔ واللہ اعلم

آٹھویں حدیث:

«يَنْزِلُ رَبُّنَا كُلَّ لَيْلَةٍ إِلَى السَّمَآءِ الدُّنْيَا» (متفق علیه)[2]

[ہمارا رب ہر رات آسمانِ دنیا کی طرف اترتا ہے]

اس حدیث سے جس طرح جہتِ علو ثابت ہوتی ہے، اسی طرح نزول کی صفت بھی ثابت ہوتی ہے، اس کی کیفیت نا معلوم ہے، مگر اس پر ایمان لانا واجب ہے۔

نویں حدیث:

«ثُمَّ يَعْرُجُ الَّذِينَ بَاتُوا فِيكُمْ» (رواہ البخاري و مسلم)[3]

[پھر وہ فرشتے چڑھتے ہیں جنھوں نے تم میں رات گزاری ہوتی ہے]

عروج اوپر کی طرف چڑھنے کو کہتے ہیں، جیسے پہلے بھی یہ بات گزری ہے۔

دسویں حدیث:

«إِلَّا كَانَ الَّذِي فِي السَّمَآءِ سَاخِطاً عَلَيْهَا» (أخرجه مسلم)[4]

[مگر وہ (اللہ) جو آسمان میں ہے اس (عورت) پر خفا ہو گا]

یعنی جو خاوند کے بلانے پر اس کے پاس نہ جائے گی۔

---

① سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٤)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٥٨)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٤٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٣٢)

④ صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٣٦)

گیارھویں حدیث:

«اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ وَاحِدٌ فِي السَّمَآءِ وَأَنَا وَاحِدٌ فِي الْأَرْضِ» (وسنده حسن)[1]

[اے اللہ! تو ایک ہے آسمان میں اور میں ایک ہوں زمین میں]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ملت ابراہیمی میں بھی یہی بات مقرر تھی کہ اللہ آسمان پر ہے اور ہماری ملت وہی ملت حنفی ہے، إلا ماشاء اللہ تعالیٰ.

بارھویں حدیث:

«ثُمَّ يَعْرُجُ بِهَآ إِلَى السَّمَآءِ فَيُفْتَحُ لَهَا حَتّٰى يَنْتَهِيَ بِهَآ إِلَى السَّمَآءِ الَّتِي فِيهَا اللّٰهُ» (رواه ابن ماجه)[2]

[پھر فرشتے اس (نماز) کو آسمان کی طرف لے جاتے ہیں تو اس کے لیے دروازہ کھولا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اسے لے کر اس آسمان تک جا پہنچتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ ہے]

اس حدیث میں اس طرح فوق وعلو کی تعیین کی صراحت ہے کہ اس سے زیادہ صراحت کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔

تیرھویں حدیث:

اللہ تعالیٰ کے ذکر سے متعلق مروی ہے:

«فَإِذَا تَفَرَّقُوا عَرَجُوا وَصَعِدُوا إِلَى السَّمَاءِ قَالَ: فَيَسْأَلُهُمُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ وَهُوَ أَعْلَمُ بِهِمْ مِنْ أَيْنَ جِئْتُمْ؟ فَيَقُولُونَ: جِئْنَا مِنْ عِنْدِ عِبَادٍ لَكَ فِي الْأَرْضِ يُسَبِّحُونَكَ» (رواه مسلم)[3]

[پس جب وہ متفرق ہو جاتے ہیں تو وہ آسمان کی طرف چڑھتے ہیں تو اللہ رب العزت ان سے پوچھتا ہے، حالانکہ وہ بہ خوبی جانتا ہے کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ ہم زمین میں تیرے بندوں کے پاس سے آئے ہیں جو تیری تسبیح کرتے ہیں]

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے آسمان پر ہے اور اس کا علم ہر

---

1. حلیة الأولیاء لأبي نعیم (۱/ ۱۹) اس کی سند میں "ابو جعفر" اور "محمد بن یزید رقاعی" دونوں راوی ضعیف ہیں۔
2. سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٤٢٦٢)
3. صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٨٩)

جگہ ہے۔ اگر وہ اپنی ذات کے اعتبار سے ہر جگہ ہوتا تو فرشتے آسمان پر کس لیے جاتے اور کس کے پاس جاتے؟ یہاں آسمان بہ مقابلہ زمین واقع ہوا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس جگہ فوق وعلو سے مراد جہت ہے نہ کہ فوقیتِ رتبہ۔

چودھویں حدیث:

قصہ معراج میں ہے:

«اِنْتَهٰی بِهٖ إِلٰی سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی وَهِيَ فِي السَّمَاءِ السَّادِسَةِ إِلَيْهَا يَنْتَهِيْ مَا يُعْرَجُ بِهٖ مِنَ الْأَرْضِ فَيُقْبَضُ مِنْهَا وَإِلَيْهَا يَنْتَهِيْ مَا يُهْبَطُ بِهٖ مِنْ فَوْقِهَا» [1]
(رواه ابن عرفة و أبو نعيم في الدلائل عن ابن مسعود)

[(آپ ﷺ) کو سدرۃ المنتہی بھی لے جایا گیا جو چھٹے آسمان میں ہے اور زمین سے اوپر چڑھنے والی چیزوں کی آخری حد یہی ہے، یہاں سے ان چیزوں کو اٹھا لیا جاتا ہے اور آسمان سے اترنے والی چیزیں بھی یہیں آ کر رکتی ہیں]

اس حدیث میں بھی جہتِ فوق کی ایسی کمال صراحت ہے جس سے زیادہ صراحت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ واقعہ معراج پر کئی سندوں سے اور بھی احادیث مروی ہیں، ان سب میں رسول اللہ ﷺ کے ایک آسمان سے دوسرے پر جانے کی صراحت پائی جاتی ہے، یہاں تک کہ آپ ﷺ ساتویں آسمان پر پہنچے اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے ہر جگہ موجود ہوتا، جیسے معتزلہ کہتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ کو آسمان پر بلائے جانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ پھر معراج مناقب نبویہ میں کیوں کر شمار ہوتا اور اس معراج کا منکر کس طرح بدعتی اور گمراہ قرار دیا جاتا؟

اسی طرح بنی آدم کی روحوں کے قبض ہونے سے متعلق بھی بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں، ان میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ اوّلاً فرشتے روحوں کو اللہ کے پاس آسمان پر لے جاتے ہیں، پھر وہاں سے جو حکم ہوتا ہے اس کے مطابق عمل کرتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے عرش پر ہے، مگر اس کا علم، قدرت اور سلطان ہر جگہ ہے۔

پندرھویں حدیث:

حجۃ الوداع کے قصے میں ہے:

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷۳)

«أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟ فَقَالُوا: نَعَمْ، فَجَعَلَ يَرْفَعُ إِصْبَعَهُ إِلَى السَّمَآءِ وَ يَنْكُتُهَا وَ يَقُولُ: اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ» (أخرجه مسلم)[1]

[کیا میں نے تم کو پہنچا دیا؟ تو انھوں نے کہا: ہاں، پھر آپ ﷺ آسمان کی طرف اپنی انگلی اٹھانے لگے اور آپ ﷺ اسے جھکاتے تھے اور ساتھ فرماتے: اے اللہ! گواہ رہنا]

اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار آدمیوں کے روبرو انگلی اٹھائی، جن میں پڑھے لکھے، ان پڑھ، سمجھ دار، مرد، عورت، بوڑھے، لڑکے، شہری، دیہاتی، گنوار اور بدو؛ سب ہی طرح کے لوگ موجود تھے۔ یہ واقعہ آپ ﷺ کی آخری عمر کا ہے جو نہایت راستی اور ایمانداری کا وقت ہوتا ہے۔ اس سے یہی مقصود تھا کہ سب لوگ اللہ تعالیٰ کو ساتوں آسمانوں کے اوپر عرش پر جان لیں۔ ورنہ آپ ﷺ آخری عمر میں اتنے بڑے مجمع عظیم و عام میں، جبکہ غلط فہمی کا اندیشہ قوی و غالب تھا، کیوں ایسا لفظ بولتے اور ایسا کام کرتے جس کے ظاہر پر اعتقاد کرنا کفر ہوتا ہے، جس طرح جہمیہ اور معتزلہ کہتے ہیں۔

پھر تلاش بسیار کے باوجود ہمیں مذکورہ بالا اعتقاد کے معارض احادیث نہیں مل سکیں جو حجت و شہرت اور قوت میں ان جیسی ہوں اور مذکورہ احادیث میں موجود حکم کسی مساوی یا قوی نص کے بغیر رد نہیں ہو سکتا ہے، وباللہ التوفیق.

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٨٩)

چھٹی فصل

اہلِ علم کے اقوال کا بیان جن سے اللہ کے لیے علو اور جہتِ فوق ثابت ہوتی ہے

پہلا قول:

شیخ محمد فاخر محدث رحمہ اللہ نے "رسالہ نجاتیہ" میں لکھا ہے:

"بیہقی از امام ابوحنیفہ روایت کردہ کہ حق تعالیٰ در آسمان ست نہ در زمین و امام خود در فقہ اکبر نوشتہ کہ اگر کسی گوید، نمی شناسم پروردگار من در آسمان ست یا در زمین پس بتحقیق کافر شد برائے آنکہ خدائے تعالیٰ میفرماید: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [طٰہٰ: ۵] وعرش وی فوق سبع سمٰوٰت ست۔"[1]

[امام بیہقی رحمہ اللہ نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے روایت کی ہے کہ حق تعالیٰ زمین میں نہیں بلکہ آسمان میں ہیں۔ امام موصوف نے خود بھی اپنی کتاب "فقہ اکبر" میں لکھا ہے کہ اگر کوئی کہے کہ مجھے یہ معرفت حاصل نہیں ہوئی کہ میرا پروردگار آسمان میں ہے یا زمین میں ہے تو یقیناً وہ کافر ہو گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [طٰہٰ: ۵] [وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا] اور اس کا عرش ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے] انتھی.

شیخ فاخر کی نقل کردہ دوسری روایت فقہ اکبر کے بعض نسخوں میں نہیں ہے، جب کہ بعض نسخوں میں یہ موجود ہے،[2] جس طرح بعض میں ہے کہ حضرت ﷺ [کے والدین] ایمان پر فوت ہوئے اور

---

[1] رسالہ نجاتیہ (ص: ۲۱)

[2] شرح الفقه الأكبر (ص: ٦١)

بعض میں ہے کہ نہیں۔ اس روایت کی تائید میں بیہقی کی روایت موجود ہے۔[1] امام محمد بن عطاس رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کو کتاب "تنزیہ الذات و الصفات" میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔

چنانچہ یہ روایت احناف کے خلاف حجت ہے، لہٰذا بعض محقق احناف اس کے قائل بھی ہوئے ہیں۔

دوسرا قول:

امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ آسمان پر ہے، مگر اس کا علم ہر جگہ ہے، کوئی جگہ اس کے علم سے خالی نہیں ہے۔"[2]

اس روایت سے مالکیہ پر حجت قائم ہوگئی۔ جمہور مالکیہ کا بھی یہی قول ہے۔ إلا ماشاء اللّٰه.

تیسرا قول:

"اعلام الموقعین" میں ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے یہ صراحت کی ہے کہ جس لونڈی نے یہ کہا تھا کہ میرا رب آسمان پر ہے اور تم اللہ کے رسول ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مکمل ایمان قرار دیا اور اسے آزاد کرنے کا حکم دیا۔[3] انتھی.

یہ روایت شافعیہ پر حجت ہے، لیکن بعض شافعیہ فوق وعلو کا تو اقرار کرتے ہیں مگر جہت کا انکار کرتے ہیں، بعض شوافع دونوں کے منکر ہیں، جیسے امام رازی رحمہ اللہ وغیرہ۔

چوتھا قول:

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ شیخ ابو طاہر مدنی رحمہ اللہ نے مجھے اپنے باپ کے خط سے یہ پڑھایا کہ شیخ ابو الحسن نے اپنی کتاب میں کہا ہے کہ میں مسئلہ صفات میں امام احمد رحمہ اللہ کے مذہب پر ہوں کہ اللہ تعالیٰ فوق العرش ہے۔[4] انتھی. اس قول سے حنابلہ پر حجت قائم ہو جاتی ہے۔ جمہور حنابلہ کا یہی اعتقاد ہے۔ إلا ماشاء اللّٰه تعالىٰ، ولله الحمد. بلکہ ان چار گروہوں میں سے

---

[1] الأسماء والصفات للبيهقي (ص: ٥٤)

[2] كتاب العلو للذهبي (ص: ١٣٨)

[3] إعلام الموقعين (٤/٣٣٧)

[4] الإبانة للأشعري (ص: ٢٠)

اس مسئلہ خاص میں حق کو عام کرنے کی جتنی توفیق حنابلہ کو ملی ہے، وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔
والله يختص برحمته من يشاء.

پانچواں قول:

امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کتاب ''مختلف الحدیث'' میں لکھا ہے کہ اگر یہ لوگ اپنی فطرت کی طرف اور اس چیز کی طرف رجوع کریں جس پر معرفتِ خالق کے حوالے سے ان کی ذات کو جوڑا گیا ہے تو وہ اس بات کو جان لیں گے کہ اللہ عزوجل بہت بلند اور اوپر ہے، اسی کی طرف دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں۔ ساری امتیں، کیا عرب اور کیا عجم، جب تک ان کو اپنی فطرت پر چھوڑا جائے، وہ یہی کہتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر ہے۔[1] انتہیٰ.

چھٹا قول:

''رسالہ نجاتیہ'' میں ہے:

''بذیل اثبات جہت شیخ ابو الحسن اشعری در ابانہ شرح و بیان ایں عقیدہ نمودہ بدان قائل گشتہ است''[2] انتہیٰ.

[اثباتِ جہت کے حوالے سے شیخ ابو الحسن اشعری نے ابانہ میں اس عقیدے کی شرح و بیان کو ذکر کیا اور اسی کے قائل ہیں]

اشعریہ پر یہی حجت کافی ہے۔

ساتواں قول:

"غنية الطالبين" میں ہے:

"هو بجهة العلو"[3] [وہ جہتِ علو میں ہے]

آٹھواں قول:

"كتاب البهجة" میں ہے:

---

① تأويل مختلف الحديث (ص: ٢٧١)

② رسالہ نجاتیہ (ص:۲۱)

③ الغنية للجيلاني (١/ ٧١)

”جان لو کہ تمھاری عبادت زمین میں نہیں گھستی بلکہ آسمان پر چڑھتی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ﴾ [الفاطر: ۱۰] [اسی کی طرف ہر پاکیزہ بات چڑھتی ہے اور نیک عمل اسے بلند کرتا ہے] پس ہمارا رب جہتِ علو میں ہے۔“ انتھیٰ.

شعرانی نے ایک طرح کا اقرار کر کے اس کی تاویل کی ہے۔ مذکورہ بالا دونوں کتابیں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی ہیں، ان میں خاص لفظ جہت موجود ہے اور یہ صوفیہ اور اولیا کے گروہ پر ان کی حجت تمام ہے، کیونکہ وہ سب اولیا اور صوفیہ کے سردار ہیں۔

نواں قول:

محمد بن موصلی نے کتاب ”سیف السنة الرفیعة“ میں لکھا ہے:

”اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے جدا ہے، فرشتے اس کی طرف چڑھتے ہیں اور اس کے پاس سے اترتے ہیں، اسی نے مسیح علیہ السلام کو اپنے پاس بلایا ہے اور اسی کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں۔“[1] انتھیٰ.

دسواں قول:

امام نووی رحمہ اللہ کی شرح مسلم میں ہے:

”فمن قال بإثبات جهة فوق من غير تحديد و لا تكييف من المحدثين و الفقهاء و المتكلمين... الخ“[2]

”یہ سب متکلمین، فقہا اور محدثین تحدید وتکییف کے بغیر جہتِ فوق کے قائل ہیں۔“

یہاں سے معلوم ہوا کہ انکارِ جہت پر اجماع و اتفاق نہیں ہوا ہے اور کیوں کر ہوتا کہ ساری امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی ہے، وللّٰه الحمد.

گیارھواں قول:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کتاب ”شرح حديث النزول“ میں جہتِ فوق کو صحیح دلائل

[1] سيف السنة الرفيعة (ص: ٤٧٧)

[2] شرح صحيح مسلم للنووي (٥/ ٢٤)

کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ جلال الدین دوانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کا باوجود علومِ نقلیہ وعقلیہ میں علو مرتبہ ہونے کے جہتِ فوق کے اثبات کی طرف بہت زیادہ میلان ہے۔

اس عبارت میں اگرچہ دوانی رحمہ اللہ نے خود اس صفت کا انکار کیا ہے، مگر اس بات کا اقرار کیا ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس صفت کے قائل تھے اور علوم نقلیہ اور عقلیہ پر قدرت ومہارت رکھتے تھے، ولله الحمد.

بارھواں قول:

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے "حادي الأرواح" میں لکھا ہے:

"وقد جمعنا منه في مسألة علو الرب على خلقه و استوائه على عرشه سفرا متوسطا"[1]

[ہم نے رب تعالیٰ کے اپنی مخلوق سے بلند اور عرش پر مستوی ہونے کے بارے میں ایک متوسط کتاب لکھی ہے]

تیرھواں قول:

امام ابو الولید رشد نے کہا ہے کہ اہلِ شریعت ہمیشہ جہت کو ثابت کرتے آئے ہیں، یہاں تک کہ معتزلہ نے اس کی نفی کی اور متاخرین اشاعرہ ابو المعالی وغیرہ نے ان کی پیروی کی۔

حتی کہ انھوں نے کہا: ''سب شریعتیں اس بات پر مبنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر ہے اور وہیں سے فرشتے پیغمبروں کی طرف وحی لے کر اترتے ہیں، وہیں سے کتابیں نازل ہوئیں، اسی طرف رسول اللہ ﷺ شبِ معراج میں گئے تھے۔ سارے حکما اس پر متفق ہیں کہ اللہ اور فرشتے آسمان پر ہیں جس طرح کہ سب شریعتیں اس پر متفق ہیں۔ پھر عقلی تقریر سے بھی اسے ثابت کیا ہے اور اس شبہے کو باطل ٹھہرایا ہے جس کے سبب سے جہمیہ نے جہت کی نفی کی تھی۔ پھر کہا کہ جہت کا ثابت کرنا شرع وعقل دونوں سے واجب ہے اور اس کا باطل کرنا ساری شریعتوں کو باطل کرنا ہے۔''[2] انتهىٰ ملخصاً، كذا في إغاثة اللهفان.

---

[1] دیکھیں: حادي الأرواح إلى بلاد الأفراح (ص: ٢٩٢)

[2] إغاثة اللهفان (٢/٢٥٨)

چودھواں قول:

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں انھوں نے استوا اور فوق کے موضوع پر ساری آیات و احادیث اور تمام آثارِ صحابہ و تابعین اور علماے دین کے تمام اقوال کو جمع کیا ہے۔[1] ذکرہ الشوکانی رحمہ اللہ.

پندرھواں قول:

امام محمد بن علی الشوکانی رحمہ اللہ نے رسالہ "الإرشاد والتحف" میں لکھا ہے:

''اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کا سلف کا مذہب ہی حق ہے اور اس کے جہت فوق میں ہونے کی صراحت قرآن مجید میں کئی جگہوں پر موجود ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے بھی کئی ایک احادیث میں اس کی تصریح فرمائی ہے، بلکہ ہر شخص اسے اپنے دل میں پاتا ہے، اپنی فطرت میں اس کا احساس کرتا ہے اور اس کی طبیعت اسے اس کی طرف کھینچتی ہے۔ دعا کرنے والا اپنے ہاتھ اس کی طرف اٹھا کر اشارہ کرتا ہے اور اپنی نظر اس کی طرف اٹھاتا ہے۔ ایسے امور کے پیش آنے کے وقت اس بات میں عالم اور جاہل برابر ہیں۔''[2] انتھیٰ ملخصاً.

سولھواں قول:

امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

''اللہ تعالیٰ کا علم، قدرت اور سلطان ہر جگہ ہے، مگر وہ عرش کے اوپر ہے، جس طرح اس نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔''[3] انتھیٰ.

سترھواں قول:

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے رسالہ "الذب عن ابن تیمیہ رحمہ اللہ" میں لکھا ہے:

---

[1] یہ رسالہ "العلو للعلي الغفار" کے نام سے مطبوع ہے۔

[2] التحف في مذاهب السلف (ص: ۷۷)

[3] سنن الترمذي (۴۰۳/۵)

''اس مقام میں حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جہت فوق کو ثابت کیا ہے۔''

اس کے بعد انھوں نے کہا کہ امام مالک، ان جیسے دوسرے لوگوں اور امام ابو الحسن اشعری کا یہی مذہب ہے۔[1] انتهى.

یہاں سے معلوم ہوا کہ جناب ممدوح نے جو اپنے رسالے ''حسن عقیدہ'' میں لکھا ہے:

''حیز وجہت کے معنی میں نہیں'' تو وہ متکلمین حنفیہ کی تقلید میں لکھا ہے اور یہاں جو کہا کہ جہتِ فوق کا ثبوت حق ہے تو یہ بطور تحقیق کے فرمایا ہے اور تحقیق تقلید پر راجح ہے، واللہ أعلم.

اٹھارواں قول:

''فرع نابت'' میں ہے کہ جو آیات و احادیث اللہ تعالیٰ کے جزئی حقیقی ہونے پر دلالت کرتی ہیں، نیز اس کے علو، فوق اور آسمان پر ہونے کی آیات و احادیث ہیں، وہ ہم اصل چہارم میں ذکر کریں گے اور یہی تمام محدثین کا مذہب ہے۔ انتهى.

انیسواں قول:

''رسالہ نجاتیہ'' میں ہے:

''اس مقدمے میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں جن کا شمار کرنا مشکل ہے۔ نیز صحابہ، تابعین اور تبع تابعین رضی اللہ عنہم اور ائمہ مجتہدین اور ان کے تلامذہ کے اقوال بہت کثرت سے ہیں، مگر آیات و احادیث کا بیان کر دینا ان سے بے نیاز کرتا ہے۔''[2] انتهى.

بیسواں قول:

شیخ محدث محمد فاخر زائر رحمہ اللہ نے امام ابو حنیفہ، ابو الحسن اشعری اور شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کا قول نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے:

''کتاب اللہ اور احادیثِ مصطفیٰ پر ایمان لانے والوں، مقلدینِ امام ابو حنیفہ اور شیوخ اشاعرہ

---

[1] شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے متعلق ایک استفسار کے جواب میں ان کے دفاع اور تائید میں ایک جواب لکھا تھا جو مکتوباتِ شاہ ولی اللہ میں موجود ہے۔ نیز یہ جواب مولانا محمد بشیر سیالکوٹی حفظہ اللہ کی کتاب "حياة الشاه ولي الله الدهلوي" (ص: ٥٤) میں بھی مطبوع ہے۔

[2] رسالہ نجاتیہ (ص: ۲۲)

اور معتقدین غوث پر لازم حق یہ ہے کہ وہ سر مو اس عقیدے سے تجاوز نہ کریں، وہ اس عقیدے والوں جیسے ہو جائیں اور دوسرے لوگوں کی خواہش کے پیچھے نہ چلیں۔"[1] انتھیٰ.

مذکورہ بالا اقوال کی اصل عبارت رسالہ "انتقاد فی شرح الاعتقاد" وغیرہ میں موجود ہے۔[2]

---

① رسالہ نجاتیہ (ص:٢٦)

② دیکھیں: الانتقاد الرجیح في شرح الاعتقاد الصحیح (ص: ٦٠)

ساتویں فصل

ادلہ اربعہ شرعیہ سے مسئلہ استوا، فوق اور علو کا ثبوت

ادلہ شرعیہ کی تحقیق:

مخفی نہ رہے کہ احناف کے نزدیک ادلہ شرعیہ چار ہیں۔ ایک قرآن، دوسری حدیث، تیسری اجماع اور چوتھی قیاس، مگر محققین کے نزدیک شرعی دلائل دو ہی ہیں۔ ایک قرآن مجید اور دوسری سنت مطہرہ۔ مسئلہ استوا، فوق اور علو ان چاروں دلائل سے ثابت ہے، وہ اس طرح کہ قرآن مجید کے دلائل فصل اول اور فصل چہارم میں ذکر ہو چکے۔ حدیث کے دلائل فصل دوم اور فصل پنجم میں گزر چکے اور اجماع اہلِ علم بلکہ اتفاق جمیع بنی آدم کے دلائل فصل سوم اور فصل ششم میں لکھے گئے۔ اب رہا قیاس، جو چوتھی دلیل ہے، تو وہ بھی اس کا مقتضی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات فوق عالم ہو اور وراء الوراء، داخل عالم، عالم اعلیٰ کے تحت اور اسفل نہ ہو۔ غزالی نے کہا ہے:

"ليس في ذاته سواه، ولا في سواه ذاته"[1]

[اس کی ذات میں اس کے سوا کوئی نہیں اور نہ کسی دوسرے میں اس کی ذات ہے]

ظاہر ہے کہ عالم ما سوا اللہ کا نام ہے، تو جب عالم ما سوا اللہ ٹھہرا تو اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات داخل نہیں ہو سکتی، بلکہ یہ تو حلولیہ، اتحادیہ، ہنود اور معتزلہ کا اعتقاد ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو بذاتہ ہر چیز اور ہر جگہ میں جانتے ہیں یا اس کے متعلق عین خلق ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔

کون سا قیاس معتبر ہے؟

جہاں تک اس قیاس کا تعلق ہے جو دلیل شرعی ہے تو وہ مجتہدین امت کا قیاس ہے نہ کہ ما و شما کا۔ مجتہدین میں سے بڑے نامور چار امام ہیں اور اکثر امت انھیں کی مقلد ہے۔ ان ائمہ اربعہ میں

[1] إحياء علوم الدين (١/ ٩٠)

سے کسی نے اس مسئلے میں قیاس نہیں کیا اور وہ کیوں کر کرتے؟ قیاس تو اس جگہ کرتے ہیں جہاں کوئی نص قرآن موجود ہو نہ دلیل حدیث اور نہ حجت اجماع، جب کہ یہاں یہ سب کچھ موجود ہے۔ ہاں مخالفین نے اس کے خلاف پر قیاس کیا ہے اور متشابہ سے محکم کو رد کرنا چاہا ہے، مگر کتاب و سنت اور اجماع سلف کے مخالف ہونے کے سبب وہ قیاس مردود ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

''جو کوئی یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات وصفات سے متعلق اس طرح خبر دی ہے کہ اس کا ظاہر باطل تشبیہ اور تمثیل ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان حقائق کو ترک کر دیا ہے جو اس کے کلام سے مقصود ہیں اور بندوں سے رموز کے ساتھ کلام کیا ہے، دور دراز اشارے کیے اور تشبیہ و تمثیل جیسے امور کے ساتھ صراحت کی اور پھر مخلوق سے یہ بات چاہی کہ وہ کلام اللہ کی تحریف کرنے میں اور اس کے مواضع سے اس کی تاویل کے خلاف اور اس کے ظاہر سے جو سمجھا جاتا ہے، اس کے خلاف تاویل کرنے میں اپنے ذہنوں، قوتوں اور فکروں کو کھپائیں اور اس کے لیے شرعاً وعقلاً طرح طرح کے ناخوش احتمال طلب کریں اور چیستان و معما کے ساتھ ملتی جلتی تاویلیں کریں، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اسما و صفات کو پہچاننے کے لیے انھیں اپنی کتاب کے بجائے ان کی عقلوں کے سپرد کر دیا، بلکہ ان سے یہ چاہا کہ وہ اس کے کلام کو اس ظاہری معنی پر محمول نہ کریں جو اس کے خطاب اور لغت سے سمجھا جاتا ہے، باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر تھا کہ اس حق کو کھول کر بیان کر دے جس کی وہ صراحت کرنا چاہتا ہے اور لوگوں کو ان الفاظ کے حوالے سے اطمینان و آرام بخشے جس سے وہ باطل اعتقاد میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کلام تو نہ کیا اور ان کے لیے راہ ہدایت کے خلاف ایک اور ہی راہ اختیار کی، تو ایسا سوچنے والا شخص اللہ کے ساتھ بدگمان ہے۔

''اگر کہیں کہ اللہ تعالیٰ ان صریح لفظوں کے ساتھ تعبیر کرنے پر قادر نہیں ہے جن لفظوں کے ساتھ اس شخص اور اس کے اسلاف نے تعبیر کی ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کو عاجز گمان کرنا پڑتا ہے اور اگر کہیں کہ اللہ تعالیٰ قادر تو ہے لیکن اس نے کھول کر بیان نہیں کیا اور صریح بیان سے ایسے الفاظ کی طرف عدول فرمایا جو وہم میں مبتلا کریں بلکہ محال باطل

میں پھنسائیں اور اعتقاد فاسد میں گرفتار کریں تو بے شک اس شخص نے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت کے ساتھ بدگمانی کی۔ اس نے اس بات کا گمان کیا کہ اس نے اور اس کے اسلاف نے تو حق سے تعبیر کی ہے اور حق کو صاف صاف بیان کیا ہے مگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اسے بیان نہیں کیا ہے، ہدایت وحق ان کے کلام میں ہے، اللہ اور اس کے رسول کے کلام میں نہیں، بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ظاہر کلام سے تشبیہ وتمثیل حاصل ہوتی ہے اور اہل تہور وتحیر کے ظاہر کلام سے ہدایت اور حق حاصل ہوتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی کی بات ہے اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے ساتھ جاہلیت کے گمان کی طرح بدگمانی کرنے والے ہیں۔"[1] انتهى ملخصاً.

[1] زاد المعاد (٣/ ١٩٦)

آٹھویں فصل

مذکورہ بالا آیات واحادیث محکم ہیں، متشابہ نہیں

امام محمد بن موصلی نے اپنی کتاب "سیف السنة الرفیعة" میں قرآن وحدیث کے دلائل کے ساتھ استوا اور جہتِ فوق ثابت کرنے کے بعد فرمایا ہے:

"وهذه نصوص محكمة"[1] [یہ سب دلائل محکم ہیں]

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ ''اعلام الموقعین'' میں رقم طراز ہیں:

''یہ لوگ دو طرح سے سنتوں کو رد کرتے ہیں۔ ایک متشابہ قرآن یا حدیث کے ساتھ ان کو رد کرنا اور دوسرے محکم دلالت کو بیکار کرنے کے لیے محکم کو متشابہ ٹھہرانا۔ جب کہ صحابہ کرام، تابعین عظام اور امام شافعی، امام احمد، امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، امام بخاری اور امام اسحاق بن راہویہ وغیرہ ائمہ حدیث کا طریقہ اس کے برعکس ہے کہ وہ متشابہ کو محکم کی طرف لوٹاتے ہیں اور محکم سے متشابہ کی تفسیر کرتے ہیں۔ وہ متشابہ کو اس لیے بیان کرتے ہیں تاکہ متشابہ اور محکم کی دلالت موافق ہو جائے اور نصوص ایک دوسرے سے مل کر ایک دوسرے کی تصدیق کریں، کیونکہ وہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہیں۔ جو چیز اللہ کی طرف سے ہوتی ہے، اس میں اختلاف اور تناقض نہیں ہوتا، اختلاف وتناقض تو اس چیز میں ہوتا ہے جو غیر اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔''[2] انتھی.

پھر حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے اس کی مثال میں ذکر کیا ہے کہ جیسے اس محکم اور معلوم بالضرورۃ امر کو رد کرنا جسے پیغمبر و رسول لائے ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ کے مخلوق پر علو اور عرش پر مستوی ہونے کے اثبات کو اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل اور ان جیسے دیگر متشابہ فرامین کے ساتھ رد کرنا:

---

[1] سيف السنة الرفيعة، وهو مختصر الصواعق المرسلة، لابن الموصلي (ص: ٤٧٧)

[2] أعلام الموقعين (٢/٢٩٤)

① ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ [الحديد: ٤]

[اور وہ تمھارے ساتھ ہے، جہاں بھی تم ہو]

② ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ [ق: ١٦]

[اور ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں]

③ ﴿ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ [المجادلة: ٧]

[کوئی تین آدمیوں کی کوئی سرگوشی نہیں ہوتی مگر وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اور نہ کوئی پانچ آدمیوں کی مگر وہ ان کا چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم ہوتے ہیں اور نہ زیادہ مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے، جہاں بھی ہوں، پھر وہ انھیں قیامت کے دن بتائے گا جو کچھ انھوں نے کیا۔ یقیناً اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے]

پھر ایسے امکانات اور حیلے پیدا کرنا جس سے علو و فوقیت کی نصوص کو متشابہ کے ساتھ رد کیا جاتا ہے۔[1] انتہیٰ

اٹھارہ وجوہ سے صفتِ علو اور استوا کا ثبوت:

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے پھر بارھویں مثال میں کتاب و سنت کے دلائل کے ساتھ اٹھارہ وجوہ سے علو و استوا کو ثابت کیا ہے، جو ہمارے رسالے "انتقاد في شرح الاعتقاد" میں نقل کی گئی ہیں۔[2]

کتاب "حادي الأرواح" میں فرمایا ہے:

"اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کے اوپر تہ بہ تہ سات آسمان پیدا کیے ہیں اور ایک دوسری کے نیچے تہ بہ تہ سات زمینیں بنائی ہیں۔ سب سے اوپر والی زمین اور سب سے نیچے والے آسمان کے درمیان پانچ سو برس کا راستہ ہے، اسی طرح ہر آسمان سے دوسرے آسمان تک پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ ساتویں آسمان کے اوپر پانی ہے، پانی کے اوپر

---

① أعلام الموقعين (٢/٢٩٥)

② الانتقاد الرجيح في شرح الاعتقاد الصحيح (ص: ٧٩) نیز دیکھیں: أعلام الموقعين (٢/٣٠٤)

رحمٰن کا عرش ہے، اللہ عزوجل عرش کے اوپر ہے اور کرسی اس کے دونوں قدموں کی جگہ ہے۔ ساتوں آسمانوں، ساتوں زمینوں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، جو کچھ زمین کے نیچے ہے اور جو کچھ دریا کی تہ میں ہے، وہ سب کچھ جانتا ہے۔ وہ ہر بال، درخت، کھیتی اور روئیدگی کی جگہ کو، ہر پتے کے گرنے کی جگہ کو، ہر کلمے کی گنتی کو، ریت، کنکری اور خاک کی گنتی کو، پہاڑوں کے وزن کو اور بندوں کے اعمال، آثار، کلام اور سانسوں تک سب کو جانتا ہے اور اس پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے ساتویں آسمان کے اوپر عرش پر ہے۔ اس کے سامنے نار، نور اور ظلمت کے اور اس چیز کے، جسے وہ خوب جانتا ہے، پردے حائل ہیں۔ پھر اگر کوئی مخالف بدعتی اللہ تعالیٰ کے ان فرامین سے دلیل پکڑے:

1. ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ [ق: ١٦]

[اور ہم اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں]

2. ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ [الحديد: ٤]

[اور جہاں کہیں بھی تم ہو وہ تمھارے ساتھ ہوتا ہے]

3. ﴿هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا﴾ [المجادلة: ٧]

[وہ جہاں بھی ہوں، وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے]

4. ﴿مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ [المجادلة: ٧]

[کوئی تین آدمیوں کی کوئی سرگوشی نہیں ہوتی مگر وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اور نہ کوئی پانچ آدمیوں کی مگر وہ ان کا چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم ہوتے ہیں اور نہ زیادہ مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے، جہاں بھی ہوں، پھر وہ انھیں قیامت کے دن بتائے گا جو کچھ انھوں نے کیا۔ یقیناً اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے]

''یا اس کے مثل قرآن مجید کی کسی اور متشابہ آیت سے حجت پکڑے تو اسے یہ کہہ دو

کہ ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی مراد علم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں کے اوپر عرش پر ہے، سب کو جانتا ہے، وہ اپنی مخلوق سے جدا ہے اور کوئی جگہ اس کے علم سے خالی نہیں ہے۔"[1] انتھی.

مذکورہ بالا ساری عبارت کو عقائد اہلِ حدیث میں ذکر کیا ہے، پھر کہا ہے کہ علماے حجاز و شام وغیرہ کا یہی مذہب ہے۔ لہٰذا جو شخص اس مذہب کی مخالفت کرے یا اس میں طعن کرے یا اس کے قائل پر عیب لگائے، وہ مخالف اور مبتدع، جماعت سے خارج، سنت کے راستے اور طریقِ حق سے دور چلا گیا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ استوا اور فوق کی آیات و احادیث محکمات ہیں اور آیاتِ معیت و قرب وغیرہ متشابہ ہیں، لہٰذا متشابہ کو محکم کی طرف لوٹانا چاہیے، محکم کو متشابہ کے ساتھ رد نہیں کرنا چاہیے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے شاگرد حرب نے کہا ہے کہ استوا و فوق کے ثبوت والا مذہب ہی امام احمد بن حنبل، اسحاق بن ابراہیم، عبداللہ بن زبیر حمیدی اور سعید بن منصور رحمہم اللہ کا مذہب ہے۔ (میں کہتا ہوں) امام مالک اور ابو الحسن اشعری رحمہما اللہ وغیرہ اہلِ حدیث کا یہی مذہب ہے۔[2] صحابہ کرام، تابعین عظام اور تبع تابعین وغیرہ رضی اللہ عنہم کا بھی یہی مذہب ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہے اور تمھارے اعمال میں سے کوئی چیز اس پر پوشیدہ نہیں ہے۔[3] امام اوزاعی رحمہ اللہ نے کہا ہے: ہم اور تابعین رحمہم اللہ یہی کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے اور اس کا عرش آسمانوں کے اوپر ہے۔[4] مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا: ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم کے ساتھ ہم سے قریب ہے اور اپنی ذات سے عرش کے اوپر ہے۔[5] امام طحاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے: وہ سب کے اوپر ہے اور ہر ایک چیز کو محیط ہے۔[6] انتھی. قرآن مجید میں جہاں کہیں علم کی قید کے بغیر احاطے کا ذکر آتا ہے تو وہ مقید بالعلم پر محمول ہوگا، جس طرح فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] حادي الأرواح إلى بلاد الأفراح (ص: ٣٦)

[2] دیکھیں: العلو للعلي الغفار للذهبي (ص: ١٣٨، ٢١٧)

[3] خلق أفعال العباد للبخاري (ص: ٤٣)

[4] الأسماء والصفات للبيهقي (٢/ ٣٠٤)

[5] العرش للذهبي (ص: ١٩٢)

[6] شرح العقيدة الطحاوية (٦/ ١٧٥)

﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴾ [الطلاق: ۱۲]

[اور یہ کہ بے شک اللہ نے یقیناً ہر چیز کو علم سے گھیر رکھا ہے]

"فرع ثابت" میں ہے کہ جمہور محدثین یہی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ عرش پر رہتا ہے، عرش اس سے خالی نہیں ہوتا، اگرچہ وہ قریب ہے اور جب وہ آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے تو عرش اس کے اوپر نہیں ہوتا، اس کا اترنا اجسام کے چھت سے زمین کی طرف اترنے کی مانند نہیں ہے کہ چھت اس کے اوپر ہو بلکہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے۔ انتهىٰ.

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

"جہمیہ نے ان سب نصوص کو متشابہ ٹھہرایا ہے اور پھر متشابہ کو محکم پر مسلط کر کے اس کا رد کیا ہے اور پھر متشابہ کو محکم کہا ہے۔ کبھی تو اس کے ساتھ باطل پر حجت پکڑی ہے اور کبھی اس کے ساتھ حق کو دفع کیا ہے۔ جسے تھوڑی سی بھی سوجھ بوجھ ہے، وہ یہ جانتا ہے کہ ازروے دلالت نصوص میں سے کوئی چیز ان نصوص کے مضمون سے ظاہر تر اور مبین تر نہیں ہے، جب یہی نصوص متشابہ ٹھہریں تو ساری شریعت متشابہ ہوئی اور کوئی چیز شریعت میں محکم نہ رہی... دلوں کو ثابت رکھنے والے اللہ سے ہم سوال کرتے ہیں کہ وہ ہمارے دل اپنے دین پر ثابت رکھے اور ہدایت عطا کرنے کے بعد ہمیں اس ہدایت و حق سے نہ پھیرے، جس کے ساتھ اس نے اپنے پیغمبر کو مبعوث کیا ہے۔ إنه قریب مجیب."[1]

كذا في الإعلام.

[1] أعلام الموقعين (۲/۲۹۵)

نویں فصل

کتاب وسنت کی نصوص کے ظاہر پر محمول ہونے اور مووّل نہ ہونے کا بیان

شیخ حاج محدث محمد فاخر زائر الہ آبادی ثم المکی رحمہ اللہ نے "رسالہ نجاتیہ" میں فرمایا ہے:

"کتاب وسنت کی شرعی نصوص اپنے ظاہر پر محمول ہیں، لہٰذا ہر شخص کے لیے ان میں سے جو سمجھ میں آئے، اس کے ساتھ کلام کرنا جائز ہے اور اسے چاہیے کہ وہ اس پر اعتقاد کرے اور ان میں سے جو موہم جسمیت وغیرہ ہو، اس پر بھی ظاہر کے موافق اعتقاد کرے، لیکن اس کے لازم اور متبادر سے بچے اور اس کی مراد کو اللہ اور رسول ﷺ پر چھوڑ دے۔ شریعت میں وارد ہونے والی صفات بولنے سے کسی چیز پر وہم لازم آنے پر انھیں چھوڑ کر ایک طرف نہ ہو جائے۔ ہر لفظ کو بے کیف جوں کا توں بولے۔ ہر ایک فرقے نے بعض مسئلوں میں یہ بات اختیار کی ہے، جیسے اشاعرہ وغیرہ نے آخرت کے متعلقہ امور میں اللہ تعالیٰ کی رویت وغیرہ کے مسئلے پر بے کیف تاویل کی راہ بند کی ہے اور جو کچھ وارد ہوا ہے اسے قبول کر لیا ہے۔

"معتزلہ حیات کی نفی نہیں کرتے، اس صورت میں ان کے قاعدے کے موافق جسمیت لازم آتی ہے، لہٰذا ضروری ٹھہرا کہ وہ سلبِ کیفیت کے قائل ہو کر ایمان لائیں۔ اسی طرح اہلِ حدیث، جو پیشوائے اہلِ سنت ہیں، ہر مقدمے میں یہی اعتقاد رکھتے ہیں، جو کچھ وارد ہوا ہے اس پر ایمان لاتے ہیں اور عوام کی نظر میں جو کچھ اس سے لازم آتا ہے اس پر نظر نہیں کرتے ہیں، لہٰذا تم پر لازم ہے کہ تم ان کی پیروی کرو، کیوں کہ وہ اہلِ رسول اللہ ﷺ ہیں۔ ان لوگوں کے ہاتھ سے فریاد ہے، جو اس چیز پر اعتقاد کرنے کو جسمیت اور مکان

کے وہم کی بنا پر کفر جانتے ہیں جو قرآن و حدیث میں آئی ہے اور وہ اس میں اللہ سے نہیں ڈرتے کیونکہ جو شخص قرآن و حدیث کے ظاہر پر ایمان لایا ہے، اس نے اپنی طرف سے کچھ ایجاد نہیں کیا ہے، اب اگر اسے قیامت کے دن پکڑا جائے گا تو یہ سوائے ظلم کے اور کیا ہے؟

جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾ [آل عمران: ۱۸۲]

[اور اس لیے کہ بے شک اللہ بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں]

اس ظلم سے انکار کرتا ہے۔ اپنی فاسد عقلوں سے عقائد مقرر کرنا اور اس کے سوا کو کفر جاننا، اگرچہ ظاہر قرآن و حدیث میں اسی طرح آیا ہو، حقیقت میں قرآن و حدیث میں غلطی نکالنے کے مترادف ہے۔ حق تعالیٰ نے قرآن مجید کو بیان کے لیے بھیجا ہے، رسول اللہ ﷺ، جو لوگوں میں سے فصیح تر ہیں، کس طرح ظاہر میں ایسے لفظ بول سکتے ہیں جن کا اعتقاد رکھنا کفر ہے؟ یہ جرات اس جماعت سے ہوئی جن کا چھوٹا جوان اور جوان بوڑھا ہو گیا۔ عادت، جو ایک طبیعت ہوتی ہے، اس سے جا ملی۔ حال کی تحقیق کیے بغیر اندھے بہرے کی طرح اسے قبول کرنے کے لیے دوڑے اور آخر کار اپنے ایمان کو برباد کر بیٹھے۔ خبردار! ایسوں کی تقلید نہ کرنا، اگرچہ لوگوں کی نظروں میں وہ بڑے عالم اور شیخ المشائخ ہی کیوں نہ ہوں۔ اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ عادل ہے۔ جو کوئی اس کے ظاہر قول کے مطابق ایمان لایا ہے، وہ اس سے ناخوش اور ناراض نہیں ہوگا، اس کا عدل ظلم کو نہیں چاہتا ہے۔"[1] انتھی۔

من جملہ ان الفاظ کے جن کو سلف صالحین نے بلا تمثیل، تشبیہ، تاویل، تعطیل اور تکییف کے ظاہر پر محمول کیا ہے وہ ید، یمین، کف، اصبع، شمال، قدم، رجل، وجہ، نفس، عین، نزول، اتیان، مجی، کلام، قول، ساق، حقو، جنب، فوق، استوا، ذات، شخص، مرء، صورت، یدین، حثیات، اصابع، ساعد، ذراع، صدر، روح، رحم، استظلال، فوق، من فی السماء، رفع، عروج، صعود، معیت، مرصاد، دنو، قرب، برداء، وطاء، قبل، ضحک، عجب، فرح، تبشبش، نظر، غیرت، ملال، استحیا، استہزا، غیرت، خدیعت، مکر، فراغ، تردد، فضل، رحمت، محبت، رضا، سخط، غضب، عداوت، ولایت، اختیار، صبر، محاضرہ، مصافحہ، اطلاع، اشراف عند اللہ، تقلیب قلوب، سبق اور کلمہ کن فیکون ہیں۔

[1] رسالہ نجاتیہ (ص: ۲۵)

قرآن وحدیث میں ان کا اطلاق خدا تعالیٰ کے حق میں ہوا ہے اور یہ الفاظ معناً محکم ہیں۔ ان کا عربی، فارسی، اردو وغیرہ لغات میں حسبِ ترجمہ لغت حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنبلیہ کے نزدیک بالاتفاق درست ہے۔ ان کی کیفیت متشابہ ہے اور ان کی تاویل کرنا درست ہے، جس طرح کتبِ عقائد اور قرآن پاک کے تراجم سے ظاہر ہے۔ اس مسئلے کے دلائل میرے رسالے "انتقاد في شرح الاعتقاد" میں مذکور ہیں۔

سنن ترمذی میں لکھا ہے کہ جہمیہ نے ان روایات کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ تشبیہ ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ ید، سمع اور بصر کا ذکر کیا ہے، مگر جہمیہ نے ان آیات کی تاویل کی ہے اور اہلِ علم کی تفسیر کے خلاف ان کی تفسیر کی ہے اور یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اس جگہ ہاتھ بہ معنی قوت کے ہے۔

اسحاق بن ابراہیم رحمہ اللہ نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ تشبیہ تب ہوتی ہے جب یہ کہا جائے کہ ہاتھ مانند ہاتھ کے اور سننا مانند سننے کے ہے۔ جب یہ کہا کہ ہاتھ، سننا اور دیکھنا اور کیف نہ کہا اور نہ کہا سننا مانند سننے کے تو یہ تشبیہ نہ ہوئی۔[1] انتهى ملخصاً.

[1] سنن الترمذي (۳/ ۵۰)

دسویں فصل

صفاتِ الٰہیہ ظاہر پر جاری کرنے کے سبب جہمیہ اور معتزلہ وغیرہ کا اہلِ سنت کو مشبہہ اور مجسمہ کہنا بے جا ہے

قرآن و حدیث میں وارد اللہ تعالیٰ کی صفات کو تنزیہ کے اعتقاد اور تشبیہ کی نفی کے ساتھ جوں کا توں جاری کرنا اور چیز ہے اور انھیں اللہ کے ساتھ جسمانی ہونے کا قائل ہونا اور اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوق کے ساتھ تشبیہ دینا اور چیز ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے ''غنیۃ الطالبین'' میں لکھا ہے:

''مشبہہ کے تین گروہ ہیں: ہشامیہ، مقاتلیہ اور واسمیہ۔ ان تینوں گروہوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ جسم ہے، کیونکہ کوئی موجود عقل میں اس وقت آ سکتا ہے جب کہ وہ جسم ہو۔ ہشامیہ نے یہ گمان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک لمبا، چوڑا، گہرا، نورانی اور چمکتا ہوا جسم ہے۔ مختلف اندازوں میں سے اس کے لیے ایک اندازہ یہ ہے کہ وہ صاف جال کی طرح ہے، جو ہلتا ہے، ٹھہرتا ہے، کھڑا ہوتا ہے اور بیٹھتا ہے۔''[1] انتھی.

شرح مواقف میں ہے کہ مشبہہ حشویہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ جسم ہے، مگر اجسام کی مانند نہیں، گوشت اور خون رکھتا ہے، مگر دوسرے گوشتوں اور خونوں کی مانند نہیں اور اس کے کئی اعضا اور جوارح ہیں۔[2] انتھی.

اہلِ سنت ائمہ اربعہ کے اصحاب ہوں یا اہلِ حدیث، ان میں سے کوئی بھی اس کا قائل اور معتقد نہیں ہے۔ اگر صفاتِ الٰہیہ کو صرف ان کے ظاہر پر جاری کرنے کو تشبیہ اور تجسیم کہا جائے گا تو پھر اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ سمیت کوئی بھی اس سے بچ نہ سکے گا، کیوں کہ تمام صحابہ و تابعین، تبع تابعین،

---

[1] الغنية الطالبي طريق الحق للجيلي (١/ ١٣١)

[2] كتاب المواقف (٣/ ٧١٥)

ائمہ مجتہدین اور جمہور محدثین کا یہی مذہب ہے کہ آیاتِ صفات کو ان کے ظاہر پر جاری کریں اور اللہ تعالیٰ کو صفاتِ مخلوق سے پاک جانیں، صفات کی تاویل نہ کریں، جس طرح کہ معتزلہ، قدریہ اور جہمیہ تاویل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے ان صفات کو بلا تاویل اور بلا کیف بولا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے "حجة الله البالغة" میں لکھا ہے:

"ان ناحق باتوں میں مشغول رہنے والوں نے اہلِ حدیث پر زبان درازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھیں مجسمہ اور مشبہہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ بلا کیف کہہ کر چھپنے والے ہیں۔ مجھ پر یہ حقیقت خوب آشکارا ہو گئی ہے کہ ان کی یہ زبان درازی بے حقیقت ہے اور یہ اپنے قول، روایت و درایت دونوں میں خطا کار ہیں۔"[1] انتهى.

تفہیمات میں فرمایا ہے:

"تشبیہ کا ایک اجمالی کلمے سے علاج کیا جاتا ہے جس کلمے کا ہر مومن اعتقاد رکھتا ہے، وہ کلمہ یہ ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ [الشورىٰ: ۱۱] [اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے] لہٰذا اس سے زیادہ سے وہ مشغول نہ ہو۔"[2] وبالله التوفيق.

---

[1] حجة الله البالغة (۱/۱۳٤)

[2] التفهيمات للشاه ولي الله الدهلوي (۱/۲۱۳)

گیارھویں فصل

صفتِ استوا وغیرہ کی نفی جہمیہ اور معتزلہ کا عقیدہ ہے

سب سے پہلے جس نے استوا کا انکار کیا، وہ جہم بن صفوان ہے۔ ''غنیۃ الطالبین'' میں لکھا ہے:

''وہ (جہم بن صفوان) کہتا تھا: اللہ کا عرش اور کرسی نہیں ہے اور نہ وہ عرش کے اوپر (مستوی) ہے۔''[1] انتہیٰ

ملا علی قاری رحمہ اللہ نے ''شرح فقہ اکبر'' میں لکھا ہے:

''جہم بن صفوان کہتا تھا: میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ آیتِ استوا قرآن مجید سے کھرچ ڈالی جائے۔''[2] انتہیٰ

''اعلام الموقعین'' میں ہے کہ جہمیہ و معتزلہ کے پیروکاروں کے نزدیک اللہ کی طرف حساً اشارہ کرنا ممتنع ہے۔[3] انتہیٰ. پھر معتزلہ، قدریہ اور سالمیہ نے اس اشارے کا انکار کیا۔

''غنیۃ الطالبین'' میں ہے:

''ان ساری صفات کا انکار اور نفی کرنا جو شرع سے ثابت ہیں،[4] یہ وہ چیز ہے جس پر سارے معتزلی فرقوں کا اتفاق ہے، جیسے استوا اور نزول وغیرہ۔'' انتہیٰ ملخصاً.

پھر فرقہ سالمیہ کے تذکرے میں ان کا یہ قول لکھا ہوا ہے کہ اللہ ہر مکان میں ہے، عرش وغیرہ مکانات کا کچھ فرق نہیں ہے، مگر قرآن میں ان کی تکذیب موجود ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴾ [طٰہٰ: ٥] [وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا]

---

[1] الغنية للجيلاني (١/ ١٢٨)

[2] الغنية للجيلاني (١/ ١٣٢)

[3] أعلام الموقعين (٢/ ٣٠٢)

[4] الغنية للجيلاني (١/ ١٢٩)

چنانچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ زمین پر، حاملہ عورتوں کے شکم پر، پہاڑوں پر اور ان کے سوا دیگر جگہوں پر وہ مستوی ہوا۔[1] انتھیٰ

شیخ عبدالوہاب شعرانی مصری نے کتاب ''الیواقیت والجواہر'' میں سید علی خواص سے نقل کیا ہے کہ یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ ہے، جس طرح معتزلہ اور قدریہ کہتے ہیں اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں:

﴿وَ هُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ فِي الْاَرْضِ﴾ [الأنعام: ٣]

[اور آسمانوں میں اور زمین میں وہی اللہ ہے]

ایسا کہنا اس لیے جائز نہیں کہ اس سے اللہ تعالیٰ کے مکان میں حلول کرنے کا وہم ہوتا ہے۔[2] انتھیٰ.

مطلب یہ ہے کہ مذکورہ آیت ان کی دلیل نہیں بن سکتی، کیونکہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ آسمان و زمین کا معبود ایک ہی ہے نہ کہ وہی اللہ اپنی ذات کے اعتبار سے ان دونوں جگہوں پر یکساں موجود ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

''جس نے یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کے اوپر عرش پر نہیں ہے اور اپنی مخلوق سے جدا نہیں ہے اور عرش کی طرف اس کی نسبت اسفل السافلین کی طرف اس کی نسبت کی مانند نہیں ہے اور جس نے یہ کہا: "سبحان ربي الأعلیٰ" اور اس نے ویسے ہی یہ کہا: "وسبحان ربي الأسفل" تو اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی کی۔''[3] انتھیٰ.

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

''جب ہم اپنے وجدان کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم اس بات میں شک نہیں کرتے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ کو عرش کے ساتھ ایک خصوصیت ہے جو خصوصیت اسے دوسری مخلوقات کے ساتھ نہیں ہے۔ اس مسئلے میں ہمیں استوا علی العرش سے زیادہ فصیح عبارت نہیں ملتی، جس طرح انکشافِ مسموعات و مبصرات میں ہمیں سمع و بصر سے فصیح تر عبارت میسر نہیں آتی۔'' انتھیٰ.

---

[1] الغنية للجيلاني (١/ ١٣٢)

[2] اليواقيت والجواهر للشعراني (١/ ٦٠)

[3] زاد المعاد (٣/ ١٩٦)

امام غزالی رحمہ اللہ ایک جگہ اربعین میں یوں رقم طراز ہیں:

"اللہ تعالیٰ کسی چیز میں حلول نہیں کرتا اور نہ کوئی چیز اللہ تعالیٰ میں حلول کرتی ہے، وہ اس سے برتر ہے کہ کوئی جگہ اسے اپنے میں سما لے، جس طرح وہ اس بات سے پاک ہے کہ اسے زمانہ روک لے، بلکہ وہ مکان اور جہان کو پیدا کرنے سے پہلے بھی تھا اور اب بھی وہ اسی حال پر ہے جس پر وہ پہلے تھا۔ وہ اپنی صفات کے ساتھ مخلوق سے جدا ہے، اس کی ذات میں اس کے سوا کوئی نہیں ہے اور نہ اس کے غیر میں اس کی ذات ہے۔"[1] انتھیٰ

ایک بہت بڑی جماعت کا یہی موقف ہے۔ یہاں سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے علم و قدرت وغیرہ کے سوا ہر مکان میں یا ہر انسان کے ساتھ بذاتہ قرار دینا معتزلہ کا مذہب ہے۔ اہلِ سنت و جماعت کی، ائمہ اربعہ کے مقلدین ہوں یا اہل حدیث، عقائد پر لکھی ہوئی سبھی کتابیں اس عقیدے سے خالی ہیں، جس کا جی چاہے تلاش کر دیکھے۔ ہاں! جار اللہ زمخشری اور عبدالجبار معتزلی وغیرہ اس کے قائل ہیں اور متکلمین کی کتابوں میں ان کا رد بھی لکھا ہوا ہے۔

جمہور علما نے قرب، معیت اور احاطہ کی آیات کو علم، عون اور نصر وغیرہ جیسے ہر محل کے مناسب الفاظ پر محمول کیا ہے، تاکہ متشابہ کو محکم کے موافق کر دیں، مگر محققین محدثین کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جس طرح صفتِ استوا کو ثابت کرتے ہیں، اسی طرح صفتِ قرب و معیت وغیرہ کو بھی بلا کیف مانتے ہیں اور علم و عون وغیرہ کے ساتھ ان کی تاویل نہیں کرتے ہیں، امام شوکانی رحمہ اللہ کا بھی مختار قول یہی ہے۔ یہ دونوں طریقے جائز ہیں، اگرچہ بعد والی بات احتیاط کے زیادہ قریب ہے۔ واللہ أعلم.

مسئلہ استوا و فوق کی بحث ختم ہوئی۔ اب اہلِ حدیث کے باقی عقائد اختصار کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں۔ و باللہ التوفیق.

[1] الأربعین في أصول الدین للغزالي (ص: ١٨)

بارھویں فصل

عقائدِ اہلِ حدیث کا بیان

اہلِ حدیث کا عقیدہ یہ ہے:

① وہ اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں، جو کچھ اس کے پاس سے آیا ہے اور جو کچھ ثقہ راویوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے، اس کا اقرار کرے اور ان میں سے کسی چیز کو رد نہ کرے۔

② یقیناً اللہ تعالیٰ ہی ایک معبود ہے، وہ اکیلا بے نیاز ہے۔ اس کی بیوی ہے نہ اولاد اور یقیناً محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔

③ ایمان قول و عمل اور سنت کے ساتھ تمسک کرنے کا نام ہے۔ ایمان کم اور زیادہ ہوتا ہے۔ بندہ اپنا ایمان بیان کرتے وقت ان شاء اللہ کہے، لیکن شک کے طور پر نہیں، بلکہ علما کے ہاں یہ ایک طریقہ رائج ہے کہ جب کوئی پوچھے: کیا تو مومن ہے؟ تو جواب میں کہے: میں ان شاء اللہ مومن ہوں۔ یا وہ کہے: میں مومن ہوں اور ساتھ کہے: ”أرجو الله“ [میں اللہ سے امید رکھتا ہوں کہ وہ مجھے مومن بنا دے] یا وہ یہ کہے کہ میں اللہ پر، اس کے فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر ایمان لایا۔ جس نے یہ گمان کیا کہ ایمان قول بلا عمل کا نام ہے تو وہ مُرجی ہے۔ جس نے یہ گمان کیا کہ ایمان صرف منہ سے کہنا ہے اور اعمال تو نرے شرائع ہیں تو وہ بھی مُرجی ہے۔ جس نے یہ گمان کیا کہ اس کا ایمان جبریل و ملائکہ کی مانند ہے تو وہ بھی مُرجی ہے۔ جس نے یہ گمان کیا کہ معرفت دل میں ہوتی ہے، اگرچہ اس کے ساتھ تکلم نہ کرے تو وہ بھی مُرجی ہے۔

④ اچھی اور بری تقدیر، تھوڑا اور زیادہ، ظاہر و باطن، میٹھا اور کڑوا، محبوب اور مکروہ، خوب و زِشت اور اول و آخر سب اللہ کی طرف سے ہے۔ یہ ایک حکم ہے جو اس نے سب بندوں پر جاری کیا ہے۔ ان پر ایک قدر تو وہ ہے جو از روئے تقدیر ہے کہ کوئی اس کی مشیت و قضا سے تجاوز نہیں کرتا، بلکہ سب لوگ وہی کام کرتے ہیں جس کے لیے اللہ نے انھیں پیدا کیا ہے اور وہی عمل

بجا لاتے ہیں جو ان کی تقدیر میں لکھے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کا عدل ہے۔ زنا، چوری، شراب خوری، قتلِ نفس، حرام مال کھانا اور دیگر سارے گناہ اس کی قضا و قدر سے ہیں، بغیر اس کے کہ مخلوق میں سے کوئی اس کے خلاف حجت بازی کرے، بلکہ مخلوق پر حجت بالغہ اللہ ہی کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ جو کام کرتا ہے، اس سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کر سکتا، جب کہ لوگوں سے ان کے اعمال کی پوچھ گچھ ہوتی ہے۔

⑤ اللہ تعالیٰ کا علم اس کی مخلوق پر اس کی مشیت کے موافق جاری ہے۔ وہ ابلیس وغیرہ کی معصیت کو جانتا ہے، جب سے اس نے معصیت کی اور جب تک قیامت قائم ہوگی، اس نے عاصیوں کو معصیت کے لیے پیدا کیا ہے۔ اہلِ اطاعت سے اطاعت کو جانا اور ان کو اطاعت کے لیے پیدا کیا، لہٰذا ہر کوئی وہی کام کرتا ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اسی حکم کی طرف لوٹنے والا ہے جو اللہ نے اس پر جاری فرمایا ہے۔ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی مشیت اور تقدیر سے تجاوز نہیں کرتا، جو وہ چاہتا ہے، کرتا ہے۔

⑥ جس شخص نے یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو نافرمانوں سے بھلائی اور اطاعت چاہی تھی، لیکن بندوں نے اپنی خواہش کے مطابق اپنے لیے برائی اور نافرمانی چاہی اور اپنی خواہش کے موافق کام کیا تو اس شخص نے یہ گمان کیا کہ بندوں کی خواہش اللہ کی خواہش پر غالب ہے، اس سے بڑھ کر اللہ پر اور کیا افترا ہوگا؟ جس نے یہ گمان کیا کہ زنا تقدیر سے نہیں ہے تو اس سے یہ کہنا چاہیے کہ بھلا عورت جو زنا کی وجہ سے حاملہ ہوئی ہے اور اس نے بچہ جنم دیا ہے، اللہ نے اس بچے کو پیدا کرنا چاہا تھا، اس کے علم میں یہ بات تھی یا نہیں؟ اگر وہ جواب دے کہ نہیں تھی تو اس نے گویا یہ گمان کیا کہ اللہ کے ساتھ ساتھ کوئی اور بھی خالق ہے اور یہ صریح شرک ہے۔ جس شخص نے یہ گمان کیا کہ چوری، شراب خوری اور مالِ حرام کھانا قضا و قدر سے نہیں ہے تو اس نے یہ گمان کیا کہ آدمی اس بات پر قادر ہے کہ کوئی دوسرا اس کا رزق کھا جائے، حالانکہ یہ تو صاف مجوسیوں کا قول ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے جس طرح سے بھی کھایا ہے، اپنا ہی رزق کھایا ہے، جو اللہ نے اس کے لیے مقدر کیا تھا۔ جس نے یہ گمان کیا کہ قتلِ نفس اللہ کی تقدیر سے نہیں ہے، اس نے یہ گمان کیا کہ مقتول بے موت مر گیا ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا کفر ہوگا؟

بلکہ یہ اللہ ہی کے حکم سے ہوا ہے۔ یہ اس کا اپنی مخلوق کے حق میں عدل ہے۔ یہ اس کی تدبیر ہے جو اس کے موافق ہے، جو اس کے علم میں تھا، وہ اس کا سچا عدل ہے، جو اس نے کیا ہے۔ جس شخص نے اللہ کے علم کا اقرار کیا ہے اس پر یہ لازم ہے کہ وہ قدر و مشیت کا بھی اقرار کرے۔

⑦ کوئی مسلمان اہلِ قبلہ میں سے کسی شخص کے گناہ کے سبب جو اس سے سرزد ہوا یا کسی کبیرہ گناہ کے سبب جس کا وہ مرتکب ہوا، اس کے دوزخی ہونے کی گواہی نہ دے الا یہ کہ کسی حدیث یا نص میں آیا ہو، اسی طرح کسی شخص کے نیک کام کے سبب جو اس نے سرانجام دیا ہے یا کسی خیر کے سبب جو اس سے ہوئی ہے، اس کے جنتی ہونے کی گواہی نہ دے الا یہ کہ کسی حدیث میں آیا ہو۔

⑧ خلافت اور بادشاہی قریش میں ہے، جب تک کہ دو آدمی بھی ان میں سے باقی رہیں۔ کسی آدمی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ بادشاہت میں قریش سے جھگڑا کرے، اسی طرح ان کے خلاف خروج کرے اور نہ غیر قریش کے لیے خلافت کا اقرار کرے۔

⑨ قیامت قائم ہونے تک جہاد کا حکم جاری ہے، جہاد اماموں کے ساتھ قائم ہے خواہ وہ امام نیک ہوں یا بد، کسی ظالم کا ظلم اور عادل کا عدل اسے باطل نہیں کرتا ہے۔

⑩ جمعہ، عیدین اور حج بادشاہ کے ہمراہ ہوتا ہے، اگرچہ وہ نیکو کار، عادل اور پرہیزگار نہ ہو۔ صدقات، خراج، عشر، فيئ اور غنیمت بادشاہ کو دی جائے خواہ وہ اس میں برابری اور انصاف کرے یا ظلم کا مرتکب ہو۔ جسے اللہ تعالیٰ نے ولی امر بنا دیا، یہ اس کی اطاعت کرے، اس کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچے، اس کے خلاف تلوار لے کر خروج نہ کرے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی راہ پیدا کر دے۔ بادشاہ کی بات سنے، اس کا کہنا مانے اور اس کی بیعت نہ توڑے۔ جو شخص ایسا نہ کرے گا، وہ مبتدع، مخالف اور جماعت کو چھوڑنے والا شمار ہوگا۔ ہاں! اگر بادشاہ ایسے کام کا حکم دے جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے تو اس میں وہ بادشاہ کی اطاعت نہ کرے، مگر اس کے باوجود اسے امام کے خلاف خروج کرنے کا حق نہیں پہنچتا اور نہ امام کے حق کو روکنے کا اسے کوئی حق ہے۔ فتنے کے وقت رک جانا ایک جاری سنت ہے، جس کو لازم پکڑنا واجب اور ضروری ہے۔ پھر اگر وہ اس میں مبتلا ہو جائے تو اپنے دین کے بجائے اپنی جان کو آگے کرے۔ ہاتھ اور زبان سے فتنے کی مدد نہ کرے، بلکہ اپنے ہاتھ اور زبان کو اس سے روک

کر رکھے، اللہ تعالیٰ اس کا معاون و مددگار ہو گا۔

⑪ اہلِ قبلہ کو ان کے کسی عمل کے سبب اسلام سے نہ نکالے اور انھیں کافر نہ کہے الا یہ کہ حدیث میں آیا ہو تو اس حدیث کی تصدیق کرے اور اسے قبول کرے۔ جیسے نماز کا ترک کرنا، شراب پینا یا اس جیسی کوئی چیز پینا یا ایسی بدعت کا ارتکاب کرنا جس کا مرتکب کفر کی طرف یا اسلام سے خروج کی طرف منسوب ہو تو اسے کافر کہے، مگر حدیث کے لفظ سے تجاوز نہ کرے۔

⑫ یقیناً کانا دجال نکلنے والا ہے، وہ تمام جھوٹوں میں سے بڑا جھوٹا ہے۔

⑬ قیامت آنے والی ہے، اس کے آنے میں کوئی شک نہیں، تب اللہ تعالیٰ قبروں میں پڑے ہوئے لوگوں کو اٹھائے گا۔

⑭ قبر کا عذاب حق ہے اور قبر میں بندے سے رب تعالیٰ اور دین کی بابت سوال کیا جاتا ہے، اسی طرح جنت و دوزخ اور منکر و نکیر حق ہیں، جو دونوں قبر کے آزمائش کنندہ ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے اس وقت ثابت قدم رہنے کا سوال کرتے ہیں۔

⑮ محمد ﷺ کو ملنے والا حوض حق ہے، جس پر آپ ﷺ کی امت وارد ہو گی۔ اس حوض پر برتن ہوں گے جن سے لوگ اس کا پانی نوش کریں گے۔

⑯ پلِ صراط حق ہے، جو جہنم کی پشت پر رکھا جائے گا، اس پر سے لوگ گزریں گے اور اس کے پار واقع جنت میں داخل ہوں گے۔

⑰ ترازو حق ہے، جس میں نیکیاں اور گناہ، جس طرح اللہ تعالیٰ چاہے گا، تولے جائیں گے۔

⑱ صور حق ہے۔ اسرافیل علیہ السلام اس میں پھونکیں گے تو ساری مخلوق مر جائے گی، پھر دوبارہ صور پھونکیں گے تو سب لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے اور رب العالمین کے دربار میں پیش ہو جائیں گے۔

⑲ حساب کتاب اور ثواب و عقاب کے فیصلے حق ہیں۔ بندوں کے اعمال لوح محفوظ سے اس طرح لکھے جاتے ہیں جس طرح ان کے متعلق اللہ کی قضا و قدر واقع ہو چکی ہے۔

⑳ قلم حق ہے، جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی تقدیر کو لکھا ہے اور اپنے پاس اس کا شمار کر رکھا ہے۔

㉑ قیامت کے دن شفاعت کا ہونا حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ ایک قوم کی شفاعت کریں گے، لہٰذا

وہ دوزخ میں نہ جائے گی۔ ایک قوم ہمیشہ دوزخ میں رہے گی، وہ قوم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر اور شرک کرنے والے، اس کا انکار کرنے والے اور اس کی تکذیب کرنے والے بندوں پر مشتمل ہو گی۔

(۲۲) قیامت کے دن موت کو جنت اور جہنم کے درمیان ذبح کر دیا جائے گا۔

(۲۳) جنت اور جہنم اور ان دونوں میں جو کچھ ہے، وہ سب کچھ پیدا ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جنت اور دوزخ کے لیے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ جنت اور جہنم اور ان دونوں میں موجود چیزیں کبھی فنا نہ ہوں گی۔ اگر کوئی بدعتی اور مخالف یا کوئی زندیق یہ دلیل پیش کرے:

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ﴾ [القصص: ۸۸]

[ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے، مگر اس کا چہرہ]

یا اس جیسی کسی اور متشابہ قرآنی آیت کو بہ طور دلیل لائے تو اسے یہ جواب دیا جائے گا کہ ہر چیز جس کا فنا اور ہلاک ہونا اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے، وہ ہلاک ہونے والی ہے، جبکہ جنت اور دوزخ کو تو اللہ تعالیٰ نے بقا کے لیے پیدا کیا ہے، فنا و ہلاک ہونے کے لیے نہیں، کیونکہ یہ دونوں چیزیں آخرت سے تعلق رکھتی ہیں نہ کہ دنیا سے جس کو فنا ہونا ہے۔ قیامت قائم ہوتے وقت، اور صور کی آواز پر کبھی حوروں کو موت نہیں آئے گی، کیوں کہ اللہ نے انھیں بقا کے لیے پیدا کیا ہے، فنا کے لیے نہیں، اس نے ان کے حق میں موت نہیں لکھی ہے، لہٰذا جو کوئی اس کے خلاف بات کرے گا، وہ بدعتی، مخالف اور سیدھی راہ سے ہٹا ہوا ہے۔

(۲۴) اللہ تعالیٰ کا ایک تخت ہے اور اس تخت کو اٹھانے والے بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس تخت کے اوپر ہے اور اس کی کوئی حد نہیں ہے۔

(۲۵) بلا کیف اس کے دو ہاتھ ہیں، جس طرح اس نے کہا ہے: ﴿خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ [ص: ۷۵] [میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا] نیز فرمایا ہے: ﴿يَدَاهُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ [المائدۃ: ٦٤] [اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں]

(۲۶) بلا کیف اس کی دو آنکھیں ہیں، جیسے اس کا فرمان ہے: ﴿تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا﴾ [القمر: ١٤] [جو ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی] اس کا ایک چہرہ ہے، جس طرح اس نے فرمایا ہے:

﴿وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ﴾ [الرحمن: ۲۷] [اور تیرے رب کا چہرہ باقی رہے گا، جو بڑی شان اور عزت والا ہے]

(۲۷) اللہ کے ناموں سے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ غیر اللہ ہیں، جس طرح معتزلہ اور خوارج نے کہا ہے۔

(۲۸) اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے، جس طرح اس نے کہا ہے: ﴿اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ﴾ [النساء: ۱۶۶] [اس نے اسے اپنے علم سے نازل کیا ہے] مزید کہا ہے: ﴿وَ مَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ﴾ [الفاطر: ۱۱] [اور کوئی مادہ نہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ بچہ جنتی ہے مگر اس کے علم سے]

(۲۹) اللہ تعالیٰ کے لیے سمع و بصر ثابت ہے۔ معتزلہ نے جو اس کی نفی کی ہے، وہ درست نہیں ہے۔

(۳۰) اللہ تعالیٰ کے لیے قوت بھی ثابت ہے، جیسے اس کا فرمان ہے: ﴿اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً﴾ [فصلت: ۱۵] [اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ بے شک وہ اللہ جس نے انھیں پیدا کیا، قوت میں ان سے کہیں زیادہ سخت ہے]

(۳۱) زمین میں اللہ تعالیٰ کی چاہت کے بغیر کوئی نیکی و بدی نہیں ہوتی، سب چیزیں اس کی خواہش سے ہوتی ہیں، جس طرح اس نے فرمایا ہے: ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ [التکویر: ۲۹] [اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے] مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے اور وہ اس بات کے قائل ہیں جو اللہ نے چاہا وہی ہوا اور وہ نہ ہوا جو اس نے نہ چاہا۔

چاہا ہم نے وے نہ چاہا تو نے
تیرا چاہا ہوا ہمارا نہ ہوا

اللہ! اللہ! کوئی شخص کام کرنے سے پہلے کچھ نہیں کر سکتا اور نہ کوئی اللہ کے علم سے باہر ہو سکتا ہے۔ جس چیز کے متعلق اللہ کے علم میں یہ بات ہے کہ بندہ وہ کام نہیں کرے گا تو بندہ وہ کام نہیں کر سکتا۔

(۳۲) اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں ہے، بندوں کے افعال اللہ ہی کے پیدا کیے ہوئے ہیں، بندے کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے۔

(۳۳) مومنوں کو اللہ ہی نے اطاعت کرنے کی توفیق بخشی ہے اور کافروں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے۔ ایمان والوں پر وہ مہربان ہوا ہے اور ان کی طرف نظر رحمت سے دیکھا ہے، انھیں درست

کیا اور انھیں ہدایت عطا فرمائی۔ کافروں پر وہ مہربان ہوا اور ان کی اصلاح کی اور نہ انھیں راہ دکھائی۔ اگر وہ ان کی اصلاح فرماتا تو وہ سب صالحین بن جاتے اور اگر وہ انھیں راہِ ہدایت دکھاتا تو وہ سب ہدایت یافتہ ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ سب کافروں کو سنوار دے اور ان پر مہربانی فرمائے، یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں، جیسے کہ اس نے فرمایا ہے:

﴿ وَ لَوْ شَآءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ [النحل: ۹] [اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ضرور ہدایت دے دیتا] لیکن اس نے یہی چاہا کہ وہ کافر رہیں، جس طرح کہ اس کے علم میں تھا، لہٰذا اس نے انھیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا، انھیں گمراہ کیا اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔

(۳۴) اہلِ حدیث اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کے کسی نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں، مگر جو اللہ تعالیٰ چاہے، وہ اپنے کام اللہ تعالیٰ کو سونپتے ہیں، اپنی حاجت کو ہر وقت اسی کے سامنے رکھتے ہیں اور ہر حال میں اپنے فقر و فاقے کو اس کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

(۳۵) اللہ تعالیٰ سنتا ہے شک نہیں کرتا، دیکھتا ہے شک نہیں کرتا، بے جہل جانتا ہے، بے بخل جواد و سخی ہے، نسیان و سہو کے بغیر حفیظ ہے، غیر غافل قریب ہے، بولتا ہے، نظر کرتا ہے، ہنستا ہے، خوش ہوتا ہے، محبت کرتا ہے، ناپسند کرتا ہے، دشمن رکھتا ہے، راضی ہوتا ہے، خفا ہوتا ہے، رحم کرتا ہے، بخشتا ہے، معاف کرتا ہے، دیتا ہے، منع کرتا اور روکتا ہے، ہر رات آسمانِ دنیا پر اترتا ہے جس طرح وہ چاہتا ہے، اس جیسی کوئی چیز نہیں، وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔

(۳۶) بندوں کے دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے، انھیں اُلٹ پلٹ کرتا ہے۔

(۳۷) اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر اپنے ہاتھ سے پیدا کیا ہے۔

(۳۸) قیامت کے دن آسمان و زمین اس کی ہتھیلی میں ہوں گے۔

(۳۹) وہ آگ میں اپنا قدم رکھے گا تو وہ لپٹ جائے گی۔

(۴۰) وہ اپنے ہاتھ سے ایک قوم کو آگ سے نکالے گا۔

(۴۱) جنتی لوگ اس کے چہرے کی طرف نظر کریں گے اور اس کا دیدار کریں گے، لہٰذا وہ اللہ ان کی آؤ بھگت کرے گا اور ان کے سامنے تجلی فرمائے گا۔

(۴۲) اللہ تعالیٰ کا قیامت کے دن یوں دیدار کیا جائے گا جس طرح چودھویں رات کا چاند دیکھا جاتا

ہے۔ مومن تو اسے دیکھیں گے، مگر کافر اس کے دیدار سے محروم ہوں گے، کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اوٹ میں رکھے جائیں گے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾ [المطففين: ١٥] [ہرگز نہیں، بے شک وہ اس دن یقیناً اپنے رب سے حجاب میں ہوں گے] موسیٰ علیہ السلام نے اس دنیا میں اللہ تعالیٰ سے دیدار کا سوال کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر تجلی فرما کر اسے ریزہ ریزہ کر دیا تھا، پھر موسیٰ علیہ السلام کو بتا دیا کہ دنیا میں اس کا دیدار ممکن نہیں ہے، البتہ آخرت میں اس کا دیدار نصیب ہوگا۔

(۴۳) قیامت کے دن بندے اللہ کے سامنے پیش کیے جائیں گے اور وہ بذاتِ خود ان کا حساب لے گا، اس کے سوا کوئی حساب لینے والا نہیں ہوگا۔

(۴۴) قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جس کے ساتھ اس نے کلام کیا ہے اور وہ مخلوق نہیں ہے۔ جس نے یہ گمان کیا کہ قرآن مجید مخلوق ہے، وہ جہمی اور کافر ہے۔ جس نے یہ گمان کیا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، پھر توقف کیا اور یہ نہ کہا کہ وہ مخلوق نہیں تو وہ پہلے موقف اور قول سے بھی زیادہ اخبث ہے۔ جس نے یہ گمان کیا کہ ہماری تلاوت کے الفاظ ہماری مخلوق ہے اور قرآن کلام اللہ ہے تو وہ جہمی ہے۔

(۴۵) اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے خود کلام کیا، اپنے ہاتھ سے تورات لکھی اور اس دوران میں اللہ تعالیٰ ہی ان سے ہم کلام رہا۔

(۴۶) خواب اللہ کی طرف سے سچی وحی ہوتی ہے، جب کہ خواب دیکھنے والا اپنے ایسے خواب میں، جو خواب پریشان و پراگندہ نہیں ہے، جو کچھ دیکھے، کسی عالم کو وہ خواب سنائے، وہ عالم اسے سچا سمجھے اور صحیح طریقے سے تحریف کے بغیر اس کی تعبیر و تاویل بیان کرے تو ایسے خواب کی تعبیر سچی ہوتی ہے۔ پیغمبروں کے خواب وحی تھی۔ اس شخص سے زیادہ جاہل کون ہوگا جو خواب پر طعن کرتا ہے اور گمان کرتا ہے کہ وہ کچھ نہیں ہے۔ ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ جس نے یہ بات کہی وہ غسلِ احتلام کا معتقد نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ خواب مومن کا ایک کلام ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے کلام کرتا ہے،[1] کیونکہ خواب اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔

(1) بعض روافض کی کتابوں (بحار الأنوار: ٥٨/٣١١) میں ہمیں یہ روایت نظر آئی ہے، البتہ اہلِ سنت کی مستند کتبِ حدیث میں یہ روایت ہمیں نہیں ملی۔ واللہ اعلم

(۴۷) اہلِ حدیث کے نزدیک ایمان یہ ہے کہ اللہ پر ایمان لایا جائے، نیز اس بات پر کہ جو چیز مخلوق سے چوک گئی ہے، وہ انھیں پہنچنے والی نہ تھی اور جو چیز انھیں پہنچی ہے، وہ ان سے چوکنے والی نہ تھی۔

(۴۸) اسلام یہ ہے کہ بندہ یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے، جس طرح کہ حدیث میں آیا ہے۔ اہل حدیث کے نزدیک اسلام غیر ایمان ہے۔

(۴۹) وہ اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مقلب القلوب ہے۔

(۵۰) وہ اس کے بھی اقراری ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت آپ ﷺ کی امت کے اہلِ کبائر کے حق میں ہوگی۔

(۵۱) موت کے بعد اٹھنا حق ہے، پھر اللہ کی طرف سے بندوں کا محاسبہ ہونا حق ہے اور اللہ کے سامنے کھڑا ہونا حق ہے۔

(۵۲) اہلِ حدیث اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ ایمان قول و عمل کا نام ہے اور وہ اس بحث میں نہیں پڑتے کہ ایمان مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ ہاں یہ ضرور کہتے ہیں کہ اسمائے الٰہی عین الٰہی ہیں۔

(۵۳) وہ اہلِ کبائر میں سے کسی کے دوزخی ہونے کی گواہی دیتے ہیں نہ کسی موحد معین کے جنتی ہونے کا حکم لگاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ خود ہی انھیں جہاں چاہے داخل کرے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کا اختیار اللہ کو ہے، چاہے انھیں عذاب کرے اور اگر چاہے تو انھیں بخش دے۔

(۵۴) اہلِ حدیث اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ موحدین کی ایک جماعت کو دوزخ سے نکالے گا، جس طرح رسول اللہ ﷺ سے احادیث میں مروی ہیں۔

(۵۵) وہ دین کے اندر قدر سے متعلق جدال اور جھگڑے کو ناپسند کرتے ہیں، جس میں اہل جدل مناظرہ کرتے اور جھگڑتے ہیں۔

(۵۶) اہلِ حدیث صحیح روایات کو مانتے ہیں اور ان آثار کو بھی جو ثقات کے ذریعے مروی ہیں اور ایک عادل راوی نے دوسرے عادل راوی سے ان کو روایت کیا ہے، یہاں تک اس کا سلسلہ روایت رسول اللہ ﷺ تک جا پہنچے۔

(۵۷) وہ مسئلہ تقدیر میں "کیوں کر" اور "کس لیے" کے الفاظ نہیں بولتے، اس لیے کہ یہ کہنا بدعت ہے۔

(۵۸) ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بدی کا حکم نہیں دیا ہے، بلکہ بدی سے منع فرمایا ہے اور بھلائی کا

حکم دیا ہے۔ وہ شرک سے راضی نہیں، اگرچہ شرک اس کے ارادے سے ہوتا ہے۔

(۵۹) اہلِ حدیث رسول اللہ ﷺ سے مروی احادیث کی تصدیق کرتے ہیں، جیسے یہ حدیث کہ اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا پر نزول فرما کر کہتا ہے: کوئی استغفار کرنے والا ہے؟...الخ۔[1]

(۶۰) وہ کتاب و سنت سے تمسک کرتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾ [النساء: ٥٩] [پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ]

(۶۱) وہ ائمہ دین اور سلف صالحین کے اتباع کے معتقد ہیں، نیز وہ اس بات کے بھی معتقد ہیں کہ وہ اپنے دین میں اس چیز کا اتباع نہ کریں گے جس کا اللہ تعالیٰ نے اذن نہیں دیا۔

(۶۲) وہ اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جلوہ گر ہو گا، جس طرح اس نے فرمایا ہے: ﴿وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ [الفجر: ٢٢] [اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے جو صف در صف ہوں گے]

(۶۳) اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے، جس طرح چاہتا ہے، قریب ہوتا ہے: ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ [ق: ١٦] [اور ہم اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں]

(۶۴) وہ اس بات کے معتقد ہیں کہ عید، جمعہ اور جماعت ہر نیک و بد امام کے پیچھے ادا کرنا درست ہے۔

(۶۵) وہ سفر و حضر میں دونوں موزوں پر مسح کے ثبوت کے قائل ہیں۔

(۶۶) وہ مشرکوں کے خلاف فرضیتِ جہاد کو ثابت کرتے ہیں۔ جب سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو مبعوث کیا ہے، اس وقت سے لے کر آخر تک ایک جماعت دجال سے قتال کرے گی۔

(۶۷) اہلِ حدیث مسلمانوں کے لیے دعاے خیر کے معتقد ہیں، نیز اس بات کے معتقد ہیں کہ وہ ان کے خلاف تلوار لے کر خروج کریں اور نہ فتنے کے وقت لڑائی کریں۔

(۶۸) وہ دجال کے نکلنے اور عیسیٰ علیہ السلام کے اسے قتل کرنے کو بھی سچ مانتے ہیں۔

(۶۹) بدن عنصری کے ساتھ اور سوتے میں خواب کے اندر بھی معراج کا ہونا سچ جانتے ہیں۔

(۷۰) وہ یہ بھی سچ سمجھتے ہیں کہ مسلمان مردوں کے حق میں ان کی موت کے بعد ان پر دعا کا صدقہ کرنا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٥٨)

انھیں پہنچتا ہے۔

(۷۱) وہ دنیا میں جادوگروں کے وجود کو سچ مانتے ہیں، لیکن جادوگر کافر ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ جادو برحق ہے اور دنیا میں یہ موجود ہے۔

(۷۲) وہ ہر اہلِ قبلہ مردے کی نماز جنازہ ادا کرنے کے معتقد ہیں، خواہ وہ مومن ہو یا فاجر۔

(۷۳) وہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ رزق اللہ کی طرف سے ہے، وہی بندوں کو رزق عطا فرماتا ہے، خواہ وہ حلال ہو یا حرام۔

(۷۴) شیطان انسان کو وسوسہ ڈال کر شک میں مبتلا کر دیتا ہے اور اسے خبطی بنا دیتا ہے۔

(۷۵) یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکوں کو اپنی نشانیوں کے ساتھ، جو ان پر ظاہر ہوتی ہیں، خاص کرے۔

(۷۶) حدیث قرآن سے منسوخ نہیں ہوتی ہے۔

(۷۷) فوت شدہ بچوں سے متعلق اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے، چاہے انھیں عذاب دے، چاہے تو ان سے وہ سلوک کرے جو وہ چاہے۔

(۷۸) بندے جو کچھ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور اس نے یہ لکھ رکھا ہے کہ یوں ہوگا اور بندہ یوں کرے گا۔

(۷۹) اہلِ حدیث اللہ کے حکم پر صبر کرنے، اس کے حکم کو لازم پکڑنے، اس کام سے باز رہنے جس سے اس نے منع کیا ہے، اللہ کے لیے خالص عمل کرنے، مسلمانوں کی خیر خواہی کرنے، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے، جماعت مسلمین کو نصیحت کرنے، کبائر، جیسے زنا، جھوٹی بات، گناہ، فخر اور غرور، لوگوں کی عیب جوئی، خود پسندی اور گھمنڈ سے بچنے، بدعت کی طرف بلانے والے سے دور رہنے، تلاوتِ قرآن اور کتابتِ احادیث میں مشغول رہنے، تواضع، عاجزی اور حسن خلق کے ساتھ فقہ حدیث میں نظر کرنے، نیکی کے خرچ کرنے، ایذا دہی سے رکنے، غیبت وچغل خوری کے ترک کرنے اور کھانے پینے کے اسباب کی جستجو کرنے کے معتقد ہیں۔

(۸۰) اہلِ حدیث کا یہ بھی اعتقاد ہے کہ جن لوگوں کو اللہ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کی صحبت کے لیے چن لیا تھا، ان کے فضائل کو لینا، ان کے حقوق پہچاننا، ان کی ان چھوٹی بڑی باتوں سے باز رہنا، جو ان کی آپس میں لڑائی بھڑائی میں ہوئی تھیں، ان کی خوبیوں کو بیان کرنا، ان کی برائیوں کے ذکر سے رکنا

لازمی ہے۔ چنانچہ جو کوئی سارے اصحابِ رسول ﷺ کو یا ان میں سے کسی ایک کو گالی دے گا یا ان کی شان گھٹائے گا یا ان پر طعن کرے گا یا ان میں سے کسی ایک پر عیب لگائے گا تو وہ بدعتی، رافضی، خبیث اور مخالفِ سنت ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی فرض عبادت قبول کرتا ہے اور نہ نفل، بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت رکھنا سنت اور ان کے حق میں دعا کرنا قربتِ الٰہی کا سبب ہے۔ ان کی اقتدا کرنا راہِ ہدایت کا وسیلہ ہے اور ان کے آثار کو پکڑنا باعثِ فضیلت ہے۔

(۸۱) رسول اللہ ﷺ کے بعد امت کے بہترین شخص ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر عمر پھر عثمان اور پھر علی رضی اللہ عنہم ہیں۔ بعض لوگوں نے اس حوالے سے عثمان رضی اللہ عنہ ہی پر توقف کیا ہے۔ یہ سب خلفاے راشدین ہدایت یافتہ ہیں۔ پھر ان چاروں کے بعد سارے اصحابِ رسول بہترین لوگ ہیں۔

(۸۲) کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ان کی برائی کرے یا کسی عیب ونقصان کے ساتھ ان پر طعن کرے، لہٰذا جو کوئی ایسا کرے گا تو بادشاہ کے ذمے تادیبی کارروائی کرتے ہوئے اسے سزا دینا واجب ہے، اسے معافی دینے کا حق نہیں ہے، بلکہ اسے ضرور سزا دے اور اس سے توبہ کروائے، پھر اگر وہ توبہ کر لے تو بہتر ہے، ورنہ پھر اسے سزا دے اور اسے ہمیشہ قید میں بند رکھے، یہاں تک کہ اپنی بات سے رجوع کر لے یا قید ہی میں مر جائے۔

(۸۳) اہلِ حدیث عرب کا بھی حق اور فضل پہچانے اور رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے سبب ان سے محبت رکھے، کیونکہ عرب سے محبت ایمان اور ان سے بغض نفاق ہے، نیز وہ کچھ نہ کہے جو شعوبیہ یا رذیل موالی، جو عرب سے محبت نہیں رکھتے ہیں، کہتے ہیں اور ان کی بزرگی کا اقرار نہیں کرتے، کیونکہ ان کا یہ قول بدعت ہے۔

(۸۴) جس شخص نے کسب وتجارت یا حلال طریقے سے کمائے ہوئے پاک مال کو حرام کہا تو اس نے جہالت و خطا اور شریعت کی خلاف ورزی کا مظاہرہ کیا، بلکہ سارے مکاسب اپنے طور حلال ہیں، انھیں اللہ و رسول نے حلال کیا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اپنی جان اور اپنے اہل وعیال کے لیے اپنے رب کا فضل تلاش کرنے کے لیے کوشش کرے۔ جو شخص کسب کا معتقد نہ ہونے کی وجہ سے اس سعی کو ترک کرے گا، وہ مخالفِ شریعت ہے۔

(۸۵) دین تو صرف اللہ تعالیٰ کی کتاب آثار، سنن اور روایاتِ صحیحہ کا نام ہے، جو روایات صحیح، قوی اور

معروف اخبار کے ساتھ مروی ہیں، جو ایک دوسری کی تصدیق کرتی ہیں، حتی کہ رسول اللہ ﷺ تک اور آپ ﷺ کے اصحاب اور تابعین اور تبع تابعین تک پہنچ جاتی ہیں۔ ان کے بعد جو معروف، مقتدی، متمسک بسنت اور متعلق بآثار امام ہیں وہ کسی بدعت کے ساتھ معروف نہیں ہیں اور نہ ان پر جھوٹ کے ساتھ طعن کیا گیا ہے اور نہ وہ خلاف کے ساتھ ہی بدنام ہیں۔ یہ اہلِ سنت و جماعت کے عقائد اور اصحابِ روایات و اثر اور حاملین علم سنت کے عقائد ہیں، لہٰذا تم ان سے وابستہ ہو جاؤ اور انھیں کو سیکھو سکھاؤ۔ وباللہ التوفیق.

کتبِ عقائد:

مذکورہ بالا سب عقائد کو حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے کتاب "حادي الأرواح إلى بلاد الأفراح" میں دو جگہ متفرق ذکر کیا ہے، جب کہ ہم نے ان دونوں مقامات کو ایک جگہ جمع کر کے ان کا ترجمہ کر دیا ہے۔ یہ عقائد شیخ اشاعرہ ابو الحسن کے موافق و مختار ہیں اور ائمہ اہلِ حدیث رضی اللہ عنہم کے بیان کے مطابق ہیں۔ رہے مذاہب ماتریدیہ وغیرہ تو وہ ان کی کتابوں میں لکھے ہیں۔ یہ کتابیں مشہور و معروف ہیں جیسے "فقہ اکبر" اس کی شرح "وصیت امام اعظم"، اس کا ترجمہ "عقائد نسفی"، اس کی شرح "مواقف" اس کی شرح "تکمیل الایمان" شیخ عبدالحق دہلوی، کتاب الایمان، رسالہ "ما لا بد منہ" کی شرح کتاب العقائد، احیاء العلوم کی شرح، بحث خدا کی صفات کیمیائے سعادت اور اربعین فی اصول الدین وغیرہ میں۔ ان میں سے بعض کا اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے۔ مقلدین ان کتابوں کی بہت قدر کرتے ہیں، لہٰذا ان کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔

رسالے کا منہج:

اس رسالے میں صرف اہلِ حدیث سلف صالحین کے عقائد کا بیان مقصود تھا، جس شخص کو ان کے ہم عقیدہ اور ہم طریقہ ہونے کا شوق ہو، وہ اس رسالے کے مطابق عقیدہ رکھے اور اہلِ کلام کے جھگڑے اور فساد نیز علمائے زمانہ کے عقلی دلائل سے اپنے آپ کو دور رکھے۔ اس کی توفیق بخشنا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ متقی اور دین دار ہونا تقدیر سے ہوتا ہے، اس میں کسی کا کچھ زور نہیں ہے۔

اہل جنت کے عقائد:

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے ان عقائد کو بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

''یہ قول وعمل اور اعتقاد جنت کی بشارت کے مستحق لوگوں کا مذہب ہے۔''[1]

عقائد سیکھنے کی عمر:

امام غزالی رحمہ اللہ نے کہا ہے:

''لڑکوں کی نشوونما کے شروع میں انھیں عقائد کی تعلیم دینا چاہیے، تاکہ وہ انھیں خوب اچھی طرح یاد کر لیں، پھر جیسے جیسے وہ بڑے ہوتے جائیں، ان پر عقائد کے تھوڑے تھوڑے معانی واضح ہوتے جائیں، کیونکہ اس علم کی ابتدا یاد کرنا ہے، پھر سمجھنا اور پھر اس کے مطابق عقیدہ بنانا، یقین کرنا اور تصدیق کرنا ہے۔ لڑکوں میں یہ کام دلیل کے بغیر ہو جاتا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے نشوونما کی ابتدا میں آدمی کے دل کو حجت و برہان کی ضرورت و حاجت کے بغیر کھول دیا ہے۔''[2] انتھی

خاتمہ تالیف:

میں نے اس رسالے کو نظر ثانی کر کے اس لیے صحیح کیا ہے، تاکہ میرا پوتا ابوالفتح میر ابوالحسن خان ۔جعله الله من أهل العلم والإيمان۔ جب مکتب میں بیٹھے اور اردو سمجھنے لگے تو سب سے پہلے ان شاء اللہ اس رسالے کو پڑھے اور اپنی ماں، خالہ اور پھوپھی بلکہ سارے ملازمین اور نوکروں چاکروں کو پڑھ کر سنائے۔ وبالله التوفيق، والحمد لله أولا و آخرا و ظاهرا و باطنا.

---

[1] حادي الأرواح (ص: ٢٩٢)

[2] إحياء علوم الدين (١/ ٩٤)

خاتمہ

طبع اول:

الحمد للہ والمنۃ کہ در اوائل شہر ربیع الآخر ۱۲۸۵ ہجری عجالہ نافعہ، حاوی براہین ساطعہ، مثبت صفت استوا و فوقیت از براے خدا با تنزیہ از جسم و جسمیت مسمّٰی بہ "الاحتواء علی مسئلۃ الاستواء" از رشحاتِ قلم فاضلِ ربانی، عالم حقانی، بحر موّاج معقول ومنقول، حاوی فروع واصول، ذو المفاخر والمناصب مولانا سید محمد صدیق حسن خان ۔لا زالت شموس افاضاتھم بازغۃ و اقمار افاداتھم ساطعۃ۔ باہتمام خاک پائے سادات عظام خاکسار حسین علی ۔عفی اللّٰہ عنہ المعاصی والآثام۔ در مطبع گلشن اودھ واقع لکھنؤ مطبوع گردید۔

طبع ثانی:

الحمد للہ کہ یہ رسالہ اُردو بعد نظر ثانی مولف موصوف مطبع صدیقی واقع بلدہ بنارس میں باہتمام وتصحیح مجمع فضل وکمال مولوی محمد سعید صاحب مدرس مدرسہ اسلامیہ واقع محلّہ دارانگر بماہ شوال ۱۳۰۲ ہجری۔ حسب فرمایش جماعت کثیرہ موحدین، متبعین مطبوع طبع اہلِ دین ہوا۔ تکرار طبع نے مزا قند مکرر کا دیا۔ تاریخِ طبع یہ آیتِ شریفہ ہے: ﴿نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ﴾ اللہ تعالیٰ خاتمہ ہم سب کا اپنی توحید سدید اتباع رسول حمید ﷺ پر کرے۔ ایمانِ صحیح اعتقادِ رجیح پر چلاوے، کلمہ طیبہ پر مارے۔ إنه قريب مجيب وما ذلك عليه بعزيز!

قصیدہ

أنشدها الراجي رحمة ربه المنان أبو الصمام محمد عبد الرحمن بقا الغازيفوري عفي عنه يمدح النواب والاجاه أمير الملك السيد محمد صديق حسن خان بهادر دام بالمجد والتفاخر.

يا لائمي كفّ عني اللوم والحنقا ... إن الهوى لم يدع من مهجتي رمقا
بكيت وجداً على الأطلال والدمن ... حتى نبرى كبدي بالحزن منفلقا
ما عشت بعد سليمي كربة واسىً ... وما تمضمض جفتي بالكرى قلقا
يكاد يدركني موتي إذا رحلت ... والقلب أضحى مع الركبان منطلقا
قاسيت فيها هموماً كلها ظلم ... وبات صدري بنار الشوق محترقا
داء عضال عراني في محبتها ... هل من طبيب يداوي علتي شفقا
لها ذوائب سود فوق وجنتها ... سبحان من جمع الإصباح والغسقا
مرداء بهكنة غيداء عيطلة ... مغذوة بنمير لم يزل غدقا
مريضة العين مكحول مهفهفة ... يدنو الحليم إلى أمثالها عشقا
ألقى علي خطوباً صارف الزمن ... إن يلقهن على الجلمود انفتقا
فما تقدمتها إلا وصاحبني ... صبر جميل فلا جبنا ولا فرقا
والصبر يأتيك عند اليأس بالفرج ... منهج لصاحبه من سوء مالحقا
فالحمد لله إني قد لقيت به ... فتى كريماً إلى المعروف مستبقا
حوشَ الفؤاد سريًا فاتكا سُهُدا ... مبطنا لو ذعيا ماهرا اَفقا
ندسا تقيا نقيا عارفا فطنا ... سميدعا حاذ حسن الخلق والخلقا
من لا يبالي إذا ما جاد متربة ... يفني خزائن من أمواله شمقا

النار موقدة في كل ليلة فلا أشماز من الضيف الذي طرقا

إذا تحلى لنا في نور طلعته تحيرت دونه أبصارنا برقا

يدبر الملك نظما فألقا حسنا لا يعتريه عثار يعقب الرهقا

لم يبق للظلم في سلطانه أثر طاب البلاد وقام العدل مرتفقا

أصاب فيما أفاد الناس من حكم له لسان يراعي الحق إذ نطقا

لله درك يا صديق مهتديا هديت للحق أصحاب الهوى شفقا

قد جاء بالحق ما أمليت في الزّبر فليس من باطل إلا وقد زهقا

وحاسد لك في البغضاء منهمك غشاه منك شديد الخوف مخترقا

عضبا صقيلا من الهندية القضب بضربة تدع الهرماس مصطلقا

فما استطاع فراراً من شدائذها إلا وظفر أبي يحيىٰ به علقا

فزادك الله إقبالا ومنزلة وهز جود يديك الواصف الذلقا

ما ناحت الورق في الأغصان واجدة

وما تأوّه من فرط الغرام بقا

وله أيضاً

تمنيت قطع السبب المتماحل لأفضي إلى نادى الأمير الحلاحل

عليم بما يحوي كتاب و سنة له قلم يحيىٰ رسوم الأوائل

أديب ذليق فاخرت بوجوده وجوه ذرافات الكرام الأفاضل

يلوح ضياء الحق مما يفيده بأحسن تبيان وسوق الدلائل

أفاد الورى ما خطه بيمينه عليه ثناء من جميع القبائل

لقد فاق أهل العلم مجداً ورفعةً بصائب فكرٍ في صنوف المسائل

تحلى بعلم العقل والنقل واحتوى جميعا وزان العلم حسن الشمائل

هو السيد النواب صديقنا الحسن شريف عفيف جامع للفضائل

فأكرم به من فاضل في علومه عباب بحار غير ذات سواحل
لقد أخلص الإسلام عن كل بدعة فحول ناساً عن طريق الغوائل
تبحر في علم الحديث ديانة سقاه الحديث خندريس الفضائل
وأعرض عن كلٍ سواه وهكذا ليفعل ذو قلب إلى الله آئل
وكيف وفي علم الحديث بصيرة لمن ينثني بالحق عن كل باطل
به يهتدي في ليلة طلمسانة وللمرء يوم الحشر خير الوسائل
خشاش إذا هم الذي يفظع الفتى سريع إلى الحلى ببيض الناصل
إذا شب نيران الوغى فكأنه تراه هزبرا ماشيا تحت وابل
وتشتد أمواج المنية دونه وقد خطرت سمر الرماح الذوابل
جواد كريم فائق في نواله يعز على ما يحتوي رد سائل
إذا أمحل البلدان عام جمادها ترى كفه تزري بسحب هواطل
ويعطي أولي الحاجات جزلا من اللهى وهل بابه إلا ثمال الأرامل
فبوركت من غيث كانٍ عهاده قلائد درٌّ في نحور العطابل
وزادك ربي عزة ومهابة تشق فواد الحاسد المتضائل
متى فاض من ذكر الحبيب وداره مدامع صبٍ لا يعي قِول عاذل

المعتقد المنتقد

تالیف

امام العصر علامہ نواب صدیق حسن خان حسینی بھوپالی رحمہ اللہ
(۱۲۴۸ھ-۱۳۰۷ھ)

بسم الله الرحمن الرحيم و به أستعين

تمہید

الحمد لله الذي أرشد قوما إلى الانقطاع من دون الخلق إليه، ووفقهم للاعتماد في كل أمر عليه، و صرف آخرين عن كل مكرمة وفضيلة، وقيض لهم قرناء فأدوهم إلى كل ذميمة من الأخلاق و رذيلة، وطبع على قلوب آخرين فلا يكادون يفقهون حديثا ولا قولا، وثبطهم عن سبل الخيرات فما استطاعوا قوة ولا حولا، وصلى الله على سيدنا محمد عبده ورسوله ونبيه و خليله سيد البشر، وأفضل من مضى وغبر، الجامع لمحاسن الأخلاق واليسر، والمستحق لاسم الكمال على الإطلاق من البشر، وختم به الأنبياء والمرسلين، وأعطاه ما لم يعط أحدا من العالمين، وعلى آله وصحابته والتابعين، ومن تبعهم بالإحسان أجمعين. أما بعد:

تعارفِ کتاب:

اس رسالے میں سلف اور اکابر اہلِ سنت و جماعت کے عقائد کا بیان ہے، نیز اس میں بعض شرکیہ وکفریہ کلمات اور ریا کاری کی بعض صورتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ میں نے اس رسالے میں اہلِ سنت کے ہر گروہ اور ہر جماعت کے بڑے عالم کے دینی عقائد کو الگ الگ فصلوں میں تحریر کیا ہے۔ ہر چند بیانِ الفاظ میں تفاوت و فرق ہے، لیکن اکثر معانی متحد اور یکساں ہیں۔ اگرچہ مسائلِ اعتقاد میں تکرار ہے، مگر عبارت علاحدہ علاحدہ ہے۔ مبانی و معانی کا یہ تکرار اس لحاظ سے ہے کہ اس فرقہ ناجیہ کے نفسِ عقائد متحد المعنی ہیں، ناچار مبانی کی شرکت ضروری ہے۔

اس جمع و تالیف کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے بعض عقائد میں علمائے سلف و خلف کا اختلاف واضح ہو کر قوی کی ضعیف سے تمیز حاصل ہو گی اور جب ایک دین دار مومن بار بار ان کلمات طیبات اور

عبارات مبارکات کا مطالعہ کرے گا تو اس کے دل میں یہ اعتقاداتِ صحیحہ راسخ ہو جائیں گے اور اہلِ علم کی طرح طرح کی تقریرات وتحریرات سے اس کے فہم وشعور میں ایک طرح کا ملکہ راسخہ پیدا ہو گا۔ ان اعتقادات و مسائل کے دلائل اصولِ دین کی کتب مطولہ میں مرقوم ہیں، بنا بریں اختصار واقتصار کی غرض سے انھیں یہاں درج نہیں کیا گیا، بلکہ اہلِ علم کے اقوال و معانی کے نقل کرنے ہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ براہین وحجج کے بیان کی جگہ کتبِ فن ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ عقائد کے مختصر رسائل میں، جو عربی، اردو یا فارسی میں خاص میری تالیف ہیں، مذکورہ عقائد کے دلائل ونصوص تصحیح وتنقید کے ساتھ مرقوم ہیں، جیسے رسالہ "الانتقاد الرجيح بشرح الاعتقاد الصحيح" رسالہ "قطف الثمر في عقيدة أهل الأثر" رسالہ "القائد إلى العقائد" رسالہ "بغية الرائد في شرح العقائد" یا رسالہ "فتح الباب لعقائد أولي الألباب" وغیرہ۔

مجتہدین ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے عقائد، جو ان کے مذاہب کے مقلدین نے لکھے ہیں، اِلا ماشاء اللہ متفق ومتحد ہیں۔ اسی طرح صوفیہ رحمہم اللہ کے عقائد اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ کے عقائد کے موافق ہیں۔ فقہا، صوفیا، اہلِ حدیث اور اہلِ ظاہر کے درمیان اصولِ دین میں کوئی بڑا اختلاف نہیں ہے۔ دس بارہ مسائل میں اشعریہ اور ماتریدیہ باہم مختلف ہیں۔ دو چار مسئلوں میں حنابلہ کو، اسی طرح صوفیا کو ان سے اور اہلِ حدیث کو اصولیین مذاہب سے اختلاف ہے۔ رہے باقی عقائد تو اس میں سارے اہلِ سنت یکساں اور برابر ہیں، ولله الحمد. پھر اکثر جگہ اختلاف کا مرجع اور مآل نزاع لفظی کی طرف ہے اور جس جگہ نفسِ مسئلہ میں اختلاف ہے، وہ مسائل انتہائی کم ہیں، اس کے ساتھ ساتھ مسائل کا وہ اختلاف ایک دوسرے کی تکفیر وتضلیل کی طرف نہیں لے جاتا ہے، کیونکہ اکثر کا اعتبار ہوتا ہے اور اکثر کا حکم کل کا حکم ہوتا ہے۔

اینجا ز فیض پیر مغان بزمِ وحدت ست
در پردہ دار دیدۂ کثرت نمائی را

[یہاں پیر مُغاں (آتش پرستوں کا پیر طریقت) کے فیض سے وحدت کی بزم برپا ہے،
اگرچہ پردہ دار کی نگاہ اسے کثرت دکھاتی ہو]

ہم نے اس کتاب میں بلند پایہ اہلِ علم کے عقائد کو ذکر کرنے کے لیے جو فصلیں قائم کی ہیں، ان میں جس کسی کے عقیدے کا دوسرے فرقے کے عقیدے سے اختلاف ہے یا وہ اختلاف

ظاہرِ کتاب اور سنت صحیحہ کے مخالف ہے تو اسے نہایت اختصار کے ساتھ ایک علاحدہ فصل میں لکھ دیا ہے، تاکہ ہر علمِ حق کا طالب راجح اور مرجوح میں فرق کر لے اور اپنے اعتقاد کو کتاب کے ظاہر اور واضح سنت کے موافق رکھے اور اشعری یا ماتریدی یا حنبلی مقلد نہ بنے۔

فقہاے مالکیہ و شافعیہ اصولِ دین میں ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ کے طریقۂ عقائد کے مقلد ہیں۔ احناف ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کے طریقے کے مقلد ہیں اور حنابلہ بذات خود صاحبِ اصولِ دین ہیں، جن کے عقائد ظاہرِ حدیث کے موافق ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے کسی جگہ اتفاقاً کسی ضعیف جانب کو اختیار کیا ہو۔

رہے اہلِ حدیث تو جس طرح وہ فروع میں کسی خاص امام کے مقلد نہیں ہیں، اسی طرح اصول میں بھی وہ اشعری ہیں نہ ماتریدی اور نہ حنبلی، بلکہ جو کچھ کتاب عزیز کے دلائل میں بیان ہوا ہے اور سنت مطہرہ وصحیحہ سے ثابت ہو چکا ہے، اسی پر اعتقاد رکھتے ہیں، خواہ ان کا وہ عقیدہ اشاعرہ کے موافق ہو یا ماتریدیہ کے مطابق ہو یا حنابلہ کے یا ان سب کے مخالف ہو۔ فرقہ ظاہریہ کا حال بھی کچھ اس طرح کا ہے کہ وہ ظاہر و واضح قرآن و حدیث کے پابند ہیں، کسی کے اجتہاد اور رائے کے ضرورت مند نہیں ہیں۔

صوفیہ صافیہ کا بھی یہی طریقہ ہے کہ وہ اصول و فروع میں اہلِ حدیث کے طریقے پر گامزن ہیں اور عقیدہ و عمل میں کسی خاص مذہب کی تقلید کو واجب نہیں جانتے، بلکہ اتباع سنت کو تمام طریقوں پر مقدم رکھتے ہیں۔ کشف و مکاشفہ کے بعض مسائل میں ان کا اہلِ حدیث کے ساتھ تھوڑا سا اختلاف ہے، لیکن اکابر صوفیہ نے خود یہ تصریح کی ہے کہ کاشف کا کشف یا سوئے ہوئے کا خواب یا ملہم کا الہام کوئی شرعی دلیل نہیں ہے، اسی لیے یہ لوگ اصولِ عقائد میں غالباً اہلِ حدیث کے ساتھ موافق ہیں۔ یہ موافقت کیا ہی اچھی اور یہ اتفاق کیا ہی عمدہ ہے!

امت کے برگزیدہ لوگوں اور دینِ اسلام کے منتخب افراد میں یہی دو گروہ ہیں، ایک اہلِ حدیث، دوسرے صوفیہ۔ باقی رہے فقہاے مذاہب تو ان میں سے اکثر علماے دنیا ہیں، علماے آخرت نہیں اور ان کے احکام و فتاوی کا مرجع بس یہی دنیاوی امور اور معاملات ہیں، سوائے ان لوگوں کے جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت فرمائی ہے، وہی اس سے بچ پائے ہیں۔

علم اصولِ دین کی اہمیت:

اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ اصولِ دین کا یہ علم علوم دینیہ میں سے اشرف علم ہے۔ اس علم کا سیکھنا اور سکھانا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ قیامت کے دن اسی علم کی بنا پر نجات حاصل ہوگی۔ یہ علم بذات خود ایک صالح اور افضل عمل ہے، کیونکہ توحید اطاعت کے تمام کاموں کی بنیاد اور تمام نیکیوں سے افضل نیکی ہے۔

عمل سے پہلے عقیدے کی درستی ضروری ہے:

جب کسی شخص کا عقیدہ ہی درست نہیں تو اس کے سارے اعمال برباد ہیں، خواہ وہ کتنی ہی عبادت بجا لائے۔ آخرت میں اس عبادت کا اسے کچھ فائدہ نہ ہوگا، اور جس کسی کا عقیدہ درست ہے، اسے عمل قلیل بھی نفع دے گا۔ حدیث میں جن بہتر (۷۲) فرقوں کو ناری اور جہنمی قرار دیا گیا ہے، وہ سب اہلِ قبلہ ہیں اور عبادت کرتے ہیں۔ نماز، روزہ، زکات اور حج بجا لاتے ہیں، مگر اس فسادِ عقیدہ کی وجہ سے وہ جہنمی ٹھہرے۔ اس لیے یہ بات مقرر ہو چکی ہے کہ انسان عمل سے پہلے عقیدے کی اصلاح کرے اور اسے درست کرے، ورنہ ﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ﴾ [الغاشية: ٣] [محنت کرنے والے، تھک جانے والے] کا مصداق بن جائے گا، ساری محنت برباد اور الٹا گناہ لازم آئے گا۔

اہلِ اصول نے عقائد کے بیان میں بعض ایسے مسائل بھی لکھ دیے ہیں، جنھیں حقیقت میں عقیدے کے علم سے کوئی زیادہ تعلق نہیں ہے، بلکہ ان کی حیثیت مکملات کی ہے۔ جیسے بات سے بات نکل آتی ہے، اسی طرح اثنائے کلام میں موضوع سے متعلقہ امور کا ذکر بھی آجاتا ہے، چنانچہ وہ بیان اصول کے منافی نہیں ہے، بلکہ وہ ایمان ویقین اور اطاعت وفرمانبرداری کو قوت و طاقت اور کمال عطا کرتا ہے۔

کتاب کی ترجیحات:

اس رسالے میں انھیں معتبر علما کے اقوال نقل کیے گئے ہیں، جن کے علم و فضل، تقوی و طہارت، تحقیق و تنقیح اور تنقید پر کابراً عن کابر اعتماد ہے یا ان کی لغزشوں پر تنقید کا امکان بہت کم ہے۔ اس علم کے وہ طویل اور مختصر رسائل و کتب، جن میں ہر رطب و یابس جمع ہے، بہت زیادہ ہیں۔ ناظر

غیر مناظر کو ان فصول و اصول میں یہ بات بھی معلوم ہو جائے گی کہ کس عالم نے اپنے عقائد کے بیان میں کون سی بات زائد لکھی ہے اور کس نے فقط بیانِ اصول پر قناعت کی ہے، یا کس نے مزید کشف و انکشاف کیا ہے اور کس نے اجمال کو ترجیح دی ہے، لیکن اس کے باوجود ان سب کے عقائد کا مرجع ایک ہے، گو مبانی جدا جدا ہیں۔

عِبَارَاتُنا شَتّٰی وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ
وَ كُلٌّ إِلٰى ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيْرُ

[ہماری (تعریفی) عبارتیں مختلف ہیں، مگر تیرا حسن ایک (اور یکتا) ہے اور ہر عبارت اس (محبوب کے) جمال (وکمال) کی طرف اشارہ کرتی ہے]

اردو زبان میں ایسا جامع رسالہ اب تک تالیف نہ ہوا تھا۔ اللہ کے فضل و کرم سے دگر گوں حالات کے باوجود عجلت میں لکھا گیا یہ نفع مند رسالہ تھوڑی سی مدت میں اپنے انجام کو پہنچا۔

ما عقائد جمیل تر گفتیم
دُر دریائے معرفت سفتیم

[ہم نے خوبصورت عقائد کیا بیان کیے ہیں! یوں سمجھ لو کہ ہم نے دریاے معرفت کے موتی پروے ہیں]

گر تو غواص بحر عرفانی
قدر در یگانہ خود دانی

[اگر تو معرفت کے سمندر میں غوطہ زنی کرنے والا ہے تو تو درِیتیم کی قدر کو جانتا ہی ہے]

هذا فإن كنت أحسنت فيما جمعت و أصبت في الذي صنعت فذلك من عميم منن الله وجزيل فضله و عظيم أنعمه عليّ وجليل طوله، وإن أنا أسأتُ فيما فعلتُ وأخطأتُ إذ وضعتُ فما أجدر الإنسان بالإساءة والعيوب إذ لم يعصمه ويحفظه علام الغيوب.

وما أبرئ نفسي إنني بشر
أسهو وأخطئ ما لم يحمني قدر
ولا ترى عذرا أولى بذي زلل
من أن يقول مقرا أنني بشر

والله أسال أن يحلي هذا المسطور بالقبول عند الجلة والعلماء، كما أعوذ به من تطرق أيدي الحساد إليه والجهلاء، لا إله إلا هو، ولا معبود سواه، وإني أشهد وأستودع شهادتي هذه في كتابي هذا وفي غيره من الكتب التي رقمتها أناملي أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له، له الملك وله الحمد، يحيي ويميتُ، وهو على كل شيء قدير، وأن محمدًاﷺ عبده ورسوله وخاتم الأنبياء الكرام، وشافع العصاة الموحدين أصحاب الآثام، في يوم القيام، لقد جاءكم رسول من أنفسكم عزيز عليه ما عنتم حريص عليكم بالمؤمنين رؤوف رحيم، فإن تولوا فقل حسبي الله لا إله إلا هو عليه توكلتُ وهو ربُّ العرش العظيم.

مقدمہ

علمِ خلف پر علمِ سلف کی فضیلت کا بیان①

نفع ونقصان کے اعتبار سے علم کی اقسام:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کسی جگہ مقام مدح میں علم کا ذکر کیا ہے تو کسی جگہ مقام ذم میں، چنانچہ ان میں سے پہلا علم نافع اور دوسرا غیر نافع ہے۔

نفع مند علم:

مقام مدح میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [الزمر: ۹]

[کہہ دے کیا برابر ہیں وہ لوگ جو جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے؟]

ایک مقام پر فرمایا:

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ﴾ [آل عمران: ۱۸]

[اللہ نے گواہی دی کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی]

ایک جگہ فرمایا:

﴿قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا﴾ [طٰہٰ: ۱۱٤] [کہہ اے میرے رب! مجھے علم میں زیادہ کر]

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ [الفاطر: ۲۸]

[اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے صرف جاننے والے ہی ڈرتے ہیں]

① یہ مکمل مبحث علامہ ابن رجب رحمہ اللہ کے رسالے "فضل علم السلف علی علم الخلف" سے ماخوذ ہے، جیسا کہ مولف رحمہ اللہ نے اس کے آخر میں یہ صراحت کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ابوالبشر آدم علیہ السلام کو چیزوں کے نام سکھائے تھے۔ قرآن مجید میں فرشتوں کے سامنے ان چیزوں کے پیش کرنے اور ان کے نام دریافت کرنے کا قصہ بیان کیا گیا ہے، یہ علمِ لغت تھا، جس کی آدم علیہ السلام کو تعلیم دی گئی تھی، اس کے جواب میں فرشتوں نے کہا تھا:

﴿ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴾ [البقرة: ٣٢]

[تو پاک ہے، ہمیں کچھ علم نہیں مگر جو تو نے ہمیں سکھایا، بے شک تو ہی سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے]

موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا قصہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے، اس کے ضمن میں موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول درج ہے:

﴿ هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴾ [الكهف: ٦٦]

[کیا میں تیرے پیچھے چلوں؟ اس (شرط) پر کہ تجھے جو کچھ سکھایا گیا ہے، اس میں سے کچھ بھلائی مجھے سکھا دے؟]

مذکورہ بالا آیات میں جس علم کا ذکر ہوا ہے، وہ نفع مند علم ہے۔

غیر نفع مند علم:

قرآن مجید میں ایک قوم کی حالت یوں بیان کی گئی ہے کہ انھیں علم دیا گیا تھا، لیکن ان کے علم نے انھیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ﴾ [الجمعة: ٥]

[ان لوگوں کی مثال جن پر تورات کا بوجھ رکھا گیا، پھر انھوں نے اسے نہیں اٹھایا، گدھے کی مثال کی سی ہے جو کئی کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے]

اس آیت میں بے عمل عالم کو بوجھ بردار گدھے کی مانند قرار دیا گیا ہے۔ ایک اور مقام پر قرآن مجید میں اس سے متعلق اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا:

﴿ وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ وَ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَ لٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ ﴾ [الأعراف: ١٧٥، ١٧٦]

[اور انھیں اس شخص کی خبر پڑھ کر سنا جسے ہم نے اپنی آیات عطا کیں تو وہ ان سے صاف

نکل گیا، پھر شیطان نے اسے پیچھے لگا لیا تو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا اور اگر ہم چاہتے تو اسے ان کے ذریعے بلند کر دیتے، مگر وہ زمین کی طرف چمٹ گیا اور اپنی خواہش کے پیچھے لگ گیا]

نیز فرمایا:

﴿ فَخَلَفَ مِنْ م بَعْدِ هِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى﴾ [الأعراف: ١٦٩]

[پھر ان کے بعد ان کی جگہ نالائق جانشین آئے، جو کتاب کے وارث بنے، وہ اس حقیر دنیا کا سامان لیتے ہیں]

مزید فرمایا: ﴿ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ ﴾ [الجاثية: ٢٣] [اور اللہ نے اسے علم کے باوجود گمراہ کر دیا] اس آیت کا مطلب ومفہوم یہ ہے کہ جس کو اللہ نے گمراہ کر دیا، اس کا علم غیر نافع ہے۔

علم سحر ایک غیر نافع چیز ہے:

وہ علم جس کا ذکر بطورِ ذم ہوا ہے، اس میں سے ایک سحر اور جادو کا علم ہے، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَ يَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ [البقرة: ١٠٢]

[اور وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو انھیں نقصان پہنچاتی اور انھیں فائدہ نہ دیتی تھی۔ حالانکہ بلاشبہہ یقیناً وہ جان چکے تھے کہ جس نے اسے خریدا، آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں]

نیز غیر نافع علم کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ﴾ [الغافر: ٨٣]

[پھر جب ان کے رسول ان کے پاس واضح دلیلیں لے کر آئے تو وہ اس پر پھول گئے جو ان کے پاس کچھ علم تھا اور انھیں اس چیز نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے]

مزید فرمایا:

﴿ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ﴾ [الروم: ٧]

[وہ دنیا کی زندگی میں سے ظاہر کو جانتے ہیں اور وہ آخرت سے وہی غافل ہیں]

احادیث میں نافع اور غیر نافع علم کا بیان:

سنت مطہرہ میں بھی علم کو نافع اور غیر نافع کی طرف تقسیم کیا گیا ہے۔ غیر نافع علم سے پناہ مانگی ہے اور علم نافع کا سوال کیا گیا ہے۔

① سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں دعاے مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم یوں منقول ہے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَّا يَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَّا يَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَّا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَةٍ لَّا يُسْتَجَابُ لَهَا»[1]

(رواه مسلم و حرجه أهل السنن من وجوه متعددة رفعاً)

[اے اللہ! میں، ایسے علم سے جو نفع دینے والا نہ ہو، ایسے دل سے جو ڈرنے والا نہ ہو، ایسے نفس سے جو سیر ہونے والا نہ ہو اور ایسی دعا سے جو قبول ہونے والی نہ ہو، تیری پناہ مانگتا ہوں]

بعض روایات میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

«وَمِنْ دُعَاءٍ لَّا يُسْمَعُ»[2] [اور ایسی دعا سے جو سنی نہ جائے]

② سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں فرماتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا وَ أَعُوذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ»[3] (رواه النسائي)

[اے اللہ! میں تجھ سے علم نافع کا سوال کرتا ہوں اور غیر نافع علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں]

③ ایک دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

«سَلُوْا اللّٰهَ عِلْماً نَافِعاً وَتَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ عِلْمٍ لَّا يَنْفَعُ»[4] (رواه ابن ماجه)

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٢٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٤٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٨٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٤٥٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٠)

[2] سنن أبي داود (١٥٤٨) سنن الترمذي (٣٤٨٢) سنن النسائي (٥٤٤٢) سنن ابن ماجه (٣٨٣٧)

[3] سنن النسائي الكبرىٰ، رقم الحديث (٧٨٦٧)

[4] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٤٣)

[اللہ تعالیٰ سے نفع مند علم کا سوال کرو اور غیر مفید علم سے پناہ پکڑو]

④ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں کہتے تھے:

«اَللّٰھُمَّ انْفَعْنِيْ بِمَا عَلَّمْتَنِيْ، وَ عَلِّمْنِيْ مَا يَنْفَعُنِيْ وَزِدْنِيْ عِلْماً، وَارْزُقْنِيْ عِلْماً تَنْفَعُنِيْ بِهٖ»[1] (رواہ الترمذي)

[اے اللہ! میرے لیے وہ علم مفید بنا جو تو نے مجھے سکھایا ہے، مجھے وہ علم عطا کر جو مجھے فائدہ دے، مجھے علم میں زیادہ کر اور مجھے ایسا علم عنایت فرما جس کے ذریعے تو مجھے فائدہ پہنچائے]

⑤ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں دعا فرماتے تھے:

«اَللّٰھُمَّ إِنَّا نَسْأَلُكَ إِيْمَاناً دَائِماً، فَرُبَّ إِيْمَانٍ غَيْرُ دَائِمٍ، وَأَسْأَلُكَ عِلْماً نَافِعاً، فَرُبَّ عِلْمٍ غَيْرُ نَافِعٍ» (خرجه أبو نعيم)

[اے اللہ! ہم تجھ سے دائمی ایمان کا سوال کرتے ہیں، کیونکہ بعض ایمان غیر دائمی بھی ہوتے ہیں اور میں تجھ سے نفع بخش علم کا سوال کرتا ہوں، اس لیے کہ بعض علم غیر نفع بخش بھی ہوتے ہیں]

⑥ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً حدیث میں مروی ہے:

«إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ سِحْراً وَإِنَّ مِنَ الْعِلْمِ جَهْلاً»[2] (خرجه أبو داوٗد)

[بے شک بعض بیانات میں جادو ہوتا ہے اور بعض علوم بھی جہالت ہوتے ہیں]

صعصعہ بن صوحان رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ وہ علم جہالت ہے:

"أن يتكلف العالم إلى علمه ما لا يعلم فيجهله ذلك"

[عالم اپنے علم میں ایسا تکلف کرے جسے وہ جانتا نہ ہو تو وہ اس میں جاہل شمار ہوگا]

اس حدیث کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ جو علم ضرر پہنچائے نہ نفع، وہ جہل ہے، اس کا نہ جاننا اس کے جاننے سے بہتر ہے۔

جب اس علم سے جہل بہتر ٹھہرا تو وہ علم جہل سے بھی بدتر ہوا جیسے علم سحر وغیرہ علوم جو دین یا دنیا میں مضر ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض غیر نافع علوم کی تفسیر مروی ہے۔

---

[1] سنن الترمذي (٣٥٩٩) مگر اس حدیث کے آخری الفاظ «وارزقني علما تنفعني به» ترمذی میں نہیں ہیں، بلکہ یہ الفاظ المستدرك للحاكم (١/ ٦٩٠) اور سنن النسائي الكبرى (٤/ ٤٤٤) میں مروی ہیں۔

[2] سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٥٠١٢)

⑦ زید بن اسلم سے مروی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا: "مَا أَعْلَمَ فُلَاناً" (فلاں شخص کتنا بڑا عالم ہے!) آپ ﷺ نے پوچھا: «بِمَ؟» (کس علم کا (وہ بڑا عالم ہے؟) انھوں نے جواب دیا: "بِأَنْسَابِ النَّاسِ" [لوگوں کے نسب جاننے والا (بڑا عالم ہے)] آپ ﷺ نے فرمایا: «عِلْمٌ لَّا يَنْفَعُ وَجَهْلٌ لَا يَضُرُّ» [یہ ایک ایسا علم ہے جس کا جاننا فائدہ نہیں دیتا اور جس کا نہ جاننا نقصان نہیں پہنچاتا] (اسے ابو نعیم نے "رياضة المتعلمين" میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے)

اس روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ انھوں (زید بن اسلم) نے کہا تھا:

"أعلم الناس بأنساب العرب، وأعلم الناس بالشعر وبما اختلفت فيه العرب"

[وہ شخص عربوں کے نسب لوگوں سے زیادہ جانتا ہے، وہ لوگوں سے شعر زیادہ جانتا ہے اور جس میں عربوں کا اختلاف ہے، اسے بھی وہ دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ جانتا ہے]

اس کے آخر میں آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

«اَلْعِلْمُ ثَلَاثَةٌ مَا خَلَاهُنَّ فَهُوَ فَضْلٌ: آيَةٌ مُحْكَمَةٌ أَوْ سُنَّةٌ قَائِمَةٌ أَوْ فَرِيضَةٌ عَادِلَةٌ»

[علم تین ہیں جو ان کے سوا ہے وہ زائد ہے: آیت محکمہ، سنت قائمہ اور فریضہ عادلہ]

لیکن یہ اسناد صحیح نہیں ہے۔ اس کی سند میں موجود راوی بقیہ نے غیر ثقہ سے تدلیس کی ہے۔[1]

مگر حدیث کے آخری الفاظ کو ابو داود اور ابن ماجہ نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

«اَلْعِلْمُ ثَلَاثَةٌ مَا سِوَى ذٰلِكَ فَهُوَ فَضْلٌ: آيَةٌ مُحْكَمَةٌ أَوْ سُنَّةٌ قَائِمَةٌ أَوْ فَرِيضَةٌ عَادِلَةٌ»[2]

[علم تین ہیں جو ان کے سوا ہے وہ زائد ہے: آیت محکمہ، سنت قائمہ اور فریضہ عادلہ]

مگر اس کی سند میں عبدالرحمن بن زیاد افریقی ہے، جس کا ضعف مشہور ہے۔

⑧ حدیث میں انساب کو سیکھنے کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ اس سے صلہ رحمی کی جاتی ہے، چنانچہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمانِ رسول ﷺ ہے:

«تَعَلَّمُوا مِنْ أَنْسَابِكُمْ مَا تَصِلُوْنَ بِهِ أَرْحَامَكُمْ» (أخرجه أحمد و الترمذي)[3]

---

[1] دیکھیں: لسان الميزان (۳/۱۰۳)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۸۸۵) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۵٤)

[3] مسند أحمد (۲/۳۷٤)، سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۹۷۹)

[اپنا سلسلہ نسب اتنا سیکھ لو جس سے تم صلہ رحمی کر سکو]

⑨ دوسری مرفوع حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

«تَعَلَّمُوا مِنْ أَنْسَابِكُمْ مَا تَصِلُونَ بِهِ أَرْحَامَكُمْ، ثُمَّ انْتَهُوا، وَتَعَلَّمُوا مِنَ الْعَرَبِيَّةِ مَا تَعْرِفُونَ بِهِ كِتَابَ اللّٰهِ، ثُمَّ انْتَهُوا، وَتَعَلَّمُوا مِنَ النُّجُومِ مَا تَهْتَدُونَ بِهِ فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ثُمَّ انْتَهُوا»[1]

[تم اپنا سلسلہ نسب اتنا سیکھ لو جس سے تم صلہ رحمی کر سکو، پھر مزید علم سے رک جاؤ۔ عربی کا اتنا علم حاصل کرو جس سے تم اللہ کی کتاب کا علم حاصل سکو، پھر رک جاؤ۔ علم نجوم اتنا حاصل کرو جس کے ذریعے تم خشکی اور تری کے اندھیروں میں راہ نمائی پا سکو، پھر رک جاؤ]

اس کی سند میں ''ابن لہیعہ'' راوی ضعیف ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

"تعلموا من النجوم ما تهتدون به في برّكم وبحركم ثم أمسكو أو تعلموا من النسب ما تصلون به أرحامكم، وتعلموا ما يحل لكم من النساء وما يحرم عليكم، ثم انتهوا"[2] (رواه ابن زنجويه من طريق نعيم بن هند)

[اتنا علمِ نجوم سیکھو جس کے ذریعے تم بر و بحر میں راہنمائی حاصل کر سکو، پھر اس سے رک جاؤ یا سلسلہ نسب اتنا سیکھ لو جس سے تم صلہ رحمی کر سکو، نیز تم اس بات کو جان سکو کہ کون سی عورتیں تمھارے لیے حلال ہیں اور کون سی تم پر حرام ہیں، بس تمھارے لیے اتنا علم ہی کافی ہے]

عمر رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ مروی ہیں:

"تعلموا من النجوم ما تعرفون به القبلة و الطريق"[3]

[صرف اتنا علمِ نجوم سیکھو جس کے ذریعے تم قبلہ اور راستہ معلوم کر سکو]

امام نخعی رحمہ اللہ راستے جاننے کے لیے علم نجوم پڑھنے میں کوئی حرج نہیں قرار دیتے تھے اور چاند کی منازل کا علم حاصل کرنے کی رخصت عنایت فرماتے تھے۔

امام احمد اور اسحاق بن راہویہ نے اس میں یہ رخصت دی ہے:

---

① شعب الإيمان (٢/ ٢٦٨)

② مسند الفردوس للديلمي (١/ ٢٧) اس کی سند ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٣٤٠٨)

③ شرح السنة (١٢/ ١٨٣)

"ويتعلم من أسماء النجوم ما يهتدي به"

[اور انسان ستاروں کے ناموں کا اتنا علم حاصل کرے جس کے ساتھ وہ راستہ معلوم کرلے]

لیکن قتادہ رحمہ اللہ چاند کی منازل کے سیکھنے کو مکروہ بتاتے ہیں اور ابن عیینہ رحمہ اللہ بھی اس کی رخصت نہیں دیتے۔

طاؤس رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا ہے کہ ستاروں پر نظر کرنے والے اور حروف ابجد سیکھنے والے بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا اللہ کے ہاں کچھ حصہ نہیں ہے۔[1]

علامہ ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ تاثیر پر محمول ہے نہ کہ تیسیر پر، کیونکہ علم تاثیر باطل اور حرام ہے۔

⑩ اس کی وعید میں مندرجہ ذیل مرفوع حدیث وارد ہوئی ہے:

«مَنِ اقْتَبَسَ عِلْمًا مِنَ النُّجُومِ فَقَدِ اقْتَبَسَ شُعْبَةً مِنَ السِّحْرِ»[2]

(خرجه أبو داوٗد من حديث ابن عباس مرفوعاً)

[جس نے نجوم کا کچھ علم سیکھا، اس نے جادو کا ایک حصہ حاصل کیا (جو حرام ہے)]

⑪ نیز سیدنا قبیصہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رسول اللہ نے فرمایا ہے:

«اَلْعِيَافَةُ وَالطِّيَرَةُ وَالطَّرْقُ مِنَ الْجِبْتِ»[3]

[شگون (نیک وبد) لینے کے لیے پرندے کو اڑانا، اور فال نکالنا جبت سے ہے]

اس حدیث میں لفظ " عیافت" کا مطلب ہے پرندے کو اڑانا اور "طِرق" کا مطلب ہے زمین میں خط لگانا۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ علم تاثیر باطل اور حرام ہے۔ اس کے مقتضا پر عمل کرنا ستاروں کا تقرب حاصل کرنے کی مانند ہے اور ستاروں کا قرب چاہنا کفر ہے۔ باقی رہا ستاروں کی تیسیر اور چال کا علم تو جمہور کے نزدیک راہنمائی حاصل کرنے، راستہ معلوم کرنے اور قبلے کی سمت جاننے کے لیے بقدر ضرورت و حاجت اس کا علم حاصل کرنا جائز ہے اور جتنا علم اس سے زیادہ ہے، اس کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ وہ انسان کو ایسے علم کے حصول سے مشغول کرنے والا ہے جو اس سے

① شرح السنة للبغوي (١٢/ ١٨٣)

② سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٣٩٠٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٢٦)

③ سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٣٩٠٧) اس کی سند میں "حیان بن العلاء" ضعیف ہے۔

زیادہ اہم ہے۔ نیز اس علم میں زیادہ باریکی میں اترنا انسان کو مسلمانوں کے ان محرابوں کی طرف سے بدگمانی میں مبتلا کر دیتا ہے جو بڑے بڑے شہروں میں بنائے گئے ہیں، چنانچہ نئے اور پرانے دور میں اس فن کے جاننے والوں کی اکثریت سے یہ بدگمانی واقع ہوئی ہے اور یہ بدگمانی صحابہ و تابعین کی نماز کے حق میں بہت سے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں غلط اعتقاد کی طرف پہنچاتی ہے، اس لیے یہ امر باطل ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے قطبی تارے سے استدلال کرنے کو مکروہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ حدیث میں یوں مروی ہے: «مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ»[1] [مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے] یعنی قبلے کی تعیین کے لیے قطبی تارے وغیرہ کا اعتبار نہیں کیا گیا۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کعب رضی اللہ عنہ پر اس بات کا انکار کیا تھا کہ "أن الفلك تدور" [یقیناً آسمان گھومتا ہے] اسی طرح امام مالک رحمہ اللہ نے اس کا انکار کیا تھا۔

نجومیوں کے اس قول پر کہ ہر ملک میں زوال مختلف ہوتا ہے، امام احمد رحمہ اللہ نے انکار فرمایا تھا۔

ایسے اقوال پر ان کے اور کسی دوسرے کے انکار کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق کچھ کلام نہیں فرمایا ہے، اگرچہ ستاروں کے متعلق علم رکھنے والے یہ لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ علمِ نجوم کے حصول میں مشغول ہونا انسان کو بہت بڑے فساد کی طرف لے جاتا ہے۔ اس علم کے جاننے والوں میں سے بعض نے حدیثِ نزول [وہ حدیث جس میں رب تعالیٰ کے آسمانِ دنیا پر نزول فرمانے کا ذکر ہے] کا انکار کیا تھا اور کہا تھا کہ رات کا ثلث اور تہائی مختلف ملکوں میں مختلف ہوتا ہے، تو پھر وقتِ معین پر نزول کس طرح ہو سکتا ہے؟ حالانکہ دینِ اسلام میں اس اعتراض کی قباحت واضح طور پر معلوم ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا ان کے خلفاے راشدین اس اعتراض کو سنتے تو وہ اعتراض کرنے والے کے ساتھ مناظرہ نہ کرتے، بلکہ اسے سزا دینے میں جلدی کرتے یا اسے منافقین اور مکذبین کے زمرے میں شامل کرتے۔

اسی طرح علمِ انساب کا بہت زیادہ علم حاصل کرنے کی حاجت و ضرورت نہیں ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ نے اس سے منع کیا ہے، حالانکہ صحابہ و تابعین کا ایک گروہ علم انساب کو جاننے اور اس کا اہتمام کرنے والا تھا۔ ایسے ہی عربی علوم میں سے علم لغت اور علم نحو میں بہت وسیع علم حاصل کرنا اہم علم کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے اور ان علوم میں زیادہ واقفیت پیدا کرنا علم نافع سے محروم کر دیتا ہے۔

---

[1] سنن الترمذي (٣٤٢) سنن النسائي (٢٢٤٣) سنن ابن ماجه (١٠١١)

قاسم بن مخیمرہ رحمہ اللہ علم نحو کو مکروہ جانتے تھے اور کہتے تھے:

"أوله شغل و آخره بغي"[1] [اس کی ابتدا مشغولیت اور انتہا بغاوت و تکبر ہے]

اس سے ان (ابن مخیمرہ رحمہ اللہ) کی مراد اس علم میں بہت زیادہ وسعت پیدا کرنا ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ علمِ لغت میں وسعت پیدا کرنے اور عربیت کی معرفت کو مکروہ جانتے تھے، چنانچہ انھوں نے ابو عبید پر اسی بابت انکار کرتے ہوئے کہا تھا: "هو يشغل عما هو أهم منه" [اس علم میں وسعت پیدا کرنا اس علم سے غافل کر دیتا ہے جو علم اس سے زیادہ اہم ہے]

اسی لیے یہ بات کہی جاتی ہے:

"العربية في الكلام كالملح في الطعام"

[کلام میں عربیت (علم نحو وغیرہ) کی وہی حیثیت ہے جو کھانے میں نمک کی ہے]

یعنی انسان اسی قدر علم نحو پڑھے جس سے وہ صحیح اور درست کلام کر سکے۔ جس طرح کہ کھانے کی درستی کے لیے اس میں تھوڑا سا نمک شامل کیا جاتا ہے اور جب نمک زیادہ ہو جاتا ہے تو کھانا بگڑ جاتا ہے۔

اسی طرح علمِ حساب ہے۔ انسان کو چاہیے کہ بقدرِ حاجت اس علم کو حاصل کرے جس سے مستحقین کے درمیان فرائض کی تقسیم اور وصیتوں وغیرہ امور کی تقسیم ہو سکے۔ جو علم اس مقدار سے زیادہ ہو، وہ علمِ غیر نافع ہے، اس سے سوائے دماغوں کی ریاضت کے کچھ حاصل نہیں ہوتا، لہٰذا اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ یہ اہم علم کے حصول سے باز رکھتا ہے۔

میں [نواب صاحب رحمہ اللہ] کہتا ہوں کہ ضروری علوم کی مقدار کا مفصل بیان کتاب ''احیاء العلوم'' سے معلوم کرنا چاہیے، پھر ''احیاء الاحیاء'' سے اور پھر ''لسان العرفان'' سے۔

صحابہ کرام کے بعد ایجاد ہونے والے غیر نافع علوم:

رہے وہ علوم جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد معرض وجود میں آئے ہیں اور ان میں ماہرین علوم نے وسعت پیدا کی ہے، انھوں نے ان کا نام علوم رکھا ہے اور وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ جو شخص ان علوم کا علم نہیں رکھتا ہے وہ جاہل یا گمراہ ہے، تو حقیقت بات یہ ہے کہ وہ سب علوم بدعت، گمراہی، من

[1] اقتضاء العلم العمل للخطيب البغدادي (١٤٩)

گھڑت اور ممنوع امور میں شامل ہیں۔ ان علوم میں سے ایک علم وہ بھی ہے جسے معتزلہ نے ایجاد کیا تھا، یعنی وہ علم جس میں تقدیر اور اللہ کے لیے مثالیں بیان کرنے پر کلام کیا جاتا ہے، حالانکہ تقدیر میں خوض اور بحث کرنے کی ممانعت ہے، چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے:

«لَا يَزَالُ أَمْرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ مُوَافِياً أَوْ مُقَارِباً مَا لَمْ يَتَكَلَّمُوا فِي الْوِلْدَانِ وَالْقَدَرِ»[1]

(اسے ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے، اسے موقوف بھی بیان کیا گیا ہے اور بعض نے اس کے موقوف ہونے کو راجح قرار دیا ہے)

[اس امت کا معاملہ حق کے موافق یا میانہ روی پر مشتمل رہے گا، جب تک یہ لڑکوں اور تقدیر سے متعلق کلام نہ شروع کر دیں گے]

اسی طرح ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً بیان کیا ہے:

«إِذَا ذُكِرَ أَصْحَابِي فَأَمْسِكُوا وَإِذَا ذُكِرَتِ النُّجُومُ فَأَمْسِكُوا»[2]

(رواه البيهقي، وقد روي من وجوه متعددة، في أسانيدها مقال)

[جب میرے اصحاب کا ذکر کیا جائے تو رک جاؤ اور جب ستاروں کا ذکر کیا جائے تو رک جاؤ]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے میمون بن مہران کو کہا تھا:

''خبردار! جو تم نے کبھی نجوم میں نظر کی، کیونکہ یہ نظر کہانت کی طرف دعوت دیتی ہے۔ خبردار! جو تم نے تقدیر سے متعلق گفتگو کی، کیونکہ یہ زندیقیت کی طرف بلاتی ہے۔ خبردار! جو تم نے ایک صحابی کو بھی برا کہا، ورنہ اللہ تعالیٰ تجھے اوندھے منہ آگ میں ڈال دے گا۔''[3]

(خرجه أبو نعيم مرفوعاً، ولا يصح رفعه)

تقدیر پر بحث کی صورتیں:

تقدیر میں بحث کرنے کی ممانعت کئی طرح سے معلوم ہوتی ہے:

① بحث کرنے والا کتاب اللہ کے ایک حصے کو دوسرے حصے سے ٹکرائے گا۔ تقدیر کو ثابت کرنے والا ایک آیت سے اس کا اثبات نکالے اور اس کی نفی کرنے والا دوسری آیت سے اس کی نفی نکالے، پھر ان

---

[1] صحيح ابن حبان (١١٨/١٥) مستدرك الحاكم (٨٨/١)

[2] المعجم الكبير (١٩٨/١٠) نیز دیکھیں: السلسلة الصحيحة (٣٤/١)

[3] طبقات المحدثين بأصبهان لأبي نعيم (٣١٧/١) لسان الميزان (٢٩٨/١)

کے درمیان باہم مقابلہ چل پڑے۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں یہ صورت واقع ہوئی تھی تو آپ ﷺ نے غصہ فرمایا اور تقدیر پر کج بحثی سے منع کیا تھا۔[1] چنانچہ یہ قرآن مجید میں اختلاف کرنے کی ایک صورت اور کتاب مقدس میں جھگڑا کرنے کے مترادف ہے، حالانکہ اس سے منع کیا گیا ہے۔

② عقلی قیاسات کے ساتھ تقدیر کا اثبات اور نفی کرتے ہوئے اس میں خوض اور بحث کرنا، جس طرح قدریہ کہتے تھے:

"لو قدر و قضیٰ ثم عذب كان ظالما"

[اگر وہ تقدیر مقرر کرے، اسی بنیاد پر فیصلہ کرے اور پھر اس پر عذاب دے تو وہ ظالم ٹھہرے گا]

اسی طرح جبریہ نے کہا ہے:

"إن الله جبر العباد على أفعالهم"

[بلاشبہہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو ان کے افعال و اعمال پر مجبور کیا ہے]

③ تقدیر کے اسرار و رموز سے متعلق خوض و بحث کرنا، حالانکہ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ وغیرہ سلف نے اس سے منع کیا ہے، کیونکہ لوگ اس کی حقیقت پر مطلع نہیں ہو سکتے ہیں۔

نیز وہ محدثات و بدعات جنھیں معتزلہ اور ان کے ہم نواؤں نے ایجاد کیا ہے، ان میں سے ایک عقلی دلائل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر کلام کرنا ہے، حالانکہ یہ تقدیر پر کلام کرنے سے بھی زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ تقدیر میں کلام کرنا تو اللہ تعالیٰ کے افعال میں کلام کرنا ہے اور یہ اس کی ذات و صفات پر کلام کرنا ہے۔ پھر ان لوگوں کی دو قسمیں ہیں:

① ایک وہ قسم جس نے کتاب و سنت میں وارد صفاتِ الٰہیہ کی نفی کی ہے، کیوں کہ اس کے نزدیک وہ صفات مخلوقات کے ساتھ تشبیہ کو مستلزم ہیں، جس طرح معتزلہ نے کہا ہے:

اگر وہ (اللہ) دکھائی دے تو وہ جسم ہوگا، کیونکہ وہ کسی جہت اور سمت ہی میں دکھائی دے گا۔ نیز انھوں نے کہا ہے کہ اگر اس کا سنائی دینے والا کلام ہو تو اس کا جسم ماننا پڑے گا۔ وہ قوم بھی ان (معتزلہ) کی موافقت کرتی ہے جو رحمٰن کے عرش پر مستوی ہونے کی نفی کرتی ہے، اس نفی کی وجہ اور سبب یہی تشبیہ ہے، جو معتزلہ اور جہمیہ کا طریق کار ہے۔ سلف نے ان کے بدعتی اور گمراہ ہونے پر اتفاق کیا ہے۔ متاخرین

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٣٣)

اورعلم حدیث کی طرف منسوب لوگوں میں سے بہت سے لوگ بعض امور میں انھی کے راستے پر چلتے ہیں۔

② ان لوگوں کی دوسری قسم وہ ہے جس نے عقلی دلائل کے ساتھ ان صفات کے اثبات کا قصد و ارادہ کیا ہے، جن کے متعلق کوئی اثر وارد نہیں ہوا تھا اور انھوں نے ان کی نفی کرنے والوں پر رد کیا۔ چنانچہ مقاتل بن سلیمان اوران کے متبعین جیسے نوح بن ابی مریم وغیرہ کا یہی طریقہ تھا۔ پھر نئے اور پرانے محدثین کا ایک گروہ ان کے تابع ہو گیا۔ کرامیہ کا بھی یہی مسلک تھا۔ ان میں سے بعض نے صفات کے اثبات کے لیے لفظاً یا معناً جسم ثابت کیا اور بعض نے اللہ تعالیٰ کے لیے وہ صفات ثابت کیں، جو کتاب و سنت میں وارد نہیں ہوئی، جیسے حرکت وغیرہ جو ان کے نزدیک صفاتِ ثابتہ کے لیے لازم ہے۔ سلف نے مقاتل پر عقلی دلائل کے ساتھ جہم پر رد کرنے کی بابت انکار کیا تھا اور مقاتل پر شدید طعن کیا تھا۔ بعض نے تو اس کے قتل کو حلال قرار دیا تھا، جن میں امام بخاری رحمہ اللہ کے شیخ مکی بن ابراہیم وغیرہ شامل ہیں۔

صفاتِ الٰہیہ سے متعلق سلف کا طریق کار ہی درست ہے:

الغرض درست بات وہی ہے جس پر سلف صالحین گامزن تھے اور وہ یہ ہے کہ صفاتِ الٰہیہ پر مشتمل آیات و احادیث کو بالکل اسی طرح تکییف اور تمثیل کے بغیر بیان کیا جائے جس طرح وہ وارد ہوئی ہیں۔ سلف میں کسی سے اس کے خلاف کوئی بات پایہ صحت کو نہیں پہنچتی، خصوصاً امام احمد رحمہ اللہ سے۔ اسی طرح صفاتِ الٰہیہ کے معانی اور ان کے ساتھ مثالیں نہیں بیان کرنا چاہییں، اگرچہ امام احمد رحمہ اللہ کے قریب زمانے کے بعض لوگوں نے مقاتل کے طریقے کا اتباع کرتے ہوئے ایسا کیا ہے، لیکن اس بارے میں مقاتل کی پیروی نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ائمہ اسلام کی اقتدا کرنا واجب ہے، جیسے عبداللہ بن مبارک، امام مالک، سفیان ثوری، اوزاعی، امام احمد، اسحاق، ابو عبید اور دیگر سلف صالحین رحمہم اللہ۔

مذکورہ بالا سلف صالحین کے کلام میں متکلمین کے کلام کی جنس سے کوئی چیز نہیں پائی جاتی، پھر فلسفیوں کے کلام کا کیا ذکر ہے۔ کسی مسلمان نے امام احمد رحمہ اللہ کے کلام میں کوئی جرح و قدح نہیں کی۔ ابو زرعہ رازی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ جس شخص کے پاس کچھ علم ہے اور اس نے اپنے علم کی صیانت و حفاظت نہ کی اور اپنے علم کی نشر و اشاعت میں علم کلام میں سے کسی چیز کا سہارا لیا تو وہ سلف کے طریقے پر نہ رہا۔

اہلِ رائے اور اہلِ عقل کے ضوابط وقواعد:

امور محدثات میں وہ ضوابطِ رائے اور قواعدِ عقل بھی شامل ہیں، جو فقہاے اہلِ رائے نے ایجاد کیے ہیں اور فقہ کے فروغ کو ان کی طرف لوٹایا ہے، خواہ وہ سنن کے مخالف ہوں یا موافق۔ وہ ان فروع کو انھیں قواعد مقررہ پر جاری کرتے ہیں، اگرچہ ان کی اصل نصوصِ کتاب وسنت کی تاویل ہے، لیکن یہ تاویلات ایسی ہیں کہ ان تاویلات میں دوسرے لوگ ان کے مخالف ہیں۔ لہٰذا ائمہ اسلام نے حجاز وعراق میں فقہاے اہلِ رائے پر اسی بات کا انکار کیا ہے اور اس کی مذمت اور انکار میں بہت مبالغہ فرمایا ہے۔

ائمہ وفقہاے اہلِ حدیث کا منہج:

جہاں تک اہلِ حدیث کے ائمہ اور فقہا کا تعلق ہے تو وہ صحیح حدیث کے تابع ہیں، خواہ وہ حدیث کہیں سے بھی مل جائے، بشرطیکہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور بعد والے لوگوں کے نزدیک یا صحابہ، تابعین اور تبع تابعین رضی اللہ عنہم کے ایک گروہ کے نزدیک معمول بہ ہو۔ پھر جس حدیث کے ترک پر سلف نے اتفاق کیا ہے، اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"خذوا من الرأي ما يوافق من كان قبلكم فإنهم كانوا أعلم منكم"

[اپنے سے پہلے لوگوں کے موافق رائے کو اختیار کرو، کیونکہ وہ تم سے بڑے عالم تھے]

رہی وہ حدیث جو اہلِ مدینہ کے عمل کے خلاف ہے تو اس میں امام مالک رحمہ اللہ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اہلِ مدینہ کے عمل کو اختیار کرتے تھے۔ بہر حال اکثر سلف صالحین حدیث ہی کو لینے والے اور اسی کے مطابق عقیدہ رکھنے اور عمل کرنے والے تھے۔

علمِ جدال:

سلف صالحین نے جن چیزوں پر انکار کیا تھا، ان میں سے ایک وہ ہے جسے مسائل علمِ حلال وحرام میں علمِ جدال کہتے ہیں، کیونکہ ائمہ اسلام کا یہ طریقہ نہ تھا۔ یہ جھگڑا تو ان کے دور کے بعد ایجاد ہوا ہے، چنانچہ فقہاے عراق نے شوافع اور احناف کے درمیان اختلافی مسائل میں اس جھگڑے کو ایجاد کیا، اختلافی کتابیں تالیف کیں اور ان مسائل میں بحث وجدال کو بہت زیادہ وسعت دی۔

امام ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”وكل ذلك محدث لا أصل له“ [یہ سب بدعت ہے، جس کی کوئی اصل نہیں ہے]

تیری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی:

بحث و تمحیص کا یہی فن ان فقہا کا علم ٹھہرا اور اس نے انھیں علم نافع کے حصول سے روک دیا، اسی لیے سلف نے اس فن پر انکار کیا ہے۔ مرفوع حدیث میں آیا ہے:

«مَا ضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ هُدًى كَانُوا عَلَيْهِ إِلَّا أُوتُوا الْجَدَلَ، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ﴾» (رواہ أهل السنن)[1]

[ہدایت پر گامزن ہونے کے بعد جو قوم بھی دوبارہ گمراہ ہوتی ہے وہ لڑائی جھگڑوں میں پڑ جاتی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی: ﴿مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ﴾ ”یہ لوگ آپ کے سامنے جھگڑے کے علاوہ کچھ نہیں رکھتے بلکہ یہ تو جھگڑالو لوگ ہیں“]

بعض علماے سلف کا کہنا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ خیر و بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لیے عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے اور بحث و جدل کا دروازہ بند کر دیتا ہے اور جب کسی بندے کے ساتھ شر کا ارادہ کرتا ہے تو بابِ عمل کو بند کر کے اس کے لیے بابِ جدل کھول دیتا ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

”أدركت أهل هذه البلدة، و إنهم ليكرهون هذا الإكثار الذي فيه الناس اليوم“

[میں نے اس شہر (مدینہ) کے لوگوں کو اس حال میں پایا کہ وہ (مسائل میں) اس افراط و اطناب کو ناپسند کرتے تھے، جس میں دور حاضر کے لوگ مبتلا ہیں]

اس سے مراد اختلافی مسائل ہیں۔ امام موصوف کثرتِ کلام اور فتوی بازی کو ایک عیب جانتے تھے اور فرماتے تھے:

”يتكلم أحدهم كأنه جمل مغتلم، يقول: هو كذا هو كذا، يهذر في كلامه“

[ان میں کوئی یوں کلام کرتا ہے جیسے وہ بڑھی ہوئی شہوت والا اونٹ ہو۔ وہ کہتا ہے: یہ ایسے ہے اور وہ ایسے ہے۔ وہ اپنی گفتگو میں اوٹ پٹانگ بولتا ہے]

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٥٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٨)

اسی طرح امام موصوف کثرتِ مسائل میں جواب دینے کو مکروہ جانتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ [بني إسرائيل: ٨٥]

دیکھو! اس جگہ اللہ تعالیٰ نے ان کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کسی نے امام مالک رحمہ اللہ سے کہا کہ ایک آدمی سنن کا عالم ہوتا ہے اور سنتوں کی طرف سے بحث و جدل کرتا ہے؟ امام صاحب فرمانے لگے: وہ جدل کیوں کرتا ہے؟ وہ صرف سنت طریقہ بتا دے۔ سائل یا سامع اگر قبول کر لے تو بہتر ہے، ورنہ خاموش رہے۔

نیز امام مالک رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ علم میں جدال کرنا دل کے نور کو سلب کر لیتا ہے اور علم میں جھگڑا کرنا دل کو سخت کر دیتا اور باہم دشمنی پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ امام مالک رحمہ اللہ کی عادت تھی کہ وہ اکثر مسائل کے جواب میں، جو مسائل ان سے دریافت کیے جاتے تھے، کہہ دیتے کہ میں نہیں جانتا ہوں۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اس معاملے میں انھیں کے نقشِ قدم پر چلتے تھے، کیونکہ حدیث میں کثرتِ مسائل، اغلوطاتِ مسائل اور وقوعِ حوادث سے پہلے مسائل کے دریافت کرنے سے ممانعت وارد ہوئی ہے۔[1]

ائمہ و سلف کا کثرتِ جدال سے سکوت:

سلف صالحین اور ائمہ کرام امام مالک، احمد، شافعی اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کے کلام میں فقہ کے مآخذ اور مدارکِ احکام پر ایسے مختصر کلام کے ساتھ تنبیہ ہے جس سے بات کو طول دیے بغیر مقصود کا فہم حاصل ہو جاتا ہے۔

نیز ان کے کلام میں لطیف اور احسن اشارے کے ساتھ مخالف سنت اقوال کا رد ہے۔ جو شخص ان ائمہ و مجتہدین سے دین کا فہم حاصل کرتا ہے، وہ ان کے بعد اس باب میں متکلمین کی لمبی چوڑی کلام سے بے نیاز ہو جاتا ہے، بلکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اُن متکلمین کا طویل کلام اتنا درستی اور صواب پر مشتمل نہیں ہوتا، جو صواب اِن کے اس مختصر کلام میں موجود ہوتا ہے۔

[1] مسند أحمد (٥/٤٣٥) سنن أبي داود (٣٦٥٦) اس کی سند میں ''عبداللہ بن سعد'' مجہول ہے۔

سلفِ امت اور ائمہ ملت میں جس کسی نے کثرتِ خصام اور طولِ جدال سے سکوت کیا تھا، وہ عدم واقفیت اور کلام کرنے سے عاجز آ جانے کی بنا پر نہ تھا، بلکہ علم اور خشیتِ الٰہی کے سبب تھا اور جس کسی نے ان کے بعد طویل کلام کیا، وہ اس لیے نہیں کیا کہ وہ ہی اس علم کے ساتھ مختص تھا اور کوئی دوسرا عالم اس کا اہل نہ تھا، بلکہ اس کا وہ کلام اور توسع علم کلام سے وابستگی اور قلتِ ورع کی وجہ سے تھا۔ جس طرح امام حسن بصری رحمہ اللہ نے ایک گروہ کو باہم دیگر جھگڑا کرتے ہوئے دیکھا تو کہا: یہ قوم عبادت سے اکتا گئی اور ان کے دل سے خوفِ خدا ماند پڑ گیا تو آپس میں جھگڑنے اور تو تکار کرنے لگ گئے۔

مہدی بن میمون رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے محمد بن سیرین رحمہ اللہ کے ساتھ الجھنا شروع کیا تو وہ سمجھ گئے اور کہا: میں تیرا ارادہ جانتا ہوں۔ یعنی اگر میں تیرے ساتھ جھگڑا کروں تو میں جھگڑے کے دروازے کھولنے والا عالم ٹھہروں۔ دوسری روایت یوں ہے:

"أنا أعلم بالمراء منك ولكن لا أماريك"

[میں تجھ سے زیادہ حجت بازی کو جانتا ہوں، لیکن میں تجھ سے جھگڑا نہیں کروں گا]

ابراہیم نخعی کہتے ہیں: "ما خاصمت قط" [میں نے کبھی جھگڑا نہیں کیا] عبد الکریم جزری رحمہ اللہ نے کہا ہے: "ما خاصم ذو ورع قط" [کسی صاحب ورع نے کبھی جھگڑا نہیں کیا] جعفر بن محمد رحمہ اللہ کا کہنا ہے: تم دین میں الجھنے اور جھگڑنے سے بچو، کیونکہ یہ دل کو غافل کر دیتے اور اس میں نفاق بھر دیتے ہیں۔

عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إذا سمعت المراء فأقصر" [جب تم جھگڑا ہوتا ہوا سنو تو اسے چھوڑ دو] وہ یہ بھی کہتے تھے کہ جو شخص اپنے دین کو خصومات کا نشانہ بنائے گا، وہ بہت زیادہ ٹامک ٹوئیاں مارنے والا ہو گا۔

سابقینِ امت علم کی بنا پر کج بحثی اور جھگڑے سے رکے رہے اور بصارت کی بنا پر اس سے باز رہے، ورنہ وہ تو بحث پر بڑے قادر اور زور آور تھے۔ اس بارے میں سلف کا کلام بہت زیادہ ہے، مگر متاخرین اس گمان کی بنا پر فتنے میں مبتلا ہو گئے کہ جو شخص دینی مسائل میں بہت سا کلام اور جدال و خصام کرتا ہے، وہی بڑا عالم ہے، حالانکہ یہ بات نہیں ہے، بلکہ یہ تو جہل محض ہے۔

اکابر اور علماے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیکھو، جیسے شیخین (ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما) علی مرتضی، معاذ، ابن

مسعود اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم ہیں، یہ کس طرح کے لوگ تھے؟ ان کا کلام ابن عباس رضی اللہ عنہما کے کلام سے کمتر تھا، حالانکہ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے زیادہ علم والے تھے، اسی طرح تابعین کا کلام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کلام سے زیادہ ہے، حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان سے بڑے عالم تھے، اسی طرح تبع تابعین کا کلام تابعین کے کلام کی نسبت زیادہ تھا، حالانکہ تابعین علم میں ان سے زیادہ تھے۔

غرض کہ علم کثرتِ روایت کا نام ہے نہ کثرت مقال کا، وہ تو ایک نور ہے جو دل کے اندر ڈال دیا جاتا ہے اور بندہ اس کی چمک دمک کے سبب حق و باطل کے درمیان تمیز کر لیتا ہے، پھر وہ اس کی مدد سے مختصر اور با مقصد عبارتوں کے ساتھ اپنے مقاصد کی تعبیر کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جامع کلمات دیے گئے تھے، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مختصر کلام عطا ہوا تھا، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم طول کلام کے ساتھ قیل و قال میں نہیں پڑے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَبْعَثْ نَبِيًّا إِلَّا مُبَلِّغاً، وَإِنَّ تَشْقِيقَ الْكَلَامِ مِنَ الشَّيْطَانِ»[1]

[اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو صرف مبلغ بنا کر مبعوث کیا اور یقیناً تفصیلِ کلام شیطان کی طرف سے ہے]

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اتنی ہی بات کرتا ہے جس سے تبلیغ کا مقصود حاصل ہو جائے۔ باقی رہا کثرتِ اقوال اور تفصیلِ کلام تو وہ ایک مذموم حرکت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ متوسط ہوا کرتا تھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بات کرتے تو اگر کوئی شمار کرنے والا ان کلمات کو شمار کرنا چاہتا تو وہ انھیں گن لیتا۔

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: بعض بیان سحر اور جادو ہوتا ہے۔[2]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بطور مذمت کے ہے نہ کہ بطور مدح کے، جیسے بعض لوگوں نے یہ گمان کر لیا ہے۔ جو شخص الفاظِ حدیث کے سیاق پر تامل کرے گا، وہ اس مطلب و مفہوم پر یقین کرے گا۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے:

---

[1] مصنف عبد الرزاق (١١/١٦٣) مسند أحمد (٢/٩٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦٩)

«إِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ الْبَلِيغَ مِنَ الرِّجَالِ الَّذِي يَتَخَلَّلُ بِلِسَانِهِ كَمَا تَتَخَلَّلُ الْبَقَرَةُ بِلِسَانِهَا»[1]

[اللہ تعالیٰ ایسے زبان دراز شخص سے نفرت کرتا ہے جو اپنی زبان سے اس طرح باتوں کو لپیٹتا ہے جیسے گائے چارے کو (یعنی بے فائدہ اور بہت زیادہ باتیں کرتا ہے)]

اس موضوع پر اور بھی بہت سی مرفوع وموقوف احادیث عمر، سعد، ابن مسعود اور عائشہ رضی اللہ عنہم وغیرہ کے واسطے سے وارد ہوئی ہیں۔ لہٰذا یہ اعتقاد رکھنا واجب ٹھہرا کہ جو شخص بہت باتوں اور لمبا چوڑا کلام کرنے والا ہے، وہ اس شخص سے بڑا عالم نہیں ہے جو کم گو ہے۔

امام ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ہم ایسے جاہل لوگوں کے ساتھ آزماتے گئے ہیں، جو متاخرین میں سے بڑی باتیں کرنے والوں کے حق میں یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ متقدمین سے افضل ہیں۔ پھر ان میں سے کسی کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ شخص، کیا صحابہ اور کیا ان سے بعد والے لوگ، ہر متقدم سے افضل ہے، کیوں کہ وہ کثیر البیان اور کثیر المقال ہے۔ ان میں سے کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ یہ بہت باتیں کرنے والا سات مشہور ومتبوع فقہا سے بھی افضل ہے، حالانکہ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ ہر متاخر سارے متقدمین سے بہتر ہو، کیونکہ یہ سات فقہا ان لوگوں کی نسبت، جو ان سے پہلے تھے، زیادہ کلام کرنے والے ہیں۔ لہٰذا جب وہ لوگ جو ان فقہا کے بعد آئے ہیں، وہ اپنے اقوال کی وسعت کے سبب ان سے زیادہ عالم ٹھہرے، تو یہ لوگ ان لوگوں سے، جو بہ نسبت ان کے اقوال میں کم وسعت رکھتے تھے، جیسے ثوری، اوزاعی، لیث، ابن مبارک اور ان کا طبقہ، بالاولیٰ اعلم اور افضل ہوئے، بلکہ ان لوگوں سے بھی بہتر ہوئے جو ان سے پہلے تھے، جیسے تابعین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، کیونکہ وہ بہ نسبت ان لوگوں کے، جو ان کے بعد ہوئے ہیں، کم کلام کرنے والے تھے، حالانکہ یہ سلف صالحین کے حق میں بہت بڑی عیب جوئی، بدگمانی اور انھیں جہل اور قصورِ علم کی طرف منسوب کرنا ہے، لا حول ولا قوة إلا بالله!

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حق میں بہت سچی بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں:

"إِنَّهُمْ أَبَرُّ الْأُمَّةِ قُلُوباً، وَأَعْمَقُهَا عُلُوماً، وَأَقَلُّهَا تَكَلُّفاً"[2]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٥٣) اس حدیث کے آخر میں موجود لفظ "بلسانها" ترمذی میں نہیں ہے، البتہ یہ لفظ "شعب الإيمان" (٤٣/٧) اور "مسند البزار" (٤٢٢/٦) میں مروی ہے۔

[2] جامع بيان العلم (٩٧/٢)

[بلا شبہہ وہ امت میں سب سے زیادہ نیک دل، سب سے زیادہ علوم میں پختہ اور ان سب سے کم تکلف کرنے والے تھے]

اسی سے ملتی جلتی بات سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔[1] اس قول میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کے بعد آئے، وہ علم میں تو ان سے کم ہیں، مگر بہت زیادہ تکلف کرنے والے ہیں۔

نیز سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:

"إِنَّكُم فِيْ زَمَانٍ كَثِيْرٌ عُلَمَاؤُهُ، قَلِيْلٌ خُطَبَاؤُهُ، وَسَيَأْتِي بَعْدَكُم زَمَانٌ قَلِيْلٌ عُلَمَاؤُهُ، كَثِيْرٌ خُطَبَاؤُهُ"[2]

[بلا شبہہ تم ایک ایسے دور میں ہو جس میں علما زیادہ اور خطبا کم ہیں، جب کہ تمھارے بعد ایک ایسا دور آنے والا ہے جس میں علما کم اور خطبا زیادہ ہوں گے]

لہٰذا جو شخص زیادہ علم اور کم گفتگو والا ہے، وہ قابل ستایش ہے اور جو شخص اس کے برعکس ہے، وہ قابل مذمت ہے۔

علماے یمن کی مدح سرائی:

علامہ ابن رجب رحمہ اللہ نے کہا ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ یمن کے ایمان اور فقہ کی شہادت دی ہے، چنانچہ یمنی لوگ تمام لوگوں سے کم کلام کرنے والے اور وسیع علوم رکھنے والے ہیں۔ ان کا علم، علم نافع ہے جو ان کے دلوں میں ہے۔ یہ بقدر حاجت وضرورت اپنی زبان میں علم کو کرتے ہیں، اسی کو فقہ اور نفع مند علم کہتے ہیں۔

غرض کہ تمام علوم میں سے افضل علم وہ ہے، جو تفسیر قرآن اور معانی احادیث سید الأنام کے بارے میں ہو اور حلال وحرام میں وہ علم کامل ہے جو صحابہ، تابعین اور تبع تابعین سے ماثور ومنقول ہو کر اسلام کے مشہورین ائمہ کرام رحمہم اللہ تک پہنچے۔ وہ ائمہ جن کی دین میں اقتدا کی جاتی ہے اور جن کے نام ہم

---

[1] حلية الأولياء (١/٣٠٥)

[2] الأدب المفرد (٧٨٩) اس معنی میں سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بھی ایک روایت مروی ہے۔ دیکھیں: مسند أحمد (٥/١٥٥) السلسلة الصحيحة (٢٥١٠)

اوپر ذکر کر آئے ہیں، لہٰذا اس باب میں ان سے مروی چیز کو سمجھ بوجھ کے ساتھ ضبط کرنا افضل علم ہے۔

رہا وہ توسع جو ان کے بعد ایجاد ہوا ہے، تو اس میں زیادہ خیر نہیں ہے، مگر یہ کہ ان کے کلام کی شرح ہو۔ جو ان کے کلام کے مخالف ہے وہ اکثر باطل ہے، اس میں کچھ فائدہ نہیں، بلکہ انھیں کا کلام کافی و وافی ہے۔ جو لوگ ان کے بعد ہوئے، ان کے کلام میں جو حق ملتا ہے، وہی حق ان ائمہ کے کلام میں مختصر الفاظ میں موجود ہے اور جس چیز کا بطلان ان کے بعد والے لوگوں کے کلام میں پایا جاتا ہے، اس کا بطلان ائمہ سابقین کے کلام میں موجود ہے، مگر اس شخص کے لیے جو سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔

پھر ان کے کلام میں وہ انوکھے معانی اور دقیق ماخذ موجود ہیں، جن کی طرف بعد والے لوگ راہنمائی پاتے ہیں نہ کوئی اس تک پہنچتا ہے۔ پس جو شخص ان کے کلام سے علم حاصل نہیں کرتا، اس سے یہ خیر کثیر بالکل فوت ہو جاتی ہے اور متاخرین کی متابعت کی وجہ سے وہ باطل کی گہرائیوں میں جا گرتا ہے۔

سلف کے کلام کو سمجھنے کے لیے معرفت تامہ درکار ہے:

جو شخص سلف کے کلام کو جمع کرنے کا ارادہ رکھتا ہو، وہ صحیح کو سقیم سے پہچاننے کا محتاج ہوتا ہے اور یہ بات جرح و تعدیل اور علل کی معرفت سے حاصل ہوتی ہے۔ جسے اس امر کی شناخت نہیں ہے، وہ جو کچھ نقل کرتا ہے اس پر اسے وثوق نہیں ہو سکتا، بلکہ خود اس پر حق و باطل غیر واضح رہتا ہے اور اسے اپنے علم پر یقین نہیں ہوتا جس طرح کہ تھوڑے علم والے لوگ روایتِ حدیث پر یا مرویاتِ سلف پر، صحیح کو سقیم سے نہ جاننے کی وجہ سے وثوق و یقین نہیں کرتے ہیں، بلکہ وہ اپنے جہل کے سبب یہ تجویز کرتے ہیں کہ یہ سب باطل ہے، کیونکہ انھیں سرے سے وہ معرفت ہی حاصل نہیں ہے جس کے سبب وہ صحیح اور سقیم کو شناخت کر سکیں۔

اصحابِ رسول ﷺ اور تابعین سے مروی علم کی حیثیت:

امام اوزاعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

''علم وہ ہے جو اصحابِ محمد ﷺ لائے ہیں، جو کچھ اس کے سوا ہے وہ علم نہیں ہے۔''

امام احمد رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ رہے تابعین تو ان کے حق میں انھوں نے کہا ہے:

"أنت مخير بين كتابته وتركه" [تمھیں اس کو لکھنے اور چھوڑنے کا اختیار ہے]

چنانچہ امام زہری رحمہ اللہ تابعین کے کلام کو لکھتے تھے، جب کہ صالح بن کیسان رحمہ اللہ کا عمل اس کے برعکس تھا، لیکن بعد ازاں وہ تابعین کا کلام نہ لکھنے پر نادم ہوئے۔

علامہ ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہمارے زمانے میں ائمہ سلف امام شافعی، احمد، اسحاق اور ابو عبید رحمہم اللہ کے دور تک علمائے امت کا کلام لکھنا متعین تھا۔

سلف کے بعد والے علم کی حیثیت:

آدمی کو چاہیے کہ وہ سلف کے بعد ایجاد ہونے والے علم سے بچے اور خبردار رہے، کیوں کہ سلف کے بعد بہت سے حوادث معرض موجود میں آئے اور ایسے لوگ پیدا ہوئے جو متابعتِ حدیث کی طرف منسوب ہیں جیسے ظاہریہ وغیرہ۔ لیکن یہ لوگ ائمہ سے شذوذ کے سبب ان اسلاف کے سخت مخالف ہیں۔ وہ اپنے فہم میں ان سے منفرد اور الگ ہو گئے ہیں۔ جس بات کو ائمہ نے اپنے سے پہلے لوگوں سے اخذ نہ کیا تھا، یہ اسے اخذ کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ متکلمین اور فلاسفہ کے کلام میں داخل ہونا محض شر ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی شخص ان فنون میں داخل ہو اور متکلمین کے عیوب و نقائص سے آلودہ نہ ہو۔ امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

"علم کلام میں نظر رکھنے والا اس بات سے محفوظ نہیں رہتا کہ وہ جہمیہ میں شمار ہو۔"

اسی طرح باقی ائمہ سلف نے اہلِ کلام سے، اگرچہ وہ سنت کا دفاع ہی کیوں نہ کر رہے ہوں، خبردار رہنے اور ان سے بچ کر رہنے کی تلقین کی ہے۔

علم باطن ... بدعی علوم میں سے ایک علم ہے:

محدثاتِ علوم میں سے ایک علم علومِ باطنہ میں محض رائے یا ذوق یا کشف کے ساتھ کلام کرنا ہے، جیسے معارف و اعمالِ قلوب اور اس کے توابع میں کلام کرنا، کیونکہ ایسا کرنا بہت خطرناک ہے۔ اعیانِ ائمہ، جیسے امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ، نے اس امر پر انکار فرمایا ہے۔ امام ابو سلیمان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"کوئی علمی نکتہ مجھے معلوم ہوتا ہے تو میں اسے قبول نہیں کرتا الا یہ کہ اس کے دو عادل گواہ ہوں۔ ایک کتاب اللہ اور دوسری سنتِ رسول اللہ۔"

جنید رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

”علمنا هذا مقيد۔ وفي رواية: مشيد۔ علي الكتاب والسنة، فمن لم يقرأ القرآن و لم يكتب الحديث لا يقتدیٰ به في علمنا هذا“

[ہمارا یہ علم (علم تصوف) کتاب وسنت سے مقید اور محکم ہے، لہٰذا جس شخص نے قرآن پڑھا نہ حدیث لکھی، ہمارے اس علم میں اس کی اقتدا نہیں کی جائے گی]

علامہ ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اس باب میں کئی قومیں داخل ہو کر انواع و اقسام کی زندیقیت اور نفاق میں پڑ کر یہ دعویٰ کرنے لگی ہیں کہ اولیا انبیا سے افضل ہیں، یا یہ کہ وہ ان پیغمبروں سے مستغنی ہیں۔ یہ لوگ ان رسولوں کی، جو اللہ کی شریعت لے کر آئے ہیں، خامیاں بیان کرنے لگے اور حلول و اتحاد کے مدعی بن بیٹھے اور وحدت الوجود وغیرہ کے قائل ہو گئے، حالانکہ یہ سب کفر، فسق اور عصیان کے اصول اور بنیادیں ہیں، جیسے شریعت سے بالاتر ہونا اور ممنوعہ چیزوں کی حلت کا دعویٰ کرنا وغیرہ۔

پھر انھوں نے اپنے اس دین ومسلک میں ایسی بہت سی چیزیں داخل کر دیں، جو دین اسلام میں بالکل شامل نہ تھیں۔ ان میں سے بعض نے یہ اعتقاد کیا کہ ان چیزوں سے دلوں میں نرمی حاصل ہوتی ہے، جیسے ناچ گانا۔ کسی نے یہ سمجھا کہ اس سے ریاضتِ نفوس مراد ہے، جیسے ان صورتوں سے عشق جنھیں دیکھنا حرام ہے اور حسین شکلوں کی طرف نظر کرنا۔

زنکہت سحری شوق یار میخیزد
جنون ز سایۂ ابرِ بہار میخیزد

[صبح کا منظر دیکھنے سے یار کا شوق اور محبت پیدا ہوتی ہے، ابرِ بہار کے سائے سے جنون بھڑکتا ہے]

بعض نے یہ گمان کیا کہ ان میں کسرِ نفسی اور تواضع ہے، جیسے شہرتِ لباس وغیرہ جس کا شریعت میں ذکر نہیں ہوا ہے۔ پھر ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو اللہ کے ذکر اور نماز سے روکتی ہیں، جیسے گیت گانے اور حرام چیز پر نظر کرنا، چنانچہ یہ لوگ اس امر میں ان لوگوں کے مشابہ ہو گئے، جنھوں نے اپنے دین کو لہو ولعب ٹھہرا لیا ہے۔

وأتی الغناء فکالحمیر تناهقوا
والله ما رقصوا لأجل الله

[اور وہ نغمہ سننے کے لیے آیا تو (کیا دیکھا کہ گویے) گدھوں کی طرح چیخ رہے تھے، اللہ کی قسم! وہ اللہ کے لیے اچھل کود نہیں کر رہے تھے]

علم نافع کی تعیین:

علامہ ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مذکور بالا تمام علوم میں سے نفع مند علم یہی کتاب وسنت کی نصوص ضبط کرنا، ان کے معانی کو سمجھنا اور قرآن وحدیث کو ماثوراتِ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے ساتھ ضبط کرنا ہے۔ حلال وحرام، زہد ورقائق اور معارف وغیرہ کے بارے میں ان سے جو کلام منقول ہوا ہے، اس کے ساتھ اپنے علم کو وابستہ کرنا ہے۔ صحیح کی سقیم سے تمیز کی کوشش کرنا اور پھر ان کے معانی و مفاہیم سمجھنے میں کوشش کرنا ہی علم ہے۔

علم نافع کا ثمرہ:

جو شخص کتاب وسنت کے علم پر اکتفا کر کے لوجہ اللہ خالص ارادہ کیے ہوئے ہے اور اللہ سے استعانت چاہتا ہے تو اللہ اس کی اعانت کرتا ہے اور اسے صحیح راہ پر لگا کر توفیق وتسدید اور فہم صحیح عطا فرماتا ہے، تب اسے علم کا ثمرہ حاصل ہوتا ہے، جو خشیتِ الٰہی ہے، جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَٰٓؤُا﴾ [الفاطر: ٢٨]

[اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے صرف جاننے والے ہی ڈرتے ہیں]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا ہے:

”كفىٰ بخشية الله علما، وكفىٰ بالاغترار بالله جهلا“

[اللہ کی خشیت ہی کافی علم ہے اور اللہ تعالیٰ سے بے خبر رہنا ہی کافی جہل ہے]

بعض سلف نے فرمایا ہے:

”ليس العلم بكثرة الرواية، ولكن العلم الخشية“

[علم کثرتِ روایت کا نام نہیں، بلکہ خشیتِ الٰہی کا نام علم ہے]

بعض کا کہنا ہے:

”من خشي الله فهو عالم، ومن عصاه فهو جاهل“

[جو اللہ سے ڈرا وہ عالم ہے اور جس نے اس کی نافرمانی کی، وہ جاہل ہے]

علمِ نافع کس طرح خشیت پیدا کرتا ہے؟

علم دو امور پر دلالت کرتا ہے:

① اللہ کی معرفت، یعنی اللہ تعالیٰ کن اسمائے حسنیٰ، صفاتِ علیا اور افعالِ باہرہ کا مستحق ہے، چنانچہ یہ شناختِ باری تعالیٰ اجلال واعظام، خشیت ومہابت اور محبت و رضائے الٰہی کو مستلزم ہوتی ہے۔

② دوسرا اس بات کی شناخت حاصل کرنا کہ اللہ تعالیٰ کو اعتقادات، اعمالِ ظاہرہ وباطنہ اور اقوال میں سے کون سی چیز پسندیدہ ہے اور کس چیز سے وہ کراہت فرماتا ہے، لہٰذا جس شخص کو اس بات کا علم حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اس چیز کی طرف جلدی کرتا ہے جس میں اللہ کی محبت، خوشی اور رضا ہوتی ہے اور جس چیز کو وہ مکروہ، مسخوط اور ناخوش رکھتا ہے، یہ شخص اس سے دور بھاگتا ہے۔

پس جب علم نے اپنے جاننے والے کو یہ ثمرہ عطا کیا تو یہ علم نافع ٹھہرا اور جب اس نے نافع ہوکر دل میں جگہ اور وقار پکڑا تو اب وہ دل اللہ کے لیے خشوع کرنے والا، اس کی ہیبت و اجلال، خشیت و محبت اور تعظیم کے سبب اس کے سامنے ذلیل و خوار ہو جائے گا اور جب دل میں خشوع، خضوع اور انکساری آ گئی تو اب اس کا نفس دنیا میں تھوڑے سے حلال پر قانع ہوکر شکم سیر رہے گا۔ یہ قناعت اس کے لیے دنیا میں زہد کی موجب ہو جائے گی اور وہ سب کو فانی سمجھ لے گا۔ مال و جاہ اور فضول عیش کا کوئی حصہ باقی نہ رہے گا، کیونکہ عدمِ قناعت کے سبب اللہ تعالیٰ کے ہاں آخرت کی نعمتوں سے اس کا حصہ کم ہو جاتا ہے، اگرچہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کے ہاں کریم ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ سلف نے ایسے ہی کہا ہے اور یہ بات مرفوعاً بھی مروی ہے۔

بندے اور رب کے درمیان معرفت خاصہ اور اس کے ثمرات:

علم نافع اس بات کا موجب ہے کہ بندے اور رب کے درمیان ایک معرفت خاصہ ہو، تاکہ جب وہ اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگے تو اللہ تعالیٰ اسے عطا کردے اور جب بندہ دعا کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرمائے، جس طرح ایک قدسی حدیث میں آیا ہے:

«وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى أُحِبَّهُ»

[میرا بندہ ہمیشہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے

محبت کرنے لگتا ہوں]

«وَإِنْ سَأَلَنِي لَأُعْطِيَنَّهُ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِي لَأُعِيذَنَّهُ»①

[اور اگر وہ مجھ سے کوئی چیز مانگتا ہے تو میں اسے ضرور دیتا ہوں اور اگر مجھ سے پناہ مانگے تو ضرور اسے پناہ دیتا ہوں]

ایک اور روایت میں ہے: «وَلَئِنْ دَعَانِي لَأُجِيبَنَّهُ»② [اور اگر وہ مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں ضرور اس کی دعا قبول کرتا ہوں]

رسول اللہ ﷺ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو وصیت کی تھی:

«اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ، اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ أَمَامَكَ، تَعَرَّفْ إِلَيْهِ فِي الرَّخَاءِ يَعْرِفْكَ فِي الشِّدَّةِ»③ (مسند أحمد)

[(احکام کی پابندی کر کے) اللہ کی حفاظت کرو، اللہ تمھاری حفاظت کرے گا۔ اللہ کی حفاظت کرو، تم اسے اپنے سامنے پاؤ گے۔ تم اسے خوشحالی میں یاد رکھو، وہ تمھیں تکلیف کے وقت یاد رکھے گا]

الحاصل بندے کی شان اس میں ہے کہ دل سے اس کے اور رب کے درمیان ایک معرفتِ خاصہ اس طرح پر ہو کہ وہ اللہ کو اپنے قریب پا کر خلوت میں اس سے مانوس اور ذکر و دعا اور مناجات کی حلاوت اور خدمتِ الٰہی کی لذت محسوس کرے۔ یہ بات صرف اسی شخص کو حاصل ہوتی ہے، جو پوشیدہ اور علانیہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔

امام وہیب بن ورد رحمہ اللہ سے پوچھا گیا:

"هل يجد حلاوة الطاعة من عصى؟ قال: لا، ولا من هم"

[کیا وہ شخص بھی اطاعت کی لذت پاتا ہے جس نے (اللہ عزوجل کی) نافرمانی کی ہو؟ انھوں نے جواب میں کہا: نہیں، بلکہ وہ شخص بھی اس کی لذت سے محروم رہتا ہے جس نے نافرمانی کا محض ارادہ کیا ہے]

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٣٧)

② مسند أحمد (٦/٢٥٦) مسند البزار (٢/٤٦٠) اس کی سند میں "عبدالواحد بن قیس" ضعیف ہے۔

③ مسند أحمد (١/٣٠٧)

پھر جب بندہ اس انس اور حلاوت کو پالیتا ہے تو وہ عارف رب ٹھہرتا ہے۔ اس کے اور رب تعالیٰ کے درمیان ایک خاص شناخت ہو جاتی ہے اور وہ جب بھی کوئی چیز اللہ سے مانگے تو وہ چیز اسے مل جائے اور جب وہ کوئی چاہت کرے تو اس کی مطلوبہ چیز اسے عطا ہو جائے۔ جس طرح کہ شعوانہ نے فضیل سے کہا تھا:

"أما بينك وبين ربك إذا دعوته أجابك؟"

[کیا تیرے اور تیرے رب تعالیٰ کے درمیان ایسی معرفت نہیں ہے کہ جب تو اس سے دعا کرے تو وہ تیری دعا کو قبول کرے؟]

یہ سن کر فضیل پر غشی طاری ہوگئی تھی۔

بندۂ دنیا، عالمِ برزخ اور موقفِ قیامت میں ہمیشہ شدائد و کرب میں مبتلا ہوتا ہے، پھر جب اس کے اور رب تعالیٰ کے درمیان ایک خاص شناسائی ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان سب امور میں اس سے کفایت کرتا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو وصیت کرتے وقت رسول اللہ نے اسی کی طرف اشارہ فرمایا تھا:

«تَعَرَّفْ إِلَيْهِ فِي الرَّخَاءِ يَعْرِفُكَ فِي الشِّدَّةِ»[1] (مسند أحمد)

[تم اسے خوش حالی میں یاد رکھو، وہ تمھیں تکلیف کے وقت یاد رکھے گا]

کسی نے معروف کرخی رحمہ اللہ سے کہا تھا:

"ما الذي هيجك إلى الانقطاع وذكر الموت والقبر والجنة والنار؟"

[تجھے علاحدگی (رہبانیت) اختیار کرنے، موت، قبر، جنت اور جہنم کی یاد میں مگن رہنے پر کس چیز نے برانگیخت کیا ہے؟]

اس نے جواب دیا: یہ سب کچھ اسی (اللہ) کے ہاتھ میں ہے۔ جب تیرے اور اس کے درمیان جان پہچان ہوگئی تو پھر وہ تجھے ان سب سے کفایت کرے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ علم نافع وہ ہے جو بندے اور رب تعالیٰ کے درمیان شناسائی کرا دے اور بندے کو اس کی طرف راہ یاب کر دے، حتی کہ وہ صرف اکیلے رب ہی کو پہچان کر اس کے ساتھ مانوس ہو جائے اور اسی کے قرب سے شرمندہ رہے، گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے۔

[1] مسند أحمد (۱/۳۰۷)

اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے کہا ہے: "لوگوں سے سب سے پہلے جو علم اٹھ جائے گا وہ خشوع ہے۔"[1] سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "کچھ لوگ قرآن پڑھتے ہیں مگر قرآن ان کے حلقوں سے نیچے نہیں اترتا، لیکن جب قرآن مجید دل میں واقع ہو کر راسخ ہو جاتا ہے تو وہ نفع مند ثابت ہوتا ہے۔"

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے:

علم کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ علم ہے جو زبان پر ہوتا ہے اور یہ علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابن آدم پر حجت ہے۔ دوسرا وہ علم جو دل میں راسخ ہے اور یہ علم، علم نافع ہے۔

سلف کہتے ہیں: علما تین طرح کے ہوتے ہیں:

① ایک عالم باللہ، عالم بامر اللہ۔

② دوسرا عالم باللہ اور غیر عالم بامر اللہ۔

③ تیسرا عالم بامر اللہ اور غیر عالم باللہ۔

ان سب میں سے اکمل و افضل پہلی قسم ہے۔

اللہ سے ڈرنے والے وہی لوگ ہیں جو احکامِ الٰہیہ کے عارف و عالم ہیں۔ ساری شان اسی میں ہے کہ بندہ علم سے اپنے رب تعالیٰ کو پہچان لے، چنانچہ جب وہ رب کو پہچان لے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے قریب پائے گا، اللہ تعالیٰ بھی اس کے نزدیک ہو جائے گا اور اس کی دعا قبول کرے گا، جس طرح ایک اسرائیلی اثر میں مروی ہے:

"ابن آدم! اطلبني تجدني فإن وجدتني وجدت كل شيء، وإن فتك فاتك كل شيء، وأنا أحب إليك من كل شيء"

[اے ابن آدم! میری طلب اور جستجو کر تو مجھے پالے گا، پس اگر تو مجھے پالے گا تو تو ہر چیز پالے گا اور اگر تو مجھے نہ پا سکا تو تجھ سے ہر چیز چھوٹ جائے گی، جبکہ میں تجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہوں]

لكل شيء إذا فارقته عوض
وليس لله إن فارقت من عوض

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٥٣) مسند أحمد (٦/ ٢٦)

[ہر وہ چیز جسے تو چھوڑے اس کا ایک عوض اور بدلہ ہے، لیکن اگر تو اللہ ہی کو چھوڑ دے تو تیرے لیے کوئی عوض و بدلہ نہیں ہے]

ذوالنون رحمہ اللہ بہ وقت شب ان اشعار کو بار بار پڑھا کرتے تھے:

"اطلبوا لأنفسكم مثل ما وجدت أنا"

[اپنے نفسوں کے لیے اس طرح کی چیز طلب کرو جو چیز مجھے حاصل ہوئی ہے]

قد وجدت لي ساكنا
ليس في هواه عنا

[یقیناً مجھے ایسا ساتھی میسر آ گیا جس کی محبت اور دوستی میں کوئی مشقت نہیں ہے]

إن بعدت قربني
أو قربت منه دنا

[اگر میں اس سے دور ہو جاؤں تو وہ مجھے اپنے قریب کر لیتا ہے یا میں اس کے قریب ہوں تو وہ اور قریب ہو جاتا ہے]

امام احمد رحمہ اللہ نے معروف کرخی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ اصل علم اللہ کا ڈر ہے۔ یعنی علم کی بنیاد وہ علم ہے جو اللہ کی خشیت، محبت اور قرب کا موجب ہو اور اللہ تعالیٰ سے مانوس کرے، اس کی طرف رغبت دلائے۔ اس کے بعد وہ علم ہے جو اللہ کے احکام اور اس قول یا عمل یا حال یا اعتقاد کا علم ہو جو اللہ کو محبوب ہے اور اللہ تعالیٰ اسے پسند کرتا ہے۔

لہٰذا جس شخص کو ان دونوں قسم کا علم حاصل ہو، اس کا علم نافع ہے اور اسے علمِ نافع، قلبِ خاشع، نفسِ قانع اور دعاے مسموع حاصل ہوئی اور جس شخص سے یہ علمِ نافع فوت ہو جائے، وہ ان چار چیزوں میں جا گرا، جن سے رسول اللہ ﷺ نے پناہ مانگی تھی [یعنی وہ علم جو فائدہ نہ دے، وہ دل جو خشوع نہ کرے، وہ نفس جو قناعت نہ کرے اور وہ دعا جو قبول نہ ہو][1]

اس کا علم اس پر وبال اور حجت ہو گا کہ اس نے اپنے علم سے کچھ فائدہ حاصل نہ کیا، کیونکہ اس کے دل نے اپنے ربِ تعالیٰ کے لیے خشوع کیا نہ اس کا نفس دنیا سے سیر ہی ہوا، بلکہ اس کی حرصِ دنیا

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٢٢)

بڑھ گئی اور وہ طالبِ دنیا بن گیا اور نہ اس کی دعا ہی سنی گئی، کیونکہ اس نے رب تعالیٰ کے اوامر کی بجا آوری کی نہ اللہ تعالیٰ کے مکروہ اور مسخوط کاموں سے اجتناب کیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے، جب اس کا علم اس لائق ہو کہ اس سے نفع حاصل کیا جا سکتا ہو، یعنی وہ علم کتاب وسنت سے اخذ کیا گیا ہو، لیکن اگر وہ علم قرآن وحدیث سے حاصل شدہ نہ ہو تو پھر وہ علم فی نفسہ غیر نافع ہے، اس سے استفادہ کرنا ممکن ہی نہیں، بلکہ اس کا نقصان اس کے فائدے سے زیادہ ہے۔

غیر نافع علم کی علامات:

وہ علم جو نفع مند نہیں ہوتا، اس کی علامت یہ ہے کہ اس کا حامل شیخی بگھارے، فخر وتکبر کرے، علو ورفعت کا طالب ہو، دنیا میں آگے نکل جانے کی کوشش کرے، علما سے مقابلہ کرنے اور جہلا سے بحث وتکرار کرنے کا خواہش مند رہے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ جو شخص اس لیے علم حاصل کرتا ہے تو پھر (اس کے لیے) آگ ہے، آگ ہے۔[1]

یوں بھی ہوتا ہے کہ ایسے علم والے دعوی تو اللہ کی معرفت، اس کی طلب اور اس کے سوا سے اعراض کا کیا کرتے ہیں، جب کہ اس سے ان کی غرض صرف اسی چیز کی طلب ہوتی ہے جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے۔

ایسے عالموں کی مزید علامات اور نشانیاں یہ ہیں کہ وہ لوگوں اور بادشاہوں کے دل میں اپنا جاہ ومقام پیدا کرنے کے خواہش مند ہوئے ہیں، ان سے اپنے لیے حسن ظن اور کثرتِ اتباع کے طالب ہیں، لوگوں میں مخدوم، مکرم، مطاع اور معظم ہونا چاہتے ہیں، اس کی علامت ان کی طرف سے دعوی ولایت کا اظہار ہے، جس طرح کہ اہلِ کتاب اس کا دعویٰ کرتے تھے، یا قرامطہ اور باطنیہ وغیرہ نے اس قسم کا دعوی کیا تھا، حالانکہ یہ شیوہ سلف صالحین کے شیوے سے خلاف ہے، کیونکہ وہ تو اپنے نفسوں کو حقیر رکھتے تھے اور ظاہر وباطن میں اس کو برا سمجھتے تھے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: جو شخص یہ کہے کہ میں عالم ہوں تو [سمجھ لو کہ] وہ جاہل ہے۔ جو یہ کہے کہ میں مومن ہوں تو وہ کافر ہے اور جو یہ کہے کہ میں جنت میں ہوں تو وہ آگ میں ہے۔

اس کی علامت یہ ہے کہ وہ شخص حق کو قبول نہیں کرتا، تابع فرمان نہیں ہوتا اور حق گو پر تکبر

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٥٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٣)

کرتا ہے، خصوصاً جب کہ وہ حق پرست لوگوں کی نگاہ میں اس سے کم درجے کا انسان ہو۔ نیز وہ اس ڈر سے باطل پر اصرار کرتا ہے کہ کہیں لوگوں کے دل اس سے جدا اور پریشان نہ ہو جائیں، اس لیے وہ حق کی طرف رجوع نہیں کرتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی موجودگی میں اپنے نفس کی مذمت و حقارت کرنے لگتا ہے، تاکہ لوگ اپنے دلوں میں اس کے متواضع ہونے کا اعتقاد رکھیں اور اس کی مدح و ثنا کریں، حالانکہ یہ خصلت ریاکاری میں سے ہے، جیسا کہ تابعین اور ان کے بعد والے علما نے اس پر تنبیہ کی ہے۔

ایسے عالم کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ مدح کو میٹھا جان کر اسے قبول کرنے کے سبب وہ بات ظاہر کرتا ہے جو صدق و اخلاص کے منافی ہوتی ہے، کیونکہ سچے شخص کو اپنی جان پر نفاق کا خوف لگا رہتا ہے اور وہ برے خاتمے سے ڈرتا ہے، لہٰذا وہ مدح و استحسان کے قبول کرنے سے بے پروا ہوتا ہے۔

علمِ نافع کی علامات:

① اہلِ علمِ نافع کی علامات میں سے ایک علامت یہ ہے کہ وہ اپنے نفسوں کے لیے کوئی جاہ و مقام اور کسی کی مدح سرائی کی طرف نہیں دیکھتے۔ وہ دل سے تزکیہ و مدح کو مکروہ جانتے ہیں اور کسی شخص پر تکبر نہیں کرتے۔

حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے:

"إنما الفقيه الزاهد في الدنيا والراغب في الآخرة البصير بدينه المواظب على عبادة ربه"

[فقیہ تو صرف وہ ہوتا ہے جو دنیا سے بے پروا اور آخرت کی رغبت رکھنے والا ہو، اپنے دین کے ساتھ بصیرت رکھنے والا اور اپنے رب تعالیٰ کی عبادت پر ہمیشگی کرنے والا ہو]

دوسری روایت میں ہے:

"الذي لا يحسد من فوقه، ولا يسخر من دونه، ولا يأخذ على علم علمه لله"

[(فقیہ وہ ہے) جو اپنے سے بڑے اور فائق سے حسد نہیں کرتا، اپنے سے چھوٹے اور کمتر کا مذاق نہیں اڑاتا اور جو علم اس نے اللہ کے لیے پڑھایا ہے، اس پر اجرت نہیں لیتا]

اس مفہوم سے ملتا جلتا ایک قول سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔[1]

---

[1] سنن الدارمي (۱/ ۸۸)

اہلِ علمِ نافع کا علم جب زیادہ ہوتا ہے تو اللہ کے لیے ان کی تواضع، خشیت، عاجزی اور انکساری میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

بعض علماے سلف نے کہا ہے:

عالم کو چاہیے کہ اپنے سر پر خاک ڈالے اور اپنے رب کے لیے خاکساری کرے، کیوں کہ جتنا اس کا علم بڑھے گا اتنی ہی اسے اپنے رب تعالی کی معرفت زیادہ ہو گی، اللہ کی خشیت و محبت کی افزایش ہو گی اور اس کی انکساری اور عاجزی روز افزوں ہو گی۔

در خاک بلقان برسیدم بعابدے
گفتم مرا بتربیت از جہل پاک کن

[سرزمین بلقان میں میں ایک عابد و درویش کے پاس گیا تو میں نے کہا: تعلیم وتربیت کے ذریعے مجھے جہالت سے پاک کر دو]

گفتا برو چو خاک تحمل کن اے فقیہ
یا ہرچہ خواندہ ہمہ در زیرِ خاک کن

[اس نے کہا: اے فقیہ! جاؤ اور مٹی کی طرح تحمل مزاج بن جاؤ، یا جو کچھ تم نے پڑھا ہے اسے زیرِ زمین دفن کر دو]

② نفع مند علم والوں کی ایک علامت یہ ہے کہ ان کا علم انھیں دنیا سے بھاگنے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ سب سے بڑی دنیا یہی ریاست، شہرت اور مدح ہے۔ اس سے دور رہنا اور اس سے بچنے کی کوشش کرنا علمِ نافع کی علامت اور نشانی ہے۔ پھر اگر وہ بے اختیار ان چیزوں میں سے کسی میں مبتلا ہو جائے تو صاحبِ علم کو چاہیے کہ انجام کار سے ڈرتا رہے اور یہ خیال کرے کہ کہیں یہ بات میرے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف خفیہ چال اور ڈھیل دینے کے طور پر نہ ہو۔ جیسے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا نام جب لوگوں میں عام اور مشہور ہو گیا تو وہ اپنے نفس پر نہایت خوف زدہ رہتے تھے۔

③ علمِ نافع کی ایک علامت یہ ہے کہ اس علم کا عالم اپنے علم کا مدعی ہوتا ہے نہ کسی شخص پر فخر کرتا ہے اور نہ اپنے غیر کو جاہل قرار دیتا ہے، سوائے اس شخص کے جو سنت اور اہلِ سنت کی مخالفت کرتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کی گفتگو اللہ کے لیے غضب کے طور پر ہوتی ہے نہ کہ اپنے نفس کے

لیے غصے کے طور پر، اور نہ وہ کسی پر اپنی بڑھائی قائم کرنے کے لیے گفتگو کرتا ہے۔

جس شخص کا علم غیر نافع ہے، اسے اپنے نفس پر تکبر کرنے، لوگوں پر فخر کرنے، مخلوق پر اپنی فضیلت کا اظہار کرنے، انھیں جہل کی طرف منسوب کرنے اور ان پر اپنی رفعت قائم کرنے کے لیے ان کی خامیاں نکالنے کے سوا کوئی شغل نہیں ہوتا ہے، حالانکہ یہ شغل انتہائی قبیح اور ردی خصلتوں میں سے ہے، بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ اپنے سے پہلے گزرے ہوئے علما کو جہل، غفلت اور سہو کی طرف منسوب کرتا ہے، جس سے اپنے نفس کے ساتھ حسن ظن اور سلف کے ساتھ بدگمانی لازم آتی ہے۔

میں [نواب صاحب رحمہ اللہ] کہتا ہوں کہ میرے ایک ہم عصر نے خواب میں امام مالک رحمہ اللہ کی رویت کا قصہ بیان کر کے لکھا ہے کہ مجھے ان کی کتاب "موطا" پر چند اعتراضات تھے، لیکن میں نے ان سے ان کے متعلق کچھ دریافت نہ کیا۔ انتھیٰ. حالانکہ موطا ایک مبارک اور قدیم کتاب ہے، سارے ائمہ اس کتاب کے خوشہ چین ہیں اور امام مالک رحمہ اللہ امام دار الھجرۃ تھے۔

شیخی بگھارنا اور فخر وتکبر کرنا توہین آمیز خیالات پیدا کرنے کا باعث بنا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور سب مسلمانوں کو حفظِ مراتب اور آدابِ سلف کو ملحوظ رکھنے کی توفیق بخشے اور ہمارے دلوں کو اہلِ خیر القرون اور اہلِ صدر اول کی طرف سے پاک رکھے۔ اللھم آمین.

علامہ ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اہلِ علمِ نافع اپنے نفوس کے ساتھ بدگمانی کرتے ہیں اور علمائے سلف کے ساتھ حسنِ ظن رکھتے ہیں۔ وہ اپنے دل اور نفس سے سلف صالحین کے فضل کا اقرار کیا کرتے ہیں اور اپنے عجز و انکسار کے معترف رہتے اور کہتے ہیں کہ ہم ان کے درجے تک نہیں پہنچ سکتے، بلکہ ان کے مرتبے کے قریب تک بھی ہماری رسائی نہیں ہے۔

امام عالی مقام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ علقمہ افضل ہیں یا اسود؟ تو انھوں نے کیا خوب جواب دیا:

"واللہ ما نحن بأهل أن نذكرهم، فكيف نفضل بينهم؟"

[اللہ کی قسم! ہم تو اس بات کے بھی اہل نہیں ہیں کہ ان کا تذکرہ کریں، چہ جائے کہ ہم

ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دیں؟]

عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ جب سلف کے اخلاق و عادات کا ذکر کرتے تو یہ شعر پڑھتے:

لا تعرضن لذكرنا في ذكرهم

ليس الصحيح إذا مشى كالمقعد

[ان (اسلاف) کے تذکرے میں ہمارا ذکر مت کرو، صحیح اور تندرست بندہ جب چلے تو وہ بیٹھے ہوئے (بیمار) بندے کی طرح نہیں ہوتا]

جس شخص کا علم غیر نافع ہوتا ہے، وہ کثرتِ مقال اور تفصیلِ کلام میں اپنے نفس کو متقدم عالم سے افضل جانتا ہے اور یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ کے ہاں میرا نفس علم و درجے میں اس سے افضل ہے، کیوں کہ یہ فضل میرے ساتھ مختص ہے، مجھ سے پہلے کسی کو یہ امر حاصل نہ تھا، اس لیے عالم متقدم اس کی نظر میں حقیر معلوم ہوتا ہے اور یہ اس پر قلتِ علم کا عیب لگاتا ہے، حالانکہ اس بیچارے کو یہ معلوم نہیں ہے کہ سلف کی قلتِ کلام براہِ ورع اور خشیتِ الٰہی تھی۔ اگر وہ طولِ کلام کا ارادہ کرتے تو وہ اس سے ہرگز عاجز نہ ہوتے، جس طرح کہ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک قوم کو دین کے بارے میں حجت بازی اور جھگڑا کرتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا:

کیا تمھیں معلوم نہیں ہے کہ یقیناً اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جن کو کلام پر عدمِ قدرت اور گونگے پن نے نہیں بلکہ خشیتِ الٰہی نے خاموش کر رکھا ہے؟ حالانکہ یقیناً وہ علما، فصحا، طلقا، نبلا اور گزشتہ قوموں پر اللہ کے عذاب یا رحمت کے دنوں کا بہ خوبی علم رکھنے والے ہیں۔ مگر جب وہ اللہ کی عظمت اور بڑھائی کو یاد کرتے اور اس کا تصور کرتے تھے تو اس کی وجہ سے ان کی عقلیں جواب دے جاتی تھیں، ان کے دل ٹوٹ جاتے تھے اور ان کی زبانیں گنگ ہو جاتی تھیں، حتی کہ جب انھیں اس حالت سے کچھ افاقہ ہوتا اور ہوش آتی تو وہ اعمال کی بجا آوری کے ذریعے اللہ کی طرف جلدی کرتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو کوتاہی کرنے والے لوگوں میں شمار کرتے، یقیناً وہ ظالموں اور خطا کاروں کے ساتھ سخت اور عاقل و تیز فہم تھے اور وہ بہت زیادہ نیکوکار اور اللہ کے دشمنوں سے بری تھے، مگر وہ اللہ کی بہت زیادہ عبادت کر کے بھی اسے زیادہ نہیں سمجھتے تھے اور اس کی تھوڑی عبادت پر راضی

نہیں ہوتے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے اعمال کی خبر نہیں دیتے تھے اور وہ ایسے لوگ ہیں کہ تو انھیں جہاں بھی ملے گا، ان کو فکر مند، خوف زدہ، ڈرنے والے اور خشیتِ الٰہی سے لبریز پائے گا۔[1]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رسول اللہ نے فرمایا ہے:

«اَلْحَيَاءُ وَالْعِيُّ شُعْبَتَانِ مِنَ الْإِيْمَانِ، وَالْبَذَاءُ وَالْبَيَانُ شُعْبَتَانِ مِنَ النِّفَاقِ»[2]

(رواه أحمد والترمذي و حسنه و خرجه الحاكم و صححه)

[حیا اور کم گوئی ایمان کی دو شاخیں ہیں، جب کہ فحش گوئی اور زیادہ باتیں کرنا نفاق کی دو علامتیں ہیں]

نیز سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مرفوع حدیث ہے:

«اَلْبَيَانُ مِنَ اللّٰهِ وَالْعِيُّ مِنَ الشَّيْطَانِ وَلَيْسَ الْبَيَانُ كَثْرَةَ الْكَلَامِ، وَلٰكِنَّ الْبَيَانَ الْفَصْلُ فِي الْحَقِّ، وَلَيْسَ الْعِيُّ قِلَّةَ الْكَلَامِ وَلٰكِنَّ مَنْ سَفِهَ الْحَقَّ»[3]

(رواه ابن حبان)

[بیان اللہ کی طرف سے اور بیان سے عاجزی شیطان کی طرف سے ہے، لیکن بیان کثرتِ کلام کو نہیں کہتے، بلکہ بیان تو امرِ حق میں فیصلہ کن بات کرنے کا نام ہے۔ "عِيّ" قلتِ کلام کو نہیں کہتے ہیں، بلکہ "عِيّ" تو بیانِ حق سے عاجز آنے کا نام ہے]

مراسیلِ محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن سے بندہ اس دنیا میں تو کم ہو جاتا ہے، مگر ان کے سبب آخرت میں زیادہ عزت پاتا ہے۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں: ① رحم، ② حیا، ③ کم گوئی۔

عون بن عبداللہ رحمہ اللہ نے کہا ہے:

"حیا، عفاف اور زبان کا عاجز آ جانا اور دل اور عمل کا عاجز نہ آنا ایمان کا حصہ ہے۔"

یہ وہ چیزیں ہیں جو دنیا میں ناقص ہوتی ہیں، مگر آخرت میں زیادہ ہو جاتی ہیں۔ بہر حال اس نقصانِ دنیا سے آخرت کا اضافہ بڑھ کر ہے۔ یہ روایت ایک ضعیف سند کے ساتھ مرفوعاً بھی مروی ہے۔[4]

---

① حلية الأولياء (١/٣٢٥) الزهد لابن المبارك (١٤٩٥) تاريخ دمشق (١٠/٧٩)

② مسند أحمد (٥/٢٦٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٢٧) مستدرك الحاكم (١/٥١)

③ صحيح ابن حبان (١٣/١١٣) اس کی سند میں "عتبہ بن سکن" راوی سخت ضعیف ہے۔

④ سنن الدارمي (٥٠٩) اس کی سند میں "عبدالحمید بن سوار" ضعیف ہے۔

بعض سلف نے کہا ہے کہ کوئی شخص ایک قوم کے پاس بیٹھتا ہے اور وہ قوم یہ خیال کرتی ہے کہ یہ شخص بے زبان اور عاجز ہے، حالانکہ وہ عاجز نہیں ہوتا، بلکہ وہ صاحبِ بصیرت مسلمان ہوتا ہے۔ جو شخص سلف کی قدر کو پہچانتا ہے، وہ یہ بات بہ خوبی جانتا ہے کہ طولِ کلام، کثرتِ جدال و خصام اور حاجت وضرورت سے زیادہ بیان سے ان کا سکوت کسی جہل اور کوتاہ علمی کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ ورع اور اللہ تعالیٰ کی خشیت کے سبب سے تھا۔ بات صرف اتنی ہے کہ وہ بے فائدہ امور کو چھوڑ کر فائدہ مند چیزوں میں مشغول تھے اور ان کی یہ خصلت قابلِ ستایش ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے:

«مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ»[1]

[لایعنی اور فضول باتوں کو چھوڑنا انسان کے اچھا مسلمان ہونے کی نشانی ہے]

اسلاف کا وہ کلام جو اصولِ دین میں تھا یا فروع میں یا تفسیر قرآن، حدیث، زہد و رقائق، حکم اور مواعظ وغیرہ میں، انھوں نے جس چیز پر بھی کلام کیا ہے، جو کوئی ان کی راہ پر چلے گا وہ راہ یاب ہے اور جو کوئی دوسری راہ پر چلے گا، وہ کثرتِ سوال، بحث و جدال اور قیل وقال میں داخل ہوگا۔ اگر وہ ان اسلاف کے فضل اور اپنے نفس کے نقص کا معترف ہے تو وہ قریب الحال ہے۔

ایاس بن معاویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے:

جو کوئی اپنے نفس کا عیب نہیں جانتا، وہ احمق ہے۔ کسی نے ان سے دریافت کیا: ''آپ جناب میں کیا عیب ہے؟'' تو انھوں نے جواب دیا: ''یہی کثرتِ کلام'' اگر کوئی اپنے نفس کے لیے فضل کا مدعی اور سلف کے لیے نقص کا مدعی ہے تو وہ واضح گمراہی اور خسران عظیم میں مبتلا ہے۔

علامہ ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فی الجملہ ان بگاڑ سے آلودہ زمانوں میں یا تو انسان اپنے نفس کے لیے اس بات پر راضی ہو کہ وہ اللہ کے ہاں عالم ٹھہرے یا اس پر راضی ہو کہ وہ اہلِ زمان کے ہاں عالم ہو۔ اگر تو وہ پہلی بات پر خوش ہے تو وہ اپنے بارے میں اللہ کے علم پر کفایت کرے۔ جس کے اپنے اور اللہ کے درمیان کوئی جان پہچان ہے، اسے اپنی نسبت اللہ ہی کی معرفت پر اکتفا کرنا چاہیے اور جو شخص اس بات پر راضی ہے کہ وہ لوگوں کے ہاں عالم شمار ہو تو وہ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد میں داخل ہے:

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣١٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٧٦)

«مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُبَاهِيَ بِهِ الْعُلَمَاءَ أَوْ لِيُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ أَوْ لِيَصْرِفَ بِهِ وُجُوهَ النَّاسِ إِلَيْهِ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ»[1]

[جس شخص کے طلبِ علم کا سبب علما پر فخر کرنا، بیوقوف لوگوں سے جھگڑا کرنا اور لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا ہو تو اسے اپنا ٹھکانا جہنم سمجھ لینا چاہیے]

امام وہیب بن ورد رحمہ اللہ نے کہا ہے:

''بہت سے علما ایسے ہیں جنھیں لوگ عالم کہتے ہیں، مگر وہ اللہ کے ہاں جاہلوں میں شمار ہوتے ہیں۔''

صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«إِنَّ أَوَّلَ مَا يُسَعَّرُ بِهِ النَّارُ ثَلَاثَةٌ، أَحَدُهُمْ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ لِيُقَالَ هُوَ عَالِمٌ وَقَارِئٌ، وَيُقَالُ لَهُ قَدْ قِيلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلَى وَجْهِهِ حَتّٰى أُلْقِيَ فِي النَّارِ»[2]

[یقیناً سب سے پہلے جس کے ساتھ جہنم کو بھڑکایا جائے گا، وہ تین قسم کے آدمی ہوں گے، ان میں سے ایک وہ شخص ہے جس نے اس لیے قرآن پڑھا اور علم حاصل کیا تا کہ اسے قاری اور عالم کہا جائے، اسے کہا جائے گا تجھے قاری وعالم کہہ دیا گیا، پھر اس کے بارے میں حکم ہوگا تو اسے چہرے کے بل گھسیٹ کر آگ میں پھینک دیا جائے گا]

پھر اگر نفس اس پر قناعت نہ کرے، بلکہ اس درجے تک پہنچے کہ اس زمانے میں لوگ اسی شخص کی تعظیم کرتے ہیں جو اس طرح کا ہوتا ہے، ورنہ وہ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے تو اس نے اس گھٹیا چیز کو اس چیز سے بدل لیا جو اس سے بہتر تھی اور وہ علما کے درجے سے نیچے گر کر گھٹیا درجے میں آ گیا۔

اسلاف میں سے کسی کو جب قاضی مقرر کیا جانے لگا تو انھوں نے کہا:

"إنما تعلمت العلم لأحشر به مع الأنبياء لا مع الملوك، فإن العلماء يحشرون مع الأنبياء، والقضاة يحشرون مع الملوك"

[میں نے تو اس لیے علم حاصل کیا ہے کہ میرا حشر انبیا کے ساتھ ہو نہ کہ بادشاہوں کے

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٥٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٦٠)

[2] دیکھیں: صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٥)

ساتھ، کیوں کہ علما انبیا کے ساتھ اٹھائے جائیں گے اور قاضی بادشاہوں کے ساتھ]

مومن کے لیے لازم ہے کہ وہ صبر کرے، تاکہ ہمیشہ کی لمبی راحت کو پہنچے، پھر اگر وہ جزع فزع کرے اور صبر نہ کرے تو وہ اس طرح کا ہے جس طرح کہ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے کہا ہے:

"من صبر فما أقل ما يصبر، ومن جزع فما أقل ما يتمتع"

[جس نے صبر کیا تو کتنا کم ہے جو وہ صبر کرتا ہے اور جس نے جزع کیا تو کس قدر کم ہے وہ فائدہ جو وہ اس کے عوض میں اٹھاتا ہے]

صبر ست علاج دل بیمار تو واقف
افسوس کہ کم داری وبسیار ضرور ست

[اے ہوشمند! تیرے بیمار دل کا علاج صبر ہے۔ افسوس! تیرے میں یہ صبر کس قدر کم ہے، جبکہ تجھے اس کی ضرورت کس قدر زیادہ ہے]

امام شافعی رحمہ اللہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

يا نفس ما هي إلا صبر أيام
كأن مدتها أضغاث أحلام

[اے نفس! یہ چند دن ہی کا تو صبر ہے اور اس صبر کی مدت پراگندہ خوابوں کی مانند ہے]

يا نفس جوزي عن الدنيا مبادرة
وخل عنها فإن العيش قدام

[اے نفس! دنیا سے جلدی کنارہ کشی اختیار کر لو اور اسے چھوڑ دو، کیوں کہ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے]

ایک غور طلب امر:

یہاں پر ذرا اس بات پر بھی غور و تامل کر لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کو کتاب دی تھی اور انھوں نے اللہ کی آیات کا مشاہدہ کیا تھا، جیسے گائے کے بعض اعضا کے لگانے سے مقتول کا زندہ ہونا، لیکن ان کے دل کس طرح ہمیشہ کے لیے سخت ہو گئے؟ اللہ نے انھیں سخت دل بنا دیا اور ہمیں ان کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے سے منع فرمایا، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ [الحدید: ١٦]

[کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد کے لیے اور اس حق کے لیے جھک جائیں جو نازل ہوا ہے اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں، جنھیں ان سے پہلے کتاب دی گئی، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے بہت سے نافرمان ہیں]

کئی مقامات پر ان کے سخت دل ہونے کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے:

﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَ جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً﴾ [المائدۃ: ١٣]

[تو ان کے اپنے عہد کو توڑنے کی وجہ ہی سے ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا]

اس سے معلوم ہوا کہ ان کے دلوں کا سخت ہونا ان کے عہد کے توڑنے کی سزا کے طور پر تھا اور ان کی عہد شکنی یہ تھی کہ انھوں نے حکم الٰہی کی مخالفت کی اور ممانعت کا ارتکاب کیا، حالانکہ وہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ سے مواثیق وعہود کر چکے تھے کہ ہم یہ نقضِ عہد ہرگز نہ کریں گے۔

نیز اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں فرمایا:

﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَ نَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ﴾ [المائدۃ: ١٣]

[وہ کلام کو اس کی جگہوں سے پھیر دیتے ہیں اور وہ اس میں سے ایک حصہ بھول گئے جس کی انھیں نصیحت کی گئی تھی]

یعنی ان کے دلوں کی سختی کی وجہ سے ان میں دو مذموم خصلتیں در آئیں۔ ایک کلام اللہ کو اس کی جگہوں سے پھیر دینا اور دوسرے اس چیز میں سے ایک حصہ بھول جانا جس کی انھیں نصیحت کی گئی تھی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انھوں نے اس حکمت اور نصیحتوں کو ترک کر دیا جو انھیں یاد دلائی گئی تھیں اور انھوں نے اس سے اپنا نصیب اور حصہ نہ لیا، بلکہ اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا۔ چنانچہ یہ دونوں چیزیں ان علما میں موجود ہیں جو اہلِ کتاب کی مشابہت کے سبب بگڑ گئے ہیں۔ ان میں سے ایک تحریفِ کلام

ہے۔ یعنی جو شخص عمل کے لیے سمجھ بوجھ حاصل نہیں کرتا، اس کا دل سخت ہو جاتا ہے۔ وہ عمل میں مشغول نہیں ہوتا، بلکہ کلمات کو ان کی جگہوں سے تحریف کر کے کتاب و سنت کے الفاظ کو ان کی جگہوں سے پھیر دیتا اور انواع واقسام کے لطیف حیلوں کے ذریعے نرمی اور گنجایش تلاش کرتا ہے۔ کبھی تو ان کو لغت کے بعید مجازات وغیرہ پر محمول کرتا ہے اور کبھی الفاظِ سنن میں طعن کرتا ہے، اس لیے کہ کتاب اللہ کے الفاظ میں طعن کرنا ممکن نہیں ہے۔ جو شخص نصوص کو ان کے حقیقی معانی پر جاری کرتا ہے۔ یہ لوگ اس کی مذمت کرتے ہیں اور اس کا نام جاہل یا حشوی رکھتے ہیں۔ یہ بات ان فقہاے رائے، صوفیہ اور فلاسفہ و متکلمین میں موجود ہے جو اصول دیانات میں کلام کرتے ہیں۔

دوسری چیز علم نافع کا بھلا دینا ہے جن کی انھیں نصیحت کی جا چکی ہے۔ اب ان کے دل اسے نصیحت نہیں کرتے، بلکہ جو شخص ایسی بات سیکھتا ہے جس سے رونا آئے یا اس کا دل نرم پڑے تو اس کی مذمت کرتے ہیں اور اس کا نام ''قصہ گو'' رکھتے ہیں۔

اہلِ رائے نے اپنی کتابوں میں اپنے بعض شیوخ سے نقل کیا ہے:

''علوم کے ثمرات ان کے شرف و مقام پر دلالت کرتے ہیں، پس جو شخص علم تفسیر میں مشغول ہوا تو اس کی غایت و انتہا یہ ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے بیان کرتا اور انھیں نصیحت کرتا ہے، اور جو شخص ان [اہلِ رائے] کی رائے اور ان کے علم میں مصروف ہوا تو یقیناً وہ فتوی دیتا ہے، فیصلے کرتا ہے، حکم لگاتا ہے اور درس دیتا ہے۔''

یہی وہ لوگ ہیں جو ان لوگوں میں شامل ہیں جو دنیا کی ظاہری زندگی کو جانتے ہیں اور وہ آخرت سے غافل ہیں۔ ان لوگوں کو اس کام پر آمادہ کرنے والی چیز دنیا کی شدید محبت اور اس میں ترقی کی خواہش ہے۔ اگر یہ لوگ دنیا میں زاہد، آخرت میں راغب اور اپنے نفس اور اللہ کے بندوں کی خیر خواہی کرنے والے ہوتے تو یہ اس چیز کے ساتھ تمسک کرتے جو اللہ تعالی نے اپنے رسول ﷺ پر اتاری ہے اور لوگوں کے لیے لازم کی ہے۔ اکثر لوگ تقوے سے باہر ہونے لگے، حالانکہ ان کو کتاب وسنت کی نصوص کفایت کر سکتی تھیں۔ اس لیے اللہ تعالی ان لوگوں میں سے، جن کو نصوص کے معانی کا فہم حاصل ہے، کچھ ایسے لوگ مقرر فرماتا ہے جو قرآن وحدیث سے نکلنے والوں کو کتاب وسنت کی طرف پھیر لاتے ہیں اور وہ ان باطل فروع اور حرام حیلوں سے، جو ریا کاری کے دروازے کھولنے کا سبب

ہیں، بے نیاز ہوتے ہیں۔ انھیں اہلِ کتاب کی چال ڈھال سے کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ [البقرة: ٢١٣]

[پھر جو لوگ ایمان لائے اللہ نے انھیں اپنے حکم سے حق میں سے اس بات کی ہدایت دی جس میں انھوں نے اختلاف کیا تھا اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے]

یہاں پر علامہ ابن رجب رحمہ اللہ کی عبارت کا ترجمہ ختم ہوا۔[1] ان کی یہ عبارت مجھے ایک رسالے کی شکل میں ملی تھی جس میں حمد ونعت کے بعد یہ کلمات لکھے ہیں:

"هذه كلمات مختصرات في معنى العلم وانقسامه إلى علم نافع وعلم غير نافع، والتنبيه على فضل علم السلف على علم الخلف، فنقول والله المستعان وعليه التكلان ولا حول ولا قوة إلا بالله"

[یہ مختصر کلمات ہیں جو میں نے علم کے معنی، اس کی علم نافع اور علم غیر نافع کی طرف تقسیم اور علم سلف کی علم خلف پر فضیلت سے متعلق تحریر کیے ہیں، پس ہم کہتے ہیں اور اللہ ہی اس میں معاون و مددگار ہے اور اسی پر توکل و بھروسا ہے اور اللہ کے بغیر نیکی کرنے کی طاقت اور گناہ سے بچنے کی ہمت نہیں ہے]

میں نے اس سے قبل کتاب "احیا" وغیرہ سے رسالہ "ضوء الشمس بشرح حديث بني الإسلام على خمس" میں علم نافع اور غیر نافع کا بیان لکھا ہے اور علوم شریعت کی تعداد رسالہ "نصب الذريعة إلى تعديد علوم الشريعة" میں ضبط کی ہے، لیکن چونکہ علامہ ابن رجب رحمہ اللہ کی یہ نہایت پاکیزہ اور مختصر تحریر مل گئی، اس لیے اسے اس رسالے کے مقدمے کے طور پر تحریر کر دیا گیا۔ ولله الحمد.

---

[1] یعنی امام ابن رجب رحمہ اللہ کے رسالے "فضل علم السلف على علم الخلف" کا ترجمہ اختتام پذیر ہوا۔

پہلی فصل

اہلِ امصار کے مذاہب کا بیان[1]

عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے زمانے کے بعد باقی ماندہ اہلِ کتاب کے سوا سارے عرب و عجم اہلِ شرک، بت پرست اور غیر اللہ کی عبادت کرنے والے تھے، تب اللہ تعالیٰ نے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری دنیا اور تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر مبعوث کیا۔ جب قریشِ مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہ سنی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ چلے آئے۔ مدینے کے لوگ ہر وقت آپ کے گرد جمع رہتے تھے، حالانکہ وہ نہایت تہی دست، تنگ عیش اور مفلس تھے۔ کوئی ان میں سے بازاروں میں کام دھندا کرتا، کوئی کھجوروں کے باغوں کا مالک تھا تو کسی کو طلبِ رزق میں بہت ہی کم فرصت ملتی تھی۔ اس لیے جو شخص جس وقت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا وہ آپ کے ارشادات سن کر یاد رکھتا اور جو اس وقت حاضر نہ ہوتا اسے ان ارشادات کا علم نہ ہوتا جو اس کی غیر موجودگی میں صادر ہوتے تھے، چنانچہ کوئی بات کسی کو معلوم ہوتی اور کسی کو معلوم نہ ہوتی، بلکہ جو بات کسی اعرابی کو معلوم ہوتی وہ بعض اکابر صحابہ پر مخفی رہتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں خلفاے اربعہ وغیرہ فتویٰ دیتے تھے۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد جب ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مرتدین اور اہلِ شام و عراق سے جہاد و قتال کرنے کے لیے مدینے سے نکل گئے اور بہت تھوڑے صحابی مدینے میں باقی بچے۔ جب کوئی مسئلہ پیش آتا تو خلیفہ اول کتاب و سنت سے اس کا جواب مرحمت فرماتے اور اگر قرآن و حدیث میں وہ مسئلہ نہ ملتا تو حاضرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت کرتے، پھر اگر ان کے پاس بھی اس کا علم نہ ہوتا تو خود اس مسئلے میں اجتہاد کرتے۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بھی فتوے کے اجرا کا یہی طریقہ رہا، اس وقت تک

[1] یہ مبحث امام احمد بن علی مقریزی کی کتاب "المواعظ والاعتبار بذكر الخطط والآثار" (۳/۶۸-۱۰۸) سے ماخوذ ہے۔

بچے کھچے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی متفرق ہو گئے۔ کبھی یوں ہوتا کہ ایک مسئلے میں حدیث موجود ہوتی لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بکھر جانے اور دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل جانے کے سبب مفتی کو اس کا علم نہ ہوتا تو وہ چار و ناچار اجتہاد کرتا۔

اس کے بعد جس صحابی نے جس شہر میں قیام کیا، وہاں کے لوگوں نے اسی کے علم پر اقتصار و اکتفا کیا، چنانچہ ایک شہر کے لوگوں کو دوسرے شہر کے علم کی خبر نہ ہوئی، کوئی مکہ میں تھا تو کوئی کوفہ میں، کوئی بصرہ میں تھا تو کوئی شام و مصر میں۔

ایک زمانے تک احکامِ شریعت کی بابت مختلف شہروں میں اہلِ اسلام کا یہی حال رہا، جب سفر کی کثرت ہوئی اور لوگ حدیث کے جمع کرنے اور اس کی تدوین کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو ہر جگہ سے اس علم کو جمع کر کے ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہنچایا اور جس کو یہ علم پہنچا اس پر حجت قائم ہو گئی۔ نیز اس علم میں صحیح کو سقیم سے جدا کیا گیا، اجتہاد کا وہ بازار، جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے کلام کی مخالفت ہوتی تھی، سرد پڑ گیا، عمل بالحدیث کے ترک کا عذر جاتا رہا، کیونکہ لوگوں کو سنن اور احادیث پہنچ گئیں اور ان پر حجت قائم ہو گئی۔

صحابہ کرام اور تابعین عظام رضی اللہ عنہم اسی طریق پر لگے رہے۔ ایک ایک حدیث کے لیے مدت دراز اور مسافت دراز کا سفر کرتے تھے۔ ہارون الرشید رحمہ اللہ کے زمانے میں جب قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ ۱۷۰ھ میں والی قضا ہوئے تو عراق، خراسان، مصر اور شام میں وہی شخص قاضی بنتا جس کی طرف قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ اشارہ کرتے۔

اسی طرح جب مختصر ۱۸۰ھ میں اندلس کے حاکم بنے تو یحییٰ بن یحییٰ رحمہ اللہ جس کی طرف اشارہ کرتے، وہی بلاد و اعمالِ اندلس میں قاضی مقرر ہوتا۔ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ حنفی تھے اور یحییٰ بن یحییٰ رحمہ اللہ مالکی تھے۔

افریقہ میں سنن و آثار کا غلبہ تھا، پھر ابو محمد فارسی نے وہاں پر حنفی مذہب کو رواج دیا، پھر جب سحنون قاضی بنے تو مالکی مذہب نے رواج پایا۔

مصر میں عبد الحی بن خالد امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب لائے۔ یہ ۱۶۳ھ کی بات ہے۔ اس سے پہلے مصر میں مذہب مالک رحمہ اللہ کو کوئی پہچانتا بھی نہیں تھا۔ پھر امام شافعی رحمہ اللہ مصر تشریف لائے، تب

وہاں پر مذہب شافعی رحمہ اللہ عام ہو گیا۔ ارجون نے ۲۶۳ھ میں نماز میں اونچی آواز سے بسم اللہ پڑھنے سے روکا۔ اہلِ مصر مالکی اور شافعی مذہب پر گامزن تھے تاوقتیکہ ۳۵۸ھ میں فائد جوہر نے شیعہ مذہب کو رواج دیا۔ اس شیعہ مذہب کی بنیاد عبداللہ بن سبا نے رکھی۔

۵۶۴ھ میں ملک ناصر صلاح الدین رحمہ اللہ کے زمانے میں مصر میں مدارس مالکیہ اور شافعیہ بنے اور شیعہ مذہب کا کلی طور پر خاتمہ ہو گیا، حتی کہ وہ سرزمین مصر میں کہیں بھی باقی نہ رہا۔ پھر محمود زنگی نے تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے حنفی مذہب کو رائج کیا اور مصر و شام میں کثرت سے حنفی ہو گئے، تب سے اس مذہب نے خوب رواج پایا۔

اہلِ امصار کے عقائد کا بیان:

اب ذرا اہلِ امصار کے عقائد کا حال بھی سن لو! سلطان صلاح الدین رحمہ اللہ نے تمام لوگوں کو شیخ ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ کے عقیدے پر لگایا اور دیارِ مصر کے اوقاف میں اس عقیدے کو لازم قرار دیا، چنانچہ دیارِ مصر، شام، ارضِ حجاز و یمن اور بلادِ مغرب میں یہ عقائد رائج ہو گئے۔ جو شخص اس کے خلاف بات کرتا اس کی گردن ماری جاتی اور اب تک وہاں یہی حال ہے۔ دولتِ ایوبیہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کا بہت چرچا نہیں تھا، پھر دولت ایوبیہ کے آخر میں ان دونوں مذاہب کا ذکر نکلا۔ ملک ظاہر بیبرس کے دور میں چاروں مذاہب کے قاضی مقرر ہوئے۔ ۶۶۵ھ سے یہ طریقہ چل نکلا۔ یہاں تک کہ جمیع امصارِ اسلام میں مذاہب اربعہ اور عقیدہ اشعری کے سوا کوئی مذہب و عقیدہ باقی نہ رہا۔ تمام ممالکِ اسلامیہ میں ان لوگوں کے لیے مدارس، خانقاہیں، حجرے، تکیے اور قیام گاہیں بن گئیں۔ جو شخص اس مذہب اور عقیدے پر نہ ہوتا اس پر انکار کیا جاتا، وہ دشمن ٹھہرتا، اسے عہدہ قضا ملتا نہ اس کی گواہی قبول ہوتی، نہ اسے خطابت، امامت اور تدریس ملتی، جب تک کہ وہ ان مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کا مقلد نہ ہوتا۔

امام مقریزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”وأفتى فقهاء هذه الأمصار في طول هذه المدة بوجوب اتباع هذه المذاهب و تحريم ما عداها والعمل على هذا إلى اليوم“ انتهى.

[اس طویل عرصے میں ان امصار کے فقہا نے ان مذاہب کے اتباع کے وجوب اور ان

کے سوا کی حرمت کا فتوی دیا اور آج کے دن تک اسی پر عمل ہے]

میں [نواب صاحب رحمہ اللہ] کہتا ہوں کہ ان مذاہب کو تسلیم کرنے کا وجوب اور نہ ماننے کی حرمت کا موقف ٹھیک نہیں تھا، اس پر کوئی نص جلی اور دلیل قوی قائم نہیں ہے، یقیناً ان مذاہب اربعہ کے درمیان حق ضرور موجود ہے لیکن حق انھی میں منحصر نہیں ہے، مگر اس لحاظ سے کہ مذہب اہلِ حدیث اور ظاہر یہ بھی ان مذاہب کے اندر موجود ہیں۔ اگر یہ بات کہیں کہ کتاب و سنت پر پیش کرنے کے بعد ان مذاہب کو اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے تو یہ درست ہے، مگر اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔

عقائد کے اختلاف کا ذکر:

جب نبی مکرم ﷺ کی وفات سے لے کر مذاہبِ اربعہ کے قرار پانے اور رائج ہونے کے دور تک کا حال معلوم ہو چکا تو اب مختلف فرقوں کے عقائد کے اختلاف کا حال اجمالاً معلوم کرنا ضروری ہے۔ اس کی تفصیل رسالہ "كشف الغمة في افتراق الأمة" میں لکھی جا چکی ہے۔

جن لوگوں نے اصولِ دیانات میں کلام کیا ہے، وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک ملتِ اسلام کے مخالف اور دوسرے اسلام کا اقرار کرنے والے۔ مخالفینِ ملت اسلام دس گروہ ہیں:

① دہریہ، ② اصحابِ عناصر، ③ ثنویہ یعنی مجوس، ④ نیچری، ⑤ صابیہ، ⑥ یہود، ⑦ نصاریٰ، ⑧ اہلِ ہند، ⑨ زنادقہ انھیں میں قرامطہ بھی داخل ہیں، ⑩ فلاسفہ، فلسفت حکمت کو کہتے ہیں اور فیلسوف محبّ حکمت کو۔ ان کا علم چار انواع میں منحصر ہے: طبیعی، مدنی، ریاضی اور الٰہی۔

دوسری قسم اہلِ اسلام کے فرقے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو مندرجہ ذیل حدیث سے مراد ہیں:

«سَتَفْتَرِقُ أُمَّتِي ثَلَاثاً وَّسَبْعِينَ فِرْقَةً، ثِنْتَانِ وَسَبْعُونَ هَالِكَةٌ وَ وَاحِدَةٌ نَاجِيَةٌ»[1]

[میری امت تہتر گروہوں میں بٹ جائے گی جن میں سے بہتر ہلاک ہوں گے اور ایک جماعت نجات پائے گی]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

«اِفْتَرَقَتِ الْيَهُودُ عَلٰى إِحْدٰى وَسَبْعِينَ أَوْ ثِنْتَيْنِ وَ سَبْعِينَ فِرْقَةً وَتَفَرَّقَتِ النَّصَارىٰ عَلٰى إِحْدٰى أَوْ ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِينَ فِرْقَةً وَتَفْتَرِقُ أُمَّتِي عَلٰى ثَلَاثٍ

[1] یہ روایت متعدد کتب سنن میں مختلف الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔ دیکھیں: سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٥٩٦) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٦٤٠) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٣٩٩٢)

وَّ سَبْعِيْنَ فِرْقَةً»[1]

[یہودی اکہتر (۷۱) یا بہتر (۷۲) فرقوں میں تقسیم ہو گئے اور نصاری اکہتر (۷۱) یا بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے، اور میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی]

مسلم فرقے:

مسلمانوں کے پانچ فرقے ہیں: ۱۔ اہلِ سنت ۲۔ مرجہ ۳۔ معتزلہ ۴۔ شیعہ ۵۔ خوارج۔ پھر ان پانچ فرقوں میں مزید کئی فرقے ہیں۔ اہلِ سنت کا اکثر افتراق واختلاف فتوؤں میں ہے اور تھوڑا سا اعتقادات میں اختلاف ہے۔ رہے باقی کے چار فرقے تو ان میں سے کسی کا اہلِ سنت کے ساتھ اختلاف بعید ہے اور کسی کا اختلاف قریب۔ مرجیہ فرقوں میں سے اہلِ سنت کے زیادہ قریب وہ فرقہ ہے جس کا کہنا ہے کہ ایمان دل اور زبان کی اکٹھی تصدیق کا نام ہے اور اعمال فقط فرائض و شرائع ہیں، ایمان نہیں۔ ان میں سے اہلِ سنت سے زیادہ دور اصحابِ جہم بن صفوان اور اصحابِ محمد بن کرام ہیں۔

اسی طرح معتزلی فرقوں میں سے اصحابِ حسین نجار اور بشر بن غیاث مریسی اہلِ سنت کے قریب ہیں اور اصحابِ ابو ہذیل بن علاف بعید ہیں۔ اسی طرح مذاہب شیعہ میں سے اقرب اصحابِ حسن بن صالح ہیں۔ اور زیادہ بعید امامیہ ہیں۔ رہے غلو پسند تو وہ سرے سے مسلمان ہی نہیں ہیں، بلکہ اہلِ ردت و شرک ہیں۔

خوارجی فرقوں میں سے اصحابِ عبداللہ بن یزید اباضی اقرب ہیں اور ان میں سے ازارقہ ابعد ہیں۔ جہاں تک بطیحیہ اور بعض قرآن کے منکرین کا تعلق ہے یا جو مفارق اجماع جیسے عجاردہ وغیرہ تو وہ اجماعِ امت کے ساتھ کافر ہیں۔

فرقِ ہالکہ کا تذکرہ:

الغرض فرقِ ہالکہ دس گروہوں میں منحصر ہیں:

① معتزلہ:

اس فرقے کے لوگ صفاتِ الٰہیہ کی نفی میں غلو کرتے ہیں، عدل و توحید کے قائل ہیں اور سارے معارف کو شرع سے پہلے اور بعد میں وجوباً عقلیہ بتاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر یہ کہتے ہیں

[1] سنن البيهقي الكبرى (۱۰/ ۲۰۸) المستدرك للحاكم (۱/ ۲۱۷) صحيح ابن حبان (۱۴/ ۱۴۰)

کہ امامت اختیار سے ہوتی ہے۔ یہ کل بیس فرقے ہیں۔

② مشبہہ:

ان کے ہاں اثباتِ صفات میں غلو ہے اور یہ معتزلہ کی ضد ہیں۔ ان میں سات فرقے ہیں۔

③ قدریہ:

ان کو بندے کی قدرت ثابت کرنے اور خلق و ایجاد کے اثبات میں غلو ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان معاملات میں اللہ کی طرف سے معاونت کی حاجت نہیں ہے۔

④ جبریہ:

اس فرقے کے لوگ بندے کی استطاعت کی نفی میں غلو کرتے ہیں۔ یہ فعل سے پہلے، اس کے بعد اور اس کے ساتھ بندے کے اختیار کی نفی کرتے ہیں، نیز یہ کسب کی بھی نفی کرتے ہیں۔ قدریہ اور جبریہ دونوں فرقے آپس میں متضاد ہیں۔ جبریہ میں تین فرقے ہیں۔

⑤ مرجیہ:

اس فرقے کے لوگوں کو یہ امید ہے کہ اصحابِ معاصی کو اللہ کی طرف سے ثواب ملے گا۔ لہٰذا یہ کہتے ہیں:

"لا يضر مع الإيمان معصية، كما أنه لا ينفع مع الكفر طاعة"

[ایمان کے ساتھ ویسے ہی معصیت و نافرمانی ضرر رساں نہیں ہے جیسے کفر کے ساتھ اطاعت فائدہ مند نہیں ہے]

یہ لوگ اصحاب کبائر کے حکم کو آخرت تک موخر کرتے ہیں۔ اس فرقے کی حقیقت یہ ہے کہ انھیں وعد و رجا کے اثبات اور وعید و خوف کی نفی میں اہلِ ایمان سے غلو ہے۔ ان کے تین فرقے ہیں۔

⑥ حروریہ:

ان لوگوں کو وعید وخوف کے اثبات میں مومنوں کے حق میں ایمان کے باوجود ہمیشہ جہنمی ہونے میں غلو ہے۔ یہ نواصب وخوارج کی ایک قوم ہیں۔ یہ وعد و وعید کی نفی و اثبات میں مرجیہ کی ضد ہیں۔ یہ کبائر کے مرتکب کو مشرک قرار دیتے ہیں جبکہ عام خوارج اسے کافر کہتے ہیں نہ کہ مشرک۔ ان

میں سے بعض کا قول ہے کہ ایسا شخص منافق ہے اور آگ کے سب سے نچلے طبقے اور حصے میں ہو گا۔ اس گروہ کے لوگوں کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ ایمان معصیت سے اجتناب کا نام ہے۔

⑦ نجاریہ:

یہ حسن بن نجار حائک کے متبع ہیں جو جبریہ میں سے تھا۔ ان کے تین فرقے ہیں۔

⑧ جہمیہ:

اس فرقے کے لوگ جہم بن صفوان کے پیروکار ہیں۔ یہ لوگ قضا و قدر کے مسئلے میں جبر کی طرف میلان کے باوجود اہلِ سنت کے موافق ہیں، مگر رویت و صفات کی نفی کرتے ہیں اور خلقِ قرآن کے قائل ہیں۔ یہ فرقہ ایک بہت بڑا گروہ ہے اور ان کا شمار معطلہ اور مجبرہ میں ہوتا ہے۔

⑨ روافض:

یہ لوگ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کی محبت اور شیخین (ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما)، عثمان، عائشہ، معاویہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بغض میں غلو کرتے ہیں۔ سیدنا زید بن علی رضی اللہ عنہ نے ان کا نام رافضہ رکھا تھا۔ ان کے تین سو فرقے ہیں جن میں سے بیس فرقے مشہور و معروف ہیں۔

⑩ خوارج:

اس فرقے کے لوگوں کو نواصب بھی کہا جاتا ہے، نیز انھیں حروریہ بھی کہتے ہیں، کیوں کہ حرورا نامی جگہ پر سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے ساتھ قتال کرنے کے لیے یہ لوگ جمع ہوئے تھے۔ انھیں سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی محبت اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بغض میں غلو ہے۔ مقریزی رحمہ اللہ نے کہا ہے:

"ولا أجهل منهم فإنهم القاسطون المارقون"

[ان سے بڑا جاہل کوئی نہیں، یہی لوگ ظالم اور دین سے نکل جانے والے ہیں]

ان کے کل بیس فرقے ہیں۔ ان سے دس فرقوں کی فروع کا بیان مع ان کے باطل اقوال کے کتاب "كشف الغمة" میں ہو چکا ہے۔

ابتدائے اسلام سے مذہب اشعریہ کے انتشار تک عقائد کی حالت:

اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن میں

بیان شدہ اور وحی کے ذریعے معلوم شدہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا وصف بیان کیا۔ عرب میں کسی شخص نے، خواہ وہ شہری تھا یا دیہاتی، آپ ﷺ سے کسی چیز کے معنی دریافت نہیں کیے جس طرح وہ نماز، روزہ، حج، زکات اور امر ونہی سے متعلق آپ ﷺ سے سوال کرتے تھے یا جس طرح قیامت، جنت اور جہنم کے بارے میں پوچھتے تھے، کیونکہ اگر کوئی شخص ان صفاتِ الٰہیہ سے متعلق سوال کرتا تو وہ ضرور نقل ہو کر ہم تک پہنچتا، جس طرح حلال وحرام، ترغیب وترہیب کے احکام، قیامت، ملاحم اور فتن کے احوال کی احادیث منقول ہوئی اور دواوینِ احادیث اور آثارِ سلفیہ میں موجود ہیں، حالانکہ کسی صحیح یا سقیم طریق سے کسی ایک صحابی سے اختلافِ طبقات اور کثرتِ عدد کے باوجود یہ بات مروی نہیں ہے کہ اس نے قرآن مجید میں ذکر کردہ اور نبی رحیم کی زبان سے بیان شدہ صفاتِ الٰہیہ میں سے کسی وصف کے بارے میں آپ ﷺ سے سوال کیا ہو، بلکہ سب صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کے معانی سمجھ کر ان پر کلام کرنے سے سکوت کیا تھا۔

کسی صحابی رضی اللہ عنہ نے یہ فرق بھی نہیں نکالا کہ یہ صفتِ ذات ہے اور وہ صفتِ فعل، بلکہ علم، قدرت، حیات، ارادہ، سمع، بصر، کلام، جلال، اکرام، جود، انعام، عز اور عظمت سے صفاتِ ازلیہ کا اثبات کیا اور کلام کو ایک ہی طریق پر چلایا۔ اسی طرح ان الفاظ کا اثبات کیا جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنے نفسِ کریم پر اطلاق کیا ہے، جیسے وجہ، ید اور اسی طرح کے دیگر الفاظ، مگر مخلوق کی مماثلت کی نفی کے ساتھ۔

غرض یہ کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کسی تشبیہ کے بغیر یہ اثبات کیا ہے اور تعطیل کے بغیر تنزیہ اختیار کی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ کوئی ایک صحابی رضی اللہ عنہ بھی کسی ایک صفت کی تاویل کے درپے نہیں ہوا، بلکہ سب نے بالاتفاق یہ عقیدہ رکھا کہ صفات کو، جس طرح وہ وارد ہوئی ہیں، جاری کریں۔ ان میں سے کسی کے پاس کتاب اللہ کے سوا کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے اللہ کی وحدانیت اور آپ ﷺ کی نبوت پر استدلال کریں۔ اسی طرح کسی ایک صحابی نے کبھی کوئی چیز طرق کلامیہ اور مسائل فلسفیہ سے نہیں پہچانی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دور مسعود اسی طرز اور نہج پر گزر گیا، یہاں تک کہ ان کے زمانے میں تقدیر پر نقطہ چینی کی بدعت ایجاد ہوئی اور امر کو ''انف'' کہا گیا، یعنی اللہ نے اپنی مخلوق پر کسی چیز کو اس حال سے، جس پر مخلوق ہے، مقدر نہیں فرمایا۔

عہدِ صحابہ اور اس کے بعد پیدا ہونے والے فرقے اور مذاہب:

اسلام میں سب سے پہلے جس شخص نے تقدیر پر بات کی، وہ معبد بن خالد جہنی ہے۔ چنانچہ سیدنا

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کا حال سن کر اس سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا، اسی طرح سلف نے فرقہ قدریہ سے اجتناب کرنے کی تاکید فرمائی۔ معبد بن خالد جہنی امام حسن بصری رحمہ اللہ کے پاس بیٹھا کرتا تھا، چنانچہ حسن بصری رحمہ اللہ نے اس کے متعلق کہا: "كذب عدو الله" [اللہ کے دشمن نے جھوٹ کہا ہے]۔

اسی طرح خوارج کا مذہب بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے ہی میں شروع ہوا تھا اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان سے مناظرہ کیا تھا، مگر وہ حق کی طرف نہ پلٹے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ان خارجیوں کی ایک جماعت کو قتل کیا تھا۔

مذہبِ تشیع کا حدوث بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور ہی میں ہوا تھا، چنانچہ علی رضی اللہ عنہ نے غالی شیعوں کو آگ میں جلا دیا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور کے بعد جہم بن صفوان کا مذہب ایجاد ہوا جس کے سبب بلادِ مشرق میں ایک عظیم فتنہ برپا ہوا، اہلِ اسلام نے اس کی بدعت کو بہت بڑا سمجھ کر اس کا انکار کیا اور جہمیہ کی تضلیل کی۔

اسی اثنا میں مذہبِ اعتزال ایجاد ہوا۔ دوسری صدی ہجری کے بعد ائمہ اسلام نے ان کے مذہب سے ممانعت کی اور علمِ کلام کی مذمت فرمائی۔

پھر اس کے بعد مذہب تجسیم ایجاد ہوا، اس مذہب کی ابتدا ۲۶۴ھ میں ہوئی۔ یہ مذہب کوفہ سے نکل کر عراق تک جا پہنچا، اسی طرح بحرین میں یہ مذہب پہنچا۔ اس مذہب کا موجد حمدان اشعث المعروف قرمط تھا۔ قرمط کوتاہ قامت، اور باریک چال چلنے والے کو کہتے ہیں حمدان اسی طرح کا تھا۔ اس کا ایجاد کردہ مذہب بہت پھیل گیا۔

بلادِ روم سے درآمد شدہ کتابیں مذاہبِ باطلہ کی بنیاد ہیں:

بغداد کے ساتویں خلیفہ مامون الرشید نے بلادِ روم سے قدیم کتابیں طلب کر کے ان کے عربی میں تراجم کرائے۔ ۲۲۰ھ کے بعد مذاہبِ فلاسفہ کا انتشار ہوا، چنانچہ معتزلہ، قرامطہ اور جہمیہ ان پر فریفتہ ہو گئے۔ مقریزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فانجر على الإسلام وأهله من علوم الفلاسفة ما لا يوصف من البلاء والمحنة في الدين و عظم بالفلسفة ضلال أهل البدع و زادتهم كفرا إلى كفرهم"

[فلسفی علوم کے ذریعے اسلام اور اہلِ اسلام میں ان کے دین کے بارے میں وہ بلائیں

اور مصیبتیں در آئیں جو بیان سے باہر ہیں، نیز اس فلسفے کے ذریعے اہلِ بدعت بہت زیادہ گمراہ ہوئے اور اس نے ان کے کفر میں مزید اضافہ کر دیا]

۳۳۴ھ میں جب بنو بویہ کی حکومت قائم ہوئی اور ۴۳۷ھ تک وہ حکمران رہے، اس دوران میں مذہبِ تشیع نے خوب قوت پکڑی۔ عراق، خراسان اور ماوراء النہر میں مذہبِ اعتزال پھیل گیا اور مشاہیر فقہا بھی اس کی طرف مائل ہو گئے۔ ادھر افریقہ اور بلادِ مغرب میں مذاہب اسماعیلیہ کا ظہور ہو گیا۔ ۳۵۸ھ میں ان کی سعی سے عموماً بلادِ مغرب، مصر، شام، دیارِ بکر، کوفہ، بصرہ، بغداد، سارا عراق، بلادِ خراسان، ماوراء النہر، بلادِ حجاز، یمن اور بحرین میں رافضہ کا مذہب عام ہو گیا۔ ان کے اور اہلِ سنت کے درمیان فتنے ظاہر ہوتے رہے اور آپس میں جنگیں ہوتی رہیں۔

پھر اس کے بعد مذاہبِ قدریہ، جہمیہ، معتزلہ، کرامیہ، خوارج، روافض، قرامطہ اور باطنیہ نے شہرت پکڑی اور ساری زمین انھی لوگوں سے بھر گئی۔ کوئی شہر اور علاقہ ایسا نہ بچا جہاں یہ مذاہب نہ ہوں۔ یہ لوگ فلسفے میں نظر کرتے تھے۔

ادھر ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ نے مذہبِ اعتزال چھوڑ کر طریقِ سنت اختیار کیا اور نفی و اثبات کے درمیانی راستے پر چلے، یعنی نفی اعتزال اور اثبات اہلِ تجسیم۔ اہلِ علم کی ایک جماعت نے ان کی رائے پر اعتماد کیا، جیسے ابو بکر باقلانی مالکی، ابن فورک، ابو اسحاق اسفرائنی، ابراہیم شیرازی، امام غزالی، ابو الفتح شہرستانی اور فخر الدین رازی وغیرہ۔

۳۸۰ھ سے یہ عقیدہ عراق میں پھیلا، پھر شام میں آیا، پھر مصر اور مغرب میں، پھر اس عقیدے کا ایسا انتشار ہوا کہ اس عقیدے کے سوا کوئی عقیدہ باقی نہ رہا اور پہلے عقائد فراموش ہو گئے، چنانچہ مقریزی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

”حتی لم يبق اليوم مذهب يخالفه، إلا أن يكون مذهب الحنابلة أتباع الإمام أحمد بن حنبل رضي الله عنه فإنهم كانوا على ما كان عليه السلف، لا يرون تأويل ما ورد من الصفات“

[حتی کہ آج کوئی مذہب ایسا باقی نہیں بچا جو اس کے خلاف ہو، الا یہ کہ وہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے پیروکار حنابلہ کا مذہب ہو، یقیناً وہ لوگ سلف کے منہج پر گامزن ہیں اور (کتاب وسنت

میں) وارد ہونے والی صفات کی تاویل کے قائل نہیں ہیں]

یہاں تک کہ ۷۰۰ھ کے بعد دمشق اور اعمالِ دمشق میں تقی الدین ابو العباس احمد بن عبد الحلیم بن عبد السلام بن تیمیہ حرانی رحمہ اللہ کی شہرت ہوئی اور وہ مذہبِ سلف کی ترویج واشاعت کے درپے ہوئے۔ انھوں نے اشعری مذہب کے رد کرنے میں مبالغہ کیا اور رافضہ اور صوفیہ پر کھلم کھلا انکار فرمایا۔ لوگ ان کے حق میں دو فریق بن گئے، ایک فریق نے ان کی اقتدا کی، ان کے اقوال پر اعتماد کیا، ان کی رائے پر عامل ہوئے، انھیں شیخ الاسلام جانا اور ملتِ اسلامیہ کے کبار حفاظ میں شمار کیا، جبکہ دوسرے گروہ نے ان کو بدعتی اور گمراہ قرار دیا، اثباتِ صفات کی بابت ان پر عیب لگایا اور چند مسائل پر تنقید کی جن میں ان کے لیے سلف موجود تھا اور بعض میں انھیں خارق اجماع سمجھا جن میں ان کا سلف نہ تھا۔ ان کے اور لوگوں کے درمیان بہت سے معاملات اور حوادث وقوع پذیر ہوئے، بہر حال ان کا اور لوگوں کا معاملہ اور حساب اس اللہ کے سپرد ہے جس پر آسمان و زمین کی کوئی چیز مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے۔ ابھی تک شام میں ان کے متبعین بہت زیادہ ہیں، جب کہ مصر میں کم ہیں۔

اشاعرہ اور ماتریدیہ کے عقائد میں اختلاف:

اشاعرہ اور ابو منصور محمد بن محمد بن محمود ماتریدی کے متبعین ماتریدیہ میں عقائد کی بابت جو اختلاف ہے وہ بہ جائے خود مشہور ہے۔ فرقہ ماتریدیہ امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کا مقلد ہے۔

مقریزی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

تحقیق و تفتیش سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے درمیان اختلافی مسائل دس سے کچھ اوپر ہیں۔ شروع میں ان مسائل کے سبب کچھ تباین و تنافر تھا، چنانچہ ہر فرقہ دوسرے فرقے کے عقیدے میں جرح اور تنقید کرتا تھا، لیکن انجام کار ان میں چشم پوشی ہوگئی، ولله الحمد.

"فهذا أعزك الله بيان ما كانت عليه عقائد الأمة من ابتداء الأمر إلى وقتنا هذا فقد وصل ذلك إليك صفواً ونلته عفواً بلا تكلف مشقةٍ ولا بذل مجهودٍ ولكن الله يمن على من يشاء من عباده" انتهىٰ حاصله.

[اللہ تعالیٰ آپکو عزت عطا فرمائے! یہ تھا امت کے ابتدا سے لیکر ہمارے آج کے دور تک کے عقائد کا بیان جو صاف ستھرا ہو کر آپ تک کسی تکلف اور کوشش و محنت کے صرف کیے بغیر

پہنچا، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان فرماتا ہے]

میں [نواب صاحب رحمہ اللہ] کہتا ہوں: امام ابوالحسن اسماعیل بن اسحاق بن سالم اشعری رحمہ اللہ ابوموسیٰ اشعری بصری رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہیں۔ وہ ۲۶۶ھ یا ۲۷۰ھ میں پیدا ہوئے اور بغداد شہر میں وفات پائی۔

تخلیق انسانی کا مقصد اللہ کی معرفت ہے:

اللہ تعالیٰ نے مخلوق سے اپنی معرفت اور شناخت طلب کی ہے جس کی دلیل اس کا یہ فرمان ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ [الذاریات: ۵٦]

[اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے کہ مذکورہ آیت میں ﴿يَعْبُدُونَ﴾، "يَعْرِفُونَ" کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کر کے شرائع کے ذریعے اپنی پہچان کروا دی۔ اب جس کے نصیب میں تھا اس نے اللہ کی تعریف کے مطابق اس کی معرفت حاصل کی۔ انبیا کی بعثت اور شرائع کے انزال سے پہلے مخلوق کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ علم کچھ اس طریقے سے تھا کہ وہ سمات، حدوث، ترکیب اور افتقار سے اللہ کی تنزیہ کرتے تھے اور اسے باقتدار مطلق متصف کرتے تھے، یہی تنزیہ عقلاً مشہور ہے۔ عقل اس سے آگے ہرگز تجاوز نہیں کر سکتی۔

جب اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی شریعت نازل فرمائی اور اپنے دین کو کامل و مکمل کیا تو پھر اللہ تعالیٰ کی شناخت کا رستہ یہ ٹھہرا کہ عارف باللہ کو دو معرفتوں کا جامع ہونا چاہیے۔ ایک وہ معرفت جس کا ادلہ عقلیہ تقاضا کرتی ہیں۔ دوسری وہ معرفت جسے اخبارات الٰہیہ لائی ہیں، پھر وہ اس علم کو اللہ کی طرف منسوب کرے اور جو کچھ شریعت حقہ لائی ہے اس پر ارادہ الٰہی کے موافق تاویل فکر اور تحکم رائے کے بغیر ایمان لائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس لیے شریعتیں نازل فرمائی ہیں کہ عقول بشریہ اشیا کا جوں کا توں بالکل اسی طرح جس طرح اللہ کے علم میں ہیں، ادراک کرنے سے قاصر ہیں اور انھیں یہ استقلال کہاں ہو سکتا ہے، حالانکہ وہ اس اطلاق کے ساتھ مقید ہیں جو ان کے پاس ہے۔

پس اگر اللہ تعالیٰ ان عقلوں کو اپنی مراد کے مطابق اوضاع شرعیہ سے علم عطا کر دے اور اس باب میں اپنی حکمتوں پر اطلاع کر دے تو یہ اس کا فضل ہے۔ البتہ عارف کو یہ نہ چاہیے کہ وہ اس احسان کو اپنی فکر کی طرف منسوب کرے، کیونکہ وہ تنزیہ جو عارف اپنی فکر کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کے لیے

واجب ہے کہ وہ کتاب منزل اور سنت مطہرہ کے مطابق ہو، ورنہ اللہ تعالیٰ تنزیہ عقول بشریہ سے، جن کے افکار مختلف قیود کے ساتھ مقید ہیں، منزہ ہے۔

اسی طرح عقول کی تنزیہ قرآن و حدیث کی موافقت کے ساتھ مقید ہے کہ وہ احکام و آثارِ شرع کے مطابق ہو۔ جب یہ معرفت ہوائے نفس سے خالی ہوتی ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ بصائر سے پردے ہٹا کر راہِ حق دکھاتا ہے اور بصائر کی تنزیہ افکارِ عادیہ کے ساتھ تنزیہات عرفیہ سے کرتا ہے۔

صفاتِ الٰہیہ پر مشتمل آیات واحادیث پر کسی تاویل، تشبیہ اور تمثیل کے بغیر ایمان لانا:

سارے مسلمانوں کا اس بات پر قطعی اجماع ہے کہ صفاتِ الٰہیہ کے بارے میں وارد احادیث کو روایت کرنا، ان کو نقل کرنا اور ان کا پہچاننا جائز ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ پھر اہلِ حق نے اس پر بھی اجماع کیا ہے کہ یہ احادیث مخلوق کی مشابہت کے احتمال سے بعید ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ [الشوریٰ: ١١]

[اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے]

نیز فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ اللَّهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۝ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝﴾ [سورۃ الإخلاص: ١-٤]

[کہہ دے وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ ہی بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا۔ اور نہ کبھی کوئی ایک اس کے برابر کا ہے]

اس سورت کا نام سورۃ الاخلاص ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی بہت زیادہ شان بیان کی ہے اور اپنی امت کو اس کی تلاوت کرنے کی رغبت دلائی ہے، یہاں تک کہ اسے ایک تہائی قرآن فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سورت اللہ تعالیٰ کی تنزیہ، عدمِ تشبیہ اور عدمِ تمثیل پر گواہ ہے۔ اسی لیے اس کا نام سورۃ الاخلاص ہے کہ یہ اخلاصِ توحیدِ الٰہی پر مشتمل ہے اور اس میں مخلوق کے ساتھ تشبیہ کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [الشوریٰ: ١١] میں ''کاف'' زائدہ ہے۔ کلامِ عرب میں حرف ''کاف'' اور کلمہ ''مثل'' تشبیہ کے لیے آتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو جمع فرما کر

مثلیت کی نفی کی۔

پس جب ان احادیث کے جوازِ نقل اور انھیں تشبیہ سے دور رکھنے پر سارے مسلمانوں کا اجماع ثابت ہے تو اللہ کی تعظیم میں اس سورت کے ذکر کرنے سے نفیِ تعطیل کے سوا کچھ باقی نہ رہا، کیونکہ رسولوں کے دشمنوں نے رب تعالیٰ کے ایسے نام رکھے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی صفات علیا کی نفی ہوتی ہے، چنانچہ کفار کی ایک قوم نے کہا: رب نیچر ہے، دوسروں نے اسے علت قرار دیا اور انھوں نے اسمائے الٰہی میں اس طرح کا بہت زیادہ الحاد کیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی صفات علیا پر مشتمل یہ احادیث ارشاد فرمائیں اور اصحابِ ابرار نے ان اخبار کو نقل کیا، پھر ائمہ مسلمین نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ان کو روایت کیا، یہاں تک کہ وہ احادیث ہم تک پہنچ گئیں۔ ہر شخص نے ان روایات کو جوں کا توں روایت کیا اور ان میں کسی چیز کی تاویل نہ کی، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ان کا عقیدہ یہ تھا:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ [الشوریٰ: ۱۱]

[یقیناً اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے]

اس سے ہماری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ ان احادیث سے، جن کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے تکلم اور تلفظ کیا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے انھیں تداول فرمایا اور امت کو پہنچایا، اللہ تعالیٰ کی مراد یہ ہے کہ کافروں کے دل میں نفرت ہو اور ہر گمراہ اور معطل مبتدع کے دل میں ان صفات کا غلبہ ہو، کیونکہ یہ لوگ اہلِ طبائع وغیرہ مبتدعہ کے آثار پر اکتفا کرنے والے ہیں، اسی لیے اللہ نے اپنی کتاب میں اپنے نفس کریم کا وصف بیان کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اللہ عزوجل کا وصف بیان کیا ہے جو احادیثِ صحیحہ میں ثابت ہے۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ جب کسی مومن نے یہ اعتقاد کر لیا:

"ليس كمثله شيء وهو السميع البصير وإنه أحد صمد لم يلد ولم يولد ولم يكن له كفواً أحد"

[اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے، اور بلاشبہہ وہ اکیلا ہے، بے نیاز ہے، نہ اس نے کسی کو جنم دیا ہے، نہ وہ جنم دیا گیا ہے اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے]

تو اس کا ان احادیث کو ذکر کرنا اثبات کو تقویت دینا ہے اور معطلہ کے اندر پھنس جانے والی ہڈی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: "الإثبات أمكن" [اثبات زیادہ آسان اور ممکن ہے] امام

خطابی رحمہ اللہ نے امام موصوف سے اس بات کو نقل کیا ہے۔ کسی صحابی یا تابعی یا تبع تابعی سے ہمیں یہ بات نہیں پہنچی ہے کہ انھوں نے ان احادیث کی تاویل کی ہو، اللہ تعالیٰ کا اجلال اس بات سے مانع ہے کہ ان احادیث کی تاویل کی جائے یا اس کے لیے کوئی کہاوت بیان ہو۔

جب ان صفات علیا میں سے کئی ایک کے ساتھ قرآن عظیم نازل ہوا، جیسے ﴿يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ﴾ [الفتح: ١٠] تو اس کے نفس تلاوت سے ہر سامع اس کے معنی مراد کو سمجھ جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ﴾ [المائدة: ٦٤] چونکہ یہودی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف بخل کی نسبت کرتے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔ اس آیت کے تلاوت کرنے ہی سے اس کا معنی ومقصود واضح ہو جاتا ہے۔

ان آیات کی تاویل اللہ تعالیٰ کے لیے تمثیل کو مستلزم ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [طٰہٰ: ٢٠]

میں ان کا یہ قول کہ اس جگہ ''استوی'' سے مراد استیلا ہے، حالاں کہ اس سے باری تعالیٰ کی بشر کے ساتھ تشبیہ لازم آتی ہے اور اہلِ اثبات اس بات سے اللہ تعالیٰ کے جلال کی تنزیہ کرتے ہیں کہ اسے حقیقتاً یا مجازاً اجسام کے مشابہ قرار دیں، کیونکہ وہ یہ بات جانتے ہیں کہ یہ نطق ان کلمات پر مشتمل ہے جو خالق ومخلوق کے درمیان متداول ہیں۔ اور اہلِ اثبات ان کلمات کو مشترک کہنے میں حرج محسوس کرتے ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں ہے۔

لہٰذا انھوں نے ان احادیثِ صفات میں سے کسی حدیث کی تاویل نہیں کی ہے، حالاں کہ ہمیں قطعاً معلوم ہے کہ یہ احادیث جاہلوں کے ان ظنون سے بالاتر ہیں جو گمان وہ ان احادیث کی طرف سے کرتے ہیں۔ ذرا سا غور اور تامل کرنے سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے نر اور مادے سے پیدا ہونے والی مخلوقات کا اس آیت میں ذکر فرمایا:

﴿جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ﴾ [الشوریٰ: ١١]

[اس نے تمھارے لیے تمھارے نفسوں سے جوڑے بنائے اور جانوروں سے بھی جوڑے۔ وہ تمھیں اس (جہاں) میں پھیلاتا ہے]

تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ جان لیا تھا کہ مخلوق کے دلوں میں کیا خطرہ ہوگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴾ [الشوریٰ: ۱۱]

[اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے]

عقائد کے بگاڑ میں اہلِ فارس (ایران) کا کردار:

اکثر طوائف اور گروہوں کے دیانتِ اسلام سے نکلنے کا سبب یہ بنا کہ ملک فارس (ایران) بہت وسیع تھا، ان کا ہاتھ ساری امم کے اوپر تھا، وہ لوگ اپنے نفس میں نہایت درجے کے جلیل الخطر اور عظیم القدر تھے، اسی لیے وہ اپنے آپ کو احرار و اسیاد اور باقی سب لوگوں کو اپنا غلام سمجھتے تھے۔

جب عرب کے ہاتھوں ان کی دولت و سلطنت زوال پذیر ہوئی، درآں حالے کہ وہ عرب ہی کو سب سے زیادہ کم حقیقت جانتے تھے، تو ان پر یہ امر نہایت گراں گزرا اور ان کے سر پر ایک سخت مصیبت آئی، چنانچہ انھوں نے چاہا کہ وہ اسلام کے ساتھ کید و مکر کی چال چلیں، اسی لیے وہ مختلف اوقات میں اس کے خلاف محاربہ اور لڑائی کرتے رہے، لیکن ہر جگہ اور ہر لڑائی میں اللہ تعالیٰ نے عرب اور حق کو غلبہ دیا۔

اہلِ فارس کے وہ بڑے بڑے سردار جو اسلام کے خلاف اس کارروائی میں ملوث ہوئے، وہ شفاد، اشنیس، مقفع اور بابک وغیرہ ہیں اور ان سب سے پہلے عمار ملقب بخداش اور ابو مسلم سروح نے اس کید و مکر کا قصد و ارادہ کیا تھا۔

اس کے بعد یہ طے ہوا کہ لڑنے سے کچھ کام نہ بنے گا، بلکہ مکر و حیلے سے کام نکلے گا۔ اسی لیے وہ اہلِ بیت کی محبت کا اظہار کرنے لگے اور سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو مظلوم ٹھہرا کر ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ پھر طرح طرح کی راہیں اور چالیں چل کر انھیں راہِ ہدایت سے گمراہ کر دیا۔ انھوں نے شیعہ کی ایک قوم کے حلق سے یہ بات اتار دی کہ ایک مرد کا انتظار ہے جسے مہدی کہتے ہیں، دین کی حقیقت کا علم اس کے پاس ہے اور کفار سے دین اخذ کرنا روا اور جائز نہیں ہے۔ یہ لوگ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو [العیاذ باللہ] کفر کی طرف منسوب کرتے تھے۔

انھوں نے ایک دوسری قوم کو اس پر لگا دیا کہ وہ لوگوں کے لیے مدعی نبوت بن بیٹھے اور ان نبوت کے دعوے داروں کے نام تک مقرر کر دیے۔ تیسری قوم کو حلول کا قائل بنا دیا اور شرائع کو ساقط

ٹھہرا دیا۔ چوتھی قوم کے ساتھ یہ کھیل کھیلا کہ ان پر دن رات میں پچاس نمازیں واجب کیں۔ پانچویں قوم کو یہ سکھا دیا کہ سترہ نمازیں فرض ہیں اور ہر نماز میں پندرہ رکعتیں ہیں، چنانچہ عبداللہ بن عمرو بن الحارث کندی، خارجی صفری ہونے سے پہلے اسی کا قائل تھا۔

پھر عبداللہ بن سبا حمیری یہودی نے اہلِ اسلام کو فریب دینے کے لیے اسلام کا اظہار کیا۔ اصل میں عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے قتل پر لوگوں کو بھڑکانے والا یہی شخص تھا، چنانچہ علی رضی اللہ عنہ نے اس کی پارٹی کے چند گروہوں کو آگ میں جلا دیا، کیونکہ وہ کھلم کھلا علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت کا اعلان کرتے تھے۔ انہی اصول سے فرقہ اسماعیلیہ اور قرامطہ کا حدوث ہوا۔

مقریزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس میں ذرا بھر بھی شک وشبہہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دین ظاہر ہے، اس میں کوئی باطن نہیں ہے، اور یہ جوہر ہے اس کے نیچے کوئی راز نہیں ہے، ہر کسی پر یہ دین لازم ہے کسی کے لیے اس میں کوئی رعایت اور گنجایش نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت میں سے کوئی چیز نہیں چھپائی ہے اور نہ اپنی کسی زوجہ یا چچا زاد میں سے کسی خاص شخص کو شریعت کی کسی چیز پر مطلع کیا ہے جسے کسی لال یا کالی چمڑی والے سے چھپایا تھا یا بکریاں چرانے والوں سے پوشیدہ رکھا تھا۔ نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی راز یا رمز یا باطن تھا سوائے اس کے جس کی طرف سارے لوگوں کو دعوت دیتے تھے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ بھی چھپاتے تو اللہ کے امر کی تبلیغ نہ ہوتی۔ لہٰذا جو شخص اس بات کا قائل ہے کہ انھوں نے کچھ چھپا کر رکھا، وہ باجماعِ امت کافر ہے۔

ہر بدعت کی اصل کلام سلف سے انحراف ہے:

مقریزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

دین میں ہر بدعت کی اصل اور بنیاد کلامِ سلف سے بُعد اور صدرِ اول کے اعتقاد سے انحراف کرنا ہے۔ یہاں تک کہ قدری نے قدر میں مبالغہ کر کے بندے کو اپنے افعال کا خالق ٹھہرا دیا اور جبری نے قدری کے بالمقابل بندے کے فعل اور اختیار کو بالکل سلب کر لیا۔ معطل نے تنزیہ میں اتنا مبالغہ کیا کہ اللہ تعالیٰ سے اُس کی صفاتِ جلال اور نعوتِ کمال کو مسلوب ٹھہرا دیا، مشبہہ نے بمقابلہ معطل ایسا مبالغہ کیا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو ایک بشر کی مثل بنا دیا، عیاذاً باللہ. مرجی نے سلب عقاب میں مبالغہ کیا۔ معتزلی نے تخلید عذاب میں مبالغہ فرمایا۔ ناصبی نے سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کی امامت کے

خلاف مبالغہ کیا۔ غلاۃ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو خدا ٹھہرایا۔ سنی نے تقدیم ابی بکر میں مبالغہ کیا۔ رافضی نے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی تاخیر میں یہاں تک مبالغہ کیا کہ، معاذ اللہ، انھیں کافر کہہ دیا، غرض کہ گمان کا میدان بہت کشادہ ہے اور غالب ظنون کا تعارض ہوا، اوہام کی کثرت ہوئی۔ ہر فریق نے شر وعناد اور بغی و فساد میں انتہائی مبالغہ کیا۔ باہم تباغض و تلاعن ہوا، اموال کو حلال اور خونوں کو مباح ٹھہرا لیا، دولتوں سے انتصار کیا اور ملوک سے استعانت کی۔

پس ان میں سے کوئی جب کسی معاملے میں مبالغہ کرتا تو (کاش) وہ اسے اپنے قریب کرنے کے لیے جھگڑا کرتا، کیونکہ گمان، گمان سے بہت زیادہ دور نہیں ہے، اور وہ جھگڑے میں مقابل اطراف میں سے آخری کنارے تک نہ پہنچتا، لیکن وہ وہی کچھ کرنے پر بضد رہے جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے یعنی وہ آپس میں کید و مکر اور باہم قطع تعلقی کرتے ہوئے اختلاف کرتے رہے سوائے اس شخص کے جس پر تیرا رب رحم فرمائے۔ انتهى كلام المقريزى.

دوسری فصل

راہِ ہدایت سے گمراہ ہونے والے فرقوں کا بیان[1]

امتوں کی گروہ بندی:

شیخ جیلی رضی اللہ عنہ نے کتاب "غنية الطالبين" میں فرمایا ہے کہ اس بات میں اصل عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث ہے:

«لَتَسلُكُنَّ سَنَنَ مَنْ قَبْلَكُم حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعلِ وَ لَتَأْخُذُنَّ بِمِثْلِ أَخْذِهِم إِنْ شِبْراً فَشِبْراً وَ إِنْ ذِرَاعاً فَذِرَاعاً وَ إِنْ بَاعًا فَبَاعاً حَتّٰى لَوْ دَخَلُوا فِيْ جُحْرِ ضَبٍّ دَخَلْتُمْ فِيْهِ، أَلَا إِنَّ بَنِي إِسْرَائِيْلَ افْتَرَقَتْ عَلٰى مُوسٰى بِإِحْدٰى وَسَبْعِيْنَ فِرْقَةً كُلُّهَا ضَالَّةٌ إِلَّا فِرْقَةً وَّاحِدَةً: اَلْإِسْلَامُ وَ جَمَاعَتُهُمْ، ثُمَّ إِنَّهَا افْتَرَقَتْ عَلٰى عِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ عَلٰى إِحْدٰى وَ سَبْعِيْنَ فِرْقَةً كُلُّهَا ضَالَّةٌ إِلَّا وَاحِدَةً: اَلْإِسْلَامُ وَ جَمَاعَتُهُمْ، ثُمَّ إِنَّكُمْ تَكُوْنُوْنَ عَلَى اثْنَتَيْنِ وَ سَبْعِيْنَ فِرْقَةً كُلُّهَا فِي النَّارِ إِلَّا وَاحِدَةً: اَلْإِسْلَامُ وَ جَمَاعَتُهُمْ»[2]

[تم اپنے سے پہلے لوگوں کے طرز پر چل پڑو گے، تمھاری یہ مماثلت یوں ہو گی جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے برابر ہوتا ہے، تم ایک ایک بالشت، ایک ایک ذراع (کہنی سے درمیانی انگلی کے کنارے تک کا فاصلہ) اور ایک ایک باع (دو ہاتھوں کے پھیلاؤ کا درمیانی فاصلہ) میں ان کے طریقے کو اختیار کر لو گے، حتی کہ اگر ان میں سے کوئی شخص کسی سانڈے کی بل میں بھی گھسا ہو گا تو تم بھی اس میں داخل ہو گے۔ دیکھو! بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے بعد تہتر (۷۳) فرقوں میں تقسیم ہو گئے، وہ سب کے سب گمراہ ہیں

[1] یہ مبحث امام عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی کتاب "الغنية لطالبي طريق الحق" (۱/۱۱۹) سے ماخوذ ہے۔

[2] المستدرك للحاكم (۱/۲۱۹) المعجم الكبير (۱۷/۱۳)

سوائے ایک فرقے کے اور وہ فرقہ اسلام کی جماعت ہے، پھر بنی اسرائیل عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بہتر (۷۲) جماعتوں میں بٹ گئے، تمام جماعتیں گمراہ ہیں سوائے ایک جماعت کے اور وہ جماعت اسلام والی جماعت ہے، پھر اس کے بعد تم تہتر (۷۳) گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے، سب گروہ گمراہ ہوں گے سوائے ایک گروہ کے اور وہ گروہ وہ ہے جو اسلام کے ساتھ وابستہ ہے]

نیز عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی دوسری حدیث یہ ہے:

«تَفْتَرِقُ أُمَّتِي عَلٰى بِضْعٍ وَّسَبْعِينَ فِرْقَةً أَعْظَمُهَا فِتْنَةً عَلٰى أُمَّتِي قَوْمٌ يَقِيسُوْنَ الْأُمُوْرَ بِرَأْيِهِمْ يُحَرِّمُوْنَ الْحَلَالَ وَ يُحَلِّلُوْنَ الْحَرَامَ»[1]

[میری امت ستر (۷۰) سے کچھ اوپر جماعتوں میں بٹ جائے گی، میری امت میں سب سے زیادہ فتنہ پرور اس جماعت کے لوگ ہوں گے جو اپنے معاملات کو اپنی رائے کے مطابق حل کریں گے، چنانچہ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھہرائیں گے]

تیسری حدیث سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے:

«إِنَّ بَنِي إِسْرَائِيْلَ افْتَرَقُوْا عَلٰى إِحْدٰى وَ سَبْعِيْنَ مِلَّةً وَّ تَفْتَرِقُ أُمَّتِي عَلٰى ثَلَاثٍ وَّ سَبْعِيْنَ مِلَّةً كُلُّهَا فِي النَّارِ إِلَّا مِلَّةً وَّاحِدَةً فَقِيْلَ لَهُ: مَا الْوَاحِدَةُ؟ قَالَ: مَا أَنَا عَلَيْهِ الْيَوْمَ وَ أَصْحَابِي»[2]

[یقیناً بنی اسرائیل اکہتر (۷۱) فرقوں میں تقسیم ہو گئے، جبکہ میری امت تہتر (۷۳) گروہوں میں بٹ جائے گی، ایک گروہ کے علاوہ تمام کے تمام آگ میں جائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا: وہ گروہ کون سا ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو گروہ اس طریقے پر ہو گا جس پر آج میں اور میرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گامزن ہیں]

ان احادیث سے سابقہ امتوں اور اس امت کا افتراق ثابت ہوتا ہے۔ شیخ رحمہ اللہ نے ان احادیث کی تخریج ذکر نہیں فرمائی، لیکن ان احادیث کی اصل کتب سنن میں موجود ہے، الفاظ اگرچہ مختلف ہیں لیکن سب کے معانی ملتے جلتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً یوں روایت کیا ہے:

---

[1] المستدرك للحاكم (٤/٤٧٧) المعجم الكبير (١٨/٥٠)

[2] المستدرك للحاكم (١/٢١٨)

«وَإِنَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ تَفَرَّقَتْ عَلَى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِينَ مِلَّةً وَتَفْتَرِقُ أُمَّتِي عَلَى ثَلَاثٍ وَّسَبْعِينَ مِلَّةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ إِلَّا مِلَّةً وَّاحِدَةً، قَالُوا: وَمَنْ هِيَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي» [1] (الترمذي)

[بنو اسرائیل بہتر (۷۲) فرقوں پر تقسیم ہوئے اور میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں تقسیم ہوگی، ان میں ایک کے علاوہ باقی سب فرقے جہنمی ہوں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ نجات پانے والے کون ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو میرے اور میرے صحابہ کے راستے پر چلیں گے]

اسی طرح احمد اور ابو داؤد کی روایت میں معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«ثِنْتَانِ وَسَبْعُونَ فِي النَّارِ، وَوَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ، وَهِيَ الْجَمَاعَةُ» [2]

[بہتر (۷۲) آگ میں داخل ہوں گے اور ایک جنت میں جائے گا اور وہی (نجات پانے والی) جماعت ہے]

امتِ مسلمہ افتراق کا شکار کب ہوئی؟

پھر شیخ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ احادیث میں جس افتراق کا ذکر فرمایا ہے، وہ افتراق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نہیں تھا، نہ ابو بکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے زمانے ہی میں یہ افتراق تھا، یہ افتراق تو زمانہ نبوت کو سالہا سال بیت جانے کے بعد پیدا ہوا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین عظام رحمہم اللہ، فقہائے سبعہ، فقہائے مدینہ اور علمائے امصار قرناً بعد قرنٍ فوت ہو گئے، ان کے دنیائے فانی سے کوچ کرنے کی وجہ سے علم مقبوض ہو گیا، سوائے چھوٹی سی جماعت کے، وہی جماعت فرقہ ناجیہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کے سبب دین کو محفوظ رکھا ہے، چنانچہ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی حدیث میں آیا ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْزِعُ الْعِلْمَ مِنْ صُدُورِ الرِّجَالِ بَعْدَ أَنْ يُّعْطِيَهُمْ وَلٰكِنْ يَّذْهَبُ بِالْعُلَمَاءِ فَكُلَّمَا ذَهَبَ عَالِمٌ ذَهَبَ بِمَا مَعَهُ مِنَ الْعِلْمِ حَتّٰى يَبْقٰى مَنْ لَّا يَعْلَمُ فَيَضِلُّونَ وَيُضِلُّونَ» [3]

[1] سنن الترمذي (٢٦٤١)

[2] مسند أحمد (٤/١٠٢) سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٥٩٧)

[3] مسند أحمد (٢/٢٠٣) مصنف عبدالرزاق (١١/٢٥٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٣/٤٥٦) اس سے ملتے جلتے الفاظ "صحيح البخاري" (٦٨٧٧) میں بھی مروی ہیں۔

[یقیناً اللہ تعالیٰ لوگوں کو علم عطا کرنے کے بعد ان کے سینوں سے نہیں چھین لے گا، لیکن اللہ تعالیٰ علما کو فوت کرے گا، تو جب بھی کوئی عالم فوت ہوگا تو وہ اپنا علم ساتھ لے جائے گا، حتیٰ کہ دنیا میں بے علم لوگ باقی رہ جائیں گے، جو خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے]

ان سے دوسری روایت میں یہ الفاظ بھی مرفوعاً مروی ہیں:

«إِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ النَّاسِ وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ فَإِذَا لَمْ يُبْقِ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُسًا جُهَّالًا فَسُئِلُوا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا»[1] (میں کہتا ہوں: یہ حدیث متفق علیہ ہے)

[اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح قبض نہیں کریں گے کہ اسے لوگوں سے چھین لیا جائے، بلکہ علما کو قبض کرنے کے ساتھ علم قبض فرمائیں گے۔ جب کسی عالم کو اللہ باقی نہیں رکھے گا تو لوگ جہلا کو سردار مان لیں گے، ان جہلا سے سوالات کیے جائیں گے اور وہ علم کے بغیر فتویٰ دیں گے، اس طرح خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے]

اسی طرح سیدنا عوف رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی حدیث یوں ہے:

«إِنَّ الدِّيْنَ بَدَأَ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ غَرِيْبًا فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ قِيْلَ: وَمَنِ الْغُرَبَاءُ؟ قَالَ: اَلَّذِيْنَ يُصْلِحُوْنَ مَا أَفْسَدَ النَّاسُ مِنْ سُنَّتِيْ مِنْ بَعْدِيْ»[2]

[یقیناً دین کا آغاز اجنبیت کے ساتھ ہوا اور وہ عنقریب اجنبیت کی طرف لوٹ جائے گا، اجنبیوں کے لیے خوشخبری ہے۔ پوچھا گیا: اجنبی کون ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ لوگ جو میری سنت کی اصلاح کریں گے جسے میرے بعد لوگوں نے بگاڑ دیا ہوگا]

(میں کہتا ہوں: اس حدیث کو ترمذی نے عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

"لا يأتي على الناس زمان إلا أماتوا فيه سنة وأحيوا بدعة"[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٣)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٣٠)

[3] التذكرة للقرطبي (ص: ١١٥)

[ہر زمانے میں لوگ سنت کو ماریں گے اور بدعت کو زندہ کریں گے]

سیدنا عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

«فَإِنَّهُ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِي فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ فَتَمَسَّكُوا بِهَا وَعَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»[1]

(رواه أحمد وأبو داود والترمذي وابن ماجه)

[تم میں سے جو شخص زندہ رہے گا، وہ عنقریب بہت سے اختلافات دیکھے گا، لہٰذا تم میری اور خلفائے راشدین مہدیین کی سنتوں کو اپنے اوپر لازم پکڑو۔ ان باتوں کو اچھی طرح محفوظ کرلو اور نوایجاد چیزوں سے اپنے آپ کو بچاؤ، کیونکہ ہر نوایجاد چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے]

تہتر (۷۳) فرقوں کی بنیاد اور فرقہ ناجیہ:

مذکورہ احادیث میں بیان کردہ تہتر (۷۳) فرقوں کی بنیاد دس فرقے ہیں: ① اہلِ سنت، ② خوارج، ③ شیعہ، ④ معتزلہ، ⑤ مرجیہ، ⑥ مشبہہ، ⑦ جہمیہ، ⑧ ضراریہ، ⑨ نجاریہ، ⑩ کلابیہ۔

ان میں سے اہلِ سنت ایک گروہ ہے اور خوارج کے پندرہ فرقے ہیں، معتزلہ چھ فرقے، مرجیہ بارہ فرقے، شیعہ بتیس فرقے، جہمیہ، نجاریہ، ضراریہ اور کلابیہ ایک ایک فرقہ اور مشبہہ تین فرقے ہیں اس طرح حدیث کے مطابق یہ کل تہتر فرقے بنتے ہیں۔ ان فرقوں میں سے فرقہ ناجیہ یہی گروہ اہلِ سنت و جماعت ہے۔ ان کے مذہب اور اعتقاد کا بیان آگے آئے گا۔

فرقہ قدریہ اور معتزلہ نے فرقہ ناجیہ کا نام ''مجبرہ'' رکھا ہے، کیوں کہ یہ فرقہ اس بات کا قائل ہے کہ ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی مشیت، قدرت، ارادے اور خلق سے ہے۔ اسی طرح فرقہ مرجیہ نے اس کا نام ''شکاکیہ'' رکھا ہے کیوں کہ یہ فرقہ ایمان میں استثنا کرتا ہے اور یہ کہتا ہے: ''أنا مؤمن إن شاء الله'' [إن شاء اللہ میں مومن ہوں] فرقہ رافضہ نے اس فرقہ ناجیہ کا نام ''ناصبیہ'' رکھا ہے، اس لیے کہ یہ فرقہ اس بات کا قائل ہے کہ امام کا نصب و اختیار عقدِ بیعت کے ساتھ ہے۔ فرقہ جہمیہ اور نجاریہ نے اس کا نام ''مشبہہ'' رکھا ہے، کیونکہ یہ فرقہ صفاتِ باری تعالیٰ کا اثبات کرتا ہے جیسے علم،

[1] مسند أحمد (٤/١٢٦) سنن أبي داود (٤٦٠٧) سنن الترمذي (٢٧٧٦) سنن ابن ماجه (٤٢)

قدرت اور حیات وغیرہ، فرقہ باطنیہ نے اس کا نام ''حشویہ'' رکھا ہے کیوں کہ یہ اخبار اور آثار کا قائل ہے، حالانکہ اس فرقہ ناجیہ کا نام صرف اصحابِ حدیث اور اہلِ سنت ہے۔

اسی طرح خوارج وغیرہ کے متعدد القاب اور اسما ہیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں دین سے نکل جانے والے فرمایا ہے۔ یہ لوگ اکثر جزیرہ، عمان، موصل، حضر موت اور نواحی عرب میں آباد ہیں۔

شیخ رحمہ اللہ نے ہر فرقے کے عقائد، القاب اور اسما ذکر کیے ہیں۔ اس موضوع پر ہمارا رسالہ "كشف الغمة في افتراق الأمة" کافی ہے۔

مرجیہ فرقوں میں سے ایک فرقہ حنفیہ ہے:

شیخ رحمہ اللہ نے من جملہ مرجیہ فرقوں کے حنفیہ کا نام لیا ہے اور کہا ہے کہ ان کا نام مرجیہ اس لیے ہے کہ ان کا عقیدہ یہ ہے:

"إن الواحد من المكلفين إذا قال لا إله إلا الله محمد رسول الله وفعل بعد ذلك سائر المعاصي لم يدخل النار أصلا، وإن الإيمان قول بلا عمل، والأعمال الشرائع والإيمان قول مجرد، والناس لا يتفاضلون في الإيمان، وإن إيمانهم وإيمان الملائكة والأنبياء واحد، لا يزيد ولا ينقص، ولا يستثنیٰ فيه، فمن أقر بلسانه و لم يعمل فهو مؤمن"[1]

[جب مکلفین میں سے کوئی شخص "لا إله إلا الله محمد رسول الله ﷺ" پڑھ لے اور اس کے بعد ہمہ قسم کی معاصی کا مرتکب ہی کیوں نہ ہو وہ بالکل آگ میں نہیں جائے گا۔ یقیناً ایمان بلا عمل قول کا نام ہے اور اعمال شرائع ہیں، اور ایمان صرف قول ہے۔ لوگ ایمان میں ایک دوسرے سے متفاضل نہیں ہوتے، بے شک ان کا ایمان، فرشتوں اور انبیا کا ایمان ایک ہے، اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی ہے اور نہ اس میں کوئی استثنا درست ہے، پس جس نے اپنی زبان سے اقرار کر لیا اور عمل نہ کیا تو وہ مومن ہے]

پھر شیخ جیلانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

"وأما الحنفية فهم بعض أصحاب أبي حنيفة النعمان بن ثابت زعموا أن الإيمان هو المعرفة والإقرار بالله ورسوله وبما جاء من عنده جملة على

[1] الغنية للجيلي (١/ ١٢٧)

ما ذكره البرهوقي في كتاب الشجرة" انتهىٰ

[رہے احناف تو وہ ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمہ اللہ کے وہ اصحاب ہیں جن کا یہ گمان ہے کہ ایمان معرفت کا نام ہے، نیز ایمان کا مطلب ہے کہ اللہ، رسول اور اس کے رسول اس کی طرف سے جو کچھ لائے ہیں، اس کا اقرار کرنا۔ جیسے برہوقی رحمہ اللہ نے کتاب الشجرہ میں اس کا ذکر کیا ہے]

الغرض آگ میں داخل ہونا کفر کے سبب ہوتا ہے، عذاب کا بڑھنا اور منزلوں کی (نیچے کی طرف) تقسیم بداعمالیوں اور بداخلاقیوں کے سبب ہوتی ہے۔ اسی طرح جنت کا داخلہ ایمان کے سبب ہوتا ہے، نعمتوں میں اضافہ اور بلند درجات کا میسر آنا اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کے سبب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا کر کے بطور ثواب نعمتوں سے بھر دیا ہے اور آگ کو پیدا کر کے بطور سزا عذاب سے بھر دیا ہے اور دنیا کو پیدا کر کے آفات و نعیم سے بطور محنت و آرام کے پر کیا ہے۔ پھر جنت اور جہنم کو غیب میں پیدا کیا ہے، جن کو مخلوق نے نہیں دیکھا ہے۔

دنیا میں جو نعمتیں اور آفتیں ہیں یہ آخرت کا نمونہ ہیں۔ اسی طرح دنیا میں اس نے غلام اور بادشاہ پیدا کیے ہیں جو تدبیرِ ملک اور نفاذِ امر کا نمونہ اور مثال ہے۔ اسی لیے فرمایا ہے:

﴿ وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَ مَا يَعْقِلُهَاۤ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ﴾ [العنکبوت: ٤٣]

[اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور انھیں صرف جاننے والے ہی سمجھتے ہیں]

ان امثال کو اللہ کی معرفت رکھنے والے لوگ اللہ تعالیٰ ہی سے سمجھتے ہیں:

میں [نواب صاحب رحمہ اللہ] کہتا ہوں: ان بہتر (۷۲) فرقوں میں سے اکثر فرقے ختم ہو گئے ہیں، صرف خوارج اور روافض ہی باقی بچے ہیں۔ یہ اب تک حق و باطل میں امتیاز کی خاطر دنیا میں موجود ہیں۔ لہٰذا مسلمان پر لازم ہے کہ وہ فرقہ ناجیہ کے مذہب اور اعتقاد کو بہ خوبی دریافت کر لے اور دینِ حق پر مستقیم رہے، کیونکہ اکثر لوگ جہالت کے سبب بعض عقائد میں گمراہ فرقوں کے موافق ہو جاتے ہیں اور انھیں خبر تک نہیں ہوتی۔ وہ اپنے آپ کو حق ہی پر گمان کرتے رہتے ہیں، حالانکہ وہ باطل پر ہیں۔ جب ان کی آنکھ بند ہو گی تب انھیں معلوم ہو گا کہ ہم کس باطل عقیدے پر مرے ہیں۔

بوقت صبح شود ہمچو روز معلومت
کہ با کہ باختہ عشق درشب دیجور

[صبح ہوتے ہی تیرے سامنے روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گا کہ ناکام عاشق نے تاریک رات کس کے ساتھ بسر کی ہے]

ستعلم ليلىٰ أي دين تداينت
وأي غريم في التقاضي غريمها

[لیلیٰ کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ اس نے کس قسم کے قرض کا لین دین کیا ہے اور تقاضا کرنے میں اس کا مقروض کیسا ہے]

گمراہ کن کتابوں سے تحذیر:

امام علامہ عمر بن محمد اشبیلی اشعری نے کتاب "لحن العوام" میں لکھا ہے:

''امام غزالی رحمہ اللہ کی کتاب "إحياء العلوم" اور "النفخ والتسوية" اور ان کی اس طرح کی دیگر تالیفات کی بعض جگہوں پر عمل کرنے سے گریز کرنا چاہیے، کیونکہ یہ کتابیں ان کے نام پر بہتان ہیں یا انھوں نے اپنی وہ کتابیں شروع میں تالیف کیں، پھر ان سے رجوع کر لیا جیسا کہ انھوں نے اپنی کتاب "المنقذ من الضلال" میں ذکر کیا ہے۔

''اسی طرح ابو طالب مکی کی کتاب "قوت القلوب" کی چند جگہوں سے بچنا چاہیے، جیسے اس کا اپنی اس کتاب میں یہ کہنا: اللہ تعالیٰ قوت العالم ہے۔ اسی طرح تفسیر مکی کی چند جگہیں قابل احتراز ہیں۔ ابن میسرہ حنبلی کی کتابوں میں سے تو بہت سی جگہوں سے گریز کرنا چاہیے، اس کے رد میں لوگوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔ منذر بن سعید البلوطی کے کلام کا مطالعہ کرنے سے بھی پرہیز کرنا چاہیے، کیونکہ اس کا کلام اہلِ اعتزال کے کلام سے مخلوط ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ بلادِ مشرق میں گیا تو اہلِ اعتزال کے ساتھ اس کا بیٹھنا اٹھنا رہتا تھا۔ ابن برجان کی کتابوں کا مطالعہ بھی شجرۂ ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح امام زمخشری رحمہ اللہ کی تفسیر کی چند جگہیں قابل احتراز ہیں اور اس کی بعض جگہیں تو صریح کفر ہیں۔ ایسے ہی کتاب ''اخوان الصفا'' کے مطالعہ سے بچنا چاہیے، یہ

کتاب باون رسالوں پر مشتمل ہے جو مخریطی کی تالیف ہے۔ اہلِ علم نے ذکر کیا ہے کہ یقیناً وہ ملحدین اور اسلام کا طریقہ چھوڑنے والے لوگوں میں سے تھا۔ اسی طرح ابراہیم النظام، ابن الراوندی اور معمر بن المثنی کے کلام کا مطالعہ کرنے سے باز رہنا چاہیے۔ عبد الکریم الجیلی کے قصیدے کا مطالعہ بھی قابل احتراز ہے، اس قصیدے کا قافیہ عین مضمومہ ہے اور اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

قطعت الورى من نفس ذاتك قطعة

وما أنت مقطوع ولا أنت قاطع

[تو نے اپنی نفسِ ذات سے مخلوق کو کاٹ کر جدا کیا، نہ تو کاٹا ہوا ہے اور نہ ہی کاٹنے والا ہے]

''یقیناً اللہ تعالیٰ پر اس لفظ کا مطلق طور پر اطلاق کرنا جائز نہیں ہے۔ نیز ابن قصی کی کتاب ''خلع النعلین'' کا مطالعہ نہ کرنا چاہیے، کیونکہ وہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ ایسے ہی سیدی محمد وفا کے قصیدہ تائیہ سے پرحذر رہنا چاہیے۔ محمد بن حزم الظاہری کی کتابوں کے مطالعہ سے تو بہت ہی زیادہ گریز و پرہیز کرنا چاہیے، اگر ان کی کتابوں کا مطالعہ کرنا ہی ہو تو علوم شریعت میں پختگی حاصل کرنے کے بعد ہی ایسا کرنا چاہیے۔ خاص طور پر ان کی وہ کتابیں قابل احتراز ہیں جو اصولِ دین، قواعدِ عقائد، معانی اور حقائق سے تعلق رکھتی ہیں، کیونکہ موصوف رحمہ اللہ کی ان علوم پر دسترس تو نہ تھی مگر انھوں نے اپنے ہی فہم سے ان پر ہاتھ ڈال لیا اور ان پر وہ کوئی کلام نہیں کر پائے۔

''اسی طرح المفید بن رشد کا کلام پڑھنے سے بچنا چاہیے کیونکہ عقیدے کے حوالے سے اس کا اکثر کلام فاسد ہے۔ نیز محی الدین بن عربی کی کتابوں کے مطالعہ سے بچنا چاہیے، کیوں کہ وہ کتابیں بہت بالا ہیں اور ان میں کچھ ایسا کلام بھی ہے جو شیخ کے ذمے لگایا گیا ہے۔ خاص طور پر ''الفصوص'' اور ''الفتوحات المکیہ''۔ شیخ ابو طاہر نے اپنے شیخ اور انھوں نے اپنے شیخ بدر الدین بن جماعۃ سے خبر دی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ شیخ محی الدین کی کتابوں میں علما کے کلام کے مخالف جتنی بھی باتیں ہیں وہ ان کے ذمے لگائی گئی ہیں، شیخ مجد الدین صاحب القاموس بھی یہی کہا کرتے تھے۔ ایسے ہی عبدالحق بن سبعین کی کتابوں

کا مطالعہ قابل احتراز ہے، کیونکہ ان کی کتابوں میں ایسی چیزیں ہیں جو حلول، اتحاد، تشبیہ اور اقوال ملحدین کا وہم ڈالتی ہیں۔ بعض [اہلِ علم] نے سیدی عمر بن الفارض کے قصیدہ تائیہ میں کیے گئے کلام کو سننے سے منع کیا ہے جبکہ جمہور اہلِ علم تاویل کے ساتھ اس کے جواز کے قائل ہیں۔"[1]

میں کہتا ہوں: ظاہرِ شریعت سے بچانے کے لیے مذکورہ بالا کتابوں کا مطالعہ کرنے سے خبردار کیا گیا ہے۔ یہ کتابیں شروع سے آخر تک تمام کی تمام قابل احتراز نہیں ہیں، بلکہ کسی کتاب کی بعض جگہیں اور کسی کتاب کی اکثر جگہیں لائق احتراز ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ "إحیاء العلوم" میں چار عنوان فاسد اور خراب ہیں اور وہ ہیں: فلسفیت، احادیث موضوعہ اور مسائل کلامیہ وغیرہ۔ لیکن شیخ محمد تستری رحمہ اللہ نے "إحیاء العلوم" کو اس فاسد مواد سے پاک کر کے پوری کتاب کے چوتھائی حصے کے برابر خلاصہ نکال کر "إحیاء الإحیاء" کے نام سے خوب کتاب لکھی ہے۔ محمد بن حزم ظاہری امامِ علم و عمل تھے۔ ان کی کتابوں کی نسبت جو کچھ کہا گیا ہے وہ محلِ نظر اور محتاجِ نظر ہے۔ اکثر مقلدینِ مذاہب ان کے تقلید کو ترک کرنے اور اتباع کو ترجیح دینے کے سبب ان پر تنقید کرتے ہیں، حالانکہ حقیقت میں بات ایسے نہیں ہے، اس کی وضاحت کسی اور جگہ ہو گی۔

اس کلام کو نقل کرنے کے بعد امام شعرانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فهذه عدة نصائح وتحذيرات فاعمل يا أخي بها، وعليك بمطالعة كتب الشريعة من حديث و تفسير وفقه، والاقتداء بأئمة الدين من الصحابة والتابعين وتبع التابعين ومقلديهم من الفقهاء والمتكلمين رضوان الله عليهم أجمعين، وإياك والاجتماع بهؤلاء الجماعة الذين تظاهروا بطريق القوم في النصف الثاني من القرن العاشر من غير إحكام قواعد الشريعة فإنهم ضلوا وأضلوا بمطالعتهم كتب توحيد القوم من غير معرفة مرادهم، وقد دخل عليّ منهم شخص وأنا مريض ولم يكن عندي أحد من الناس، فقلت له: من تكون؟ قال: أنا الله، فقلت له: كذبت! فقال: أنا محمد

---

[1] المختار من كتاب لحن العامة والخاصة في المعتقدات للإشبيلي (ص:٥٧)

رسول الله. فقلت له: كذبت! فقال: أنا الشيطان، وأنا اليهودي فقلت له: صدقت، فو الله لو كان عندي أحد يشهد عليه لرفعته إلى العلمآء فضربوا عنقه فالحمد لله الذي عافانا وإخواننا من مثل ذلك فالله تعالىٰ يُوَفق الإخوان ويتولاهم" انتهىٰ

[اے میرے بھائی! یہ چند نصیحتیں اور تحذیرات ہیں ان پر عمل کر اور شریعت کی کتابوں کا، جیسے حدیث، تفسیر اور فقہ ہیں مطالعہ کر اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین وتبع تابعین عظام رحمہم اللہ اور ان کے مقلد فقہا اور متکلمین سب ائمہ دین رحمہم اللہ کی اقتدا کر۔ ان لوگوں کی جماعت میں شامل ہونے سے بچ جو لوگ قواعد شرعیہ کو مستحکم کیے بغیر دسویں صدی کے نصف میں موجود قوم کی راہ چلے۔ کیوں کہ وہ خود بھی گمراہ تھے اور انھوں نے دوسروں کو بھی، اس قوم کی توحید کی کتابوں کا ان کی مراد سمجھے بغیر مطالعہ کرنے کے ساتھ، گمراہ کیا۔ ایک مرتبہ میں بیمار تھا کہ ناگہاں ایک آدمی میرے پاس آ گیا، تب میرے پاس کوئی نہیں تھا، میں نے اس سے پوچھا: تو کون ہے؟ اس نے جواب دیا: میں اللہ ہوں۔ میں نے اسے کہا: تو نے جھوٹ بولا ہے۔ تب اس نے دعویٰ کیا: میں محمد رسول اللہ ہوں۔ میں نے پھر کہا: تو نے جھوٹ بولا ہے۔ پھر اس نے کہا: میں شیطان ہوں اور میں یہودی ہوں۔ تو میں نے کہا: تو نے سچ کہا ہے۔ اللہ کی قسم! اگر میرے پاس کوئی ہوتا جو اس پر گواہ بنتا تو میں اسے علما کے پاس لے جاتا تاکہ وہ اس کی گردن ماریں۔ پس سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں اور ہمارے بھائیوں کو اس سے محفوظ کیا، پس اللہ تعالیٰ ہی بھائیوں کو اس کی توفیق دیتا ہے اور وہی ان کا نگران ہے]

میں کہتا ہوں:

امام شعرانی رحمہ اللہ کا یہ ارشاد کہ ائمہ دین کی اقتدا کرنا واجب ہے، بہت صحیح اور درست ہے، جو شخص صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے علوم پر واقف ہوگا اور ان کے اعمال پر اکتفا کرے گا یا جو لوگ ان کی سیرت پر چلتے تھے ان کی راہ پر چلے گا وہ ان شاء اللہ ناجی ہوگا۔ ان کے کلام میں فقہا سے مراد اہلِ سنت ہیں اہلِ رائے نہیں۔ اسی طرح ان کے کلام میں متکلمین سے مراد شریعت کا دفاع کرنے والے علما ہیں نہ کہ مسلمان اہلِ کلام۔

ایسے ہی ان کے کلام میں ۹۵۰ھ کے بعد والے صوفیاے اہلِ اتحاد سے جو منع کیا گیا ہے یہ بھی درست ہے، کیونکہ وحدتِ وجود کی بلا اسی سال سے زیادہ شائع اور عام ہوئی ہے اور ہر جولاہا اپنے آپ کو صاحبِ معراج سمجھتا ہے، تو پھر اس کے بعد سے لے کر زمانہ حال تک کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کو ان کتابوں اور رسائل کا مطالعہ کرنے سے احتراز کرنا چاہیے جو ہند کے اہلِ بدعت نے تالیف کی ہیں۔ ان کتب اور رسائل میں علم کی قلت، فہم کا فقدان، استدلال کا معدوم ہونا اور استنباط کی کیفیت کے انعدام کے ساتھ ساتھ اکابرِ دین کے حق میں کثرت سے سب وشتم کا استعمال کیا گیا ہے۔

ایسے ہی ان تالیفات سے بچنا چاہیے جو جاہل مریدوں نے کراماتِ اولیا میں لکھی ہیں، یا دہریہ نے عقائدِ اسلام میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے رواج دی ہیں، یا اہلِ طبائع نے اسلام کے پیرائے میں ظاہر کی ہیں، یا بادشاہوں کو نصیحتیں کرنے والوں نے دنیا حاصل کرنے کی خاطر تیار کی ہیں۔ اردو زبان میں اس طرح کی کتابیں اور رسائل فی الحال جابجا اس ملک کے عوام وخواص میں عام ہو رہی ہیں۔ وكان ذلك في الكتاب مسطورا.

اسی کے ذیل میں شعرانی رحمہ اللہ نے بعض کفریہ کلمات کا بھی ذکر کیا ہے جن کا زیادہ تر تعلق شطحیاتِ صوفیہ سے ہے، اس رسالے کے خاتمے پر ہم وہ کلمات نقل کریں گے، تاکہ صحیح العقیدہ مومن ان الفاظ اور عبارات کے استعمال سے احتراز کرے اور اپنے برحق عقائد کے بچاؤ کو اپنے پیشِ نظر رکھے۔

والله الهادي وعليه اعتمادي وإليه استنادي.

تیسری فصل

امام ابوحنیفہ کوفی رحمہ اللہ کی طرف منسوب کتاب "فقہ اکبر" کا بیان

فقہ اکبر میں بیان کردہ عقائد:

① اصل توحید، جس سے اعتقاد ثابت ہوتا ہے، یہ ہے کہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ یوں کہے:

"میں اللہ پر، فرشتوں، کتابوں، رسولوں، آخرت کے دن، موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے اور اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لایا۔ نیز اس پر ایمان لایا کہ حساب، میزان، جنت اور [جہنم کی] آگ حق ہے۔"

اللہ تعالیٰ ایک ہے، لیکن بطریق عدد نہیں[1] بلکہ اس طریق سے کہ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس نے کسی کو جنا ہے نہ وہ کسی سے جنا گیا ہے۔ اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ وہ کسی چیز کے مشابہ ہے نہ مخلوق میں سے کوئی چیز اس کے مشابہ ہے۔ اپنے ناموں اور ذاتی و فعلی صفات کے ساتھ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کی ذاتی صفات یہ ہیں: حیات، قدرت، علم، کلام، سمع، بصر اور ارادہ۔ اور اس کی فعلی صفات یہ ہیں: تخلیق، ترزیق، انشا، ابداع اور صنع وغیرہ۔ اس کی کوئی صفت حادث ہے نہ اس کا کوئی نام نوپیدا ہے۔ وہ ہمیشہ سے عالم ہے، علم اس کی ایک ازلی صفت ہے۔ وہ ہمیشہ سے قادر ہے اور قدرت اس کی ایک ازلی صفت ہے۔ وہ خالق ہے اور تخلیق اسکی ایک ازلی صفت ہے۔ وہ فاعل ہے اور فعل اس کی ایک ازلی صفت ہے۔

غرض کہ اللہ تعالیٰ فاعل ہے اور مخلوق مفعول۔ اللہ کا فعل مخلوق نہیں ہے۔ اس کی صفات ازل میں محدث ہیں نہ مخلوق، اور جو کوئی انھیں محدث یا مخلوق کہے یا ان میں توقف اور شک کرے، وہ اللہ کے ساتھ کفر کرنے والا ہے۔

---

[1] یعنی تعداد کے تناظر میں نہیں، تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ اس کے بعد کوئی اور بھی ہوگا۔ (شرح الفقه الأكبر للملا علي القاري، ص: ٦٠)

④ قرآن اللہ کا کلام ہے، جو مصاحف میں لکھا ہوا ہے، دلوں میں محفوظ ہے، زبانوں سے پڑھا جاتا ہے اور محمد ﷺ پر نازل ہوا ہے۔ قرآن مجید کے ساتھ ہمارا تلفظ مخلوق ہے۔ اسی طرح ہمارا اسے لکھنا مخلوق ہے اور ہمارا اسے پڑھنا مخلوق ہے۔[1] قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ وغیرہ انبیا علیہم السلام اور فرعون و ابلیس سے جو کچھ نقل کیا ہے، وہ سب اس کا کلام ہے، اس نے ہمیں اس کی خبر دی ہے، اللہ کا کلام مخلوق نہیں ہے، البتہ موسیٰ علیہ السلام وغیرہ کا کلام مخلوق ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے نہ کہ ان لوگوں کا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا جس طرح اس نے فرمایا ہے:

﴿وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ [النساء: ١٦٤]

[اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، خود کلام کرنا]

اللہ تعالیٰ اس حال میں بھی متکلم تھا جب تک موسیٰ علیہ السلام سے بات نہ کی تھی۔ وہ ازل میں خالق تھا، جب تک کہ مخلوق پیدا نہ کی تھی۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام سے بات کی تو اسی کلام کے ساتھ کی جو اس کی ازلی صفت تھی۔ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات مخلوق کی صفات کے برخلاف ہیں۔ وہ عالم ہے مگر ہمارے جیسے علم کے ساتھ نہیں، وہ قادر ہے مگر ہماری جیسی قدرت کے ساتھ نہیں، وہ دیکھتا ہے مگر ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں، وہ بولتا ہے مگر ہماری طرح کا بولنا نہیں اور وہ سنتا ہے مگر ہمارا جیسا سننا نہیں۔

ہم آلات و حروف سے بات کرتے ہیں، وہ کسی آلے اور حرف کے بغیر کلام کرتا ہے۔[2] حروف مخلوق ہیں اور اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے۔ اللہ ایک شے ہے لیکن اشیا کی طرح نہیں ہے۔ شے کے معنی ہیں کہ وہ موجود ہے مگر جسم، جوہر اور عرض کے بغیر۔[3] اس کے لیے حدّ ہے نہ ضد، نہ ند ہے نہ مثل۔ اس کے لیے ہاتھ، منہ اور نفس ثابت ہے، جس طرح اس نے قرآن مجید میں ذکر کیا ہے۔ یہ صفات بلا کیف ہیں۔ کوئی شخص یہ نہ کہے کہ ہاتھ سے مراد قدرت یا نعمت ہے، کیونکہ اس تاویل میں

---

① یہ قول ظاہر حدیث کے خلاف ہے۔ سلف نے اس میں بحث نہیں کی ہے کہ لفظ، تلاوت اور کتابت مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ اس لیے اس میں خوض و بحث کرنا بہتر نہیں بلکہ ہمیں سکوت ہی کفایت کرتا ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

② یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام کسی آلے کے بغیر ہے، مگر اس سے حرف اور خلقِ حرف کی نفی کرنا درست نہیں، کیوں کہ حرف وصوت کا ثبوت خود حدیث میں موجود ہے۔ حروفِ ہجا قدیم ہیں، حادث نہیں۔ [مولف رحمہ اللہ]
اللہ تعالیٰ کے لیے حرف کا اثبات درست ہے، جیسا کہ حدیث نبوی میں اس کی صراحت موجود ہے۔ دیکھیں:
صحیح مسلم (٨٠٦) سنن الترمذي (٢٩١٠) نیز دیکھیں: فتاویٰ ابن تیمیة (١٢/ ٣٠٤)

③ یہ مضمون صحیح ہے، مگر سلف سے ان الفاظ کا استعمال ثابت نہیں۔ [مولف رحمہ اللہ]

اس صفت کا باطل کرنا لازم آتا ہے۔ یہ تو اہلِ قدر اور اہلِ اعتزال کا قول ہے، بلکہ یہ اس کی بلا کیف صفت ہے۔ اسی طرح غضب ورضا بھی اس کی بلا کیف دو صفتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اشیا کو پیدا کیا مگر کسی شے سے نہیں۔ وہ ازل میں اشیا کا عالم تھا۔ اشیا کو بنانے سے پہلے اس نے ساری اشیا کی قضا وقدر مقرر کی۔ دنیا اور آخرت میں ہر چیز اس کی مشیت، علم اور قضا وقدر ہی سے معرض وجود میں آتی ہے، اس نے ہر چیز کو لوح محفوظ میں لکھ رکھا ہے، مگر یہ لکھنا بالوصف ہے بالحکم نہیں۔[1]

③ قضا و قدر اور مشیت اس کی ازلی بلا کیف صفتیں ہیں۔ وہ معدوم کا حالِ عدم میں بھی عالم ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جب اس کے ایجاد کرنے سے وہ چیز وجود میں آئے گی تو وہ کیسی ہوگی۔ اسی طرح وہ حالِ وجود میں موجود کا عالم ہے اور وہ جانتا ہے کہ وہ کیونکر فنا ہوگا۔ وہ قائم کو حالِ قیام میں اور قاعد کو حالِ قعود میں جانتا ہے بغیر اس کے کہ اس کا علم متغیر ہو یا کوئی علم اس کے لیے حادث ہو، لیکن یہ تغیر اور اختلاف مخلوقات میں حادث ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو کفر و ایمان سے سلیم پیدا کیا تھا، پھر انھیں مخاطب کیا، امر کیا اور نہی کی۔ کافر اپنے اختیار اور انکار سے نہ مانا تو اللہ نے اسے مخذول کر دیا، مومن نے اپنے اختیار، اقرار اور تصدیق سے مانا تو اللہ نے اسے توفیق ونصرت بخشی۔

④ اولادِ آدم کو ان کی پشت سے نکال کر عاقل بنایا، اس سے امر ونہی کے ساتھ خطاب کیا، انھوں نے اللہ کی ربوبیت کا اقرار کیا، یہی ان کا ایمان ہے اور اسی فطرت پر وہ پیدا ہوتے ہیں۔ جس نے اس کے بعد انکار کیا، اس نے فطرت کو بدل ڈالا اور جو ایمان دار رہا اور تصدیق کرتا رہا وہ اپنے اقرار پر ثابت رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو کفر پر مجبور کیا ہے نہ ایمان پر مجبور کیا ہے اور نہ انھیں مومن و کافر بنایا ہے، بلکہ انھیں صاحبِ اختیار پیدا کیا ہے۔ یہ ایمان اور کفر بندوں کا فعل ہے۔ اللہ تعالیٰ کافر کو اس کے کفر کے حال میں جانتا ہے۔ جب وہ ایمان لے آتا ہے تو پھر اسے حالِ ایمان میں بھی پہچانتا ہے اور اس سے محبت رکھتا ہے بغیر اس کے کہ اس کے علم وصفت میں کچھ تغیر وتبدیلی آئے۔

⑤ بندوں کے سارے افعال جیسے حرکت اور سکون حقیقت میں بندوں کا کسب ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا

[1] یعنی یہ لکھا تھا کہ فلاں فلاں چیز جب پیدا ہوگی تو اس کی ماہیت اور اوصاف کیا ہوں گے، یہ حکم نہیں لکھا تھا کہ ساری چیزیں ابھی وجود میں آجائیں۔

خالق ہے۔ یہ سارے اعمال اسی کی مشیت، علم اور قضا وقدر سے ہوتے ہیں۔ جتنی بھی طاعات ہیں، تھوڑی ہوں یا زیادہ، وہ سب اللہ کے امر، اس کی محبت ورضا، مشیت اور قدر وقضا سے ہوتی ہیں۔ جتنی بھی معاصی ہیں وہ سب بھی اسی کی قضا وقدر اور مشیت سے ہوتی ہیں لیکن ان میں اس کی محبت ورضا شامل نہیں ہوتیں۔

⑥ تمام انبیا علیہم السلام صغائر، کفر اور اعمال بد سے پاک صاف ہیں۔ ہاں! ان سے معمولی کوتاہیاں اور لغزشیاں ہوئیں۔ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے حبیب، اس کے بندے، اس کے رسول، نبی، برگزیدہ اور پاک صاف ہیں۔ انھوں نے پلک جھپکنے کے وقت کے برابر بھی کبھی بت پرستی کی نہ اللہ کے ساتھ شرک کیا اور نہ کبھی کسی صغیرہ اور کبیرہ گناہ کے مرتکب ہی ہوئے۔

⑦ محمد ﷺ کے بعد تمام لوگوں سے بہتر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، پھر عمر، پھر عثمان اور پھر علی رضی اللہ عنہم ہیں۔ یہ تمام حق کا ساتھ دینے والے اور اسی پر قائم رہ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کو بجا لانے والے تھے۔ ہم ان سب سے محبت کرتے ہیں۔ اصحابِ نبی ﷺ میں سے ہر کسی کا خیر کے ساتھ ہی ذکر کرتے ہیں۔ کسی مسلمان کو کسی گناہ کے سبب کافر نہیں کہتے، اگرچہ وہ گناہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہو، جب تک وہ اس کو حلال نہیں جانتا ہے۔ ہم اس سے ایمان کا وصف علاحدہ نہیں کرتے، بلکہ اسے حقیقتاً مومن کہتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ مومن فاسق ہو نہ کہ کافر۔

⑧ موزوں پر مسح کرنا سنت ہے۔ ہر نیک وبد مسلمان کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ گناہ [آخرت میں] مومن کے لیے ضرر رساں نہیں ہے، نہ یہ کہتے ہیں کہ وہ آگ میں نہ جائے گا اور نہ یہ کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ آگ میں رہے گا، اگرچہ وہ فاسق ہو، بشرطے کہ اس نے مسلمان ہو کر دنیا کو خیر باد کہا ہو۔ ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ ہماری نیکیاں مقبول ہیں اور ہمارے گناہ معاف ہیں جس طرح مرجیہ کا عقیدہ ہے، بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ جو شخص پوری شرائط کے ساتھ خرابیوں سے پاک صاف ہو کر نیک کام کرے گا، انھیں باطل نہ کرے گا حتی کہ ایمان کی حالت میں دنیا سے اٹھ جائے گا تو اللہ اس کی نیکیوں کو برباد نہ کرے گا بلکہ انھیں قبول کر کے ان پر ثواب عطا فرمائے گا۔ جو گناہ شرک سے چھوٹا ہوگا اور گناہ گار نے اس سے توبہ نہ کی ہوگی یہاں تک کہ وہ اللہ کی مشیت میں مومن ہو کر فوت ہوگیا تو اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے، چاہے اسے عذاب

کرے اور چاہے تو اسے معاف کر دے، لیکن اسے ہمیشہ کے لیے آگ میں عذاب نہیں دے گا۔

⑨ جب کسی عمل میں ریا کاری آ جاتی ہے تو اس کا اجر باطل کر دیتی ہے اور یہی حال خود پسندی کا ہے۔ پیغمبروں کے معجزات اور ولیوں کی کرامات حق ہیں۔ جو کام اللہ کے دشمنوں سے سرزد ہوتے ہیں جیسے ابلیس، فرعون اور دجال، جیسے بعض اخبار میں یہ بیان ہوا ہے کہ ایسے کام ہوں گے تو انھیں ہم آیات یعنی معجزات اور کرامات نہیں کہتے، بلکہ ہم ان کا نام قضائے حاجات رکھتے ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں کی حاجتوں کو بھی بطور استدراج اور آخرت میں ان کے لیے بطور عقوبت اور سزا کے پورا کرتا ہے۔ وہ اس فریب میں آ کر اور زیادہ طغیان و کفر کرنے لگتے ہیں، بہر حال یہ سب ممکن اور جائز ہے۔

⑩ اللہ تعالیٰ تخلیق اور ترزیق سے پہلے خالق اور رازق تھا۔ آخرت میں اس کی رویت اور دیدار ہو گا۔ مومن اسے جنت میں اپنے سر کی آنکھوں کے ساتھ بلاتشبیہ اور کیفیت کے دیکھیں گے، اللہ تعالیٰ اور مخلوق کے درمیان کوئی مسافت نہ ہو گی۔

⑪ ایمان اقرار اور تصدیق کا نام ہے۔ آسمان و زمین والوں کا ایمان کم اور زیادہ نہیں ہوتا ہے۔[1] تمام ایمان والے ایمان اور توحید میں برابر ہیں اور اعمال میں کم اور زیادہ۔[2] اللہ کے اوامر کو مان لینے اور بجا لانے کو اسلام کہتے ہیں۔ لغوی اعتبار سے تو ایمان اور اسلام میں فرق ہے لیکن بغیر اسلام کے ایمان نہیں ہوتا اور نہ ایمان کے بغیر اسلام پایا جاتا ہے۔ ان دونوں کا آپس میں وہی تعلق ہے جو پشت کا پیٹ کے ساتھ۔ اور دین ایک ایسا نام ہے جو ایمان، اسلام اور سارے شرائع پر بولا جاتا ہے۔

⑫ ہم اللہ تعالیٰ کو ویسا ہی پہچانتے ہیں جیسے اس کے شایانِ شان ہے اور جس طرح اس نے اپنے

---

[1] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد (ابو حاتم رازی) اور ابو زرعہ سے اصولِ دین میں اہلِ سنت کے عقائد سے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا:
"أدركنا العلماء في جميع الأمصار حجازاً و عراقاً وشاماً ويمناً فكان من مذهبهم: الإيمان قول و عمل، يزيد وينقص" (أصول اعتقاد أهل السنة للالكائي: ١/ ١٧٦)

[2] ایمان میں کمی بیشی کتاب و سنت سے ثابت ہے، پھر اس کا انکار کیا معنی رکھتا ہے۔ بعض اہلِ علم نے اسے نزاعِ لفظی کی طرف راجع کیا ہے۔ ہمارا ایمان اور ابو بکر رضی اللہ عنہ و جبریل علیہ السلام کا ایمان برابر نہیں ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

نفس کو اپنی کتاب میں تمام صفات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ہاں! یہ بات ضرور ہے کہ کسی شخص میں یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ اللہ کی ویسی عبادت کر سکے جیسی اس کی شان کے لائق ہے لیکن بندے کو جس طرح حکم دیا گیا ہے، وہ اس طرح اس کی عبادت کرتا ہے۔ سارے مومن معرفت، یقین، توکل، محبت، رضا، خوف، رجا اور ان سب امور پر ایمان لانے میں یکساں ہیں۔ اگر فرق ہے تو ایمان کے سوا ان سب چیزوں میں فرق ہے۔

⑬ اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے، عادل ہے۔ کبھی اتنا ثواب دیتا ہے جو بندے کے استحقاق سے زائد ہوتا ہے، یہ محض اس کی مہربانی ہے، کبھی گناہ پر عقاب کرتا ہے، یہ اس کا انصاف ہے، اور کبھی براہِ فضل وکرم معاف فرما دیتا ہے۔

⑭ انبیا کی شفاعت حق ہے۔ ہمارے رسول ﷺ کی شفاعت گناہ گار مومنوں اور ان اہلِ کبائر کے حق میں جو مستوجب عقاب ہوں گے، حق ہے۔ اسی طرح قیامت کے دن ترازو میں اعمال کا وزن حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا حوض حق ہے۔ آپس میں جھگڑنے والوں کا قیامت کے دن نیکیوں کے ساتھ بدلہ حق ہے، اور اگر نیکیاں نہ ہوں گی تو اس پر گناہوں کا بار لادنا حق ہے۔ جنت اور جہنم ابھی سے موجود ہیں، ان کو کبھی فنا نہیں ہے اور نہ حورعین ہی کو موت آئے گی اور نہ کبھی اللہ کا ثواب وعقاب فنا ہوگا۔

⑮ اللہ تعالیٰ براہِ فضل جسے چاہے ہدایت دے اور براہِ عدل جسے چاہے گمراہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کا گمراہ کرنا یہ ہے کہ وہ بے یارو مددگار چھوڑ دیتا ہے۔ اور خذلان کی تفسیر یہ ہے کہ بندے کو اس چیز کی توفیق نہیں دیتا جس میں اس کی رضا ہے۔ یہ اس کا عدل ہے۔ ایسے ہی مخذول کو معصیت پر عقوبت کرنا اور سزا دینا اس کا عدل ہے۔

⑯ یہ نہ کہنا چاہیے کہ شیطان مومن بندے سے جبراً اور قہراً ایمان سلب کر لیتا ہے، بلکہ اگر کہے تو یوں کہے کہ بندہ ایمان کو چھوڑ دیتا ہے، تب شیطان اس سے ایمان سلب کر لیتا ہے۔

⑰ منکر اور نکیر کا سوال حق ہے اور یہ سوال قبر میں ہونے والا ہے۔ قبر میں روح کا جسم کی طرف لوٹنا حق ہے۔ اسی طرح قبر کا دبانا اور قبر کا عذاب حق ہے۔ قبر کا یہ عذاب تمام کفار اور بعض گناہ گار مومنوں کو ہوگا۔

⑱ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے جس چیز کو علما نے فارسی میں ذکر کیا ہے، اس کا بولنا جائز ہے سوائے یَدْ کے فارسی میں، نیز یہ کہنا جائز ہے: بروئے خدا عزوجل[1] بلا تشبیہ و بلا کیفیت۔[2] اللہ کا قرب اور بعد براہ طولِ مسافت اور قصرِ مسافت کے ہے نہ وہ کرامت و اہانت کے معنی پر ہے۔ مطیع بلا کیف اللہ سے قریب ہے اور نافرمان بلا کیف اس سے بعید ہے۔ قرب، بعد اور اقبال کا وقوع مناجات کرنے والے پر ہے۔ اسی طرح جنت میں اللہ کی ہمسائیگی اور اس کے سامنے کھڑا ہونا بلا کیف ہے۔

⑲ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ پر نازل ہوا ہے۔ وہ مصاحف میں لکھا ہوا ہے۔ قرآن مجید کی تمام آیات معنی کلام کے اعتبار سے فضیلت و عظمت میں برابر ہیں، مگر بعض آیات کے لیے ذکر اور مذکور کے اعتبار سے فضیلت ہے جیسے آیۃ الکرسی۔ اسی آیت میں اللہ کے جلال، عظمت اور صفات کا ذکر ہے، چنانچہ اس میں دو فضیلتیں جمع ہو گئیں: ایک ذکر کی فضیلت اور دوسری مذکور کی۔ بعض آیات کے لیے فقط ذکر کی فضیلت ہے جیسے قصہ کفار، ان میں مذکور کے لیے کوئی فضیلت نہیں ہے، کیونکہ وہ لوگ کافر ہیں۔ اسی طرح سارے اسما و صفات عظمت و فضیلت میں یکساں ہیں، ان کے درمیان کوئی تفاوت و فرق نہیں ہے۔

⑳ رسول اللہ ﷺ کے والدین حالت کفر پر فوت ہوئے اور آپ ﷺ کے چچا ابو طالب بھی کافر ہی فوت ہوئے۔ قاسم، طاہر اور ابراہیم آپ ﷺ کے بیٹے اور فاطمہ، رقیہ، زینب اور ام کلثوم آپ ﷺ کی بیٹیاں تھیں۔

ایک مشکل اور اس کا حل:

علم توحید کی باریکیوں میں سے جب کوئی چیز انسان پر مشکل ہو تو اسے یہ چاہیے کہ فی الحال وہ اس بات کا، جو اللہ کے نزدیک صواب اور درست ہے، اعتقاد کر لے یہاں تک کہ اس کی کسی عالم سے ملاقات ہو اور اس سے وہ دریافت کر لے۔ لیکن اس کی طلب میں تاخیر کرنا جائز ہے نہ وہ توقف کرنے میں معذور ہے، بلکہ توقف کرنے سے وہ کافر ہو جاتا ہے۔

① یہ استثنا بلا دلیل ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

② یعنی فارسی میں لفظ "ید" کے استعمال کے وقت اسے کسی فارسی ہم معنی کلمے سے بدل کر استعمال کرنا درست نہیں ہے، البتہ اللہ تعالیٰ کی صفت "وجہ" [چہرہ] کو فارسی لفظ میں ترجمہ کر کے "وجہ اللہ" کے بجائے "روئے خدا" کہہ سکتے ہیں۔

㉑ معراج کی خبر حق ہے اور اسے رد کرنے والا بدعتی ہے۔ دجال اور یاجوج وماجوج کا نکلنا، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، عیسی علیہ السلام کا آسمان سے نزول فرمانا اور قیامت کے دن کی تمام علامات اور نشانیاں، جس طرح اخبار صحیحہ میں بیان ہوئی ہیں، حق ہیں اور ضرور ہوں گی۔ واللہ تعالیٰ یهدي من یشاء إلیٰ صراط مستقیم۔ فقہ اکبر کا ترجمہ مکمل ہوا۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی اپنے اصحاب کے نام ایک وصیت:

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فقہ اکبر کی مذکورہ عبارت کے بعد اپنے اصحاب کے نام وصیت میں اپنی بیماری کے وقت یہ لکھا تھا کہ اہلِ سنت و جماعت کے مذہب میں بارہ خصلتیں ایسی ہیں جو شخص ان خصال پر مستقیم رہے گا وہ بدعتی اور خواہش کا بندہ نہ ہوگا۔ لہٰذا تم اس پر جمے رہو، کیونکہ اس کی وجہ سے قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھاری سفارش کریں گے۔ وہ بارہ خصلتیں درج ذیل ہیں:

① ایمان کا مطلب ہے زبان سے اقرار کرنا اور دل سے تصدیق کرنا۔[1] خالی اقرار کا نام ایمان نہیں ہے، کیوں کہ اگر یہ ایمان ہوتا تو سارے منافق مومن ہوتے۔ اسی طرح خالی معرفت ایمان نہیں ہے کیوں کہ اگر یہ ایمان ہوتی تو سارے اہلِ کتاب مومن ہوتے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے حق میں کہا ہے:

﴿ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ [المنافقون: ۱]

[اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ بلاشبہہ یہ منافق یقیناً جھوٹے ہیں]

اور اہلِ کتاب کے حق میں کہا ہے:

﴿ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ﴾ [البقرة: ۱٤٦]

[اسے پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں]

ایمان بڑھتا ہے نہ کم ہوتا ہے[2] کیونکہ ایمان میں تبھی کمی آئے گی جب کفر زیادہ ہوگا اور ایمان میں زیادتی بھی اس وقت متصور ہوگی جب کفر میں کمی آئے گی پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک شخص ایک ہی حالت میں مومن اور کافر ہو۔ مومن کے ایمان میں کوئی شک نہیں ہے، جس طرح کافر کے کفر

---

① ائمہ سلف کے اجماع سے یہ بات ثابت ہے کہ ایمان میں اقرار و تصدیق کے ساتھ عمل بھی شامل ہے۔ دیکھیں: شرح أصول اعتقاد أهل السنة للالکائي (۱/۱۷٦)

② تقدم الکلام علی ذلك. [اس پر کلام گزر چکا ہے] [مولف رحمہ اللہ]

میں کوئی شک نہیں ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿أُولَئِكَ هُمُ الْكَٰفِرُونَ حَقًّا﴾ [النساء: ١٥١] [یہی لوگ حقیقی کافر ہیں]

﴿أُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ [الأنفال: ٤] [یہی لوگ سچے مومن ہیں]

رسول اللہ ﷺ کی امت کے نافرمان سب کے سب سچے مومن ہیں، کافر نہیں ہیں۔

② عمل غیر ایمان اور ایمان غیر عمل ہے۔[1] اس کی دلیل یہ ہے کہ اکثر اوقات مومن سے عمل مرتفع ہو جاتا ہے اور یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ اس سے ایمان مرتفع ہو گیا، کیوں کہ حائضہ سے نماز مرتفع ہو جاتی ہے اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس سے ایمان اٹھ گیا یا ترکِ ایمان کے سبب اس کے لیے نماز کی تاخیر کی گئی، حالانکہ شرع نے اس سے یہ کہا ہے: «دَعِي الصَّوْمَ ثُمَّ اقْضِيهِ» [روزہ چھوڑ دو پھر اس کی قضا کرو] اور یہ کہنا جائز نہیں ہے: "دعي الإيمان، ثم اقضيه" [ایمان چھوڑ دو، پھر اس کی قضا کرو] یہ کہہ سکتے ہیں کہ فقیر پر زکات واجب نہیں ہے، لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ فقیر پر ایمان لانا واجب نہیں ہے۔ اگر کوئی یوں کہے کہ اچھی اور بری تقدیر غیر اللہ کی طرف سے ہے تو وہ کافر ہو جائے گا اور اس کی توحید باطل ہو جائے گی۔

③ ہمیں اس بات کا اقرار ہے کہ اعمال تین طرح کے ہیں: ایک فریضہ، دوسرے فضیلت اور تیسرے معصیت، جہاں تک فریضے کا تعلق ہے تو وہ اللہ کے امر، مشیت، محبت، رضا و قضا، تقدیر، ارادے، حکم، علم اور لوح محفوظ کی کتابت سے ہوتا ہے۔ فضیلت اگرچہ امرِ الٰہی سے نہیں ہے لیکن اس کی مشیت ومحبت، رضا وقضا، تقدیر و توفیق، تخلیق، ارادہ وحکم اور علم وکتابت لوح محفوظ سے ہے۔ معصیت اللہ کے حکم سے نہیں ہے، یہ اس کی مشیت سے تو ہوتی ہے لیکن محبت سے نہیں، اس کی قضا سے ہوتی ہے لیکن رضا سے نہیں، اس کی تقدیر وتخلیق سے ہوتی ہے لیکن اس کی توفیق گناہ میں شامل نہیں ہوتی، اسی طرح معصیت میں اللہ تعالیٰ کی عدم توفیق شامل ہوتی ہے۔ اس پر پکڑ ہوتی ہے، کیوں کہ وہ اللہ کے علم میں ہے اور لوح محفوظ کے اندر لکھی ہوئی ہے۔

④ ہم اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے بغیر اس کے کہ اللہ کو اس کی

[1] لیکن کتاب وسنت کے ظاہر سے عمل کا ایمان میں داخل ہونا پایا جاتا ہے، اگرچہ اس بارے میں علماے دین کے اقوال مختلف ہیں۔ [مولف رحمہ اللہ]

کوئی حاجت ہو اور وہ اس پر مستقر ہو، بلکہ خود اللہ تعالیٰ حافظ عرش اور غیر عرش ہے۔ اگر وہ محتاج ہوتا تو اسے مخلوق کی مانند عالم کی ایجاد وتدبیر کی قدرت نہ ہوتی اور اگر وہ جلوس وقرار کا محتاج ہوتا تو عرش کی خلق سے پہلے وہ کہاں تھا؟ وہ تو اس سے نہایت درجہ منزہ اور عالی ہے۔

⑤ ہم اقرار کرتے ہیں کہ اللہ کا کلام اور اس کی وحی اور تنزیل اور اس کی صفت عین ہے نہ غیر، بلکہ علی التحقیق ایک صفت ہے۔ وہ مصاحف میں ہے، لکھا ہوا اور زبانوں سے پڑھا جاتا ہے، دلوں میں محفوظ ہے اس میں کوئی کمی بیشی متصور نہیں ہے۔ حروف، سیاہی، کاغذ اور کتابت سب مخلوق ہیں،[1] کیونکہ یہ بندوں کے افعال ہیں اور اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے، کیوں کہ یہ کتابت، حروف، کلمات اور آیات یہ سب بندوں کی حاجت کے سبب آلاتِ قرآن ہیں۔ اللہ کا کلام اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور اس کے معنی ان سب چیزوں سے مفہوم ہیں۔ جو کوئی یہ کہے کہ اللہ کا کلام مخلوق ہے، وہ اللہ عظیم کے ساتھ کفر کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے معبود ہے، جیسے کہ وہ پہلے تھا۔ اس کا کلام اس کی ذات سے زوال کیے بغیر مقروء، مکتوب اور محفوظ ہے۔

⑥ ہم اقرار کرتے ہیں کہ اس امت میں رسول اللہ ﷺ کے بعد افضل ترین شخص ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر عمر، پھر عثمان اور پھر علی رضی اللہ عنہم ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴾

[الواقعة: ۱۰، ۱۱، ۱۲]

[اور جو پہل کرنے والے ہیں، وہی آگے بڑھنے والے ہیں۔ یہی لوگ قریب کیے ہوئے ہیں۔ نعمت کے باغوں میں]

بہر حال ہر سابق افضل ہے۔ ہر متقی مومن ان سے محبت کرتا ہے۔ اور ہر بدبخت منافق ان سے دشمنی اور بغض رکھتا ہے۔

⑦ ہمیں اس بات کا اقرار ہے کہ بندے اپنے اعمال، اقرار اور معرفت کے ساتھ مخلوق ہیں۔ لہٰذا جب وہ اپنے افعال کے ساتھ مخلوق ٹھہرے تو وہ خود بھی بالاولیٰ مخلوق ہیں، جب اللہ تعالیٰ نے انھیں پیدا کیا تو ان کے پاس کوئی طاقت نہ تھی، کیوں کہ وہ کمزور اور عاجز ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا خالق اور رازق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

[1] حرف میں بحث کی گنجایش ہے، باقی درست ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ﴾ [الروم: ٤٠]
[اللہ وہ ہے جس نے تمھیں پیدا کیا، پھر تمھیں رزق دیا، پھر تمھیں موت دے گا، پھر تمھیں زندہ کرے گا]

⑧ کمانا حلال ہے، حلال کا جمع کرنا حلال ہے اور حرام مال کا جمع کرنا حرام ہے۔

⑨ مخلوق کی تین قسمیں ہیں۔ ایک مومن جو اپنے ایمان میں مخلص ہیں۔ دوسرے کافر جو اپنے کفر میں منکر ہیں۔ تیسرے منافق جو اپنے نفاق میں مداہن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مومن پر عمل، کافر پر ایمان اور منافق پر اخلاص کو فرض کیا ہے۔ جیسے اس کا فرمان ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾ [البقرة: ٢١] [اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو] اس کے یہ معنی ہوئے کہ اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اے کافرو! ایمان لاؤ اور اے منافقو! اخلاص اپناؤ۔

⑩ ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ استطاعت فعل کے ہمراہ ہوتی ہے،① وہ فعل سے قبل ہوتی ہے اور نہ فعل کے بعد، کیوں کہ اگر وہ فعل سے قبل ہوتی تو بندہ فعل کے وقت اللہ تعالیٰ سے مستغنی ہوتا اور یہ خلافِ نص ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ﴾ [محمد: ٣٨] [اور اللہ ہی بے پروا ہے اور تم ہی محتاج ہو] اور اگر فعل کے بعد یہ استطاعت ہوتی تو بلا استطاعت فعل کا حصول محال ہوتا۔

⑪ ہمیں اس بات کا بھی اقرار ہے کہ مقیم کے لیے ایک رات دن اور مسافر کے لیے تین رات دن موزوں پر مسح کرنا واجب ہے، کیوں کہ حدیث اسی طرح آئی ہے۔ مسح کے منکر پر کفر کا ڈر ہے، کیونکہ یہ مسح خبر متواتر سے ثابت ہے۔ سفر میں قصر اور افطار نص کتاب کے مطابق رخصت ہے۔② فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ﴾ [النساء: ١٠١]

[اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز کچھ کم کر لو]

---

① کتاب وسنت اس بارے میں بالکل خاموش ہیں۔ [مولف رحمہ اللہ]
② رخصت وعزیمت کی بابت اس میں بحث کی گنجائش ہے۔ اس کی تفصیل جاننے کے لیے قاضی شوکانی رحمہ اللہ کی کتاب "نیل الاوطار" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ [مولف رحمہ اللہ]

افطار کے متعلق فرمایا:

﴿ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ [البقرة: ١٨٤]

[پھر تم میں سے جو بیمار ہو، یا کسی سفر پر ہو تو دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرنا ہے]

⑫ ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ نے قلم کو حکم دیا کہ لکھ! قلم نے عرض کی: اے میرے رب! میں کیا لکھوں؟ فرمایا: قیامت کے دن تک جو کچھ ہونے والا ہے وہ لکھ!، چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ ﴾ [القمر: ٥٢]

[اور ہر چیز جسے انھوں نے کیا وہ دفتروں میں درج ہے]

⑬ ہمیں اس بات کا اقرار ہے کہ عذابِ قبر ضرور ہونے والا ہے اور منکر ونکیر کا سوال حق ہے، کیوں کہ یہ احادیث میں آ چکا ہے۔ جنت اور جہنم حق ہیں۔ وہ دونوں مخلوق اور موجود ہیں اور انھیں فنا نہیں ہے، اس لیے فرمانِ خداوندی ہے: ﴿اعدت للمتقين﴾، ﴿اعدت للكافرين﴾ پہلی آیت جنت کے حق میں ہے اور دوسری آیت جہنم کے بارے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہشت اور دوزخ کو ثواب اور عذاب کے لیے پیدا کیا ہے۔ میزان حق ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَى بِنَا حَاسِبِينَ ﴾ [الأنبياء: ٤٧]

[اور ہم قیامت کے دن ایسے ترازو رکھیں گے جو عین انصاف ہوں گے، پھر کسی شخص پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا اور اگر رائی کے ایک دانے کے برابر عمل ہوگا تو ہم اسے لے آئیں گے اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں]

قیامت کے دن بندے کا اپنا اعمال نامہ پڑھنا حق ہے، کیونکہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٤]

[اپنی کتاب پڑھ، آج تو خود اپنے آپ پر بطور محاسب کافی ہے]

⑭ ہم یہ اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو موت کے بعد زندہ کر کے اُٹھائے گا۔ جزا و ثواب اور ادائے حقوق کے لیے وہ دن پچاس ہزار برس کا ہوگا۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ﴾ [الحج: ۷]

[اور (اس لیے) کہ یقیناً اللہ ان لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں]

اہلِ جنت کے لیے اللہ تعالیٰ کا دیدار کسی کیفیت، شبہے اور جہت کے بغیر ہونا حق ہے۔[1] رسول اللہ ﷺ کا ہر اس شخص کے حق میں شفاعت کرنا حق ہے جو اہلِ جنت ہوگا، اگرچہ وہ کبائر کا مرتکب ہو۔

عائشہ رضی اللہ عنہا، خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد سارے جہاں کی عورتوں سے افضل، مومنوں کی ماں اور زنا سے پاک ہیں۔ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، کیونکہ مومنوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿أُولَٰئِكَ أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۸۲]

[وہی جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں]

اور کفار کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿أُولَٰئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ﴾ [المجادلۃ: ۱۷]

[یہ لوگ آگ میں رہنے والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں]

ان عقائد کے بعض الفاظ پر بحث کرنا قدرے باقی ہے، جو آگے آئے گی۔ نیز اس بارے میں بھی بحث ہونا باقی ہے کہ فقہ اکبر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی تالیف ہے بھی کہ نہیں۔ واللہ أعلم

[1] سلف نے جہت، مقابلہ اور مسافت وغیرہ کی نفی سے سکوت فرمایا ہے، اس میں بحث کرنا فضول ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

چوتھی فصل

مقریزی کی کتاب ”المواعظ والاعتبار في ذکر الخطط والآثار“ کے مطابق ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ کے عقیدے کا بیان

اللہ تعالیٰ علم کے ساتھ عالم، قدرت کے ساتھ قادر، حیات کے ساتھ حی، ارادے کے ساتھ مرید، کلام کے ساتھ متکلم، سمع کے ساتھ سمیع اور بصر کے ساتھ بصیر ہے۔ اس کی صفات ازلی ہیں جو قائم بالذات ہیں، ان کے متعلق نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ عین ہیں، نہ یہ کہ وہ غیر ہیں، اور نہ یہ کہ وہ عین نہیں ہیں اور غیر بھی نہیں ہیں۔[1]

اس کا علم ایک ہے جو ساری معلومات کے ساتھ متعلق ہے۔ اس کی قدرت ایک ہے جو تمام ان چیزوں کے ساتھ متعلق ہے جن کا وجود صحیح ہے۔ اس کا ارادہ ایک ہے جو ان تمام اشیا سے متعلق ہے جو قابلِ اختصاص ہیں۔ اس کا کلام ایک ہے جو اس کا امر ہے، نہی ہے، خبر ہے، استخبار ہے، وعد ہے اور وعید ہے۔ یہ سب وجوہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے مختلف اعتبارات ہیں نہ کہ نفس کلام ایسا ہے۔ وہ الفاظ جو ملائکہ کی زبانی انبیاء علیہم السلام کی طرف نازل ہوئے وہ ازلی کلام پر دلالت کرنے والے ہیں۔[2] لہٰذا مدلول یعنی قرآن مقروء قدیم ازلی ہے اور دلالت یعنی عبارات اور قراءت تو وہ مخلوق و محدث ہے۔[3] قراءت و مقروء میں اور تلاوت و متلو میں فرق ہے جس طرح کہ ذکر اور مذکور کے درمیان فرق ہے۔ کلام ایک معنی قائم بالنفس ہے[4]

---

[1] سلف نے اس میں بحث نہیں کی اور کتاب و سنت اس سے خاموش ہیں، لہٰذا ایسی بحث کو چھوڑنا ہی اولیٰ ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

[2] اشاعرہ کا یہ عقیدہ درست نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے کلام کرتا ہے۔

[3] سلف نے اس بارے میں کلام نہیں کیا، یہ تو صرف اہلِ کلام کی بحث ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

[4] یعنی اللہ تعالیٰ کا کلام حرف و صوت کے بغیر محض کلامِ نفسی ہے، لیکن یہ بات ظاہرِ حدیث کے خلاف ہے۔ کتاب و سنت سے اس کلام نفسی کا کوئی ثبوت نہیں، البتہ شعرا کے کلام میں اس کا ذکر ملتا ہے اور شعرا سے متعلق فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ﴾ [الشعراء: ٢٢٤] [مولف رحمہ اللہ]

اور عبارت اس پر دلیل ہے جو نفس کے اندر ہے، عبارت کو مجازاً کلام کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کے اندر ہونے والے خیر وشر اور نفع وضرر کا ارادہ کیا ہے۔

امام اشعری کا رجحان جوازِ تکلیف مالا یطاق کی طرف ہے، کیونکہ اشعری نے یوں کہا ہے کہ استطاعت فعل کے ہمراہ ہوتی ہے[1] اور انسان فعل سے قبل مکلّف ہے، حالانکہ وہ فعل سے پہلے ان کے مذہب کے مطابق مستطیع نہیں ہے۔

بندوں کے سارے افعال مخلوق ہیں، اللہ تعالیٰ ان کا موجد ہے، بندے کاسب ہیں۔[2] کسبِ فعل بندے کی قدرت سے وابستہ قوتِ کار سے عبارت ہے اور خالق حقیقتاً اللہ ہی ہے۔ مخلوق میں کوئی غیر اس کا شریک نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا سب سے خصوصی وصف قدرت اور اختراع ہے۔ یہی اس کے نام "باری" کی تفسیر ہے۔ ہر موجود چیز کا دکھائی دینا صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ موجود ہے لہٰذا اس کی رویت صحیح ہے۔ دلیل سمعی سے ثابت ہے کہ مومن اسے آخرت میں دیکھیں گے۔ یہ دلیل کتاب وسنت میں موجود ہے، ہاں یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی مکان یا صورت یا مقابلہ واتصال شعاع سے دکھائی دے، کیونکہ یہ سب محال ہے۔[3] رویت کی ماہیت میں دو رائیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایک مخصوص علم ہے جس کا تعلق وجود سے ہے نہ کہ عدم سے۔ دوسری یہ کہ یہ ماورائے علم کے ایک ادراک ہے۔ سمع وبصر دو ازلی صفتیں ہیں اور ماورائے علم کے دو ادراک ہیں۔ یدین اور وجہ صفات خبریہ ہیں۔ ان کی دلیل سمع وارد ہے اور ان کا اعتراف کرنا واجب ہے۔ معتزلہ نے وعد و وعید اور سمع وعقل میں ہر وجہ سے اختلاف کیا ہے۔

دل کی تصدیق اور زبان کے قول کو ایمان کہتے ہیں۔ ارکان اور اعضا سے عمل کرنا ایمان کی فرع ہے۔[4] جس نے دل سے تصدیق کی، یعنی وحدانیتِ الٰہی کا اقرار کیا اور سچے دل سے رسولوں کا

---

[1] اس سے متعلق کلام گزر چکا ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

[2] اس لفظ کی صحتِ اطلاق میں بحث کی گنجایش ہے، اگرچہ اہلِ سنت کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

[3] اس میں خوض کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے، صرف اللہ تعالیٰ کی مراد کے مطابق وقوعِ رویت پر ایمان لانا ہی ہمارے لیے کافی ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

[4] یعنی عمل ایمان میں داخل نہیں ہے۔ اس پر کلام گزر چکا ہے۔ اہلِ حدیث کے نزدیک ایمان اقرار لسان، تصدیق بالجنان اور عمل بالارکان سے عبارت ہے اور کتاب وسنت کا ظاہر بھی اسی پر ناطق ہے۔ واللہ اعلم. [مولف رحمہ اللہ]

اعتراف کیا کہ جو کچھ وہ لائے ہیں حق ہے تو وہ مومن ہے۔

کبیرہ گناہ کا مرتکب جب توبہ کے بغیر دنیا سے چلا جاتا ہے تو اس کا حکم اللہ کی طرف ہے، چاہے تو اسے اپنی رحمت سے بخش دے یا رسول اللہ ﷺ اس کی شفاعت کریں اور چاہے تو اسے اپنے عدل سے عذاب دے اور پھر اپنی رحمت سے جنت میں لے جائے۔

مومن آگ میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اللہ تعالیٰ پر توبہ کا قبول کرنا عقل کی رو سے واجب ہے، کیوں کہ موجب تو خود اللہ ہی ہے، اس پر اصلاً کوئی چیز واجب نہیں ہے۔ ہاں اس کے بارے میں سمعی دلیل وارد ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور پریشان حال لوگوں کی دعا کو قبول کرتا ہے۔ وہ اپنی مخلوق کا مالک ہے، جو چاہے سو کرے، جو چاہے وہ حکم دے۔ اگر وہ ساری مخلوق کو آگ میں داخل کر دے تو یہ کوئی ظلم نہیں ہوگا اور اگر سب کو جنت میں لے جائے تو یہ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ اس کی طرف سے ہرگز ظلم کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کی طرف ظلم اور جور کی نسبت ہو سکتی ہے، کیونکہ وہ مالک مطلق ہے۔ سارے شرعی واجبات سمعی ہیں، عقل سے کوئی چیز واجب نہیں ہو سکتی ہے۔ عقل تحسین و تقبیح کا تقاضا نہیں کرتی ہے۔ اللہ کی شناخت، منعم کا شکر، اطاعت گزار کو ثواب اور نافرمان کو عذاب دینا یہ سب کچھ سمعی ہے، عقلی نہیں۔

اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے نہ صلاح نہ اصلح نہ لطف، بلکہ ثواب و صلاح اور لطف سب اس کا فضل ہے:

بندہ چہ دعویٰ کند حکم خداوند راست

[بندہ کیا دعویٰ کر سکتا ہے؟ حکم خداوندی بجا ہے]

اللہ تعالیٰ کو کسی سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور نہ نقصان، کیوں کہ کسی شاکر کے شکر کا اسے فائدہ ہے نہ کسی کافر کے کفر کا اسے کوئی نقصان ہے، بلکہ وہ تو اس سے کہیں زیادہ بلند و بالا اور مقدس و پاک ہے۔ رسولوں کا بھیجنا جائز ہے، یہ اس پر واجب ہے نہ محال، جب اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجا، معجزہ خارقہ سے اس کی تائید کی، تحدی فرمائی اور لوگوں کو اس کی طرف بلایا، اب اس کی بات سننا، اس کا حکم ماننا اور اس کی نہی سے باز رہنا واجب ہو گیا۔ اولیا کی کرامات حق ہیں۔ سارے قرآن و سنت پر ایمان لانا اور امور غیبیہ کی خبروں پر ایمان لانا، جیسے لوح، قلم، عرش، کرسی، جنت اور جہنم حق اور سچ ہے، اسی

طرح وہ خبریں جو آخرت میں واقع ہوں گی جیسے سوالِ قبر، ثواب، عقاب، حشر، معاد، میزان، صراط اور جماعتوں کا اس صورت میں تقسیم ہونا کہ ایک جماعت جنت میں اور ایک جہنم میں یہ حق ہے۔ ان پر ایمان لانا اور اقرار کرنا واجب ہے۔

امامت اتفاق واختیار کرنے سے ثابت ہوتی ہے اس کا نص اور کسی معین شخص کی تعیین سے ثابت ہونا ضروری نہیں۔ ائمہ کی فضیلت کی ترتیب امامت کی ترتیب کے مطابق ہے۔ عائشہ، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم کے حق میں ہمارا قول یہ ہے کہ انھوں نے اپنی خطا اور غلطی سے رجوع کیا۔ ہم طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما کو عشرہ مبشرہ میں سے شمار کرتے ہیں۔ ہمارا قول ہے کہ معاویہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے امام حق علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کی۔ علی رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف ویسے ہی قتال کیا جیسے باغیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اہلِ نہروان، دین سے خارج ہیں۔ علی رضی اللہ عنہ سب احوال میں حق پر تھے اور حق ان کے ساتھ تھا۔

مقریزی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اشعری کے اصول دین اور عقائد کا خلاصہ ہے جو اس وقت تمام علاقوں کے لوگوں کا نظریہ واعتقاد ہے اور جس نے کھلم کھلا اس عقیدے کی مخالفت کی اس کا خون بہایا گیا۔[1]

اشاعرہ کو "صفاتیہ" بھی کہتے ہیں، کیوں کہ یہ صفاتِ الٰہیہ قدیمہ کو ثابت کرنے والے ہیں۔ پھر ان الفاظ میں جو کتاب وسنت میں وارد ہوئے ہیں جیسے استوا، نزول، اصبع، ید، قدم، صورت، جنب، مجی، وہ باہم اختلاف کا شکار ہو کر دو فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک فرقہ ان سب الفاظ کی ممکنہ تاویلات کرتا ہے اور دوسرا فرقہ تاویل کے درپے ہوتا ہے نہ تشبیہ کی طرف جاتا ہے، انھیں اشعریہ اثریہ کہتے ہیں۔ اب اس کے متعلق مسلمانوں کے پانچ اقوال ہیں۔ ایک اس چیز کا اعتقاد کرنا جو اس کے مانند لغت سے سمجھا جاتا ہے، دوسرے مطلق سکوت کرنا۔ تیسرے ارادہ ظاہر کی نفی کے بعد سکوت کرنا۔ چوتھے مجاز پر محمول کرنا۔ پانچویں اسے اشتراک پر محمول کرنا۔ ان میں سے ہر فریق کے دلائل اور حجتیں ہیں اور اصول دین کی کتابیں انھیں دلائل پر مشتمل ہیں۔

﴿ وَ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ﴾ [هود: ١١٨، ١١٩]

---

[1] المواعظ والاعتبار للمقريزي (٣/١٠٦)

[اور وہ ہمیشہ مختلف رہیں گے۔ مگر جس پر تیرا رب رحم کرے اور اس نے انھیں اسی لیے پیدا کیا]

﴿فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾ [البقرة: ١١٣]

[اب اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن اس کے بارے میں فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے]

میں کہتا ہوں: اشاعرہ، ماتریدیہ اور حنابلہ سب سے خوب تر ہیں، لیکن حقِ خالص اور سچائی محض اس میں ہے کہ مومن اپنے اعتقاد کو کتابِ عزیز اور سنتِ مطہرہ کے ظاہر کے تابع رکھے اور جس کا قول سرِ موان سے مختلف ہو، اسے اپنا عقیدہ نہ ٹھہرائے۔

پانچویں فصل

امام احمد بن حسین بیہقی رحمہ اللہ کے عقائد کا بیان[1]

اس کتاب میں دلائل کا ذکر کرتے ہوئے ہر عقیدے کے لیے الگ مستقل تحریر لکھی گئی ہے۔ اس جگہ دلائل کو چھوڑ کر اعتقاد کے نفس مسائل پر اقتصار و اکتفا کیا جاتا ہے۔ تاہم اگر دلائل دریافت کرنے ہوں تو ہماری کتاب "حضرات التجلي من نفحات التجلي والتخلي" کی طرف رجوع کرنا چاہیے، والله المستعان!

① بندے پر سب سے پہلے اللہ کا پہچاننا اور اس کا اقرار کرنا واجب ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ﴾ [محمد: ١٩]

[پس جان لے کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں]

رسول اللہ ﷺ نے اسی کے عدمِ اقرار پر جہاد وقتال کیا تھا۔ موت کے وقت جس شخص کا یہ آخری کلام ہوتا ہے، اس کے لیے دخولِ جنت کا وعدہ ہے، بلکہ اگر کسی رکاوٹ کی وجہ سے یہ کلمہ منہ سے نہ بھی نکلے مگر وہ اس کلمے کو دل سے جانتا اور مانتا ہو تو بھی وہ جنتی ہوتا ہے، ولله الحمد.

② عالم حادث ہے قدیم نہیں ہے، سارے جہان کا ایجاد کنندہ اور مدبر ایک الٰہ ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ حدوثِ عالم اور صانعِ عالم کا منکر کافر ہوتا ہے۔

③ اللہ تعالیٰ کے اسماے علیا اور صفاتِ حسنیٰ ثابت ہیں۔ اس کی یہ صفات صفتِ ذات اور صفتِ فعل کی طرف تقسیم ہوتی ہیں۔ اسماے ذات کو اسماے فعل پر فضیلت حاصل ہے۔ صفتِ ذات وہ ہے جس کا وہ ازل میں مستحق تھا اور ابد تک اس کا استحقاق رکھتا ہے، جیسے کہ وہ موجود قدیم ہے، یہ سارا ملک اسی کا ہے، وہ قدوس، جلیل، عظیم، عزیز اور متکبر ہے۔ اس قسم میں اسم اور مسمیٰ ایک ہوتا ہے۔ دوسری قسم ان صفات کی ہے جو اس کی ذاتِ پاک کے ساتھ قائم ہیں، جیسے حی، عالم،

[1] یہ مبحث امام بیہقی رحمہ اللہ کی کتاب "الاعتقاد والهداية إلى سبيل الرشاد" پر مشتمل ہے۔

قادر، مرید، سمیع، بصیر اور متکلم۔ اس قسم میں اسم کو نہ عین مسمی کہتے ہیں اور نہ غیر مسمی۔

رہی اس کی وہ صفات جو کتاب وسنت سے بطور سمع ثابت ہیں، جیسے وجہ، یدین اور عین وغیرہ، تو یہ بھی اس کی ذات سے قائم ہیں، اس میں بھی اسم کو مسمی یا غیر مسمی نہیں کہہ سکتے ہیں۔ اس جگہ تکییف، تمثیل، تشبیہ، تعطیل اور اہمال جائز نہیں ہے، بلکہ جس طرح یہ صفات وارد ہوئی ہیں، اسی طرح ان کا ظاہر پر بلا تاویل اجرا و اقرار کرنا چاہیے۔ انسان یہ اعتقاد کرے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی مشابہت سے منزہ اور پاک ہے۔ فرمانِ الٰہی سے تشبیہ کا بہ خوبی علاج ہو سکتا ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [الشوریٰ: ۱۱] [اس کی مثل کوئی چیز نہیں] اور ﴿وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾ [الإخلاص: ٤] [اور نہ کبھی کوئی ایک اس کے برابر کا ہے] امت کے سلف اور ملت کے ائمہ کرام اسی عقیدے پر گزرے ہیں۔ خلف نے لزوم تشبیہ سے راہ فرار اختیار کرنے کے لیے تاویل کا راستہ اپنایا ہے جو ٹھیک نہیں ہے، کیوں کہ اللہ نے ہم پر ان کی تاویل کرنا واجب نہیں کیا ہے۔

باقی رہی صفاتِ فعل تو وہ اس کے افعال سے مشتق ہیں، جیسے خالق، رازق، محی، ممیت، منعم اور مفضل۔ اس جگہ اگر یہ اللہ کی طرف سے تسمیہ ہے تو یہ صفت اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے، یہاں مسمی اور غیر مسمی کی گنجائش نہیں ہے اور اگر یہ تسمیہ مخلوق کی طرف سے ہے تو یہ صفتِ فعل ہے، متقدمین کا کلام اسی پر دلیل ہے۔

④ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے نام خود قرآن مجید میں ذکر فرمائے ہیں اور احادیث میں بھی ان کا بیان آیا ہے، جیسے علی، عظیم، کبیر، غنی، حمید، اوّل، آخر، ظاہر، باطن احد، صمد، حق، مبین، مجید، واحد، قہار، نصیر، ملک، قدوس، سلام، مومن، مہیمن، عزیز، جبار، متکبر اور ذوالجلال والاکرام وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کے لیے ان صفاتِ کمال کا ثابت کرنا واجب ہے۔ نیز انسان کو چاہیے کہ وہ ہر نقصان اور عیب کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے دور کرے۔

⑤ آیات و احادیث میں ایسی صفات بھی بیان ہوئی ہیں جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں، جیسے هو الحي القيوم، اس سے حیات کا ثبوت ملتا ہے۔ نیز جیسے قدرت، علم، قوت، ارادہ، مشیت، سمع، بصر، کلام اور بقا۔

⑥ قرآن وحدیث میں صفتِ وجہ، یدین اور عین وغیرہ کو ثابت کیا گیا ہے، یہ صفات چونسٹھ کے

قریب ہیں، جو رسالہ "القائد إلی العقائد" اور اس کے ترجمے "سائق العباد إلی صحة الاعتقاد" میں لکھی گئی ہیں۔ کسی آیت یا حدیث سے ہر صفت کی دلیل کتاب "الجوائز والصلات من جمع الأسامي والصفات" میں مذکور ہے۔ یہ سب اس کی ذات بابرکات کی صفات ہیں جو کتابِ عزیز اور سنتِ مطہرہ سے ثابت ہیں، چنانچہ ان سب پر بلا تکییف و تاویل ایمان لانا فرض ہے۔ ان صفات کا منکر کافر اور ان کی تاویل کرنے والا خطا کار ہے۔

⑦ خلق ایک صفت فعل ہے۔

⑧ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، یہ مخلوق نہیں ہے۔ جو معتزلہ کی مانند اسے مخلوق کہے وہ کافر ہے۔

⑨ رحمن کا عرش پر استوا قرآن و حدیث دونوں سے بہ خوبی ثابت ہے۔ صفتِ استوا کے اثبات پر آیات و احادیث محکمات ہیں، متشابہات نہیں ہیں۔

⑩ آخرت میں سر کی آنکھ کے ساتھ اللہ عزوجل کی رویت ثابت ہے۔ قرآن و حدیث دونوں اس پر دلیل اور شاہد ہیں۔ رویت کا منکر کافر ہے۔ رویت کی حدیث صحیحین اور سنن میں وارد ہوئی ہے۔

⑪ تقدیر پر ایمان لانا واجب ہے، یعنی اب تک عالم میں جو کچھ ہوا اور ابد تک جو کچھ ہوگا، وہ خیر ہو یا شر وغیرہ، وہ سب کچھ اللہ کی تقدیر سے ہے۔ فرقہ قدریہ کے لوگ تقدیر کے منکر ہیں، اسی لیے سلف نے ان کو کافر قرار دیا ہے۔

⑫ بندوں کے تمام افعال وغیرہ کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، خواہ وہ فعل خیر ہو یا شر یا اور کچھ، جو کوئی اس کا منکر ہے، اس کا ایمان میں کچھ حصہ نہیں ہے۔

⑬ بندوں کا ہادی اور انھیں گمراہ کرنے والا بندوں کا خالق [اللہ] ہی ہے، وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔

⑭ بندوں کے تمام افعال اللہ تعالیٰ کی مشیت سے واقع ہوتے ہیں خواہ وہ اچھے ہوں یا برے۔ کوئی شخص اپنے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہے۔ کبار صحابہ، تابعین، فقہائے سلف اور صدر اوّل کے لوگ اسی عقیدے پر گزرے ہیں کہ اعمال کا وقوع اللہ تعالیٰ کے ارادے اور مشیت سے ہوتا ہے۔

⑮ بچے فطرت پر پیدا ہوتے ہیں، یعنی توحیدِ خالص پر، پھر ان کے ماں باپ انھیں یہودی یا نصرانی

یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ وہ آخرت میں جنتی ہیں یا جہنمی؟ تو یہ قطعی طور پر لازم نہیں ہے۔ بعض دلائل سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ مومنوں کی اولاد مومنوں کے ساتھ ہی ملا دی جائے گی۔ إن شاء اللہ تعالیٰ

⑯ جس کی موت جس وقت پر مقدر ہو چکی ہے اس سے تاخیر ہوتی ہے نہ تقدیم۔ ہر شخص اپنا رزق پورا کر لیتا ہے۔ حلال اور حرام دونوں رزق ہیں، اگرچہ ایک جائز اور دوسرا ناجائز ہوتا ہے۔ حلال کا حساب، حرام پر عذاب اور مشتبہ پر عتاب ہوگا۔

⑰ ایمان میں کمی اور بیشی ہوتی ہے۔ قرآن وحدیث دونوں سے یہ بات ثابت ہے۔ ایمان تصدیق قلب، اقرار باللسان اور عمل بالارکان کا نام ہے اور یہی قول راجح اور صحیح ہے۔ ایمان میں ''ان شاء اللہ'' کہنا تبرک کے لیے ہوتا ہے نہ کہ شک کے لیے۔

⑱ کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرنے سے مومن ایمان سے باہر ہوتا ہے نہ وہ آگ میں ہمیشہ رہنے والا ہے، چنانچہ سارے صحابہ، تابعین، ان کے اَتباع ائمہ مجتہدین اور تمام اہلِ سنت و جماعت اسی عقیدے پر گزرے ہیں۔ توبہ سے کبیرہ گناہ بخش دیا جاتا ہے، جب اس کی شرائط کمال طریقے سے ادا ہوتی ہیں۔ اگر اللہ چاہے تو توبہ کے بغیر خرق عادت کے طور پر بھی کسی کو بخش دے۔ ہمیشہ آگ میں رہنا شرک اور کفر کے ساتھ خاص ہے۔ رسول اللہ ﷺ اہلِ کبائر کی شفاعت کریں گے۔ باطن کے کبائر ساٹھ (۶۰) ہیں اور ظاہر کے چار سو ایک (۴۰۱)۔ اللهم احفظنا عنها بمنك وكرمك.

⑲ رسول اللہ ﷺ کی کبائر کے مرتکبین کے حق میں شفاعت قرآن وحدیث دونوں سے ثابت ہے، مقام محمود اسی مرتبہ سے عبارت ہے، جہاں تک اس قول کا تعلق ہے کہ مومن ہمیشہ آگ میں رہیں گے تو یہ باطل ہے۔ ہاں اگر ایمان کے ساتھ شرک کا ارتکاب کیا گیا تو اس شرک کی وجہ سے خلود ہوگا کسی کبیرہ گناہ کی وجہ سے نہیں، چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ ﴾ [يوسف: ١٠٦]

[اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، مگر اس حال میں کہ وہ شریک بنانے والے ہوتے ہیں]

⑳ ملائکہ، کتب، رسل، بعث بعد الموت، حساب، میزان، جنت، جہنم، حوض اور قیامت قائم ہونے سے پہلے قیامت کی نشانیوں پر ایمان لانا واجب ہے۔ جنت اور جہنم اس وقت بھی موجود اور مخلوق ہیں۔

㉑ عذابِ قبر اور عذابِ دوزخ حق ہیں اور ان پر ایمان لانا واجب ہے۔ جنتوں کی دائمی نعمتیں، آگ میں عذابِ الیم اور نعمت وزحمتِ برزخ قرآن وحدیث دونوں سے ثابت ہے۔ ان کا منکر ایمان میں کچھ حصہ نہیں رکھتا ہے۔

㉒ سنت کو لازم پکڑنا اور بدعت سے اجتناب کرنا فرض ہے۔ شرک کے ستر (۷۰) دروازے ہیں اور وہ گہری زمین میں سیاہ وتاریک رات میں کالے پتھر پر چلتی ہوئی چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی ہے۔ بدعت کے بہتر (۷۲) دروازے ہیں جبکہ سنت کا ایک ہی راستہ ہے، چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾ [الأنعام: ۱۵۳]

[اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کے راستے سے جدا کر دیں گے]

بدعت کی حسنہ اور سیئہ کی طرف تقسیم کرنا حدیث صحیح کے ظاہر کے خلاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اہلِ بدعت کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور ہم کلام ہونے سے منع فرمایا ہے اور فرقہ قدریہ اور مرجیہ کو انبیا علیہم السلام کی زبان پر ملعون ٹھہرایا ہے۔

㉓ والی پر رعایا کے امور کا خیال رکھنا واجب ہے۔ وہ بڑے کی تعظیم اور چھوٹے پر رحم کرے۔ عالم کی توقیر بجا لائے اور کمزور کو طاقتور سے انصاف دلائے۔

㉔ ملکِ اسلام کے والیان کی اطاعت کرنا، جماعت اہلِ سنت کو لازم پکڑنا، منکر امر پر ہاتھ یا زبان یا دل سے انکار کرنا اور سلطان کے جور وظلم پر صبر کرنا واجب ہے۔

㉕ وہ فرض عبادات جو کتاب وسنت سے ثابت ہیں، جیسے نمازِ پنج گانہ، رمضان کا روزہ، زکاتِ اموال اور حجِ بیت اللہ وغیرہ مشروع کیفیت، آداب اور ارکان واردہ کے مطابق انھیں بجا لانا فرض ہے، عمداً اور بلاعذر ان کا ترک کرنے والا کافر ہو جاتا ہے۔ یہ سب فرائض ادائے ترک میں استطاعت کے باوجود متساوی الاقدام ہیں اور ان کے درمیان فرق کرنا خلافِ سنت ہے۔

㉖ رسول اللہ ﷺ کی نبوت معجزات کے ظہور اور بہ طریق تواتر وغیرہ ثابت ہے۔ نبوت کے دلائل بہت زیادہ ہیں، اس کے بارے میں مستقل کتابیں تالیف ہو چکی ہیں۔ سب سے بڑا معجزہ

قرآنِ کریم ہے جو قیامت کے قائم ہونے تک باقی رہے گا۔ قرآن مجید کے لیے لوگوں کو چیلنج کیا گیا، مگر جن وانس اس کے مقابلے سے عاجز نکلے۔

ہماری کتاب "حضرات التجلي من نفحات التحلي و التخلي" میں اس مقام کو بسط وکشاد کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی نبوت، رسالت اور آپ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کا منکر اجماعِ امت کے ساتھ کافر ہے۔

(۲۷) اولیا کی کرامات قرآن وحدیث اور علما کے اقوال سے بہ خوبی ثابت ہیں، لیکن ان کرامات کے صدور کا اختیار اولیا کے پاس نہیں ہے، بلکہ اللہ کی مشیت اور اس کے ارادے پر موقوف ہے۔ پھر اکثر وہ لوگ جن سے کرامت کا ظہور نہیں ہوا یا ہوا تو بہت کم جیسے اکثر صحابہ، تابعین رضی اللہ عنہم اور تبع تابعین، یہ سب ان اولیا سے افضل ہیں جن سے کرامات کا صدور ہوا۔

(۲۸) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل کتاب وسنت سے صوری اور معنوی تواتر کے ساتھ بہ خوبی ثابت ہیں۔ ان کے مرتبے کی حفاظت کرنا ساری امت پر واجب ہے۔ مہاجرین ہوں یا انصار، سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے، جو شخص ان سے محبت رکھتا ہے وہ اللہ کا دوست اور محبّ ہے اور جو ان سے دشمنی اور بغض رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا دشمن ہے۔ جس کسی کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر غصہ آتا ہے اس میں کفر کی ایک علامت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ [الفتح: ۲۹] [تاکہ وہ ان کے ذریعے کافروں کو غصہ دلائے] اسی طرح احسان کے ساتھ ان کا اتباع کرنے والوں سے اور اتباعِ تابعین سے محبت رکھنا واجب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان قرون اور طبقوں کے لیے خیر وبھلائی کی شہادت دی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض رکھنا ۔عیاذاً باللّٰہ۔ آگ کو واجب کر دیتا ہے۔ لہٰذا اہلِ علم کی ایک جماعت نے روافض کے کفر پر اتفاق کیا ہے۔

(۲۹) رسول اللہ ﷺ کے اہلِ بیت خواہ ازواجِ مطہرات ہوں یا عترتِ امجاد، سب کے ساتھ محبت رکھنا اور ان کا حقِ تعظیم وخدمت بجا لانا واجب ہے، آیاتِ کتاب اور سنتِ مطہرہ سے اس پر واضح دلائل موجود ہیں۔ ان کے دشمن جہنم کے کتے ہوں گے، لہٰذا علما نے خوارج کو کافر قرار دیا ہے۔

(30) دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی شہادت وبشارت دی ہے جو درج ذیل ہیں: چاروں خلفا، طلحہ، زبیر، عبدالرحمان بن عوف، سعد بن مالک، سعید بن زید اور ابوعبیدہ بن جراح،[1] انھیں عشرہ مبشرہ کہتے ہیں، کیوں کہ ایک ہی حدیث کے سیاق میں انھیں "فلان وفلان فی الجنة" [فلاں اور فلاں جنتی ہے] کے الفاظ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، ورنہ اس کے سوا بھی ایک جماعت کو جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ جیسے اہلِ بدر اور اہلِ بیعت رضوان وغیرہ۔

(31) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا میرے بعد تیس سال تک خلافت رہے گی پھر ملوکیت اور بادشاہی ہوگی۔[2] چنانچہ ایسے ہی ہوا کہ علی مرتضی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر وہ تیس سال مکمل ہو گئے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ دو سال اور دس راتیں کم چار ماہ خلیفہ رہے۔ عمر رضی اللہ عنہ دس برس چھ ماہ چار دن خلیفہ رہے، عثمان رضی اللہ عنہ بارہ دن کم بارہ برس خلیفہ رہے۔ علی مرتضی رضی اللہ عنہ دو یا تین ماہ کم پانچ برس خلیفہ رہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات بروز پیر بائیس جمادی الآخرہ ۱۳ھ میں ہوئی۔ عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت بروز بدھ چھبیس ذوالحج ۲۳ھ میں ہوئی۔ عثمان رضی اللہ عنہ اٹھارہ ذوالحج ۳۵ھ میں شہید کیے گئے۔ علی مرتضی رضی اللہ عنہ کی شہادت سترہ رمضان ۴۰ھ بروز جمعہ ہوئی۔ خلفاے اربعہ کی فضیلت خلافت کی ترتیب کے مطابق ہے۔ امام شافعی، امام احمد رحمہ اللہ اور تمام اہلِ سنت کا یہی مذہب ہے۔ اشارۃ النص یا دلالۃ النص کے ساتھ خلافت کی صحت پر کتاب وسنت شاہد ہیں۔ مسلمانوں نے خلفا میں سے ہر ایک کی خلافت پر عقدِ بیعت کے وقت اجماع اور اتفاق کیا تھا، اس وقت مہاجرین وانصار سب موجود تھے، وللہ الحمد، یہی عقیدہ حق ہے، اس کے سوا بحث مباحثہ کرنا اور دوسری شاخیں نکالنا ایمان کی خرابی کا موجب ہے۔ امام حسن رضی اللہ عنہ چھ ماہ خلیفہ رہ کر دست بردار ہوگئے۔ خلافت سے ان کی علاحدگی پر بلاکم وکاست زمانہ خلافت کے تیس برس پورے ہو گئے۔

(32) اہلِ شام وغیرہ میں سے جس نے علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا، اس نے صحیح نہیں کیا، بلکہ وہ خطا کار ہے، لیکن باغی کا حکم کفر کا نہیں ہے۔ تلك أمة قد خلت لها ما كسبت وعليها ما اكتسبت، انتهى.

---

[1] سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٦٤٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٤٨) سنن ابن ماجه (١٣٣)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٢٦)

یہ "حضرات التجلي من نفحات التحلي والتخلي" کا خلاصہ ہے اور وہ [حضرات التجلي] کتاب "الاعتقاد والهداية إلى سبيل الرشاد" سے ملخص ہے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کتاب میں فرمایا ہے:

"هذا الذي أودعناه هذا الكتاب اعتقاد أهل السنة والجماعة وأقوالهم، وقد أفردنا كل باب منها بكتاب، يشتمل على شرحه، منورا بدلائله وحججه، واقتصرنا في هذا الكتاب على ذكر أصوله، والإشارة إلى أطراف أدلته إرادة انتفاع من نظر فيه، والله تعالىٰ يوفقنا لمتابعة السنة واجتناب البدعة" انتهى.

[ہم نے اس کتاب میں جو کچھ درج کیا ہے وہ اہلِ سنت و جماعت کا عقیدہ اور ان کے اقوال ہیں اور ہم نے اس کے ہر باب اور موضوع کو الگ ایک کتاب میں تحریر کیا ہے جو کتاب اس موضوع کی شرح پر مشتمل ہے اور اس کے دلائل اور حجتوں کے ساتھ منور ہے۔ اِس کتاب میں ہم نے صرف اس کے اصول اور اس کے دلائل کے اطراف کی طرف اشارہ کرنے ہی پر اکتفا کیا ہے، اس ارادے سے کہ جو اس کا بہ غور مطالعہ کرے اسے فائدہ حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سنت کا اتباع کرنے اور بدعت سے اجتناب کرنے کی توفیق عطا فرمائے]

اگر چہ اس کتاب الاعتقاد میں بھی نصوصِ کتاب اور براہینِ احادیث سے ہر قول کے دلائل لکھے ہیں، لیکن جس شرح کا حوالہ دیا گیا ہے وہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔[1] اللہ تعالیٰ موت سے قبل مجھے اس کتاب کا مطالعہ کرنا نصیب فرمائے، کیونکہ یہ وہ عقائدِ صحیحہ ہیں جن میں کسی مسئلے پر انتقاد نہیں کیا گیا ہے۔[2] ولله الحمد.

---

[1] امام بیہقی رحمہ اللہ کی یہ کتاب "الأسماء والصفات" کے نام سے تین جلدوں میں مطبوع ہے۔

[2] جب امام بیہقی رحمہ اللہ کی کتاب "الاعتقاد والهداية إلى سبيل الرشاد" طبع ہوئی تو علامہ ابن باز رحمہ اللہ نے اس میں بعض امورِ عقیدہ سلف کے مخالف دیکھے تو علامہ عبدالرزاق عفیفی رحمہ اللہ کو اس کتاب میں عقیدہ سلف کے منافی اشیا سے متعلق نقد و تبصرہ لکھنے کی درخواست کی، چنانچہ علامہ عفیفی رحمہ اللہ نے اس پر نقد و تبصرہ لکھا جو "فتاوی و رسائل الشیخ عبد الرزاق العفیفی رحمہ اللہ" (۱/ ۷۸) میں مطبوع ہے۔

چھٹی فصل

امام محمد تستری رحمہ اللہ کی تالیف کتاب "إحیاء الإحیاء" کے مطابق امام غزالی رحمہ اللہ کے عقائد کا بیان

ہر دو کلمہ شہادت میں اہلِ سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ پہلے کلمے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ بات بتائی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ واحد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ فرد ہے، کوئی اس کا مثل نہیں، صمد ہے کوئی اس کا ضد نہیں۔ منفرد ہے کوئی اس کا ند نہیں۔ قدیم ہے اس کے لیے اول نہیں۔ ازلی ہے اس کے لیے نہایت نہیں۔ مستمر الوجود ہے، اس کے لیے آخر نہیں۔ ابدی ہے اس کے لیے نہایت نہیں، قیوم ہے اس کے لیے انقطاع نہیں، دائم ہے اس کے لیے انصرام نہیں۔ ہمیشہ سے ہمیشہ تک نعوتِ جلال کے ساتھ موصوف ہے، اس پر انقضا، تغیر اور زوال کا حکم جاری نہیں ہو سکتا ہے۔ وہی اول ہے اور وہی آخر، وہی ظاہر ہے اور وہی باطن۔

تنزیہ:

وہ جسم ہے نہ جسم کی مانند ہے، وہ جوہر ہے نہ عرض اور نہ کسی موجود کی مانند ہے اور نہ کوئی موجود اس کی مانند ہے، وہ مقدار سے محدود ہو سکتا اور نہ امکنہ، جہات اور اقطار اس پر حاوی ہو سکتی ہیں۔ وہ عرش پر مستوی ہے جس طرح اس کے لائق ہے۔ عرش اسے نہیں اٹھاتا، بلکہ اس کی قدرت عرش اور حاملینِ عرش کو اٹھائے ہوئے ہے۔ وہ فوقیتِ مکانیت کے ساتھ نہیں، بلکہ فوقیتِ مکانت کے ساتھ ہر چیز سے بالا ہے۔[1] وہ ہر موجود سے قریب ہے اور ہر شے پر شہید۔ وہ کسی چیز میں حلول کرتا ہے نہ کوئی چیز اس میں حلول کرتی ہے۔ وہ تو زمان ومکان سے قبل تھا اور اس وقت بھی اسی حال پر ہے

[1] یہ معانی صحیح ہیں، لیکن یہ الفاظ مبتدع ہیں۔ سورۃ الاخلاص اور آیت الکرسی کے ہوتے ہوئے ان الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تنزیہ یا وصف بیان کرنا بے فائدہ ہے۔ ہمیں صفات کا اجرا اس طرح کفایت کرتا ہے جس طرح وہ کتاب وسنت میں بیان ہوا ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

جس پر وہ پہلے تھا۔ وہ اپنی صفات کے ساتھ اپنی مخلوق سے جدا ہے۔ اس کی ذات میں اس کے سوا کوئی نہیں ہے اور نہ اس کے سوا میں اس کی ذات ہے۔ اسے حوادث پیش نہیں آتے۔ وہ استکمال اور زیادت فی الکمال سے بے نیاز ہے۔ وہ اپنی ذات میں عقلوں کے ساتھ معلوم الوجود ہے اور ابصار کے ساتھ دار القرار میں مرئی الذات ہے۔

قدرت:

اللہ تعالیٰ حی، قادر، جبار اور قاہر ہے۔ کسی چیز سے عاجز نہیں ہے۔ وہ سوتا ہے نہ فنا ہوگا اور نہ اسے موت ہی آئے گی۔ ملک، ملکوت، سلطان، امر اور خلق سب کچھ اسی کا ہے۔ ساری موجودات اس کے قبضے میں مقہور ہیں، وہ سب کا موجد اور ان کے رزق اور زندگیاں مقدر کرنے والا ہے۔ اس کے مقدورات شمار میں نہیں آ سکتے۔

علم:

وہ جمیع معلومات کا عالم ہے، آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز اس کے علم سے غائب نہیں ہے۔ اسے علمِ قدیم ازلی کے ساتھ ظواہر اور بواطن پر اطلاع ہے اور وہ اس علم کے ساتھ ازل سے متصف ہے نہ کہ اس علمِ متجدد کے ساتھ جو حلول و انتقال کے واسطے سے اسے حاصل ہوا ہو۔

ارادہ:

وہ ساری کائنات کا مرید و مدبر ہے۔ ملک اور ملکوت میں اس کی قضا، قدر، حکم اور مشیت کے سوا کوئی چیز جاری نہیں ہوتی۔ اس نے جو چاہا وہ ہوا اور جو نہ چاہا وہ نہیں ہوا۔ جملہ صفات میں اس کی ذات کے ساتھ اس کا ارادہ قائم ہے۔ وہ ہمیشہ سے اسی طرح ارادے کے ساتھ موصوف ہے۔ اس نے ازل میں اشیا کے وجود کو اوقاتِ اشیا میں مقدر کیا تھا۔ جس طرح ازل میں اپنے علم کے موافق اس نے ارادہ کیا تھا، اسی طرح وہ اشیا پائی گئیں۔ وہ سارے امور کا مدبر ہے، لیکن افکار کی ترتیب اور زمانے کے انتظار کے ساتھ نہیں، کیوں کہ اسے کوئی کام کسی کام سے مشغول نہیں کرتا ہے۔

سمع وبصر:

وہ سمیع وبصیر ہے، کوئی مسموع اس کی سماعت سے غائب نہیں ہوتا، اگرچہ وہ بعید و خفی ہو۔ کوئی

دکھائی دینے والی چیز اس کی رویت سے مخفی نہیں ہوتی، اگرچہ وہ باریک ہو، وہ کان اور کان میں سوراخِ گوش کا محتاج نہیں ہے اور نہ اسے حدقۂ چشم اور پلک ہی کی حاجت ہے، وہ دل کے بغیر جانتا ہے، ہاتھ کے بغیر پکڑتا ہے اور آلے کے بغیر پیدا کرتا ہے۔[1]

کلام:

اللہ تعالیٰ کلام ازلی کے ساتھ متکلم، آمر، ناہی، واعد اور متوعد ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے نہ کہ ایسی آواز کے ساتھ جو اجرام کے باہم ٹکراؤ سے پیدا ہو کر اس سے نکلی ہو اور نہ ایسے حروف کے ساتھ جو ہونٹوں کے ملنے اور زبان کے ہلانے سے منقطع ہو۔[2] قرآن، تورات، انجیل اور زبور اس کی کتابیں ہیں، جو اس نے اتاری ہیں۔ قرآن قدیم ہے اور اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے، وہ اس سے جدا ہے، نہ دل اور ورق کی طرف منتقل ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ زبان سے مقروء، مصحف میں مکتوب اور دل میں محفوظ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے صوت و حرف کے بغیر اس کا کلام سنا، جس طرح اس کی ذات جوہر اور عرض کے بغیر دکھائی دے گی۔[3]

افعال:

اللہ کے سوا جو کوئی موجود ہے، اسے اللہ ہی نے اکمل وجوہ پر ایجاد کیا ہے، جبکہ وہ پہلے کوئی چیز نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں حکیم اور اپنے فیصلوں میں عادل ہے، اس کی طرف سے ظلم کا تصور نہیں ہے کیوں کہ کسی غیر کی کچھ ملکیت نہیں ہے کہ اس میں تصرف کرنے سے ظلم ہو۔ اس نے جس کسی چیز کو ایجاد کیا ہے، اسے اظہارِ قدرت اور تحقیقِ ارادہ کے لیے ایجاد کیا ہے نہ اس لیے کہ وہ اس کا محتاج تھا، یہ ایجاد اس کا کرم ہے، اس پر واجب نہیں ہے۔ اسی کے لیے فضل و احسان ہے، کیوں کہ

---

[1] یہ ٹھیک ہے، لیکن صفت ''اُذُن'' اور ''یَدْ'' کسی تشبیہ اور تمثیل کے بغیر ثابت ہے۔ اس عبارت سے صفتِ ید اور اذن کی نفی کی بو آتی ہے، لہٰذا اس عبارت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

[2] اس تقریر میں ہوا اور شفتین کے انسلال [پھسلنے] کی قید کے ساتھ حرف و صوت کی نفی ہے۔ پس اس سے یہ ثابت ہوا کہ حرف و صوت تو موجود ہے لیکن ہمارے جیسا صوت و حرف نہیں۔ یہ عقیدہ اس معنی میں تو صحیح ہے، لیکن اگر اس سے مطلقاً حرف و صوت کی نفی مقصود ہے تو یہ سنتِ صحیحہ مطہرہ کے بالکل خلاف ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

[3] کسی آیت یا حدیث میں یہ تصریح آئی ہے نہ ہمیں اس میں خوض کرنے کی کوئی ضرورت ہے۔ ہمارے لیے صرف اتنی بات پر ایمان لانا ہی کافی ہے جو فرمانِ باری تعالیٰ میں ہے: ﴿وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ [النساء: ١٦٤] [اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، خود کلام کرنا] [مولف رحمہ اللہ]

بندوں کو عذاب دینے کی قدرت کے باوجود اس نے انھیں عذاب نہ کیا اور اگر عذاب کرتا تو یہ اس کا عدل تھا۔ اطاعت کرنے پر وہ ثواب دیتا ہے اور یہ ثواب وہ اپنے کرم سے عطا کرتا ہے نہ بطور لزوم واستحقاق، کیونکہ اس پر کسی کا کوئی حق واجب نہیں ہے، بلکہ مخلوق پر اسی کا حقِ طاعت واجب ہے کہ اس نے انبیا کی زبانی وحی بھیجی۔

دوسرے کلمے سے بندوں کو اس بات کی خبر دی ہے کہ اس نے نبی، امی، قرشی محمد ﷺ کو رسالت دے کر تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا۔ ان کی شرع سے سارے شرائع منسوخ کر دیے، انھیں سارے انبیا پر فضیلت دی اور سید البشر قرار دیا۔ اس نے آپ ﷺ پر ایمان لائے بغیر ایمان و توحید کے کامل ہونے کو روک دیا۔ آپ ﷺ کی تصدیق کو موت کے بعد ہر خبر میں جیسے منکر ونکیر کا سوال، عذابِ قبر، وزنِ اعمال اور پل صراط ہے، واجب ٹھہرایا۔ میزان میں اعمال کا وزن ہوگا۔ پل صراط تلوار سے تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ حوض مورود سے جو کوئی ایک بار پانی پیے گا وہ پھر کبھی پیاسا نہ ہو گا۔ اس دن بندوں کا حساب لیا جائے گا۔ جو موحد آگ میں گئے ہوں گے وہ انتقام کے بعد انبیا پھر علما پھر شہدا پھر مومنوں کی شفاعت کے ذریعے دوزخ سے نکالے جائیں گے۔ جس کا کوئی سفارشی نہ ہوگا وہ اللہ کے فضل سے نجات پائے گا اور وہ ہمیشہ آگ میں نہ رہے گا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت کا اسی ترتیب سے معتقد رہے جس طرح وہ وارد ہوئی ہے، ان سب کے ساتھ نیک گمان رکھے اور ان پر ثنا کرے۔ فمن اعتقد هذا كله كما ذكرنا فهو من أهل السنة.

تعلیم و تربیت کا تدریجی طریقہ:

انسان کو چاہیے کہ وہ ارشاد وراہنمائی کے لیے طریقہ تدریج کو اختیار کرے۔ لہٰذا سب سے پہلے بچے کو مذکورہ بالا عقائد کا یاد کرانا واجب ہے، ایسا کرنے سے بڑی عمر میں اس پر بتدریج اس کے معنی واضح ہو جائیں گے۔ لہٰذا پہلے حفظ، پھر فہم، پھر تصدیق اور پھر اعتقاد ہے۔ یہ بات اس بچے کو بلا برہان و دلیل اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہو جاتی ہے جس کا دل ایمان کے لیے منشرح ہوتا ہے، کیونکہ عوام الناس کے لیے مبادیِ عقائدِ اسلام محض تلقین و تعلیم ہے۔ ہاں کبھی اعتقاد تقلیدی ضعیف ہوتا ہے اور نقیض سے ازالے کو قبول کر لیتا ہے، جبکہ اس نقیض کا اس پر القا کرتے ہیں، اس لیے اس کی تقویت واجب ہے تاکہ وہ اس کے قابل ہو۔

اس تلقین کا طریقہ یہ ہے کہ جدل وکلام کا طریقہ سیکھے، بلکہ تلاوتِ قرآن، تفسیر، قراءتِ حدیث، معاینہ سنن اور وظائف عبادات میں مشغول ہو۔ اس اشتغال سے اس کا اعتقاد رسوخ میں بڑھتا رہے گا، کیونکہ اس کے کان میں قرآن کے دلائل اور حدیث کے شواہد آئیں گے اور انوارِ عبادات واضح ہوں گی، مشاہدہ صالحین سے ان کا حال اس میں سرایت کرے گا۔ جدل و کلام سے اپنے سمع کی حفاظت کرے، کیونکہ ان کا بگاڑ اصلاح کی نسبت زیادہ ہے۔ صالح عوام کے عقیدے کو متکلمین کے عقیدے سے قیاس کرے۔ عوام کا اعتقاد مضبوط ہوگا، کوئی چیز اسے متغیر نہیں کرتی۔ اہلِ کلام کا اعتقاد کمزور ہوگا، ادنی شبہ اسے زائل کر دے گا۔

بچہ جب اس عقیدہ پر نشوونما پا کر دنیا میں مشغول ہوگا تو اسے اس عقیدے کے سوا کچھ اور دکھائی نہ دے گا اور وہ آخرت میں سلامت رہے گا، کیونکہ شریعت عوام سے ان پر تصدیقِ جازم کا مطالبہ کرتی ہے نہ کہ ان کے دلائل پر بحث ونظر کرنا۔ پھر اگر وہ بچہ آخرت کی راہ چلتے ہوئے تقوی اور ریاضت کو لازم پکڑتے ہوئے خواہشات نفس سے اجتناب کرے گا تو اس کے لیے ہدایت کے دروازے کھل جائیں گے اور ان عقائد کے حقائق اس کے اجتہاد واستعداد کے حسب حال نورِ الٰہی سے کھلنے لگیں گے۔ جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ [العنکبوت: ٦٩]

[اور وہ لوگ جنھوں نے ہمارے بارے میں پوری کوشش کی ہم ضرور ہی انھیں اپنے راستے دکھا دیں گے]

امام شافعی، مالک، احمد، سفیان اور سلف محدثین رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے کہ علمِ جدل وکلام بدعت اور حرام ہے۔ اگر یہ علم امرِ دین سے ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا حکم دیتے، لوگوں کو سکھا جاتے اور اس علم والوں کی ثنا وتعریف فرماتے جس طرح فقہ کی تعریف وثنا کی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حقائق کو بہت زیادہ جاننے والے تھے اور ترتیب الفاظ میں اپنے غیر کی نسبت بہت فصیح تھے، لیکن کسی نے ان سے اس علم کا سوال نہ کیا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس علم سے شر پیدا ہوتا ہے۔ بعض نے اس علم کو فرض کفایہ اور فرض عین کہا ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس علم کی مطلق مذمت یا تعریف کرنا غلطی ہے، اس جگہ اس کی تفصیل کا ہونا ضروری ہے مگر زیادہ احتیاط اسی میں ہے کہ اس میں زیادہ خوض وبحث نہ

کرے اور جدلِ باطل سے بچے اور احسن مجادلہ ہی پر اکتفا کرے، کیونکہ تمام بدعات اسی علم سے ایجاد ہوئی ہیں حتی کہ اہلِ بدعت کے بہتر (۷۲) فرقے بن گئے۔

شریعت کا ظاہر و باطن:

جس نے یہ کہا کہ ظاہر کے مخالف باطن شریعت ہے تو وہ ایمان سے زیادہ کفر سے قریب تر ہے۔ اس مقام میں لوگ تین طرح پر ہیں، ایک وہ جو حد اعتدال سے تجاوز کر کے ساری شرعیات واردہ کی زبانِ حال کے ساتھ تاویل کرتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَتُكَلِّمُنَآ أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُم﴾ [یٰس: ٦٥]

[اوران کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور ان کے پاؤں اس کی گواہی دیں گے]

یا جیسے منکر ونکیر کے خطاب اور اہلِ نار اور ان جیسے لوگوں کے باہم ایک دوسرے سے مخاطب ہونے کی تاویل۔ دوسرے غفلت اور کوتاہی کرنے والے جو اصلاً کسی چیز کی تاویل نہیں کرتے تاکہ تاویل کا یہ دروازہ بند ہی رہے اور امر دین ضبط سے خارج نہ ہو، جیسے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ "کن فیکون" کا خطاب حرف اور صوت کے ساتھ ہے۔ اس قسم کے لوگ تاویل سے منع کرتے ہیں سوائے تین جگہوں کے، ایک «اَلْحَجَرُ الْأَسْوَدُ يَمِينُ اللهِ فِي الْأَرْضِ»[1] [حجر اسود زمین میں اللہ کا دستِ راست ہے] دوسرے «قَلْبُ الْمُؤْمِنِ بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ»[2] [مومن کا دل رحمن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے] تیسرے: "إِنِّي لَأَجِدُ نَفَسَ الرَّحْمٰنِ مِنْ قِبَلِ الْيَمَنِ"[3] [یقیناً میں رحمان کے نفس کو یمن کی جانب پاتا ہوں] تو اس احتیاط میں کوئی حرج نہیں۔ تیسرا معتدل گروہ کہ جو چیز اللہ کے ساتھ متعلق ہے اس کی تاویل کرتا ہے اور جو چیز آخرت کے متعلق ہے اس کو ترک کرتا ہے، ایسا کرنے والے اشاعرہ ہیں۔[4] رہے معتزلہ تو

---

[1] مصنف عبد الرزاق (٥/٣٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٤)

[3] مسند الشاميين (٦/١٤٩)

[4] ایسا کرنے والے معتدل نہیں بلکہ افراط وتفریط کا شکار ہیں، کیوں کہ انھوں نے طریقہ سلف کو چھوڑ کر نئی راہ اپنائی ہے، جس میں انھوں نے بعض صفات کو تسلیم کیا ہے اور کئی صفاتِ الٰہیہ کا انکار کیا ہے اور یہ صفات میں تاویل کا عقیدہ بھی صحابہ وتابعین کے منہج کے مخالف ہے۔

انھوں نے رویت، سمع، بصر، معراج جسمانی، عذابِ قبر، میزان اور صراط کی تاویل کی ہے اور وہ حشرِ اجساد اور وجودِ جنت کا جنت کی حسی پناہ گاہ کے ساتھ اقرار کرتے ہیں۔

"ومعرفة القصد في أمثال هذه الاشياء دقيق لا يطلع عليه إلا موفق يدرك الأمور بنور الهي وهو من علم المكاشفة فلا نخوض فيه."

[اس طرح کی چیزوں میں درمیانی راہ کی پہچان حاصل کرنا دقیق اور باریک ہے، صرف صاحبِ توفیق ہی اس پر مطلع ہو سکتا ہے اور وہ نورِ الٰہی کے ساتھ اس کا ادراک کر لیتا ہے، اور اس کا تعلق علم مکاشفہ سے ہے جس میں ہم خوض و بحث نہیں کرتے ہیں]

ذاتِ الٰہیہ کی معرفت کے اصول:

حاصل کلام یہ ہے کہ کلمہ شہادتین اس ایجاز کے باوجود اثباتِ الٰہ، صفاتِ الٰہ، افعالِ الٰہ اور رسول ﷺ کے صدق وسچائی کو متضمن ہے اور ایمان کی بنیاد انھیں چار ارکان پر ہے: ایک معرفتِ ذات، جس کا مدار دس اصولوں پر ہے۔

پہلی اصل:

واجب الوجود کے وجود کی معرفت، عقل اور نقل دونوں اس پر دلیل ہیں اور من جملہ نقلی دلائل کے ایک یہ آیت ہے:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴾ [البقرة: ١٦٥]

[بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں اور ان کشتیوں میں جو سمندر میں وہ چیزیں لے کر چلتی ہیں جو لوگوں کو نفع دیتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا، پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیا اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور اس بادل میں، جو آسمان و زمین کے درمیان مسخر کیا ہوا ہے، ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں

ہیں جو سمجھتے ہیں]

جسے تھوڑی سی بھی عقل ہے وہ جانتا ہے کہ یہ جہاں جو اس ترتیبِ محکم پر واقع ہے، اس کا ضرور کوئی صانع مدبر ہے۔ اسی طرح عقل اس پر دلیل ہے کہ یہ جہاں حادث ہے اور حادث اپنے حدوث میں سبب سے بے نیاز نہیں ہوتا، بنا بریں عالم بھی سبب سے مستغنی نہیں ہے۔

دوسری اصل:

حق تعالیٰ کا قِدم ہے، کیونکہ اگر وہ حادث ہوتا تو کسی محدث کی طرف مفتقر ہوتا، پھر وہ محدث کسی اور محدث کا محتاج ہوتا، پھر یہی تسلسل رہتا یا کسی قدیم کی طرف منتہی ہوتا۔ لہٰذا وہ ہی قدیم صانعِ عالم ہے۔

تیسری اصل:

حق تعالیٰ کا بقا ہے، کیونکہ اگر وہ منعدم ہوتا تو بنفسہ ہوتا یا کسی معدم سے، اول باطل ہے اور اسی طرح ثانی بھی۔

چوتھی اصل:

اللہ تعالیٰ جوہر متحیز نہیں ہے۔

پانچویں اصل:

اللہ تعالیٰ جواہر سے مولف جسم نہیں ہے۔

چھٹی اصل:

وہ عرض نہیں ہے۔

ساتویں اصل:

وہ جہات کے ساتھ مختص نہیں ہے، کیونکہ جہات مخلوق ہیں۔[1]

آٹھویں اصل:

وہ اسی معنی میں عرش پر مستوی ہے جو معنی اس کی مراد ہے اور یہ اس کے وصفِ کبریا کے

[1] ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ یہ الفاظ مبتدع ہیں، خواہ ان کے معانی صحیح ہوں۔ جہتِ فوق، علو اور استوا کتاب و سنت سے ثابت ہیں، اس لیے ان کا انکار قرآن و حدیث کا انکار ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

منافی نہیں ہے۔

نویں اصل:

وہ قیامت کے دن سر کی آنکھ سے دکھائی دے گا، کیونکہ اس کا فرمان ہے:

﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴾ [القيامة: ٢٢-٢٣]

[اس دن کئی چہرے تروتازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھنے والے]

رویت کا اجرا ظاہر پر مستحیل نہیں ہے، کیوں کہ رویت علم سے ایک مکمل کشف ہے۔

دسویں اصل:

وہ واحد ہے، چنانچہ اس کا ارشاد ہے:

﴿ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ﴾ [الأنبياء: ٢٢]

[اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے]

اللہ تعالیٰ کی صفات کے ارکان:

اللہ تعالیٰ کی صفات کے دس ارکان ہیں:

① ہر چیز پر قدرت۔

② ساری موجودات کا علم: ﴿وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ [البقرة: ٢٩] [اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے] نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ﴾ [الملك: ١٤]

[کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے اور وہی تو ہے جو نہایت باریک بین ہے، کامل خبر رکھنے والا ہے]

③ حیات، کیونکہ قادرِ عالم کا حی ہونا لا محالہ ہے اور جو کوئی اس میں شک کرے، اسے چاہیے کہ وہ تمام حیوانات کی حیات میں بھی شک کرے۔

④ ارادہ، جو کچھ موجود ہے وہ اسی کے ارادے سے صادر ہے۔

⑤ سمع وبصر، کوئی چیز اس کے سمع وبصر سے غائب نہیں ہے، اگرچہ کیسی ہی باریک کیوں نہ ہو۔

⑥ وہ متکلم ہے اور کلام ایک صفت ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے، وہ حرف ہے نہ صوت،

بلکہ محض کلامِ نفسی ہے۔[1]

⑦ اس کا کلام قدیم ہے۔

⑧ اس کا علم قدیم ہے، وہ اپنی ذات، صفات اور سارے محدثات کا دائماً عالم ہے۔

⑨ اس کا ارادہ قدیم ہے، ہر حادث جس وقت حادث ہوتا ہے تو وہ گذشتہ علم کے موافق قِدم ہی میں اس کے ساتھ متعلق ہو چکا ہے۔

⑩ وہ علم کے ساتھ عالم اور حیات کے ساتھ حی ہے اور اس کی ساری صفات کا یہی حال ہے۔

افعالِ الٰہیہ کے ارکان:

اللہ تعالیٰ کے افعال کے دس ارکان ہیں:

① ہر حادث اسی کا فعل اور اختراع ہے، بندوں کے تمام افعال اسی کی مخلوق ہیں۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ [الصافات: ۹۶] [حالانکہ اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا اور اسے بھی جو تم کرتے ہو] اس کی قدرت تام ومکمل ہے، اس میں کوئی قصور اور نقص نہیں ہے۔

② وہ بندوں کے افعال کا مخترع ہے، اس سے یہ بات خارج نہیں ہوتی ہے کہ وہ افعال جو بندوں کے مقدر میں لکھے ہوئے ہیں، وہ ان کے کسب کردہ اور کمائے ہوئے نہ ہوں، بلکہ قدرت ومقدور اور اختیار ومختار کا خالق وہی اللہ ہے۔ یہ قدرت اللہ کا وصف اور بندے کا کسب ہے۔ حرکت اللہ کی مخلوق اور بندے کا وصف وکسب ہے۔ یہ اس تفرقہ ضروریہ کا جبر نہیں ہے جو حرکت مقدورہ اور رعدہ ضروریہ کے درمیان ہے۔

③ بندے کا فعل اگرچہ اس کا کسب ہے، لیکن وہ اللہ کے ارادے سے ہے، کوئی چیز اس کے قضا وقدر، ارادے اور مشیت کے بغیر جاری نہیں ہوتی خواہ وہ خیر ہو یا شر، اسلام ہو یا کفر، غوایت ہو یا رشد، طاعت ہو یا عصیان اور یہی حال ہے سارے متقابلات کا،

﴿يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ [النحل: ۹۳]

[1] کلام اللہ کے کلامِ نفسی ہونے پر قرآن مجید یا سنت یا سلف یا اجماعِ امت سے کوئی دلیل ثابت نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام حرف وصوت ہے، اگرچہ وہ مخلوق کے حرف وصوت کے مثل نہیں۔ احادیثِ صحیحہ اسی پر دلالت کرتی ہیں۔ حرف وصوت کا انکار کرنا محض اہلِ کلام کا قال وقیل ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

[وہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے]

④ اللہ تعالیٰ اس ایجادِ وخلق میں متفضل ہے، اس پر کوئی چیز واجب نہیں ہے۔

⑤ انسان کو اس کام کی تکلیف دینا جائز ہے جو اس کی طاقت میں نہ ہو۔[1] اگر ایسا کرنا جائز نہ ہوتا تو اس سے بچنے کا سوال کیوں کیا جاتا؟ جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ [البقرة: ٢٨٦] [اے ہمارے رب! اور ہم سے وہ چیز نہ اٹھوا جس (کے اٹھانے) کی ہم میں طاقت نہ ہو]

⑥ بندوں کو کسی جرم اور ثواب کے بغیر عذاب دینا جائز ہے برخلاف معتزلہ کے، کیونکہ یہ اپنے مِلک میں تصرف ہے، جبکہ ظلم تو غیر کے مِلک میں تصرف کرنے کو کہتے ہیں اور یہاں اس کے غیر کی کوئی مِلک ہی نہیں ہے، نیز اس کے جواز پر اس کا وجود دلیل ہے۔ جانوروں کو ذبح کر کے تکلیف دینا ان کے جرم کے بغیر ہی ہوتا ہے۔

⑦ وہ اپنے بندوں کے ساتھ جو چاہے سو کرے، اس کے لیے اس بات کی رعایت رکھنا واجب نہیں ہے کہ وہ بندوں کو ایسے کاموں کا حکم دے جو ان کے لیے ٹھیک اور نفع بخش ہوں۔

⑧ اللہ تعالیٰ اور اس کی طاعت کی معرفت شرعاً واجب ہے نہ کہ عقلاً۔

⑨ انبیا کی بعثت مستحیل ومحال نہیں ہے براہمہ کے خلاف، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ عقل ہی کافی ہے، حالانکہ عقل آخرت میں نجات دلانے والے مفید امور کی طرف راہنمائی نہیں کرتی ہے جس طرح عقل مفیدِ صحت دوا کو نہیں جانتی ہے۔ تو جس طرح لوگ تجربہ کار تصدیق شدہ طبیب کے محتاج ہوتے ہیں، اسی طرح معجزے کے ساتھ تصدیق شدہ نبی کے بھی محتاج ہیں۔

⑩ محمد ﷺ خاتم النبیین ہیں اور ان کی شریعت پہلے کے جملہ شرائع کی ناسخ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے معجزات ظاہرہ کے ساتھ ان کی تصدیق وتائید کی ہے، جیسے چاند کا پھٹنا اور کنکریوں کا تسبیح خواں ہونا وغیرہ۔ اگر قرآن مجید کے سوا ان کا کوئی معجزہ بھی نہ ہوتا تو ان کی نبوت کو سچ ثابت کرنے کے لیے یہی کافی تھا، کیونکہ آپ ﷺ نے اس قرآن کے ساتھ ان لوگوں کو چیلنج کیا جو فصاحت

[1] اس میں اہلِ علم کا اختلاف ہے، لیکن راجح یہی ہے کہ ایسا کرنا جائز نہیں۔ اس کی دلیل اللہ عزوجل کا یہ فرمان ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا﴾ [البقرة: ٢٨٦] یہ آیت کریمہ: ﴿رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ [البقرة: ٢٥٦] قابلِ تاویل ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

وبلاغت کے سرچشمے تھے، مگر وہ سب اس کے معارضے و مقابلے سے عاجز نکلے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس قرآن مجید میں غیب کی خبریں اور پہلے لوگوں کی تاریخ ہے، حالانکہ آپ ﷺ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور دیگر کتابوں کے مطالعے سے بے خبر تھے۔ اور معجزے کا صاحبِ معجزہ کی سچائی پر دلیل ہونا واضح ہے جو زیادہ بیان کا محتاج نہیں ہے۔

امورِ آخرت کا بیان:

رسول اللہ ﷺ نے جن امورِ آخرت کی خبر دی ہے، وہ سب حق ہیں اور اس کی دس اصلیں ہیں:

اصل اول:

حشر ونشر، یعنی بندوں کو، دفن کرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھانا عقلاً بھی ممکن ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے، جیسے پہلی دفع پیدا کرنا اس کی قدرت میں تھا۔ کیونکہ اعادہ دوسری ابتدا ہے جو پہلی ابتدا کی طرح ہی ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيٓ اَنْشَاَهَا اَوَّلَ مَرَّةٍ ﴾ [یٰسٓ: ۷۹]

[کہہ دے انھیں وہ زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا]

اصل دوم:

منکر ونکیر کا سوال بھی ممکن ہے، کیوں کہ یہ اجزا میں سے کسی جز میں اسی حیات کے اعادے کو چاہتا ہے جو ممکن ہے اور ممکن پر موقوف ممکن ہوتا ہے۔ ہمارا اس کو نہ سننا اور میت کے اجزا کا سکون اسے دفع اور رد نہیں کر سکتا ہے۔ سونے والا بظاہر ساکن ہوتا ہے، جب کہ باطن میں آلام ولذات کا ادراک کرتا ہے، جیسے رسول اللہ ﷺ جبریل علیہ السلام کو دیکھتے اور ان کی بات سنتے تھے، اور آپ کے اردگرد والے بے خبر ہوتے تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لَا يُحِيطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ﴾ [البقرۃ: ۲۵۵]

[اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کرتے مگر جتنا وہ چاہے]

اصل سوم:

عذابِ قبر حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے اور اسلافِ امت کی طرف سے یہ مشہور ومشتہر ہے کہ انھوں نے عذابِ قبر سے پناہ پکڑی ہے، لہٰذا عذابِ قبر ممکن ہے۔ میت کے اجزا کا منتشر ہو جانا

عذابِ قبر کی نفی کے لیے دلیل نہیں ہے، کیونکہ اس عذاب کا ادراک کرنے والا ایک جز یا اجزاے مخصوصہ ہوتے ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ ادراک کے اعادے پر قادر ہے۔

اصل چہارم:

میزان حق ہے۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ صحائفِ اعمال میں اعمال کے درجات کے حسبِ حال عذاب میں عدل کے اظہار کے لیے، معافی اور ثواب میں اضافے کے ساتھ اپنے فضل کے اظہار کے لیے وزن کرے گا۔

اصل پنجم:

صراط حق ہے، اس کا ذکر بھی قرآن مجید میں وارد ہوا ہے اور یہ ممکن ہے۔ وہ اللہ جسے یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ پرندے کو ہوا میں اڑاتا ہے، اسے یہ قدرت بھی ہے کہ انسانوں کو ایسی چیز پر چلائے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔

اصل ششم:

جنت اور جہنم برحق ہیں، چنانچہ یہ دونوں پیدا ہو چکی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ﴾ [آل عمران: ١٣٣] [ڈرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے] اور ﴿أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرة: ٢٤] [کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے] اور یہ کہنا کہ جزا اور سزا کے دن سے پہلے ہی انھیں پیدا کرنے میں کیا فائدہ ہے؟ بے فائدہ ہے، کیوں کہ ﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ﴾ [الأنبياء: ٢٣] [اس سے نہیں پوچھا جاتا اس کے متعلق جو وہ کرے]۔

اصل ہفتم:

رسول اللہ ﷺ کے بعد امامِ حق ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر عمر، پھر عثمان اور پھر علی رضی اللہ عنہم ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے کسی امام پر نص نہیں فرمائی ہے، ورنہ وہ ہم تک منقول ہو کر پہنچتی۔ اگر آپ ﷺ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے نص فرماتے تو سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ اول مان کر رسول اللہ ﷺ کی مخالفت لازم آتی، جبکہ کوئی عقلمند انصاف پسند اسے جائز قرار نہیں دے گا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے علی رضی اللہ عنہ سے امامت کے مسئلے پر جھگڑا نہیں کیا، بلکہ ان کی بات کی بنیاد اجتہاد پر تھی۔ علی رضی اللہ عنہ نے یہ گمان کیا کہ حکومت کو قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ کے سپرد کرنے کا انجام امرِ امامت میں

اضطراب کی شکل میں ظاہر ہوگا، کیونکہ ان کے خاندان اور قبائل بہت تھے اور لشکر کے اندر ان کا اچھا خاصا حصہ تھا اور معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ گمان کیا کہ ان کے معاملے میں اتنے بڑے جرم کے باوجود تاخیر کرنا ائمہ کے خون گرانے پر امت کی جرات کا موجب بنے گا۔ اس معاملے میں ہر مجتہد درست ہے اور ان میں سے کسی ایک کو درست کہنا ہو تو وہ بالاجماع علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

اصل ہشتم:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت خلافت کی ترتیب کے مطابق ہے، کیوں کہ مشاہدینِ وحی نے ان کے فضل کو معلوم کرکے یہ ترتیب رکھی ہے۔

اصل نہم:

اسلام و تکلیف کے بعد امامت کی شرائط پانچ امر ہیں:

① مردانگی ② ورع ③ علم ④ کفایہ ⑤ نسب قریش۔ اگر ان اوصاف کے حامل لوگ متعدد ہوں تو اکثر لوگ جس کی بیعت کرلیں وہی امام ہے اور ان کا مخالف باغی ہے۔

اصل دہم:

اگر امام مذکورہ صفات کے ساتھ متصف تو نہ ہو البتہ وہ ایسے فتنے کو دبانے کی قدرت رکھتا ہو جو لوگوں کی برداشت میں نہیں ہے تو فتنے کے ضرر کو دور کرنے کے لیے اس کی امامت منعقد ہو جاتی ہے۔ یہ کل چار ارکان اور چالیس اصول ہیں، جس نے ان کے مطابق عقیدہ رکھا، وہ اہلِ سنت میں سے ہے اور جس نے ایسا نہ کیا وہ بدعتی ٹولے سے تعلق رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ فرمائے۔

میں کہتا ہوں: ان اصول کے بعض الفاظ میں بحث کرنا باقی ہے، اس رسالے میں اس کا بیان علاحدہ آئے گا۔

ایمان و اسلام میں فرق:

ایمان و اسلام میں تین مسئلے ہیں: ایک یہ کہ اسلام ایمان ہے یا اس کے سوا کچھ اور ہے؟ اس میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ بعض نے کہا: ایک چیز ہے، بعض نے کہا ہے کہ متغایرِ متلازم ہیں اور بعض نے کہا متباین ہیں۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ تین بحثوں سے ایضاحِ حق ہوتا ہے:

① لغت میں ایمان تصدیق کے معنی میں ہے اور اسلام تسلیم، اذعان اور انقیاد کے معنی میں اور تمرد و ابا کے ترک کے معنی میں ہے۔ لہٰذا تصدیق تو دل کے ساتھ مخصوص ہے اور زبان ترجمان دل ہے، جبکہ تسلیم دل، زبان اور جوارح کے ساتھ عام ہے، پس ہر تصدیق قلبی تسلیم اور ترکِ ابا وجود ہے اور تسلیم تصدیق نہیں ہے۔ تو اسلام اعم ہے اور ایمان اجزاے اسلام میں سے اشرف جز ہے۔

② شرع میں یہ دونوں مترادف، مختلف اور متداخل آئے ہیں، حدیث میں ہر ایک قول پر دلیل موجود ہے۔ سلف نے عمل کو جو ایمان میں شمار کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان اسلام کا تتمہ اور تکملہ ہے۔

③ ایمان کم اور زیادہ ہوتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں سلف کا قول یہ ہے کہ اطاعت سے ایمان بڑھتا اور معصیت و نافرمانی سے گھٹتا ہے۔

ایمان کی گواہی میں سلف کا طریقہ:

سلف یوں کہا کرتے تھے: "إنا مؤمنون إن شاء الله" [ان شاء اللہ ہم مومن ہیں] چنانچہ تین وجوہ سے یہ استثنا صحیح ہے:

① اس لیے کہ ایمان کے دعوے میں تزکیہ نفس کا خوف اور ڈر ہے، جب کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَلَا تُزَكُّوٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ [النجم: ٣٢] [سو اپنی پاکیزگی کا دعویٰ نہ کرو] ایک حکیم اور دانا شخص سے پوچھا گیا: صدق قبیح [برا سچ] کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: خود اپنی ثنا اور تعریف کرنا اور اپنے منہ میاں مٹھو بننا۔

② اس میں یہ ادب ہے کہ ہر حال میں اللہ کا ذکر کرنا چاہیے اور سارے امور کو اللہ کی مشیت کے سپرد کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ لَا تَقُوْلَنَّ لِشَاْیْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ﴾

[الکہف: ٢٣۔٢٤]

[اور کسی چیز کے بارے میں ہرگز نہ کہہ کہ میں یہ کام کل ضرور کرنے والا ہوں۔ مگر یہ کہ اللہ چاہے]

رسول اللہ ﷺ جب قبرستان میں تشریف لے جاتے تو کہتے:

«وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُونَ»[1]

① صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٤٩)

[اور خدا نے چاہا تو ہم تم سے جلد ہی ملنے والے ہیں]

اگرچہ آپ ﷺ کو ان قبروں والوں کے ساتھ جا ملنے میں کوئی شک نہیں تھا۔ عرفِ عام میں اس کا استعمال اظہارِ رغبت اور اظہارِ تمنا کے معنی میں ہوتا ہے۔ جیسے کوئی کہتا ہے کہ فلاں مرے گا یا آئے گا تو کہتے ہیں: إن شاء الله تعالىٰ.

③ اس سے مراد یہ ہے:

"أنا المؤمن حقا إن شاء الله تعالىٰ" [ان شاء اللہ تعالیٰ میں سچا مومن ہوں]

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ [الأنفال: ٤]

[یہی لوگ سچے مومن ہیں]

اس صورت میں شک کمالِ ایمان میں ہے نہ کہ اصلِ ایمان میں اور یہ کوئی کفر نہیں ہے، بلکہ دو وجہ سے حق ہے۔ ایک یہ کہ ایمان اعمالِ طاعات سے کامل ہوتا ہے لیکن اس کا کامل وجود معلوم نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ نفاق کمالِ ایمان کو زائل کرنے والا ہے اور وہ ایک مخفی امر ہے جس سے بری ہونا ثابت نہیں ہوتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

«أَكْثَرُ مُنَافِقِي هٰذِهِ الْأُمَّةِ قُرَّاؤُهَا»[1] [اس امت کے اکثر منافق قرا ہیں]

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَإِنَّهُ أَخْفَى مِنْ دَبِيبِ النَّمْلِ»[2]

[یقیناً وہ شرک چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی ہے]

④ خاتمے کا خوف ہے، معلوم نہیں کہ موت کے وقت ایمان سلامت رہے گا یا نہیں، اگر خاتمہ کفر پر ہوا تو سابقہ ایمان برباد ہو جائے گا، کیونکہ وہ سلامتِ آخرت پر موقوف ہے، والله أعلم.

"إحياء الإحياء" کا کلام ختم ہوا، ولله الحمد.

---

① مسند أحمد (٤/١٥٥) شعب الإيمان للبيهقي (٥/٣٦٣)

② مسند أحمد (٤/٤٠٣) المعجم الأوسط للطبراني (٣/١٠) حلية الأولياء (٩/٢٥٣) مصنف ابن أبي شيبة (١٠/٣٣٧۔ ٣٣٨)

کتاب ”المسايرة في العقائد المنجية في الآخرة“ کا تعارف:

شیخ ابن الہمام نے ”مسایرہ“ کو امام غزالی رحمہ اللہ کے رسالہ قدسیہ میں درج شدہ عقائد میں مزید اضافوں اور وضاحتوں کے ساتھ تحریر فرمایا ہے، اس میں انھوں نے اسی رسالے کی ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے اور اس میں ایک خاتمے کا اضافہ کر کے ایمان و اسلام اور ان کے ساتھ متصل و متعلق مسائل کی بحث کی ہے۔ انھوں نے دیباچے میں کہا ہے:

”إن بعض الفقراء من الإخوان كان قد شرع في قراءة الرسالة القدسية للإمام الحجة أبي حامد الغزالي فلما توسطها أحب أن أختصرها وأحببت ذلك فشرعت على هذا القصد فلم أستمر عليه إلا نحو ورقتين، ويعرض للخاطر استحسان زيادات أراني الذي يريني إن ذكرها مهم، وإنه تتميم لطالب الغرض فلم يزل يزداد حتى خرج عن القصد الأوّل فلم يبق إلا كتابا مستقلا غير أنه يسائرها في تراجمه، وزدت عليها خاتمة ومقدمة ... إلىٰ قوله: وبالغت في توضيحه وتسهيله إذ لم أضعه إلا ليسهل على الأوساط والمبتدئين وسميته ”كتاب المسايرة في العقائد المنجية في الآخرة.“ انتهىٰ

[ایک بھائی نے امام و حجت ابو حامد الغزالی رحمہ اللہ کا رسالہ قدسیہ پڑھنا شروع کیا تو جب وہ اس کے درمیان میں پہنچا تو اس نے یہ چاہا کہ میں اس رسالے کو مختصر کر کے تحریر کروں، مجھے اس کی یہ تجویز پسند آئی اور میں اس کام پر لگ گیا، ابھی دو ورقوں پر ہی کام ہوا تھا کہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ کیا ہی اچھا ہو اگر میں اس میں کچھ ایسے اضافے کر دوں جن کا ذکر کرنا مجھے اہم محسوس ہوا اور یقیناً وہ طالب غرض کے لیے ایک تتمہ اور تکملہ ہے، تو اس طرح اس کتاب میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ وہ اصل مقصود سے آگے نکل گئی اور وہ ایک مستقل کتاب کی صورت اختیار کر گئی، مگر وہ ابواب و معانی میں اس پہلی کتاب کے موافق تھی، پھر میں نے اس پر ایک خاتمے اور مقدمے کا اضافہ کیا۔ میں نے اس کی وضاحت اور تسہیل میں خوب محنت کی اور میں نے ایسا اس لیے کیا

ہے تاکہ درمیانے لوگوں اور مبتدیوں پر یہ کتاب سمجھنی آسان ہو جائے اور میں نے اس کا نام رکھا ہے۔ "كتاب المسايرة في العقائد المنجية في الآخرة"

شارح مسایرہ کہتے ہیں:

"المسايرة في الأصل مفاعلة من السير، وهي أن يسير الراكبان متحاذيين، أطلق هنا مجازا على محاذاة كتابه لكتاب الإمام الغزالي في تراجمه" انتهىٰ.

["مسایرہ" اصل میں سیر سے باب مفاعلہ کا مصدر ہے اور اس کا مطلب ہے کہ دو سوار ایک دوسرے کے متوازی اور ہم نوا ہو کر چلیں۔ اس جگہ ابن الہام رحمہ اللہ کی کتاب امام غزالی رحمہ اللہ کی کتاب کے ہم نوا ہونے کی وجہ سے اسے مجازاً یہ [مسایرہ] نام دیا گیا ہے]۔

یہ متن اور اس کی شرح میرے پاس موجود ہے، اس میں ایک مقدمہ، چار رکن اور ایک خاتمہ ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ شافعی تھے، جبکہ ابن الہمام رحمہ اللہ حنفی ہیں۔ انھوں نے ماتریدیہ کے طریقے پر عقائد کو بیان کیا ہے۔ چونکہ علماے حنفیہ کی چند کتب خصوصاً امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی فقہ اکبر سے عقائدِ حنفیہ کی روایات اس جگہ نقل کر دی گئی ہیں، اس لیے کتاب "مسایرہ" کے ترجمہ کی اس جگہ کچھ ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

ساتویں فصل

امام ابو عثمان اسماعیل بن عبدالرحمن صابونی رحمہ اللہ کے عقائد کا بیان

① علماے حدیث اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں۔ یہ لوگ اللہ کو ان صفات سے پہچانتے ہیں جو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمائی ہیں یا صحیح احادیث میں رسول اللہ ﷺ سے بیان ہوئی ہیں اور معتبر لوگوں نے ان کو نقل کیا ہے۔ محدثین ان صفات کو ثابت کرتے ہیں اور انھیں مخلوق کی صفات کے مانند نہیں کہتے، بلکہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے بنایا ہے، جیسے قرآن میں آیا ہے: ﴿خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ [ص: ۷۵] [جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا] اور وہ تکییف، تشبیہ، تحریف، تعطیل اور تمثیل سے بچتے ہیں اور کہتے ہیں: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ [الشوریٰ: ۱۱] [اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے] وہ اللہ تعالیٰ کے لیے سمع، بصر، عین، وجہ، علم، قوت، قدرت، عزت، عظمت، ارادہ، مشیت، کلام، رضا، غضب، دوستی، دشمنی، خوشی اور ضحک وغیرہ صفات کے، بلا تشبیہ وتاویل، قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

② قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس کی کتاب منزل اور وحی ہے جو مخلوق نہیں۔ یہ کلام اس کی صفت ہے اور خلقِ قرآن کا قائل کافر ہے۔ جبریل علیہ السلام اسے رسول اللہ ﷺ کے پاس لائے۔ یہ قرآن عربی زبان میں ہے اور بشیر ونذیر ہے۔ یہ سینوں میں محفوظ، زبانوں پر مقروء اور مصاحف میں مکتوب ہے۔ جو اسے مخلوق کہے اس کی گواہی نادرست، اس کی بیماری میں عیادت کرنا ناجائز اور اگر وہ مر جائے مسلمان اس کی نماز جنازہ ادا نہ کریں اور اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کریں۔ اگر وہ زندگی میں توبہ کر لے تو بہتر ہے ورنہ اس کی گردن مار دیں۔

امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ اور شیخ ابو بکر اسماعیل رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ ابن مہدی، جو ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ

کے مصاحب تھے، بھی اسی طرف گئے ہیں۔ قرآن کے تلفظ کو بھی مخلوق کہنا کفر ہے۔ ابو عمر و مستملی، ابن جریر طبری اور امام احمد رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔

③ اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں کے اوپر عرش پر ہے جس طرح اس نے قرآن مجید میں فرمایا ہے اور اس کی کیفیت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: استوا معلوم ہے، اس کی کیفیت عقل میں نہیں آتی، استوا کا اقرار ایمان ہے اور اس کا انکار کفر ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے اتنا اور کہا ہے: اس کی کیفیت کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔ حسین بن فضل اور عبداللہ بن مبارک رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے اور امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔

④ اللہ تعالیٰ ہر رات کسی تشبیہ، تکییف، تعطیل اور تاویل کے بغیر آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے۔

⑤ مرنے کے بعد قبروں سے اٹھنا، حشر ونشر کے احوال کا واقع ہونا، نامہ اعمال کا ہاتھوں میں ملنا، پل صراط سے گزرنا اور اعمال کا ترازو میں وزن ہونا حق ہے۔

⑥ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسے موحدین کے لیے شفاعت کرنا، جن سے کبیرہ گناہ سرزد ہوئے ہوں گے، حق ہے۔

⑦ حوض کوثر، حساب وکتاب کا ہونا، مسلمانوں کی ایک جماعت کا حساب کے بغیر جنت میں جانا اور نافرمانوں کا آگ میں داخل ہونا حق ہے، مگر یہ نافرمان لوگ آگ میں ہمیشہ نہیں رہیں گے۔

⑧ مومنوں کا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو چودھویں رات کے چاند کی طرح دیکھنا حق ہے، چنانچہ وہ سر کی آنکھوں سے اسے دیکھیں گے۔

⑨ جنت اور جہنم پیدا ہو چکی ہیں، وہ باقی رہیں گی، وہ فنا نہیں ہوں گی اور موت ذبح کر دی جائے گی۔ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں ہمیشہ کے لیے باقی رہیں گے۔

⑩ ایمان زبان سے اقرار کرنے اور دل سے یقین کرنے کا نام ہے جو کم اور زیادہ ہوتا ہے، چنانچہ عبادت بجا لانے سے یہ زیادہ اور گناہ کا ارتکاب کرنے سے کم ہو جاتا ہے اور اعمال ایمان میں داخل ہیں۔

⑪ مومن سے خواہ کبیرہ یا صغیرہ کتنے ہی گناہ سرزد ہوں وہ کافر نہیں ہوتا، اگر وہ توبہ کیے بغیر توحید و اخلاص پر فوت ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ بدوں کسی عذاب کے اسے معاف کر کے جنت میں لے جائے اور چاہے تو اس کے گناہ کی مقدار برابر عذاب دے کر پھر اسے بخش دے۔

امام سہل بن محمد رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''گناہ گار مومن کو اگر چہ عذاب ہوگا لیکن وہ کافروں کی طرح آگ میں نہیں ڈالا جائے گا، وہ ان کی طرح اس آگ میں رہے گا اور نہ اسے ان جیسی سختی اور بدبختی کا سامنا ہوگا۔''

⑫ امام احمد رحمہ اللہ اور سلف کی ایک جماعت کے نزدیک مسلمان عمداً نماز ترک کرنے سے کافر اور اسلام سے باہر ہو جاتا ہے، جب کہ امام شافعی رحمہ اللہ اور سلف کی ایک جماعت کے نزدیک وہ کافر نہیں ہوتا ہے بشرطے کہ وہ نماز کو فرض اور اپنے آپ کو عاصی اور نافرمان جانتا اور پہچانتا ہو لیکن وہ مرتد کی طرح لائق قتل ہے۔

⑬ بندوں کے افعال اللہ کی مخلوق ہیں اور اس کا منکر گمراہ ہے۔ ہدایت دینے والا اور گمراہ کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، نیز وہ عادل ہے۔ لوگوں کا ایک گروہ جنت میں اور ایک جہنم میں جائے گا۔ انسان کی نیک بختی اور بدبختی ماں کے پیٹ میں لکھ دی جاتی ہے اور پھر دنیا میں قسمت کا لکھا ہوا پورا ہوتا ہے۔

⑭ اچھا اور برا، نفع اور نقصان سب اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے ہے، نافع اور ضار وہی ہے نہ کہ کوئی اور، مگر اللہ تعالیٰ کی طرف برائی کی نسبت نہیں کرنی چاہیے۔

⑮ بندوں کے تمام کام اللہ تعالیٰ کے ارادے اور مشیت سے ہوتے ہیں۔ ایمان والا ایمان نہیں لایا اور کافر نے کفر نہیں کیا مگر اس اللہ کے ارادے سے، وہ چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی مذہب پر کر دیتا، اگر وہ چاہتا کہ کوئی گناہ نہ کرے تو وہ شیطان کو پیدا نہ کرتا، مومن کا ایمان اور کافر کا کفر اسی کی قضا وقدر سے ہے۔

⑯ بندوں کا خاتمہ کسی کو معلوم نہیں ہے، کوئی نہیں جانتا کہ خاتمہ اچھا ہوگا یا برا۔ اسی طرح کسی معین شخص کو جہنمی نہیں کہا جا سکتا، ہاں یہ کہیں گے کہ جس کی موت دین پر ہوگی اس کا انجام جنت ہے، اور نافرمان چند روز جہنم میں رہ کر اور گناہوں کی سزا پا کر جنت میں جائیں گے مگر وہ اس میں ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنتی ہونے کی گواہی دی انھیں ہم بھی جنتی کہتے ہیں، جیسے عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم اور ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ وغیرہ۔

⑰ اللہ تعالیٰ نے غیب کی جو بات چاہی اپنے پیغمبر کو بتلا دی، ورنہ پیغمبر کو علمِ غیب نہیں ہوتا ہے۔ پھر کسی اور کا کیا ذکر ہے خواہ وہ اللہ کا ولی ہو یا اللہ سے متعلق علم رکھنے والا۔

⑱ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے سب سے افضل، خلافت کی ترتیب کے ساتھ، خلفاے اربعہ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تیس سال تک خلافت رہی، پھر سلطنت اور بادشاہت کا زمانہ آگیا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر کہا: اگر سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ کی عبادت موقوف ہو جاتی، یعنی دینِ اسلام مٹ جاتا اور شرک عام ہو جاتا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں روم، ایران اور بڑے بڑے ملک فتح ہوئے، دس ہزار مسجدیں بنیں۔ سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس قابل ہیں کہ ان کی تعظیم کرنا اور ان سے محبت رکھنا واجب ہے۔ حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«فَمَنْ أَحَبَّهُم فَبِحُبِّي أَحَبَّهُم وَمَنْ أَبْغَضَهُم فَبِبُغْضِي أَبْغَضَهُم»[1]

[جس نے ان سے محبت کی اس نے میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا اس نے میرے ساتھ بغض کی وجہ سے بغض رکھا]

⑲ ہر نیک و بد حاکم کے پیچھے نماز ادا کرنا، اس کے ساتھ مل کر جہاد کرنا اور ائمہ کے لیے دعا کرنا حق ہے، ان کے خلاف بغاوت کرنا نا درست اور باغی کے رجوع کرنے تک اس سے لڑائی کرنا جائز ہے۔

⑳ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان جو جھگڑے ہوئے، انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی زبان کو ان سے روک کر رکھے اور ایسی کوئی بات نہ کہے جس میں ان کا عیب نکلے۔ نیز اسے چاہیے کہ وہ ازواج مطہرات سمیت سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے اللہ تعالیٰ سے طالب رحمت ہو اور سب کی عظمت و حرمت نگاہ میں رکھے اور ان کے لیے دعا کرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں سارے مسلمانوں کی مائیں تھیں۔

㉑ انسان کسی شخص کے لیے جنت کو واجب نہ کہے، اگرچہ اس کے اعمال نیک ہوں جب تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت کے ساتھ اسے جنت میں داخل نہ کر دے۔

㉒ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک مخلوق کی ایک اجل مقرر کر دی ہے، جب تک وہ مقرر کردہ وقت نہیں آتا اس وقت تک کوئی مر نہیں سکتا، پھر جب وہ وقت آ جاتا ہے تو ایک سانس کم اور زیادہ نہیں ہوتا اور جو شخص مر گیا یا مارا گیا، اس کی اجل پوری ہو چکی تھی۔

﴿أَيْنَ مَا تَكُونُوا يُدْرِكْكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ﴾ [النساء: ٧٨]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٦٢)

[تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تمھیں پا لے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو]

۴۳ اللہ تعالیٰ نے شیطانوں کو پیدا کیا ہے، جو لوگوں کو بہکاتے ہیں اور انھیں سیدھی راہ پر چلنے سے روکتے ہیں، مگر اللہ کے خاص بندوں پر ان کا زور نہیں چلتا، ان کا زور تو اپنے دوستوں اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے والوں پر چلتا ہے۔

۴۴ دنیا میں جادو اور جادوگر موجود ہیں، لیکن وہ کسی کو اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ جو جادوگر کو نافع یا ضار سمجھے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے والا ہے۔ ساحر سے توبہ کرائی جائے اگر نہ کرے تو اس کی گردن مار دی جائے۔ جادو کے حلال ہونے کا قائل بھی واجب القتل ہو جاتا ہے۔

۴۵ ہر شراب، جو نشہ پیدا کرے، تر انگور کی ہو یا خشک انگور کی، کھجور کی ہو یا شہد کی، جوار کی ہو یا کسی اور چیز کی، تھوڑی ہو یا زیادہ، پاک ہو یا نجس، حرام ہے اور اس کے پینے سے حد لازم آتی ہے۔

۴۶ اول وقت میں نماز ادا کرنا دیر کر کے پڑھنے سے افضل ہے۔ امام کے پیچھے سورۃ الفاتحہ پڑھنا ضروری ہے اور رکوع وسجود کا پورا اور صحیح ادا کرنا لازمی ہے، اس عمل کو اطمینان اور اعتدال کہتے ہیں اور یہ نماز میں واجب ہے۔ علمائے حدیث سونے کے بعد تہجد پڑھنے، صلہ رحمی کرنے، سلام عام کرنے، کھانا کھلانے اور مسافروں کی ضیافت کرنے، فقیروں، مسکینوں اور یتیموں پر رحم اور شفقت کرنے، مسلمانوں کا کام نکالنے، کھانے پینے، جماع اور لباس میں حرام سے بچنے، نیک کاموں میں کوشش کرنے، نیک باتوں کا حکم دینے، بری باتوں سے منع کرنے اور نیکی کی طرف جلدی کرنے کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔ نیز یہ لوگ دین کے لیے محبت کرتے اور اسی کی خاطر دشمنی رکھتے ہیں، اللہ کی ذات وصفات میں جھگڑنے سے پرہیز کرتے ہیں، اہلِ بدعت اور گمراہ لوگوں سے جدا رہتے ہیں، بد مذہبوں اور جاہلوں کو دشمن رکھتے ہیں اور دین میں سلف صالحین کی پیروی کرتے ہیں۔

۴۷ اہلِ بدعت کی علامات اور نشانیاں بڑی واضح ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اہلِ حدیث سے دشمنی رکھتے ہیں اور انھیں حقیر جانتے ہیں، کبھی ان کا نام حشویہ رکھتے ہیں تو کبھی جہلہ اور کبھی مشبہہ۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث علم سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ ان کے

نزدیک علم وہی ہے جو شیطان نے انھیں سمجھا دیا ہے یا ان کے جاہلانہ خیالات اور جھوٹے وساوس کا نام علم ہے۔ اسی طرح کے لوگوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے اور انھیں اندھا اور بہرا کر دیا ہے۔ خبردار! جسے اللہ تعالیٰ ذلیل کر دے، اسے کون عزت دے سکتا ہے؟

امام ابن قطان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں کوئی ایسا بدعتی نہیں ہے جو اہلِ حدیث سے دشمنی نہ رکھتا ہو۔ پھر جو شخص بدعت ایجاد کرتا ہے اس کے دل سے حدیث کی لذت اور مزہ جاتا رہتا ہے۔ ابونصر بن سلام فقیہ کہتے ہیں: بے دینوں پر اس سے زیادہ بھاری بات کوئی نہیں ہے کہ وہ حدیث سنیں اور اسے روایت کریں۔ فقیہ، حدیث احمد بن اسحاق رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا تم کب تک "حدثنا" کہو گے؟ شیخ نے فرمایا: اے کافر! میرے پاس سے اٹھ جا اور دوبارہ کبھی میرے گھر میں نہ آنا۔ انتھیٰ حاصلہ.

میں کہتا ہوں: شیخ امام اسماعیل صابونی رحمہ اللہ جن کی کتاب کا یہ خلاصہ ہے، وہ ۳۷۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے انھیں امام المسلمین اور شیخ الاسلام قرار دیا ہے۔ امام الحرمین نے کہا ہے: مجھے عقائد و مذہب میں شک رہتا تھا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا، آپ ﷺ نے فرمایا: عقائدِ صابونی کا اتباع کرو۔ انتھیٰ

امام ذہبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ صابونی فقیہ، محدث، حافظ، صوفی، شیخ نیساپور، سنت کو قائم کرنے اور بدعت کو نیست و نابود کرنے والے تھے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو۔ چار محرم ۴۵۹ھ بروز جمعہ ان کا انتقال ہوا۔ انھیں قرآن مجید کی چند آیات سن کر ایسی تاثیر ہوئی کہ ساتھ روز تک مضطرب رہ کر انتقال کر گئے، إنا لله وإنا إليه راجعون.

انھوں نے عقائد کا جو بیان کیا ہے کتاب وسنت کے میزان میں ان کا وزن ہو چکا ہے۔ ان عقائد کے سوا ان کی ایک اور ضخیم کتاب ہے جس میں انھوں نے بادلائل اصولِ دین کا بیان کیا ہے، لیکن مجھے وہ کتاب میسر نہیں آسکی۔ اس رسالے میں بھی انھوں نے بعض دلائل کا ذکر کیا ہے اور ائمہ سلف کا حوالہ دیا ہے، مگر یہاں اختصار کی غرض سے وہ دلائل حذف کر دیے گئے ہیں۔ عقائدِ صابونی کا اردو ترجمہ علاحدہ طبع ہو چکا ہے۔ جزاهم الله تعالیٰ عنا خيرا.

آٹھویں فصل

عقائدِ نسفی کا بیان

اہلِ حق نے کہا ہے کہ اشیا کے حقائق ثابت ہیں اور سوفسطائیہ کے خلاف ان حقائق کے ساتھ علم متحقق ہے۔ مخلوق کے لیے علم کے اسباب تین ہیں: ① حواسِ سلیمہ ② خبرِ صادق ③ عقل۔ جہاں تک حواس کا تعلق ہے تو وہ پانچ ہیں: ① سننا، ② دیکھنا، ③ سونگھنا، ④ چکھنا، ⑤ چھونا۔

خبرِ صادق دو طرح کی ہوتی ہے:

① خبرِ متواتر جو ایسی قوم کی زبانوں سے ثابت ہوئی ہو جن کا جھوٹ پر اتفاق کرنا غیر متصور ہے، اس خبر سے علم ضروری حاصل ہوتا ہے جیسے گذشتہ زمانوں میں گذشتہ بادشاہوں کا علم اور دور کے شہروں کا علم۔

② معجزے کے ساتھ موید رسول کی خبر۔ اس خبر سے علمِ استدلال حاصل ہوتا ہے، جو علم اس خبر سے ثابت ہوتا ہے وہ اسی علم کی مانند ہے جو بالضرورت ثابت ہے۔ یقین وثبات کے حصول میں مطابقِ جازم اعتقاد کے معنی میں یہی علم ثابت ہے اور اگر یہ بات نہ ہو تو پھر وہ خبر ظن یا جہل یا تقلید ٹھہرے گی۔ عقل بھی علم کا ایک سبب ہے اور جو بات بالبداہت عقل سے ثابت ہوتی ہے وہ ضروری ہے، جیسے یہ علم کہ شے کا کل اس کے جز سے بڑا ہوتا ہے۔ جو علم استدلال سے ثابت ہوتا ہے وہ اکتسابی ہے۔ رہا الہام تو اہلِ حق کے نزدیک وہ کسی چیز کی صحت کی معرفت کے اسباب میں سے نہیں ہے۔

① عالم اپنے تمام اجزا کے ساتھ محدث ہے، کیونکہ یہ عین اور عرض ہے۔ عین وہ ہے جو بذات خود قائم ہو، پھر اگر مرکب ہے تو جسم ہے اور اگر غیر مرکب ہے تو جوہر ہے۔ اسی کو "جز لا يتجزى" [وہ جزو جس کی تقسیم نہیں ہوتی] کہتے ہیں۔ عرض وہ ہے جو خود قائم نہ ہو بلکہ جسم و جوہر میں پیدا ہو، جیسے طرح طرح کے رنگ اور الوان اور ہر طرح کے اکوان جیسے حرکت، سکون، اجتماع، افتراق

اور ہر طرح کے مزے اور ہر طرح کی بو، تو یہ عالم قابل فنا ہے، کل شي هالك إلا وجهه.

② اس عالم کا محدِث وموجد اللہ تعالیٰ ہے، اس کی ذات واحد، قدیم، حی، قادر، علیم، سمیع، بصیر، شائی اور مرید ہے۔ وہ عرض، جسم، جوہر، مصور، محدود، معدود، متبعض، متجزی، ان دونوں سے مترکب، متناہی، موصوف بمائیت وکیفیت اور کسی مکان کے اندر متمکن نہیں ہے۔ اس پر کوئی زمانہ جاری ہوتا ہے اور نہ کوئی چیز اس کے مشابہ ہے۔[1] کوئی چیز اس کے علم وقدرت سے باہر نہیں ہے۔

③ اللہ تعالیٰ کی ازلی صفات اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہیں، نہ وہ عین ہیں اور نہ غیر۔[2] وہ صفات درج ذیل ہیں: ① علم ② حیات ③ سمع ④ بصر ⑤ ارادہ ⑥ مشیت ⑦ فعل ⑧ تخلیق ⑨ ترزیق ⑩ کلام۔

④ اللہ کا کلام اللہ کی ازلی صفت ہے جو حرف وصوت کی جنس سے نہیں ہے۔[3] یہ صفت سکوت وآفت کے منافی ہے۔ اللہ تعالیٰ متکلم، آمر، ناہی اور مخبر ہے۔ قرآن مجید اس کا غیر مخلوق کلام ہے، جو مصاحف میں لکھا ہوا ہے، دلوں میں محفوظ ہے، زبان پر پڑھا جاتا ہے اور کانوں سے سنا جاتا ہے، لیکن اس نے ان سب مین حلول نہیں کیا ہے۔

⑤ تکوین اللہ تعالیٰ کی ایک ازلی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس جہان کو اس کے تمام اجزا کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ تکوین ازل میں تھی اور مکون اپنے وقت پر حادث ہوا۔ یہ تکوین ہمارے [ماتریدیہ کے]

---

[1] یہ سارے الفاظ اہلِ کلام اور مبتدعین کے تراشیدہ ہیں۔ ان میں سے کوئی لفظ قرآن یا حدیث میں نہیں آیا۔ متکلمین نے رب جل جلالہ کی تنزیہ کے لیے یہ الفاظ از خود ہی تراشے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سلفِ امت کو اس تراش خراش سے ہمیشہ عافیت میں رکھا۔ کتاب وسنت کے کلمات میں تنزیہ وتقدیس ہے جو ان الفاظِ مخترعہ اور عبارات محدثہ سے بے پروا کرتی ہے، خواہ ان الفاظ کے معانی فی نفسہا صحیح ہوں۔ [مولف رحمہ اللہ]

[2] ہمیں ایسے مسائل میں خوض وبحث کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں، کیوں کہ سلف صالحین نے جس بات سے تعرض نہیں کیا، اس میں خوض کرنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انسان حق کو ناحق یا باطل کو حق سمجھ بیٹھے اور اپنا ہی نقصان کر لے۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنی صفات سے متعلق سب سے زیادہ جاننے والا ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

[3] متعدد مرتبہ گزر چکا ہے کہ باری تعالیٰ کے کلام سے حرف وصوت کی نفی کرنا کتاب وسنت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ پر قول، کلمہ، کلمات، حدیث، حرف اور صوت کا اطلاق قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ اللہ اور اس کا رسول جس لفظ وعبارت کا اطلاق وتلفظ کریں، کسی بشر کو اس کے انکار کا حق نہیں پہنچتا، کیونکہ ایسا انکار کتاب وسنت کے انکار کے مترادف ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

نزدیک الگ چیز ہے اور مکون الگ چیز ہے، کیونکہ فعل مفعول کے مغایر ہوا کرتا ہے۔

⑥ ارادہ اللہ تعالیٰ کی ایک ازلی صفت ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی مثل، شبہ، ضد، ند، ظہیر اور معاون نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے غیر کے ساتھ متحد ہوتا ہے نہ غیر میں حلول کرتا ہے۔ وہ تو جمیع صفاتِ کمال کے ساتھ متصف ہے اور تمام سمات، نقص اور زوال سے منزہ اور پاک ہے۔

⑦ اللہ تعالیٰ کو آنکھ سے دیکھنا عقلاً جائز اور نقلاً واجب ہے۔ سمعی دلیل نے مومنوں کے لیے آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رویت کو واجب بتلایا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دن نظر آئے گا، لیکن آمنے سامنے اور اتصالِ شعاع یا دیکھنے والے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ثبوتِ مسافت کے طور پر کسی مکان اور جہت میں نہیں۔[1] یوں مسلمان قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے۔

⑧ بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ کفر ہو یا ایمان، طاعت ہو یا عصیان؛ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ارادے، مشیت، حکم اور قضا و تقدیر سے ہوتا ہے۔

⑨ بندوں کے اختیاری افعال پر، اگر وہ اطاعت والے ہیں، ثواب اور اگر معصیت و نافرمانی پر مشتمل ہیں تو عقاب کیا جاتا ہے۔ اچھا عمل اللہ کی رضا سے ہے اور برا عمل اسے ناپسند ہے۔ وہ جسے چاہے ہدایت دے اور جسے چاہے گمراہ کرے۔

⑩ استطاعت فعل کے ہمراہ ہے۔[2] یہی استطاعت اس قدرت کی حقیقت ہے جس سے فعل ہوا کرتا ہے۔ یہ نام سلامتِ اسباب، آلات اور جوارح پر بولا جاتا ہے اور صحتِ تکلیف کا اعتماد اسی استطاعت پر ہے۔ جو چیز بندے کی وسعت اور طاقت میں نہیں ہوتی، بندے کو اس کی تکلیف نہیں دی جاتی۔

⑪ مار کے بعد جو درد ہوتا ہے اور توڑنے کے بعد جو شکستگی شیشے میں پائی جاتی ہے، یہ سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، بندے کو اس کے پیدا کرنے میں کوئی دسترس نہیں ہے۔

---

[1] اہلِ حدیث کے نزدیک ان الفاظ کے ساتھ بحث کرنا بدعت ہے۔ کیوں کہ کتاب و سنت سے فقط رویتِ باری تعالیٰ کا ثبوت ملتا ہے اس میں ان قیود کا وجود نہیں۔ ہم کون ہیں جو اس میں خوض کریں اور عقیدے کے مسئلے میں حیص بیص کے سبب راہِ صواب سے دور جا پڑیں، وباللہ العصمۃ۔ [مولف رحمہ اللہ]

[2] یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ ایسی بحث میں سلف نے کوئی بحث و کلام نہیں کیا۔ [مولف رحمہ اللہ]

⑫ مقتول اپنی اجل سے مرتا ہے، موت جو میت کے ساتھ قائم ہے یہ بھی اس کی مخلوق ہے، جس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ﴾ مرگ اور مدتِ مرگ ایک ہی چیز ہے۔

⑬ حرام بھی رزق ہے، اللہ تعالیٰ جسے چاہے ہدایت پر لگائے اور جسے چاہے گمراہ کر دے۔

⑭ جو بات بندے کے حق میں زیادہ بہتر اور مفید ہے وہ اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فعل کسی غرض سے نہیں ہوتا ہے۔ اس کے سوا کوئی حاکم نہیں ہے۔ اشیا کی اچھائی اور برائی میں عقل کا کچھ دخل نہیں ہے۔

⑮ کفار اور بعض گناہ گار مومنوں کے لیے قبر کا عذاب اور اہلِ طاعت کے لیے قبر کا آرام علمِ الٰہی کے مطابق ثابت ہے۔ اسی طرح منکر ونکیر کا سوال اور مرنے کے بعد اٹھنا حق ہے۔ اعمال کا وزن، کتابِ اعمال کا ملنا، حساب کا لیا جانا، سوال کا ہونا، حوض، صراط، جنت اور جہنم کا وجود حق ہے۔ جنت اور دوزخ دونوں اس وقت مخلوق اور موجود ہیں جو باقی رہیں گی، ان میں رہنے والے لوگ فنا نہیں ہوں گے۔

⑯ کبیرہ گناہ مومن کو ایمان سے خارج کرتا ہے نہ کفر میں داخل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ شرک کو نہیں بخشتا ہے، البتہ جو گناہ شرک سے کم ہیں، جیسے صغائر اور کبائر تو یہ گناہ جس کے لیے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ صغیرہ گناہ پر عقاب کرے اور کبیرہ گناہ کو معاف کر دے بشرطے کہ کسی حرام کو حلال نہ ٹھہرایا ہو۔ کبیرہ گناہ کو حلال سمجھنا کفر ہے۔

⑰ رسولوں اور نیک لوگوں کا اہلِ کبائر کے حق میں شفاعت کرنا مشہور احادیث سے ثابت ہے۔ مومنوں میں سے اہلِ کبائر ہمیشہ آگ میں نہیں رہیں گے، اگرچہ توبہ کے بغیر مر گئے ہوں۔

⑱ ایمان یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے، اسے سچ جانے، یعنی دل اور زبان سے اس کا اقرار کرے۔ رہے اعمال تو وہ بڑھتے رہتے ہیں۔ اور جہاں تک ایمان کا تعلق ہے تو وہ بڑھتا ہے نہ کم ہوتا ہے۔[1] ایمان واسلام ایک چیز ہے۔ جب بندے کی طرف سے تصدیق و اقرار پایا گیا تو اب وہ یوں کہہ سکتا ہے کہ میں سچ مچ مومن ہوں۔ اسے یوں نہ کہنا چاہیے کہ ان شاء اللہ

---

① کتاب وسنت ایمان کے زیادت ونقصان پر شاہد ہیں۔ لہٰذا اس میں تاویل کی کوئی حاجت نہیں ہے، ہمارے لیے بس قرآن وحدیث پر ایمان لانا ہی کافی ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

میں مومن ہوں۔[1] نزع اور مایوسی کے وقت کا ایمان قبول نہیں ہوتا ہے۔

(۱۹) نیک بخت بد بخت ہو جاتا ہے اور بد بخت نیک بخت بن جاتا ہے، یہ تغیر نیک بختی اور بد بختی پر واقع ہوتا ہے نہ کہ نیک بخت بنانے اور بد بخت بنانے پر، کیونکہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی صفتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر تغیر نہیں آتا ہے۔

(۲۰) رسول مبعوث کرنے میں حکمت ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے جنسِ بشر سے بشارت سنانے اور ڈرانے کا کام دے کر رسول بھیجے، جنھوں نے دین ودنیا کے ان امور کو بیان کیا جن کے سارے لوگ محتاج تھے اور پھر ان رسولوں کو خرق عادات معجزوں سے موید فرمایا۔

(۲۱) سب سے اول نبی ابو البشر آدم علیہ السلام ہیں اور آخری نبی محمد ﷺ ہیں۔ بعض احادیث میں پیغمبروں کی گنتی اور تعداد بیان ہوئی ہے، لیکن اولیٰ یہ ہے کہ معین تعداد پر اقتصار نہ کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ﴾ [المؤمن: ۷۸]

[ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا حال ہم نے تجھے سنایا اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا حال ہم نے تجھے نہیں سنایا]

کیوں کہ ذکر عدد میں اس بات کا خطرہ ہے کہ غیر نبی انبیا میں داخل ہو جائے اور کوئی نبی انبیا میں سے خارج ہو جائے۔ یہ سارے پیغمبر سچے، خیر خواہ، معصوم اور غیر معزول تھے۔

(۲۲) انبیا میں سے سب سے افضل محمد ﷺ ہیں۔ ملائکہ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور انھیں جو حکم ہوتا ہے وہی بجا لاتے ہیں، وہ مذکر ہیں نہ مونث۔

(۲۳) اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں پر اپنی کتابیں نازل فرمائیں اور ان کتابوں میں امر، نہی اور وعد و وعید کو بیان کیا۔ اللہ تعالیٰ کے نام توقیفی ہیں۔

(۲۴) رسول اللہ ﷺ کو حالت بیداری میں بدن کے ساتھ آسمان پر پھر اوپر کی جانب جہاں تک اللہ تعالیٰ نے چاہا معراج ہوئی۔ آپ ﷺ کی امت تمام امتوں میں سے بہترین امت ہے۔

---

[1] سلف سے "ان شاء اللہ" کہنا ثابت ہے اور یہ اس لفظ میں کوئی شک کی وجہ سے نہیں ہے۔ یہ محاورہ کتاب وسنت میں موجود ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

آپ ﷺ کی شریعت اکمل شرائع ہے۔ آپ ﷺ کا دین جملہ ادیان کا ناسخ اور آپ ﷺ کے اصحاب امت کے بہترین افراد ہیں۔

(۲۵) اولیا کی کرامات حق ہیں۔ نقضِ عادت کے طور پر ولی کے لیے کرامت کا ظہور ہوتا ہے، جیسے دراز مدت کی مسافت کو قلیل مدت میں طے کرنا، پانی پر چلنا، ہوا میں اڑنا، جمادات اور جانوروں کا بات کرنا، مصیبت کا دفع کرنا، اعدا کی مہم کو کفایت کرنا اور اس کے سوا اس طرح کی دیگر چیزیں۔ امت میں سے جس کسی شخص کے ہاتھ پر یہ کرامت ظاہر ہوتی ہے تو حقیقت میں یہ رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ہے، کیونکہ اس کرامت سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ شخص اللہ کا ولی ہے اور ولی تو صرف وہی ہوتا ہے جو اپنی دیانت میں پختہ ہو اور دیانت یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار کرنے والا ہو۔

(۲۶) نبی ﷺ کے بعد افضل البشر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، پھر عمر فاروق، پھر عثمان ذوالنورین اور پھر علی مرتضی رضی اللہ عنہم ہیں۔ ان کی خلافت اسی ترتیب پر ہوئی ہے۔ ان کی خلافت کا زمانہ تیس برس رہا، پھر اس خلافت کے بعد بادشاہی اور امارت ہے۔ مسلمانوں کے لیے ایک امام کا ہونا ضروری ہے جو احکام نافذ کرے، حدود قائم رکھے، سرحدوں کی حفاظت کرے، فوج تیار کرے، صدقات وصول کرے، رہزنوں اور چوروں کو زیر کر کے دبا کر رکھے، جمعہ اور عیدین قائم کرے، بندوں کے درمیان جو جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں، ان کا فیصلہ کرے، حقوق پر قائم ہونے والی گواہی کو قبول کرے، اولیا کے بغیر بچے بچیوں کی شادی کروا دے اور مال غنیمت کو تقسیم کرے، یہ امام ظاہر ہو، مخفی نہ ہو، قریش میں سے ہو کسی اور قوم میں سے نہ ہو، اگرچہ امامت بنو ہاشم یا اولادِ علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ امام کا معصوم ہونا شرط ہے اور نہ یہ شرط ہے کہ وہ اہلِ زمانہ سے افضل ہو اور نہ یہ کہ وہ مطلق طور پر کامل ولایت والا ہو۔ بس اتنا کافی ہے کہ سیاست کرنے والا، تنفیذِ احکام، حفظِ حدودِ اسلام اور مظلوم کے لیے ظالم سے انصاف لینے دینے پر قادر ہو۔ بدعملی اور ظلم کے سبب امام معزول نہیں ہو سکتا ہے۔

(۲۷) ہر نیک و بد کے پیچھے نماز ادا کرنا جائز ہے اور یہی حال ہر نیک و بد کی نمازِ جنازہ پڑھنے کا ہے۔

(۲۸) خیر کے سوا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذکر سے ہم باز رہتے ہیں۔ دس صحابیوں کے لیے جنت کی گواہی

دیتے ہیں۔ پھر اہلِ بدر، اہلِ احد اور اہلِ بیعت رضوان کے لیے بھی یہ شہادت دیتے ہیں۔

۲۹ ہم سفر و حضر میں موزوں پر مسح کرنے کے معتقد ہیں اور کھجوروں کے نبیذ کو حرام نہیں کہتے۔

۳۰ کوئی ولی انبیا کے درجے کو نہیں پہنچتا اور نہ کوئی بندہ اس رتبے کو کہ اس سے امر و نہی کی تکلیف اور ذمے داری ساقط ہو جائے۔

۳۱ نصوص اپنے ظواہر پر محمول ہیں۔ اہلِ باطن اور اہلِ الحاد جن معانی کا ادعا کرتے ہیں، ہمیں ان کی طرف نہ جانا چاہیے۔ نصوص کا رد کرنا کفر ہے۔ نافرمانی خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، اس کو حلال جاننا کفر ہے۔ اسی طرح معصیت کو معمول خیال کرنا اور شریعت سے استہزا کفر ہے۔ کفریہ عمل کے ساتھ مذاق کرنا کفر ہے یعنی بطور دل لگی کے کلمہ کفر کہنا۔ ہم مجذوب کو کافر نہیں کہتے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امن میں ہونا اور اس سے ناامید ہونا دونوں کفر ہیں۔ غیبی امور میں کاہن کی تصدیق کرنا کفر ہے۔ معدوم کوئی چیز نہیں ہے۔

۳۲ زندوں کی مردوں کے حق میں دعا اور صدقہ نفع مند ہے، اللہ تعالیٰ دعائیں قبول کرنے والا اور حاجتیں پوری کرنے والا ہے۔ ایمان خوف و رجا کے درمیان ہوتا ہے۔

۳۳ رسول اللہ ﷺ نے قیامت کی جن نشانیوں جیسے خروجِ دجال، دابۃ الارض، یاجوج ماجوج، عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے زمین پر نزول اور مغرب کی جانب سے طلوعِ آفتاب کی خبر دی ہے وہ سب حق ہے۔

۳۴ مجتہد سے خطا اور صواب دونوں ہوتے ہیں، اسے اصابت پر دو اجر اور خطا پر ایک اجر ملتا ہے۔ ہم کسی اہلِ قبلہ کو کافر نہیں کہتے، اگرچہ اس کے بعض کلمات سے کفر لازم آتا ہو، لیکن جب تک وہ اس کا التزام نہ کریں یا جب تک وہ لزوم انتہائی طور پر ظاہر و باہر نہ ہو، ہم اس کی تکفیر نہیں کریں گے۔

۳۵ رسل بشر، رسلِ ملائکہ سے افضل ہیں۔ رسل ملائکہ عامہ بشر سے افضل ہیں اور عامہ بشر عامہ ملائکہ سے افضل ہیں۔ انتهیٰ كلام النسفي.

مذکورہ بالا عقائد میں سے ہر عقیدے کی دلیل ہماری کتاب "بغية الرائد في شرح العقائد" میں مذکور ہے۔ ان میں سے بعض عقائد پر انتقاد بھی کیا گیا ہے۔ فارجع إليه وعول عليه وبالله التوفيق.

نویں فصل

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کی تالیف "حادي الأرواح إلى بلاد الأفراح" کے مطابق عقائدِ حنابلہ کا بیان

ایمان:

ہر اہلِ حدیث کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں اور اس چیز کا اقرار کرے جو اللہ تعالیٰ کے پاس سے آئی ہے، نیز اس کا بھی جسے معتبر لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے۔

یہ [اہلِ حدیث] لوگ اس میں سے کسی چیز کا رد نہیں کرتے اور جانتے ہیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ایک اکیلا معبود اور بے نیاز ہے، اس کی بیوی ہے نہ اولاد اور یقیناً محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ ایمان قول وعمل اور سنت کے ساتھ تمسک کرنے کا نام ہے جو کم اور زیادہ ہوتا ہے۔ وہ ایمان میں ان شاء اللہ کہتے ہیں مگر شک کے طور پر نہیں، بلکہ یہ ایک طریقہ ہے جو علما کے درمیان جاری ہے۔ جب کوئی پوچھے کہ کیا تو مومن ہے؟ تو یہ جواب میں کہے: میں ان شاء اللہ تعالیٰ مومن ہوں، یا یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں کہ میں مومن ہوں، میں اللہ تعالیٰ، اس کے ملائکہ اور رسولوں پر ایمان لایا۔ جس نے یہ گمان کیا کہ ایمان بلا عمل قول کا نام ہے تو وہ مرجی ہے۔ جس نے یہ گمان کیا کہ ایمان صرف اقرار باللسان ہے اور اعمال تو صرف شرائع ہیں تو وہ بھی مرجی ہے، جس نے یہ گمان کیا کہ میرا ایمان جبریل اور ملائکہ کی مثل ہے تو وہ بھی مرجی ہے، جس نے یہ گمان کیا کہ معرفت دل میں ہوتی ہے گو منہ سے نہ کہے تو وہ بھی مرجی ہے۔

تقدیر:

تقدیر کی نیکی اور بدی، تھوڑا اور بہت، ظاہر اور باطن، شیریں اور تلخ، محبوب اور مکروہ، خوب اور

زشت، اول اور آخر سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اس کا ایک حکم ہے جو سب بندوں پر جاری ہے۔ اس کی ایک قدر ہے جسے اس نے ان پر مقدر کیا ہے۔ کوئی نفس اس کی مشیت اور قضا سے تجاوز نہیں کرتا، بلکہ سارے لوگ وہی کام کرتے ہیں جس کے لیے اس نے ان کو پیدا کیا ہے۔ جو کچھ ان کی تقدیر میں لکھا ہے اس میں وہ گرفتار ہوتے ہیں یہ اس کا عدل ہے۔ زنا، چوری، شراب خوری، قتلِ نفس، مالِ حرام کھانا، شرک اور سارے گناہ کرنا اللہ کی قضا وقدر ہے بغیر اس کے کہ مخلوق میں سے کسی کو اللہ تعالیٰ پر کوئی حجت ہو، بلکہ اس کی حجتِ بالغہ ان پر قائم ہے، اس سے کوئی کچھ نہیں پوچھ سکتا، یہی پوچھے جاتے ہیں۔

علمِ الٰہی:

اس کا علم اس کی مشیت کے موافق مخلوق میں جاری ہے۔ وہ ابلیس وغیرہ نافرمانوں کی نافرمانی کو جانتا تھا جب انھوں نے اس کی وہ نافرمانی کی ہے اور قیامت کے قائم ہونے تک اس نے نافرمانوں کو نافرمانی کے لیے پیدا کیا ہے، اس نے اہلِ طاعت سے طاعت کو معلوم کر لیا ہے۔

مشیت و ارادہ:

ہر کوئی وہی کام کرتا ہے جس کام کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے، وہ اللہ ہی کے حکم کی طرف لوٹتا ہے، اللہ تعالیٰ کی مشیت اور تقدیر سے کوئی تجاوز نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ ہی ہے جو چاہے سو کرے۔ جو شخص یہ گمان کرے کہ اللہ تعالیٰ نے تو یہ چاہا تھا کہ نافرمان لوگ خیر وطاعت بجا لائیں لیکن بندوں نے اپنے لیے شر اور معصیت چاہی اور اپنی خواہش کے مطابق کام کیا تو وہ شخص یہ گمان رکھتا ہے کہ گویا بندوں کی خواہش اللہ تعالیٰ کی خواہش پر غالب ہے، اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ پر اور کیا افترا ہوگا۔ جس نے یہ گمان کیا کہ زنا تقدیر سے نہیں ہے اسے یہ کہنا چاہیے کہ بھلا یہ عورت جو زنا سے حاملہ ہوئی ہے اور اس نے بچہ جنا ہے، اللہ نے اس بچے کو پیدا کرنا چاہا تھا یا نہیں؟ اگر وہ کہے: نہیں، تو اس نے یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور خالق بھی ہے اور یہ کھلا شرک ہے اور جس نے یہ گمان کیا کہ زنا، چوری، بادہ نوشی اور حرام مال کھانا قضا وقدر سے نہیں ہے تو اس نے یہ گمان کیا کہ آدمی اس بات پر قادر ہے کہ کوئی دوسرا اس کا رزق کھا جائے، جو صرف مجوسیوں کا قول ہے، بلکہ اس نے تو اپنا ہی کھایا ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقدر کیا تھا اور اسی طرح کھایا جیسے اس کی تقدیر میں تھا، جس نے یہ گمان کیا

کہ قتلِ نفس اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں سے نہیں ہے تو اس نے یہ گمان کیا کہ مقتول بے موت مر گیا ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا کفر ہوگا، بلکہ یہ کام اللہ ہی کے حکم سے ہوا ہے یہ اس کا عدل ہے، اس کی خلق پر اس کے علم کے موافق اس کی تدبیر ہے، جو کچھ اس نے کیا وہ سچا عدل ہے، اللہ تعالیٰ کے علم کے معترف کو یہ لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت کا اقرار کرنے والا ہو۔

کسی کے حق میں دوزخ کی گواہی:

کوئی شخص اہلِ قبلہ میں سے کسی آدمی کے حق میں یہ گواہی نہ دے کہ وہ دوزخ میں ہے، کسی ایسے گناہ کے سبب جس کا وہ مرتکب ہوا ہے یا کسی کبیرہ گناہ کی وجہ سے جو اس سے سرزد ہوا ہے الا یہ کہ کسی نص یا حدیث میں آیا ہو۔ اسی طرح کسی کے جنتی ہونے کی گواہی نہ دے کسی نیک کام کے سبب جو اس نے کیا ہے یا کسی بھلائی کے باعث جو اس سے ہوئی ہے، مگر یہ کہ کسی حدیث میں آیا ہو۔

خلافت کا حق دار:

جب تک قریش میں سے دو آدمی بھی باقی رہیں خلافت و سلطنت انھیں میں ہے۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ بادشاہی میں قریش سے جھگڑا کرے یا ان پر خروج کرے یا غیر قریش کے لیے خلافت کا اقرار کرے۔

بادشاہ کے حقوق:

جہاد کا حکم قیامِ قیامت تک جاری ہے۔ جہاد ہر امام کے ساتھ قائم ہے وہ امام خواہ نیک ہو یا بد، اس جہاد کو ظالم کا ظلم اور عادل کا عدل باطل نہیں کرتا۔ جمعہ، دونوں عیدیں اور حج بادشاہ کے ساتھ ہوتا ہے اگرچہ وہ نیک، عادل اور متقی نہ ہو۔ رعایا صدقات، خیرات، عشر، خراج، فے اور مالِ غنیمت بادشاہ کو دے، اب بادشاہ پر ہے کہ وہ اس میں عدل کرے یا ظلم۔ اللہ تعالیٰ نے جسے والی امر بنایا ہے مسلمان اس کی اطاعت کرے اس کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچے اور اس پر تلوار لے کر خروج نہ کرے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کوئی راہ نکالے۔ بادشاہ کی سمع و طاعت کرے، اس کی بیعت کو نہ توڑے، جو کوئی ایسا نہ کرے گا وہ بدعتی، سنت کا مخالف اور مفارقِ جماعت ہے۔ بادشاہ اگر ایسے کام کا حکم دے جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہے تو اس میں بادشاہ کی اطاعت نہیں ہے۔ بادشاہ پر خروج کرنا اور اس کے حق کو روکنا درست نہیں ہے۔

فتنے کے وقت:

فتنے میں رک جانا ایک سنت ماضیہ ہے اور اس سنت کا لازم پکڑنا واجب ہے۔ پھر اگر انسان اس فتنے میں مبتلا ہو جائے تو اپنے نفس کو آگے کرے نہ کہ اپنے دین کو۔ ہاتھ اور زبان سے فتنے کی مدد نہ کرے، ہاں اسے زبان سے روکے، اللہ تعالیٰ اس کا مددگار ہوگا۔

تکفیر:

اہلِ قبلہ سے رک جائے، کسی عمل کے سبب جیسے ترکِ نماز اور بادہ نوشی وغیرہ، انھیں اسلام سے خارج نہ کرے اور انھیں کافر نہ کہے الا یہ کہ حدیث میں آیا ہو تو اس کی تصدیق کرے اور حدیث کو مانے۔ یا وہ ایسی بدعت کا مرتکب ہو جس کا فاعل کفر یا اسلام سے خروج کی طرف منسوب ہو تو اسے کافر کہے، مگر حدیث کے الفاظ سے تجاوز نہ کرے۔

احوالِ آخرت:

کانا دجال یقیناً نکلنے والا ہے، وہ تمام جھوٹوں سے بڑا جھوٹا ہے۔ قیامت آنے والی ہے اس کے آنے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ مردوں کو قبروں سے اٹھائے گا۔ عذابِ قبر حق ہے۔ قبر میں بندے سے دین، رب تعالیٰ اور نبی کے متعلق سوال کیا جاتا ہے۔ منکر ونکیر حق ہیں اور یہ دونوں قبر کے دو فتان ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے ان کے سوال کے وقت ثابت قدمی کا سوال کرتے ہیں۔ جنت اور دوزخ حق ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا حوض حق ہے، آپ ﷺ کی امت اس حوض پر آئے اور اس کا پانی پیے گی۔ پل صراط حق ہے، یہ پل جہنم کی پشت پر رکھا جائے گا، اس پر سے سب آدمی گزریں گے۔ بہشت اس پل سے آگے ہوگی۔ ترازو حق ہے، اس میں یوں نیکیاں اور بدیاں تولی جائیں گی جس طرح اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ صور حق ہے، اسرافیل علیہ السلام اسے پھونکیں گے تو ساری مخلوق مر جائے گی۔ پھر دوسری بار پھونکیں گے تو سب لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے اور رب العالمین کی طرف آئیں گے۔ حساب کا ہونا، کتاب [نامہ اعمال] کا ملنا اور ثواب وعقاب کا ہونا حق ہے۔ بندوں کے افعال لوحِ محفوظ میں لکھے جاتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے فیصلہ فرمایا ہے اور تقدیر مقرر کی ہے۔ قلم حق ہے، اللہ تعالیٰ نے اس سے ہر

چیز کی تقدیر کو شمار کر کے اپنی یاد میں لکھ رکھا ہے۔

شفاعت:

قیامت کے دن شفاعت کا ہونا حق ہے، رسول اللہ ﷺ اس دن شفاعت کریں گے۔ آپ ﷺ کی شفاعت سے ایک قوم دوزخ میں جانے سے بچ جائے گی۔ ایک قوم ہمیشہ جہنم میں رہے گی اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو مشرک، کافر، منکر اور اللہ تعالیٰ کو جھٹلانے والے ہیں۔ اس دن موت کو بہشت اور دوزخ کے درمیان ذبح کر دیا جائے گا۔

جنت اور جہنم:

جنت اور جہنم اپنے اندر تمام چیزوں کے ساتھ پیدا ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جنت اور جہنم کے ان دونوں گھروں کے لیے لوگ بنائے ہیں۔ جنت اور جہنم کو فنا نہیں ہے اور نہ ان اشیا ہی کو فنا ہے جو ان دونوں کے اندر ہیں۔ اگر کوئی بدعتی، مخالف یا زندیق یہ دلیل لائے: ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ [القصص: ۸۸] [ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے، مگر اس کا چہرہ] یا اس جیسی کوئی اور متشابہ آیت یا حدیث پیش کرے تو اسے یہ کہا جائے گا کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے جس چیز پر ہلاکت وفنا کو لکھ دیا ہے وہ ہلاک اور فنا ہونے والی ہے مگر جنت اور جہنم کو اس نے بقا کے لیے پیدا کیا ہے نہ کہ فنا اور ہلاکت کے لیے۔ پھر یہ دونوں آخرت کے امور میں سے ہیں نہ من جملہ امورِ دنیا کے۔ نفخ صور اور قیامِ قیامت کے وقت یا کسی اور وقت حوریں فوت نہیں ہوں گی، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بقا کے لیے پیدا کیا ہے نہ کہ فنا کے لیے، اس نے ان پر موت نہیں لکھی ہے، اب جو کوئی اس کے خلاف کہے گا وہ بدعتی، مخالف اور راہِ مستقیم سے گمراہ ہے۔

صفاتِ باری تعالیٰ:

اللہ تعالیٰ کا ایک تخت ہے، اس تخت کو کچھ اٹھانے والے ہیں، اللہ تعالیٰ اس تخت کے اوپر ہے، اس کے لیے کوئی حد نہیں ہے، بلا کیف اس کے دو ہاتھ ہیں جس طرح اس نے فرمایا ہے:

﴿خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ [صٓ: ۷۵] [جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا]

نیز فرمایا:

﴿بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ [المائدة: ٦٤] [بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں]

پھر اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں، حدیث میں آیا ہے:

«وَكِلْتَا يَدَيْهِ يَمِيْنٌ»[1] [اس کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں]

بلا کیف اس کی دو آنکھیں ہیں، جس طرح اس نے فرمایا ہے:

﴿تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا﴾ [القمر: ١٤] [جو ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی]

اس کا چہرہ ہے، چنانچہ اس کا فرمان ہے:

﴿وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ﴾ [الرحمٰن: ٢٧]

[اور تیرے رب کا چہرہ باقی رہے گا، جو بڑی شان اور عزت والا ہے]

اسمائے حسنیٰ:

اللہ تعالیٰ کے ناموں میں نہ تو یہ کہیں گے کہ وہ غیر اللہ ہیں جس طرح معتزلہ اور خوارج نے کہا ہے اور نہ یہ کہیں گے کہ وہ عین ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام اشیا کا عالم ہے، جس طرح اس نے فرمایا ہے:

﴿اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ﴾ [النساء: ١٦٦] [اس نے اسے اپنے علم سے نازل کیا ہے]

نیز اس نے فرمایا:

﴿وَ مَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ﴾ [الفاطر: ١١]

[اور کوئی مادہ نہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ بچہ جنتی ہے مگر اس کے علم سے]

اسی طرح وہ سمیع وبصیر ہے۔ اس طرح نہیں جس طرح معتزلہ نے ان دونوں صفات کی نفی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ صاحبِ قوت ہے جس طرح اس نے فرمایا:

﴿هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً﴾ [فصلت: ١٥] [وہ قوت میں ان سے کہیں زیادہ سخت ہے]

زمین میں ہر نیکی اور بدی اس کے ارادے اور مشیت ہی سے ہوتی ہے۔ تمام باتیں اس کی خواہش ہی سے ہوتی ہیں، جس طرح اس نے فرمایا ہے:

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [التكوير: ٢٩]

[اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، جو سب جہانوں کا رب ہے]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٦٧)

مسلمانوں کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چاہا وہ ہوا اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا۔ کوئی شخص اس کے کرنے سے پہلے کچھ نہیں کر سکتا اور نہ اللہ تعالیٰ کے علم سے باہر ہو سکتا ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ یہ کام وہ نہیں کرے گا اسے کوئی نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خالق نہیں ہے۔ بندوں کے تمام کام اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں۔ بندے کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ ہی نے مومنوں کو اطاعت کی توفیق دی ہے اور کافروں کو ایمان والوں کے مقابلے میں بے یار ومددگار رکھا ہے۔ وہ مہربان ہے، اس نے ان کی طرف نظرِ رحمت سے دیکھا اور ہدایت فرمائی۔ وہ کافروں پر مہربان ہوا نہ ان کی اصلاح کی اور نہ ان کو راہ دکھائی۔ اگر وہ ان کو سنوارتا وہ سب صلحا ہو جاتے، اگر وہ انھیں راہ دکھاتا تو وہ سب راہ یاب اور کامیاب ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ سب کفار کو سنوار دے، ان پر مہربانی کرے، یہاں تک کہ وہ سب ایماندار ہو جائیں، جس طرح اس نے فرمایا ہے:

﴿فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ [الأنعام: ١٤٩]

[سو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ضرور ہدایت دے دیتا]

لیکن اس نے یہی چاہا کہ وہ کافر رہیں جس طرح کہ اس کے علم میں تھا، اس لیے ان سے دست کش ہو گیا، انھیں گمراہ کیا اور ان کے دلوں پر مہر لگائی۔

صفاتِ الٰہیہ:

اہلِ حدیث اس بات پر ایمان لائے ہیں کہ لوگ اپنے نفس کے نفع وضرر کے مالک نہیں ہیں مگر جو اللہ تعالیٰ چاہے۔ وہ اپنے تمام کاموں کو اللہ ہی کے حوالے کرتے ہیں، ہر وقت اپنی حاجت اللہ کی طرف پیش کرتے ہیں اور ہر حال میں اس کے در کے فقیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ سنتا ہے، شک نہیں کرتا، دیکھتا ہے شک نہیں کرتا، بے جہل کے علیم ہے، بے بخل کے جواد وسخی ہے، نسیان اور سہو کے بغیر حفیظ ہے، بے غفلت کے قریب ہے۔ وہ بولتا ہے، نظر کرتا ہے، ہنستا ہے، خوش ہوتا ہے، پسند کرتا ہے، مکروہ رکھتا ہے، دشمن رکھتا ہے، راضی ہوتا ہے، خفا ہوتا ہے، رحم کرتا ہے، بخشتا ہے، معاف کرتا ہے، دیتا ہے، روکتا ہے، اور ہر رات آسمان دنیا کی طرف جس طرح چاہتا ہے اترتا ہے۔ اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ سمیع وبصیر ہے۔ بندوں کے دل اس کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے انھیں الٹتا پلٹتا ہے۔ اس نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے اپنی صورت پر بنایا۔ قیامت کے دن آسمان وزمین

اس کی مٹھی میں ہوں گے۔ وہ اپنا قدم آگ میں رکھ دے گا، تب آگ کے اجزا آپس میں لپٹ سمٹ جائیں گے۔ وہ لوگوں کی ایک جماعت کو اپنے ہاتھ سے آگ میں سے نکالے گا۔ بہشت والے اس کے چہرے کی طرف دیکھیں گے، وہ ان کی آؤ بھگت کرے گا، ان کے لیے تجلی فرمائے گا، یقیناً اللہ تعالیٰ آنکھوں سے نظر آئے گا جس طرح چودھویں کا چاند دکھائی دیتا ہے، اسے سب مومن دیکھیں گے نہ کہ کافر، کیونکہ اللہ تعالیٰ کفار سے اوٹ میں ہوگا، چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿كَلَّآ إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ﴾ [المطففين: ١٥]

[ہرگز نہیں، بے شک وہ اس دن یقیناً اپنے رب سے حجاب میں ہوں گے]

یقیناً موسیٰ علیہ السلام نے دنیا میں اللہ تعالیٰ سے اس کی رویت کا سوال کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر تجلی کی تو وہ پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کو یہ بات بتلائی کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں دکھائی نہیں دیتا ہے، بلکہ آخرت میں نظر آئے گا۔

کلامِ الٰہی:

قیامت کے دن بندے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیے جائیں گے تو وہ خود ان کے حساب کا متولی ہوگا کوئی دوسرا محاسب نہیں ہوگا۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ تکلم کیا ہے، وہ مخلوق نہیں ہے، جس نے یہ گمان کیا کہ قرآن مجید مخلوق ہے وہ جہمی اور کافر ہے اور جس نے کلام کا اقرار کر کے مخلوق نہ ہونے میں توقف کیا وہ پہلے سے بھی زیادہ خبیث ہے۔ جس نے یہ گمان کیا کہ کلام تو اللہ تعالیٰ ہی کا ہے مگر ہماری تلاوت و قراءت مخلوق ہے وہ جہمی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود موسیٰ علیہ السلام سے باتیں کیں اور اپنے ہاتھ سے انھیں تورات عطا فرمائی اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے متکلم ہے۔

خواب:

خواب اللہ کی طرف سے سچی وحی ہوتی ہے۔ صاحبِ خواب اپنے پاکیزہ خواب میں کچھ دیکھے، کسی عالم سے وہ خواب بیان کرے، اگر وہ عالم اسے سچا سمجھے، صحیح طور پر کسی تحریف کے بغیر اس کی تاویل و تعبیر بیان کرے تو ایسے خواب کی تعبیر سچی ہوتی ہے۔ پیغمبروں کے خواب وحی تھے۔ جو شخص خواب پر طعن کرتا ہے اور اس کا گمان یہ ہے کہ خواب کوئی چیز نہیں ہے تو اس سے زیادہ اور کون جاہل ہوگا؟ خود قرآن میں خواب کا ذکر اور اس کی تعبیر بیان ہوئی ہے اور سنتِ صحیحہ سے ثابت ہے۔ جو شخص

خواب کا منکر ہے وہ اس بات کا بھی معتقد نہیں ہے کہ احتلام سے غسل کرنا واجب ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ خواب مومن کا ایک کلام ہے جو اس کے رب تعالیٰ نے اپنے بندے سے کیا ہے، کیونکہ سچا خواب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔

اسلام اور ایمان:

اہلِ حدیث اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ جو چیز آپ کو نہیں پہنچی وہ پہنچنے والی نہ تھی اور جو پہنچی ہے وہ چوکنے والی نہ تھی۔ اسلام یہ ہے کہ "لا إله إلا الله" کی گواہی دے۔ اہلِ حدیث کے نزدیک اسلام غیر ایمان ہے اور ایمان غیر احسان، جس طرح حدیثِ جبریل علیہ السلام میں آ چکا ہے۔ انھیں اس بات کا اقرار ہے کہ اللہ مقلب القلوب ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی امت کے اہلِ کبائر کی شفاعت کریں گے۔ مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے حق میں محاسبہ ہونا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونا حق ہے۔ اہلِ حدیث اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ ایمان قول وعمل کا نام ہے، وہ یہ نہیں کہتے کہ ایمان مخلوق ہے یا غیر مخلوق، ہاں یہ کہتے ہیں کہ اسمائے الٰہی عین الٰہی ہیں۔[1] وہ کسی کبیرہ گناہ کے مرتکب کو جہنمی کہتے ہیں نہ کسی موحد کو جنتی ہی ٹھہراتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ جہاں چاہے انھیں داخل کرے اور ان کا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے چاہے انھیں عذاب کرے اور چاہے بخش دے۔ وہ اس بات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ موحدین کی ایک قوم کو دوزخ سے باہر نکالے گا، جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں روایات مروی ہیں۔

خصومات:

اہلِ حدیث دین میں جھگڑے اور تقدیر میں خصومت کے منکر ہیں، جن میں یہ اہلِ جدل مناظرہ کیا کرتے ہیں۔ ہاں وہ صحیح روایتوں کو مانتے ہیں اور ان آثار کو، جو ثقات سے آئے ہیں اور ایک عادل نے دوسرے عادل سے ان کو روایت کیا ہے، وہ قبول کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ سلسلہ روایت رسول اللہ ﷺ تک جا پہنچے۔ وہ ''کیوں کر'' اور ''کس لیے'' نہیں کہتے، کیونکہ یہ کہنا بدعت ہے، ہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بدی کا حکم نہیں دیا ہے، بلکہ بدی سے منع کیا ہے اور بھلائی کا

[1] ممکن ہے ایسے ہی ہو، لیکن جب تک کوئی آیت اور صحیح حدیث اس پر دلالت نہ کرے، تب تک اس سے متعلق خاموشی ہی اولیٰ ہے۔ ہم اس کو ترک کرنے پر ان شاء اللہ تعالیٰ ماخوذ نہ ہوں گے۔ [مولف رحمہ اللہ]

حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ شرک سے راضی نہیں ہے، اگرچہ وہ شرک اس کے ارادے ہی سے ہوتا ہے۔ جو احادیث رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں، اہلِ حدیث ان کی تصدیق کرتے ہیں، جیسے یہ حدیث کہ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر رات، رات کے آخری حصے میں آسمانِ دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے اور کہتا ہے: کوئی استغفار کرنے والا ہے کہ میں اسے بخش دوں؟[1] الحدیث۔ وہ ہر اختلاف اور نزاع میں قرآن وحدیث سے تمسک کرتے ہیں، جس طرح کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾ [النساء: ٥٩]

[پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ]

وہ ائمہ دین اور سلف صالحین کے اتباع کو مانتے ہیں اور اس بات کے معتقد ہیں کہ جس چیز کا اللہ تعالیٰ نے اذن نہیں دیا ہے اپنے دین میں اس کا اتباع نہ کریں۔ وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے آنے کا اقرار کرتے ہیں جس طرح اس نے فرمایا ہے:

﴿وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ [الفجر: ٢٢]

[اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے جو صف در صف ہوں گے]

وہ جس طرح چاہتا ہے اپنی مخلوق کے نزدیک ہوتا ہے، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ [ق: ١٦]

[اور ہم اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں]

وہ عید، جمعہ اور جماعت کو ہر نیک و بد امام کے پیچھے ثابت کرتے ہیں۔ نیز وہ سفر و حضر میں موزوں پر مسح کو ثابت کرتے ہیں۔ وہ مشرکین کے ساتھ جہاد کو ثابت کرتے ہیں، اس وقت سے لے کر جب سے رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے اور جب تک مسلمانوں کی ایک جماعت دجال سے لڑے گی اور اس کے بعد قیامِ قیامت تک اسے ثابت کرتے ہیں۔

متفرق عقائد:

اہلِ حدیث اس بات کے معتقد ہیں کہ مسلمانوں کے لیے دعاے صلاح کی جائے اور ان پر تلوار لے کر خروج نہ کریں اور فتنے میں نہ لڑیں۔ دجال کا نکلنا سچ جانیں۔ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام آ کر

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٥٨)

اسے قتل کریں گے۔ معراج کا ہونا اور سوتے میں خواب کا ہونا حق ہے۔ مسلمان مُردوں کے لیے جو دعا کی جاتی ہے اور جو صدقہ ان کی طرف سے دیا جاتا ہے، وہ انھیں پہنچتا ہے۔ دنیا میں جادوگروں کا ہونا حق ہے، مگر جادوگر کافر ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ﴾

[البقرۃ: ۲ ۱۰۲]

[اور سلیمان نے کفر نہیں کیا اور لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے]

یہ جادو دنیا میں موجود ہے۔ ہر اہلِ قبلہ میت پر نمازِ جنازہ پڑھنا درست ہے خواہ وہ مومن ہو یا فاجر۔ رزق اللہ کی طرف سے ملتا ہے خواہ حلال ہو یا حرام۔ شیطان وسوسہ ڈال کر انسان کو شک میں مبتلا کرتا ہے۔

یہ امر جائز ہے کہ اللہ نیک بندوں کو اپنی نشانیوں کے ساتھ خاص کرے جو ان پر ظاہر ہوتی ہیں۔ قرآن مجید سے حدیث منسوخ نہیں ہوتی ہے۔ [بچپن میں فوت ہونے والے] بچوں کا اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے چاہے تو انھیں عذاب کرے اور چاہے تو ان سے وہ سلوک کرے جو وہ چاہے۔ جو کچھ بندے کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے، اس نے لکھ رکھا ہے کہ یوں ہوگا اور بندہ یوں کرے گا۔

اہلِ حدیث اس بات کے معتقد ہیں کہ اللہ کے حکم پر صبر کرنا، اس کے حکم کو پکڑنا، اس کی نہی سے باز رہنا، اللہ تعالیٰ کے لیے عمل خالص کرنا، مسلمانوں کی خیر خواہی کرنا، کسی غیر کی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا، جماعتِ اسلام کو نصیحت کرنا، کبائر جیسے زنا، جھوٹی بات، فخر، کبر اور حسد وغیرہ سے بچنا، لوگوں کی عیب جوئی نہ کرنا، عجب اور گھمنڈ سے دور رہنا، ہر داعی بدعت سے دور بھاگنا، قرآن مجید کی تلاوت اور احادیث کی کتابت کرنا، فقاہتِ حدیث میں عاجزی کے ساتھ نظر کرنا، نیکی کرنا، ایذا دہی سے رکنا، غیبت، چغل خوری، عیبوں کی جستجو کا ترک کرنا، کسبِ معاش کرنا، سلف جیسے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے حقوق پہچاننا، ان کے فضائل کو لے لینا، ان کی آپس میں ہونے والی لڑائی کی باتوں سے باز رہنا خواہ وہ بات بڑی ہو یا چھوٹی، ان کی خوبیوں کا بیان کرنا اور ان کی برائیوں کے ذکر سے رکنا بندے کو لازم ہے۔

جو شخص تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا ان میں سے بعض کو گالی دے گا یا ان کی تنقیص کرے گا یا ان پر طعن کرے گا یا ان پر کوئی عیب لگائے گا تو وہ بدعتی، رافضی، خبیث اور مخالف سنت ہے، اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی فرض اور نفل کوئی عبادت قبول نہیں کرتا، بلکہ سنت یہ ہے کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت رکھے، ان کے لیے دعا کرے، کیوں کہ یہ قربتِ الٰہی کا ذریعہ ہے، ان کی اقتدا کرے کہ یہ ایک وسیلہ ہے اور ان کے آثار کے ساتھ تمسک کرنا فضیلت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت کے بہترین شخص ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں پھر عمر رضی اللہ عنہ، پھر عثمان رضی اللہ عنہ اور پھر علی رضی اللہ عنہ۔ بعض نے عثمان رضی اللہ عنہ پر توقف کیا ہے۔ بہر حال یہ سب خلفاے راشدین ہدایت یافتہ تھے۔ پھر ان کے بعد بقیہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم امت میں سے افضل ہیں۔ کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ انھیں برائی کے ساتھ یاد کرے یا ان پر طعن کرے یا ان پر کوئی عیب لگائے، پھر جو کوئی ایسا کرے تو بادشاہِ وقت پر واجب ہے کہ اس کے خلاف تادیبی کارروائی کرے اور اسے سزا دے، اسے معاف نہ کرے بلکہ سزا دے۔ اس سے توبہ کروائے اگر وہ توبہ کر لے تو بہتر ہے ورنہ اسے قید کرے، یہاں تک کہ وہ اس سے رجوع کرے یا مر جائے۔ عربوں کی فضیلت اور سبقت پہچانے اور ان سے محبت کرے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: عرب سے محبت ایمان ہے اور ان سے بغض نفاق[1] جو بات رذیل موالی یا شعوبیہ کہتے ہیں وہ نہ کہے، جو لوگ عرب کو دوست نہیں رکھتے ہیں اور ان کی بزرگی کا اقرار نہیں کرتے وہ اہلِ بدعت ہیں۔

میں کہتا ہوں: عرب سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا نسب عرب میں جا کر ملتا ہے، گو وہ کسی عجمی شہر میں رہتے ہوں نہ کہ وہ لوگ جو عجم کے ہیں اور فقط ملک عرب میں جا کر بس گئے ہیں اور اصل میں عربی نہیں ہیں۔

ذرائعِ کسب و تجارت:

جس شخص نے کسب یا تجارت یا حلال ذرائع سے حاصل ہونے والے پاک مال کو حرام کہا، اس نے جہالت کا مظاہرہ کیا اور وہ گناہ کا مرتکب ہوا، کیونکہ سارے مکاسب اپنے طور پر حلال ہیں۔

[1] المستدرك للحاكم (٤/٩٧) شعب الإيمان للبيهقي (٢/٢٣٠)

اللہ تعالیٰ نے اور رسول اللہ ﷺ نے یہ بات درست قرار دی ہے کہ بندہ اپنی جان اور اپنے اہل وعیال کے لیے سعی اور کوشش کرے اور اللہ تعالیٰ کے فضل کی جستجو میں رہے، جو شخص اس وجہ سے تارکِ کسب ہے کہ وہ کسب کی حلت کا معتقد نہیں ہے تو وہ مخالفِ سنت ہے۔

اصولِ دین:

دین تو صرف یہی اللہ تعالیٰ کی کتاب یا آثارِ سنن اور روایاتِ صحیحہ ہیں جو معتمد لوگوں سے مروی ہیں اور ان کی صحت وقوت معروف وثابت ہے، ان کی مرفوع سند رسول اللہ ﷺ تک پہنچتی ہے اور آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم، تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ تک متصل ہوتی ہے، یا ان ائمہ مقتدا تک جو سنت کے ساتھ تمسک کرنے والے اور آثار کے ساتھ وابستہ تھے اور وہ کسی بدعت یا طعن کے ساتھ مشہور نہیں ہیں اور نہ وہ دروغ گوئی کے ساتھ بدنام تھے۔

یہ اہلِ سنت وجماعت کے مذاہب ہیں جو اصحابِ روایت و اثر اور حاملِ سنت وخبر تھے۔ انھیں عقائد کے ساتھ تمسک کرنا چاہیے اور انھیں سیکھنا سکھانا چاہیے، انتھیٰ کلامه رحمہ اللہ۔

اس کے بعد حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ان اشخاص کا مذہب ہے جو قولاً، عملاً اور اعتقاداً بشارتِ جنت کے مستحق ہیں، وباللہ التوفیق۔

دسویں فصل

کتاب "التعرف لمذہب التصوف" کے عقائد کا بیان

اس جگہ صوفیہ صافیہ رحمہم اللہ کے عقائد کا انہی کے الفاظ میں ذکر کیا جاتا ہے۔ ہر عقیدے کی زائد عبارت کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مولف شیخ امام ابو بکر بن اسحاق بن محمد کلاباذی بخاری رحمہ اللہ ہیں۔ انھوں نے ۳۷۰ھ یا ۳۸۴ھ یا ۳۸۵ھ میں انتقال کیا۔ بعض مشائخ نے کہا ہے: "لولا التعرف لما عرفنا التصوف" [اگر کتاب "التعرف" نہ ہوتی تو ہم تصوف سے ناواقف رہتے]

① صوفیہ اس بات پر مجتمع ہیں کہ اللہ تعالیٰ واحد، احد، فرد، صمد، قدیم، عالم، قادر، حی، سمیع، بصیر، عزیز، عظیم، جلیل، کبیر، جواد، رؤف، متکبر، جبار، باقی، اول، آخر، الہ، سید، مالک، رب، رحمن، رحیم، مرید، حلیم، خالق، رازق اور متکلم ہے۔ جن صفات کے ساتھ اس نے اپنے نفس کا وصف بیان کیا ہے اور اس نے اپنے نفس کے جو نام رکھے ہیں ان سب صفات کے ساتھ متصف اور ان سب ناموں کے ساتھ وہ مسمّٰی ہے۔ وہ اپنے اسما و صفات کے ساتھ ازل سے قدیم ہے۔ کسی لحاظ سے مخلوق کے مشابہ نہیں ہے۔ اس کی ذات دوسری ذوات کے مشابہ ہے اور نہ اس کی صفت دوسری صفات کے مشابہ ہے۔

اس پر مخلوق کی سمات میں سے کوئی چیز، جو ان کے حدوث پر دلالت کرتی ہو، جاری نہیں ہوتی، وہ اپنی بقا میں ازل سے سابق، محدثات سے متقدم اور ہر چیز سے پہلے موجود تھا۔ اس کے سوا کوئی قدیم ہے نہ اس کے سوا کوئی الہ یعنی معبود ہے۔ وہ نہ جسم ہے، نہ وجود، نہ صورت، نہ شخص، نہ جوہر اور نہ عرض۔[1] اس کے لیے نہ اجتماع ہے نہ افتراق، نہ حرکت نہ سکون، نہ نقص نہ زیادت، نہ وہ صاحبِ ابعاض واجزا و جوارح واعضا ہے نہ صاحبِ جہات و اماکن۔ نہ اس پر اوقات کا جریان ہو نہ

[1] اس جگہ عبارات جدیدہ کے ساتھ بہت سے الفاظِ تنزیہ لکھے گئے ہیں۔ ان الفاظ کی نفی سے جو توحید کا مضمون ثابت کیا گیا ہے وہ اگرچہ درست ہے، مگر یہ الفاظ خود ساختہ ہیں، ان کی کوئی ضرورت نہ تھی، کیوں کہ آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے الفاظ و عبارات ہی تنزیہ و تقدیس کے اثبات کے لیے کافی ہیں۔ [مولف رحمہ اللہ]

اس میں آفات حلول کریں۔ نہ اسے اونگھ اور نیند آئے نہ وہ تداول اوقات میں آئے۔ نہ اشارات اسے معین کریں نہ کوئی مکان اس پر حاوی ہو اور نہ زمان اس پر جاری ہو، نہ اس کو چھونا ہے اور نہ عزلت، نہ وہ اماکن میں حلول کرے اور نہ افکار اس کا احاطہ کر سکیں، نہ استار اسے حجاب میں لے سکیں اور نہ ابصار اسے پا سکیں۔

بعض بڑے لوگوں نے کہا ہے کہ اس سے پہلے کچھ نہیں اور نہ اس کے بعد کچھ ہے، اس کی ابتدا ہے نہ انتہا، نہ "مِنْ" اسے مصادر نہ "عَنْ" موافق، نہ "إِلٰی" اسے ملاصق بنے نہ "فِيْ" اس میں حلول کرے، نہ "إِذْ" اس کی توقیت کرے نہ "اِنْ" اسے موامر ہو، نہ "فوق" اس پر سایہ گستر ہو نہ تحت اسے اٹھائے، نہ "حذا" اسے مقابل ہو نہ "عند" اسے مزاحم، نہ "خلف" اسے پکڑے نہ "اَمام" اسے محدود کرے، نہ "قبل" اسے ظاہر کرے نہ "بعد" اسے فنا کرے، نہ "کل" اسے فراہم کرے نہ "کَانَ" اس کا موجد ہو، نہ "لیس" اس کا فاقد نہ خفا اسے مستور رکھے، اس کا قدم ہر حدث پر متقدم ہے۔ اس کا وجود عدم سے پیشتر ہے۔

اگر تو "متیٰ" کہے تو اس کا ہونا وقت پر سابق ہو چکا ہے اور اگر تو قبل کہے تو قبل اس کے بعد ہے، اگر تو ھو کہے تو ھاء اور واؤ اس کی مخلوق ہے اور اگر "کیف" کہے تو اس کی ذات وصف سے حجاب میں ہے۔ اگر "اَیْن" کہے تو اس کا وجود مکان پر متقدم ہے اور اگر "ما ھو" کہے تو اس کی ماہیت ساری اشیا سے بائن ہے۔ اس کے غیر کے لیے ایک وقت میں دو صفات کا اجتماع ممکن نہیں ہے اور نہ کسی دوسری صفاتِ تضاد جمع ہونی ممکن ہیں۔ وہ اپنے ظہور میں باطن اور اپنے استتار میں ظاہر ہے۔ غرض کہ وہ ظاہر، باطن، قریب اور بعید ہے۔ کیوں کہ یہ بات ممتنع ہے کہ وہ خلق سے مشابہ ہو۔ اس کا فعل مباشرت کے بغیر ہوتا ہے اور اس کی طرف سے تفہیم ملاقات کے بغیر ہے اور اس کی ہدایت کسی ایما کے بغیر ہے۔ نہ ہمتیں اس سے منازعت کریں، نہ افکار اسے مخالط ہوں۔ نہ اس کی ذات کے لیے تکییف ہے اور نہ اس کے فعل کے لیے تکلیف۔ اس پر اجماع ہے کہ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتی ہیں اور نہ ظنون اس پر ہجوم کر سکتے ہیں۔ نہ اس کی صفات متغیر ہیں اور نہ اس کے اسما متبدل۔ وہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہے اور ایسا ہی رہے گا:

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ [الحديد: ٣]

[وہی سب سے پہلے ہے اور سب سے پیچھے ہے اور ظاہر ہے اور چھپا ہوا ہے اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے]

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ [الشوریٰ: ۱۱]

[اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے]

یہ توحید کا بیان تھا۔

② اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات حقیقی ہیں اور وہ ان کے ساتھ موصوف ہے جیسے علم، قدرت، قوت، عز، حلم، حکمت، کبریا، جبروت، حیات، قدم، ارادہ، مشیت اور کلام۔ یہ صفات اسی طرح اجسام ہیں اور نہ اعراض وجواہر جس طرح اس کی ذات جسم، عرض اور جوہر نہیں ہے۔ وہ سچ مچ سمع، بصر، وجہ، ید رکھتا ہے لیکن وہ اسماع، ابصار، ایدی اور وجود کے مثل نہیں ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں نہ کہ جوارح، اعضا اور اجزا۔ یہ ساری صفات عین ذات ہیں اور نہ غیر ذات۔[1] اثباتِ صفات کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ وہ ان کا محتاج ہے یا وہ اشیا کو ان کے ذریعے سے کرتا ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان صفات کے اضداد اس سے منفی ہیں، یہ صفات فی نفسہا ثابت ہیں اور اس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں۔ علم کے معنی فقط جہل کی نفی کرنے کے نہیں ہیں اور نہ قوت کے معنی فقط عجز کی نفی کے ہیں، بلکہ اثباتِ علم وقدرت کے ہیں۔ اگر وہ جہل کی نفی سے عالم اور عجز کی نفی سے قوی ہوتا تو جمادات جہل وعجز کی نفی کے سبب عالم وقادر ہوتے۔ اسی طرح اس کی باقی صفات کا بھی یہی حال ہے۔

ہمارا اللہ تعالیٰ کو ان صفات کے ساتھ بیان کرنا یہ اللہ تعالیٰ کا وصف نہیں ہے، بلکہ ہمارا یہ وصف خود ہماری صفت ہے اور اس صفت کا بیان ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ جو شخص اپنے وصف کرنے کو اللہ کی صفت ٹھہراتا ہے بغیر اس کے کہ وہ سچ مچ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی صفت ثابت کرے تو وہ درحقیقت اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر اس کے وصف کے بغیر کرتا

---

[1] احوط یہی ہے کہ اس قسم کے مسائل میں سرے سے غور ہی نہ کرے۔ اس جگہ اجمالی ایمان ہی اولیٰ ہے۔ جس صفت یا اسم کی تفصیل شارع نے ہم کو نہیں بتائی، ہمیں اس میں خوض کرنے اور بال کی کھال اتارنے کا حق نہیں پہنچتا، کیونکہ ایسے مقام پر مغالطے کا خوف ہوتا ہے۔ اجمال میں امید ہے اور تفصیل میں خوف۔ [مولف رحمہ اللہ]

ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں تغایر نہیں ہوتا ہے، لہٰذا اس کا علم نہ قدرت ہے نہ غیر قدرت اور یہی حال اس کی ساری صفات سمع، بصر، وجہ اور ید کا ہے کہ اس کی سمع بصر ہے اور نہ غیر بصر جس طرح کہ یہ ساری صفات نہ عین ذات ہیں اور نہ غیر ذات۔ اتیان، مجی اور نزول میں اختلاف ہے۔ جمہور صوفیہ نے کہا ہے کہ یہ اس کی صفات ہیں جس طرح اس کے لائق ہیں۔ وہ ان صفات سے اس سے زیادہ تعبیر نہیں کرتے کہ ان کی تلاوت وروایت کریں اور ان پر ایمان لائیں۔ ان سے بحث وتفتیش کرنا واجب نہیں ہے۔ محمد بن موسی واسطی رحمہ اللہ کہتے ہیں: جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات معلول نہیں ہے اسی طرح اس کی صفات بھی معلول نہیں ہیں۔ صمدیت کا اظہار حقائقِ صفات یا لطائفِ ذات کے مطالعہ سے ناامیدی ہے۔ بعض نے ان کی تاویل کی ہے مثلاً اتیان کے معنی مراد کو پہنچانا، نزول کے معنی متوجہ ہونا، قرب کے معنی کرامت اور بعد کے معنی اہانت ہیں اور ساری صفاتِ متشابہ کا یہی حال ہے۔ اللہ تعالیٰ ازل میں خالق، باری، مصور، غفور، رحیم اور شکور تھا، ان ساری صفات کا یہی حال ہے جن کے ساتھ اس نے اپنے نفس کو متصف کیا ہے۔ یہ لوگ صفت فعل اور غیر فعل میں فرق نہیں کرتے ہیں اور فعل کو غیر مفعول بتاتے ہیں۔ اسما میں اختلاف ہے کہ یہ عین اللہ ہیں یا غیر اللہ، بعض نے کہا کہ عین اللہ ہیں۔

③ صوفیہ قرآن مجید کو بالاجماع حقیقتاً اللہ کا کلام کہتے ہیں اور اسے مخلوق، محدث اور حدث نہیں جانتے۔ وہ قرآن زبان پر متلو، مصحف میں مکتوب اور صدور میں محفوظ ہے۔ وہ اس طرح حال نہیں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں معلوم، ہماری زبانوں پر مذکور اور ہماری مسجدوں میں معبود ہے اور ان میں حال نہیں ہے۔

④ اس پر بھی اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ جسم ہے اور نہ جوہر وعرض۔ اکثر کا یہ قول ہے کہ کلام اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے، وہ ازل سے متکلم ہے، اس کا کلام کسی طرح سے بھی مخلوق کے کلام سے مشابہ نہیں ہے۔ اس کی کوئی مائیت نہیں جس طرح کہ اس کی ذات کی مائیت نہیں ہے، مگر اسی اثبات کی جہت سے۔ بعض نے کہا ہے: اللہ کا کلام امر، نہی، خبر، وعد اور وعید ہے، چنانچہ وہ ہمیشہ سے آمر، ناہی، مخبر، واحد، حامد اور ذام ہے۔ تم جب پیدا ہو جاؤ، تم پر ایک زمانہ گزر جائے تم بالغ عاقل ہو جاؤ تو تم ایسے اور ایسے کرو اور تم اپنے معاصی پر مذموم اور اپنے طاعات پر مثاب ہو جبکہ تم پیدا ہو گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لِأُنْذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ﴾

[الانعام: ۱۹] [تاکہ میں تمھیں اس کے ساتھ ڈراؤں اور اسے بھی جس تک یہ پہنچے] جس طرح ہم رسول اللہ ﷺ پر اترنے والے قرآن کے ساتھ مامور و مخاطب ہیں حالانکہ ہم ابھی تک مخلوق نہیں ہوئے اور نہ ہم موجود تھے۔

جمہور صوفیہ کا اس پر بھی اجماع ہے کہ اللہ کا کلام حرف، صوت اور ہجا نہیں ہے، بلکہ حروف و کلام کے اصوات آلات ہیں اور یہ آلات جوارح، لہوات، ہونٹ اور زبانیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اعضا والا ہے نہ کسی آلے کا محتاج، اس لیے اس کا کلام حرف و صوت نہیں ہے۔ لیکن صوفیہ کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ اللہ کا کلام حرف و صوت ہے۔[1] ان کا یہ اعتقاد ہے کہ کلام کی شناخت اسی طرح ہوتی ہے، حالانکہ وہ اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ کلام اللہ تعالیٰ کی ایک ذاتی صفت ہے اور غیر مخلوق ہے۔ یہ حارث محاسبی اور متاخرین میں سے ابن سالم کا قول ہے۔

⑤ اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کا آخرت میں آنکھوں سے دیدار ہوگا، چنانچہ مومن اسے دیکھیں گے نہ کہ کافر، یہ اللہ کی طرف سے کرامت ہے، کیونکہ اس کا ارشاد ہے:

﴿لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ﴾ [یونس: ۲٦]

[جن لوگوں نے نیکی کی، انھی کے لیے نہایت اچھا بدلہ اور کچھ زیادہ ہے]

صوفیہ رویتِ باری تعالیٰ کو عقلاً جائز اور سمعاً واجب کہتے ہیں۔ اس کے متعلق مشہور اور متواتر خبریں آئی ہیں، اسی لیے اس کا قائل ہونا، اس پر ایمان لانا اور اس کی تصدیق کرنا واجب ہے۔

⑥ اس پر بھی اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں ان آنکھوں اور دلوں سے دکھائی نہیں دیتا ہے مگر ایقان کی راہ سے، کیونکہ یہ غایت کرامت اور افضل نعمت ہے۔ اب جائز نہیں کہ وہ دکھائی دے مگر افضل مکان میں ورنہ پھر دنیاے فانی اور آخرتِ باقیہ میں کیا فرق رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ رویت آخرت میں ہوگی، یہ خبر نہیں دی کہ دنیا میں ہوگی۔ اس لیے جتنی اس نے خبر دی ہے اسی تک رکنا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ رسول اللہ ﷺ نے معراج کی رات اللہ سبحانہ، تعالیٰ کو دیکھا ہے یا نہیں تو جمہور اور کبار صوفیہ یہ کہتے ہیں کہ اس آنکھ سے نہیں دیکھا، چنانچہ جنید، نوری

[1] صوفیہ کا یہی دوسرا قول کتاب و سنت کے مطابق ہے نہ کہ قولِ اول۔ جب ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ وارد ہے تو تشبیہ کا امکان ہی نہیں رہتا، لہٰذا تاویل کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

اور ابو خزاز کا یہی قول ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ دیکھا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ دل سے دیکھا تھا۔ جن صوفیہ نے یہ کہا کہ ہم نے اسے دنیا میں دیکھا، جملہ مشائخ نے ان کی تضلیل کی اور ان کے دعوے کی تکذیب فرمائی۔ خزاز نے اس کے انکار میں ایک کتاب اور جنید نے اس کی تکذیب میں چند رسالے تحریر کیے ہیں۔

⑦ سارے صوفیہ کا اجماع ہے کہ اللہ عزوجل بندوں کے افعال کا خالق ہے۔ بندے خیر وشر جو کچھ بھی کرتے ہیں، سب اللہ کی قضا و قدر اور مشیت وارادے سے ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر وہ بندے کب ہوں گے اور مربوب ومخلوق کس طرح ٹھہریں گے۔

⑧ استطاعت کے بارے میں صوفیہ کا قول یہ ہے کہ بندہ کوئی سانس نہیں لیتا، نہ کوئی پلک مارتا ہے اور نہ کوئی حرکت کرتا ہے مگر اس قوت کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ ان میں پیدا کرتا ہے۔ اس استطاعت کے ساتھ جسے اللہ تعالیٰ ان بندوں کے افعال کے ہمسر ان کے لیے پیدا کر دیتا ہے نہ وہ متقدم ہوں نہ متاخر اور فعل اسی استطاعت سے پایا جاتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی صفت پر ہوں کہ جو چاہیں سو کریں، جو چاہیں سو حکم دیں اور اللہ تعالیٰ حقیر، ضعیف اور فقیر بندے کی نسبت قوی، عزیز اور قدیر نہ ہو، کیونکہ اس کا ارشاد ہے: ﴿يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ﴾ [آل عمران: ٤٠] [اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے]

⑨ ان کا اس پر بھی اجماع ہے کہ بندوں کے لیے سچ مچ افعال اور اکتساب ہے جس پر انھیں ثواب ملتا ہے یا عذاب ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان پر امر و نہی آئی اور وعد و وعید وارد ہوئی۔ اکتساب کے یہی معنی ہیں کہ وہ قوت محدثہ کے ساتھ فعل کو سرانجام دیتے ہیں یا ان کا فعل منفعت حاصل کرنے یا دفع ضرر کے لیے ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

[اسی کے لیے ہے جو اس نے (نیکی) کمائی اور اسی پر ہے جو اس نے (گناہ) کمایا]

⑩ بندے اپنے اکتساب میں مختار و مرید ہیں نہ کہ محمول و مجبور و مکرہ۔ مومن نے ایمان اختیار کیا، اسے پسند کیا، اسے اچھا جانا، اپنے ارادے سے ایمان کو کفر پر اختیار کیا، کفر کو مکروہ اور برا جانا اور اسے اختیار نہ کیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ﴾ [الحجرات: ٧]

[لیکن اللہ نے تمھارے لیے ایمان کو محبوب بنا دیا اور اسے تمھارے دلوں میں مزین کر دیا اور اس نے کفر اور گناہ اور نافرمانی کو تمھارے لیے ناپسندیدہ بنا دیا]

جب کہ کافر نے کفر اختیار کیا، اسے پسند کیا، اسے اچھا جانا، اسے ایمان پر ترجیح دی اور ایمان کو اپنا دشمن اور قبیح رکھا، چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ﴾ [الأنعام: ١٠٨]

[اسی طرح ہم نے ہر امت کے لیے ان کا عمل مزین کر دیا ہے]

اس پر صوفیہ کا اجماع ہے۔

⑪ اصلح کے بارے میں صوفیہ کا اجماعاً قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ اپنے بندوں کے ساتھ کرتا ہے اور اپنے ارادے کے موافق ان کے متعلق حکم جاری کرتا ہے، خواہ یہ ان کے لیے اصلح ہو یا نہ ہو، کیونکہ اسی کی مخلوق ہے اور اسی کا امر ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو رب تعالیٰ اور بندے کے درمیان کوئی فرق نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے ساتھ جو احسان، صحت، سلامت، ہدایت اور لطف کیا ہے، یہ اس کا تفضل ہے، اگر وہ یہ نہ کرتا تو بھی جائز تھا۔ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ حمد و شکر کا مستحق نہ ٹھہرتا، اس پر اجماع ہے۔

اسی طرح اس پر بھی اجماع ہے کہ ثواب و عقاب استحقاق کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ مشیت، فضل اور عدل کی بنا پر ہے، کیونکہ وہ جرائم منقطعہ پر نہ دائمی عقاب کے مستحق ہیں اور نہ افعال معدودہ پر غیر معدود دائمی ثواب کے مستحق ہیں، بلکہ اگر وہ سارے آسمان و زمین والوں کو عذاب کرے تب بھی ظالم نہیں اور اگر سارے کفار کو جنت میں لے جائے تب بھی یہ محال نہیں ہے۔ کیونکہ مخلوق اسی کی ہے اور ان پر حکم بھی اسی کا ہے، لیکن اس نے یہ خبر دی ہے کہ وہ مومنوں کو آرام دے گا اور کفار کو عذاب کرے گا، تو وہ اپنی بات میں سچا ہے اور اس کی خبر سچی ہے، اس لیے واجب ہے کہ وہ ان کے ساتھ یہی کام کرے، اس کے سوا جائز نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ جھوٹ نہیں بولتا ہے۔

⑫ اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ بلا علت اشیا کا فاعل ہے۔ اگر کوئی علت ہوتی تو لا متناہی سلسلے

تک اس علت کے لیے بھی کوئی اور علت درکار ہوتی اور یہ باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام ظلم ہے نہ جور اور نہ اس کی کوئی چیز قبیح ہے۔ اشیا کا حسن و قبح اسی کی طرف سے ہے۔

⑭ صوفیہ کا اس پر اجماع ہے کہ وعید مطلق طور پر کفار کے حق میں ہے اور وعد مطلق طور پر محسنین کے حق میں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کی صورت میں صغیرہ گناہوں کی بخشش واجب ہے اور بعض نے کہا ہے کہ صغائر عقوبت کے جواز میں کبائر کی طرح ہیں اور کبائر کی بخشش کو مشیت وشفاعت پر رکھا ہے، نیز وہ اہلِ صلات کا آگ سے خروج واجب بتاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ آیتِ کریمہ:

﴿ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا﴾ [النساء: ۳۱]

[اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچو گے جن سے تمھیں منع کیا جاتا ہے تو ہم تم سے تمھاری چھوٹی برائیاں دور کر دیں گے اور تمھیں باعزت داخلے کی جگہ میں داخل کریں گے]

کے معنی یہ ہیں کہ بندہ کفر وشرک سے بچے، کیوں کہ اس کفر وشرک کی کئی انواع ہیں اس لیے ان پر اسم جمع کا اطلاق جائز ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ خطاب جمع کی صورت میں آیا ہے، اس لیے ہر ایک کا کبیرہ گناہ مل کر جمع ہو جاتے ہیں۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [النساء: ٤٨]

[بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور وہ بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا]

مندرجہ بالا آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مشیت کو شرک کے علاوہ کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ ان کا اجمالی قول یہ ہے کہ مومن خوف ورجا کے درمیان ہے، چنانچہ وہ اللہ کے فضل سے کبیرہ گناہوں کی بخشش کا امیدوار ہے اور صغیرہ گناہوں کی عقوبت میں اللہ تعالیٰ کے عدل سے ڈرتا ہے، کیونکہ مغفرت مشیت کے ضمن میں ہے اور صغیرہ وکبیرہ گناہ کی شرط مشیت کے ساتھ نہیں آئی ہے، جس نے شرائطِ توبہ اور ارتکابِ صغائر میں تشدید وتغلیظ کی ہے تو وہ کوئی ایجابِ وعید کی وجہ سے نہیں کی ہے، بلکہ حقِ الٰہی میں

گناہ کو عظیم سمجھا ہے اور کسی گناہ کو صغیرہ کہا ہے تو وہ صرف گناہوں کی باہمی نسبت کی بابت ایسا کہا ہے۔

فائدہ:

وعید اللہ کا بندوں پر حق ہے اور وعد اللہ تعالیٰ پر بندوں کا حق ہے، جسے اس نے اپنی جان پر واجب کیا ہے۔ پس اگر وہ ان سے اپنا حق پورا لے اور ان کا حق وفا نہ فرمائے تو یہ بات اس کے فضل کے لائق نہیں ہے، حالانکہ وہ ان سے غنی ہے اور یہ اس کے محتاج ہیں، بلکہ اس کے فضل کے لائق یہ ہے کہ ان کے حقوق پورے دے کر اپنے فضل سے انھیں کچھ اور زیادہ عطا فرمائے۔ بلکہ وہ اللہ اپنے حق کو معاف کر دے، چنانچہ اس نے اپنی طرف سے اسی بات کی خبر ان الفاظ میں دی ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَ يُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ [الأنعام: ٤٠]

[بے شک اللہ ایک ذرے کے برابر ظلم نہیں کرتا اور اگر ایک نیکی ہوگی تو اسے دوگنا کر دے گا اور اپنے پاس سے بہت بڑا اجر عطا کرے گا]

مذکورہ آیتِ کریمہ کے الفاظ ﴿مِنْ لَّدُنْهُ﴾ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اس کا تفضل ہے نہ کہ جزا ہے۔

⑭ اس پر اجماع ہے کہ شفاعت وغیرہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ سے احادیث میں جو کچھ وارد ہوا ہے، سب کا اقرار کرنا حق ہے۔ پل صراط ایک پل ہے جو جہنم کی پشت پر ہوگا۔ بندوں کے اعمال ترازو میں تولے جائیں گے، اگرچہ اس کی کیفیت معلوم نہیں ہے، آپ ﷺ کی مراد پر ایمان لانا چاہیے۔ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا، وہ بہ موجبِ حدیث آگ سے باہر نکل آئے گا۔ جنت اور جہنم ابدی اور موجود ہیں، ابد الآباد تک وہ باقی رہیں گی، انھیں فنا نہیں ہے۔ اہلِ جنت اور اہلِ جہنم بھی خالد، مخلد، متنعم اور معذب رہیں گے۔ نہ نعیم ختم ہوگی نہ عذاب ہی منقطع ہوگا۔ تمام مومن ظاہری امور پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے سرائر اللہ تعالیٰ کے سپرد ہیں۔

⑮ اصل گھر ایمان واسلام ہے اور اہلِ دار ہی مومن ومسلمان ہیں۔ اہلِ کبائر بھی مسلمان ہیں، کیونکہ وہ ایمان واسلام رکھتے ہیں، اگرچہ فسق کے سبب فاسق ہیں۔ اہلِ قبلہ پر نمازِ جنازہ پڑھنی

چاہیے۔ ہر نیک و بد کے پیچھے نماز ادا کرنا جائز ہے۔ جمعہ، جماعات اور اعیاد ہر بے عذر مسلمان پر، ہر نیک و بد امام کے ہمراہ، واجب ہیں۔ اسی طرح کے امام کے ساتھ مل کر جہاد کرنا واجب ہے۔ خلافت حق ہے اور یہ قریش میں ہونی چاہیے۔ خلفاے اربعہ سب پر متقدم ہیں۔ صحابہ اور سلف صالح کی اقتدا کرنا چاہیے۔ ان کے باہمی جھگڑوں میں سکوت اختیار کرنا بہتر ہے۔ ان کا یہ اختلاف اور جھگڑا ان کی نیکی کی سبقت میں نقصان دہ نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جس کے حق میں جنت کی گواہی دی ہے، وہ جنت میں جائے گا اور اسے آگ کا عذاب نہ ہوگا۔ ولات چاہے ظالم ہوں، پھر بھی ان کے خلاف تلوار لے کر نہ نکلنا چاہیے۔ جس سے بھی ہو سکے امر و نہی واجب ہے، مگر یہ کام شفقت، رافت، رفق، لطف، رحمت اور نرم گفتار کے ساتھ ہونا چاہیے۔

عذابِ قبر اور منکر و نکیر کا سوال حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا رات کے وقت ساتویں آسمان تک پھر وہاں سے جہاں تک اللہ نے چاہا، بیداری کی حالت میں معراج پر جانا حق ہے۔ رویا اور خواب حق ہے، یہ مومنوں کے لیے بشارت، انذار اور توفیق ہوتی ہے۔ جو کوئی بھی طبعی موت کے ساتھ فوت ہوا یا اسے مار دیا گیا تو وہ اپنی اجل سے فنا ہوا۔ یہ بات نہیں ہے کہ آجال نے اسے ہلاک کیا ہو، جس طرح معتزلہ کہتے ہیں۔ مومنوں کے بچے اپنے آبا و اجداد کے ساتھ جنت میں ہوں گے جبکہ مشرکین کے بچوں میں اختلاف ہے۔

موزوں پر مسح کرنا حق ہے۔ حرام بھی رزق ہے۔ دین میں جدل و مرا اور قضا و قدر میں تنازع اور خصومت درست نہیں ہے۔ اپنے حقوق و فرائض میں مشغول ہونا دین کے بارے جھگڑوں میں پڑنے سے اولیٰ اور بہتر ہے۔ طلبِ علم اعمال میں سب سے افضل عمل ہے اور اس علم سے مراد علم وقت ہے جو ظاہراً اور باطناً ان پر واجب ہوتا ہے، یہ مومن فصیح ہوں یا اعجم، اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر سب سے زیادہ مہربان اور مشفق ہوتے ہیں، بڑے مال خرچ کرنے والے، زاہد، دنیا سے اعراض کرنے والے، سنت و آثار کو بہت زیادہ طلب کرنے والے اور اتباعِ سنن کے بڑے حریص ہوتے ہیں۔

صوفیہ کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ نے جو کچھ کتاب و سنت میں ذکر کیا ہے وہ عقلمند بالغوں کے حق میں فرضِ واجب اور حتمِ لازم ہے، اس میں کسی طرح کی کوتاہی کرنے کی گنجایش نہیں ہے۔ دوست ہو یا دشمن یا عارف اگرچہ اقصی مراتب، اعلیٰ درجات، اشرف مقامات اور

ارفع منازل کو کیوں نہ پہنچ گیا ہو، بہر حال بندے کے لیے کوئی ایسا مقام نہیں ہے جس مقام میں آ کر اس سے آدابِ شریعت ساقط ہو جائیں، وہ محظور کو مباح اور حرام کو حلال کر بیٹھے، یا کسی حلال کو حرام یا کسی فرض کو بغیر عذر و علت کے ساقط سمجھ لے۔ عذر و علت وہی ہے جس پر مسلمانوں نے اجماع کیا ہے اور جس کے ساتھ احکامِ شریعت وارد ہوئے ہیں۔ جو شخص اعلیٰ رتبہ اور اشرف مقام والا ہوتا ہے وہی اجتہاد میں شدید تر، عمل میں مخلص تر اور بہت زیادہ پرہیز گار ہوا کرتا ہے۔

⑯ اس پر اجماع ہے کہ افعال نہ سببِ سعادت ہیں اور نہ سببِ شقاوت۔ بندوں کی سعادت و شقاوت مشیتِ الٰہی کے ساتھ پہلے سے لکھی جا چکی ہے، جس طرح کہ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آیا ہے:

«هٰذَا كِتَابٌ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِينَ فِيهِ أَسْمَاءُ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَأَسْمَاءُ آبَائِهِمْ وَقَبَائِلِهِمْ ثُمَّ أُجْمِلَ عَلٰى آخِرِهِمْ فَلَا يُزَادُ فِيهِمْ وَلَا يُنْقَصُ مِنْهُمْ أَبَدًا»[1]

[یہ کتاب رَبُّ الْعَالَمِينَ کی طرف سے ہے اور اس میں اہلِ جنت کے نام ہیں پھر ان کے آبا و اجداد اور ان کے قبیلوں کا ذکر کرنے کے بعد آخر میں میزان ہے، پھر ان میں نہ کمی ہوگی اور نہ زیادتی ہوگی]

اس طرح اہلِ نار کے حق میں فرمایا اور ارشاد کیا ہے:

«اَلسَّعِيدُ مَنْ سَعِدَ فِي بَطْنِ أُمِّهٖ وَ الشَّقِيُّ مَنْ شَقِيَ فِي بَطْنِ أُمِّهٖ»[2]

[خوش نصیب تو وہ ہے جو اپنی ماں کے پیٹ ہی میں خوش نصیب ہو اور بد بخت ہے وہ جو اپنی ماں کے پیٹ میں بد بخت ہو]

بندوں کے یہ اعمال استحقاق کے اعتبار سے موجب ثواب و عقاب نہیں ہیں، بلکہ یہ عدل کے سبب سے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا فضل ایجاب کے سبب سے ہے۔

⑰ جنت کی نعمتیں اس کے لیے ہیں جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے علت کے بغیر جنت لکھی جا چکی ہے اور آگ کا عذاب اس کے لیے ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے علت کے

---

① سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٤١)

② «اَلسَّعِيدُ مَنْ سَعِدَ فِي بَطْنِ أُمِّهٖ» کے الفاظ "المعجم الأوسط" (٨/٢٢٣) میں ہیں اور «اَلشَّقِيُّ مَنْ شَقِيَ فِي بَطْنِ أُمِّهٖ» کے الفاظ صحیح مسلم میں (٢٦٤٥) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً مروی ہیں۔

بغیر شقاوت سبقت کر چکی ہے، جیسے آپ ﷺ کا فرمان ہے:

«هٰؤُلَاءِ فِي الْجَنَّةِ وَلَا أُبَالِي وَهٰؤُلَاءِ فِي النَّارِ وَلَا أُبَالِي»①

[یہ لوگ جنت میں ہیں اور مجھے کوئی پروا نہیں اور یہ لوگ آگ میں ہیں اور مجھے کوئی پروا نہیں]

بندوں کے اعمال اس لکھے ہوئے پر علامات اور امارات ہیں، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«اِعْمَلُوْا، فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ»②

[عمل کرتے رہو، ہر ایک کو، جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے، میسر کر دیا جاتا ہے]

اس کے ساتھ ساتھ صوفیہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ اعمال پر ثواب دیتا اور عقاب کرتا ہے، کیونکہ اس نے عملِ صالح پر وعدہ اور عمل خطا پر وعید فرمائی ہے، چنانچہ وہ وعدہ پورا کرتا ہے اور وعید کو ثابت کرتا ہے، کیوں کہ وہ اپنی خبر میں صادق ہے۔

⑱ ان کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ پر دلیل وہ خود ہے۔ رہی عقل تو وہ ایسی بات ہے کہ عاقل اپنی حاجت میں دلیل کی طرف راہ نکالتا ہے، کیونکہ وہ محدث ہے اور محدث دلیل نہیں ہوتا مگر اپنی مثل پر۔ ابن عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے: عامۃ الناس نے اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوق سے پہچانا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ﴾ [الغاشية: ١٧] [تو کیا وہ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے پیدا کیے گئے] ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ﴾ [النساء: ٨٢] [تو کیا وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے]، ﴿وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ [الأعراف: ١٨٠] [اور سب سے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں، سو اسے ان کے ساتھ پکارو] انبیا نے خود اسے اس کی ذات سے پہچانا ہے، فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ [الشورىٰ: ٥٢] [اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے ایک روح کی وحی کی] ہاں! اللہ تعالیٰ کو صرف عقل والا ہی پہچانتا ہے، اس لیے کہ عقل بندے کے لیے ایک ایسا آلہ ہے جس سے وہ اشیا کی شناخت کرتا ہے۔ رہی یہ بات کہ معرفت کیا چیز ہے تو جنید رحمہ اللہ نے کہا: "هي وجود جهلك عن قيام علمه" [وہ اس کے علم کے قیام سے تیرے جہل کا وجود ہے] معلوم ہوا کہ معرفت اور علم میں فرق ہے۔

① مسند أحمد (١٨٦/٤) صحيح ابن حبان (٥٠/٢)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٦٢) صحيح مسلم (٢٦٤٧/٦)

⑲ جنید رحمہ اللہ فرماتے ہیں: روح ایک ایسی چیز ہے جس کے علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ مختص ہے، اس نے اپنی مخلوقات میں سے کسی کو اس پر آگاہ نہیں کیا اور اس روح کو موجود کہنے کے سوا اس کے متعلق اور کوئی عبارت بولنا جائز نہیں ہے، کیونکہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ [بني إسرائيل: ٨٥] [کہہ دے روح میرے رب کے حکم سے ہے] صحیح یہ ہے کہ روح جسم کی مانند ایک مخلوق ہے۔ ابن عطا رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے روح کو جسموں سے پہلے بنایا، اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿خَلَقْنٰكُمْ﴾ يعني الأرواح [یعنی روحوں کو پیدا کیا] ﴿ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ﴾ يعني الأجساد [یعنی پھر جسموں کو بنایا]۔

⑳ جمہور صوفیہ رسولوں کی فرشتوں پر اور فرشتوں کی رسولوں پر فضیلت سے ساکت اور خاموش ہیں۔ فضل اسی کو حاصل ہے جسے اللہ تعالیٰ نے فضیلت دی ہے، یہ کوئی جوہر و عمل سے نہیں ہے۔ وہ عقل و خبر کے سبب احد الامرین کو واجب نہیں جانتے۔ بعض نے رسولوں کو اور بعض نے فرشتوں کو فضیلت دی ہے۔ محمد بن فضل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سارے فرشتے سارے مومنوں سے افضل ہیں اور مومنوں میں ایسے بھی ہیں جو فرشتوں سے افضل ہیں یعنی انبیا علیہم السلام۔

㉑ ان صوفیہ کا اس پر اجماع ہے کہ رسولوں کے درمیان تفاضل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ﴾ [بني إسرائيل: ٥٥]

[اور بلاشبہہ یقیناً ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت بخشی]

لیکن فاضل و مفضول متعین نہیں ہیں، کیونکہ آپ کا ارشاد گرامی ہے: «لَا تُخَيِّرُوْا بَيْنَ الْأَنْبِيَاءِ»[1] [انبیا کو ایک دوسرے پر فضیلت و ترجیح مت دیا کرو] البتہ یہ حدیث: «أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ»[2] [میں اولادِ آدم کا سردار ہوں اور میں اس پر فخر نہیں کرتا] آپ ﷺ کا افضل ہونا واجب قرار دیتی ہے۔

㉒ تمام صوفیہ کے اجماع کے ساتھ انبیا تمام انسانوں سے افضل ہیں، انسانوں میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو ان کے برابر ہو، نہ صدیق، نہ ولی اور نہ کوئی اور، خواہ وہ کتنا ہی عظیم الخطر اور جلیل

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٨١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧٤)

② صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٧٨)

القدر کیوں نہ ہو۔ انبیا سے لغزشوں کا ہونا ثابت ہے، خواہ وہ بطریق تاویل وخطا ہوں یا سہو وغفلت، لیکن وہ ایسے صغائر ہوتے ہیں جن کے ساتھ توبہ ہوتی ہے نہ کہ کبائر، کیونکہ وہ سب کبائر سے معصوم ہیں۔

٤٣ اولیا سے کرامات ظاہر ہوتی ہیں یہ بات قرآن وحدیث دونوں سے ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے دور میں اور آپ ﷺ کے زمانے کے بعد بھی ان کا ظہور ہوا ہے۔ جب اولیا سے کوئی کرامت صادر ہوتی ہے تو ان کا تذلل، خضوع، خشیت اور استکانت بڑھ جاتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے اجر وثواب میں اضافہ کرتا ہے۔ غرض کہ انبیا کے لیے معجزات ہوتے ہیں اولیا کے لیے کرامات اور اعدا کے لیے مخادعات۔ اولیا کو اپنی کرامت کا علم نہیں ہوتا ہے، جب کہ انبیا کو معجزے کا پہلے سے علم ہوتا ہے، کیونکہ اولیا غیر معصوم اور انبیا معصوم ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ولی کو اپنا ولی ہونا معلوم نہیں ہوسکتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ وہ اس امر سے شناسا ہو، یہ جائز ہے۔ ظاہری حلیے اور غیر عادی امور سے ولایت کا اعلام نہیں ہوتا ہے، لیکن یہ اعلام سرائر میں ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔

٤٤ جمہور صوفیہ کے نزدیک ایمان قول، عمل اور نیت کا نام ہے۔ نیت کے معنی تصدیق ہیں۔ اصل ایمان یہی تصدیق قلب کے ہمراہ زبان کا اقرار ہے اور اس کی فرع عمل بالارکان ہے۔ ایمان ظاہر وباطن میں ایک چیز ہے اور وہ دل ہے اور ظاہر میں مختلف اشیا ہیں۔ اس پر اجماع ہے کہ ایمان کا ظاہراً وجوب اس کے باطناً وجوب کی مانند ہے اور وہ اقرار ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایمان بڑھتا گھٹتا ہے۔ ائمہ جنید وسہل نے کہا ہے کہ تصدیق بڑھتی ہے، گھٹتی نہیں ہے، اگر وہ گھٹے تو پھر بندہ ایمان سے نکل جائے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی اخبار ومواعید کی تصدیق ہے جس میں ادنا شک کفر ہوتا ہے اور ایمان کی زیادتی قوت ویقین کی طرف سے ہوتی ہے۔ ہاں زبان کا اقرار نہ بڑھے نہ گھٹے، جب کہ عمل بالارکان زائد اور ناقص ہوتا ہے۔

فائدہ:

بعض نے کہا ہے کہ جس مومن نے اقرار کیا، تصدیق کی، فرائض بجالایا اور منہیات سے باز رہا وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے امن میں ہے اور جس نے یہ سب کچھ نہ کیا، وہ آگ میں ہمیشہ رہنے

والا ہے، اور جس نے اقرار وتصدیق کے باوجود اعمال میں تقصیر اور کوتاہی کی تو جائز ہے کہ اسے عذاب تو ہو مگر وہ عذاب میں ہمیشہ مبتلا نہ رہے۔ لہٰذا وہ خلود سے تو امن میں ہے لیکن عذاب سے مامون نہیں ہے، تو اس کا امن ناقص اور غیر کامل ہوا۔ جو شخص یہ سب کچھ بجا لایا اس کا امن تام اور غیر ناقص ہے، اس لیے یہ بات اصل ٹھہری کہ امن کا نقصان ایمان کے نقصان کے سبب ہوا اور امن کا تمام ایمان کے تمام سے ہوا۔ واجب سے کوتاہی کرنے والے کے حق میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ وہ ضعیف الایمان ہے، چنانچہ دل سے منکر کا انکار کرنے والے کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا: «ذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ»[1] [یہ سب سے کمزور ایمان ہے]

معلوم ہوا کہ ظاہر کے ایمان کے بغیر باطن کا ایمان ضعیف اور کمزور ہوتا ہے۔ کسی جگہ آپ ﷺ نے ایمان کو کامل ٹھہرایا ہے، جیسے: «أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ إِيْمَاناً أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا»[2] [مومنوں میں سے کامل ایمان والا وہ ہے جو ان میں سے اخلاق میں اچھا اور بہتر ہے] چنانچہ اخلاق ظاہر وباطن دونوں میں ہوتے ہیں، لہٰذا جو سب کو عام ہے اسے کمال کے ساتھ متصف کیا ہے اور جو سب کو عام نہیں ہے، اسے ضعف کے ساتھ متصف کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ ایمان کی کمی بیشی عین کی طرف سے نہیں ہے بلکہ جہت کی طرف سے ہے جو حسن اور قوت سے زیادتی ہوتی ہے اور ان کی کمی سے ایمان کا نقصان ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مردوں میں تو بہت کامل ہوتے ہیں اور عورتیں صرف چار ہی کامل ہوئی ہیں۔ مگر ساری عورتیں اصل کے اعتبار سے ناقص نہیں ہیں بلکہ صفت کی طرف سے ناقص ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو عقل ودین میں ناقص فرمایا ہے۔ بعض کبار نے کہا ہے کہ ایمان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، یہ زیادہ ہوتا ہے نہ کم، انبیا کی طرف سے زیادہ ہوتا ہے نہ کم اور غیر انبیا کی طرف سے زیادہ اور کم دونوں ہوتے ہیں۔

(25) ایمان کے چار ارکان ہیں: (1) توحید بلا حد (2) ذکر بلا بت یعنی قطع (3) حال بلا نعت، (4) وجد بلا وقت۔ حال بلا نعت کے یہ معنی ہیں کہ جس حال رفیع کو بیان کرے اس کے ساتھ موصوف ہو۔

(1) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٩)

(2) سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٦٨٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٦٢)

وجد بلا وقت کے یہ معنی ہیں کہ ہر وقت میں حق کا مشاہدہ کرے نہ یہ کہ ایک وقت میں مشاہد ہو اور دوسرے وقت میں مشاہد نہ ہو۔

⑳ اسلام عام ہے اور ایمان خاص، بعض نے کہا ہے کہ دونوں ایک ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اسلام ظاہر اور ایمان باطن ہے۔ بعض نے کہا کہ اسلام تحقیقِ ایمان ہے اور ایمان تصدیقِ اسلام اور بعض نے کہا ہے کہ ایمان تحقیق واعتقاد ہے اور اسلام خضوع وانقیاد۔ انتہیٰ.

میں کہتا ہوں: حدیثِ صحیح میں اسلام، ایمان اور احسان کا وصف جدا جدا بیان ہوا ہے، وہی صحیح اور درست ہے۔ جس چیز کے فرق کا فیصلہ خود شارع نے کر دیا ہے ہمیں اس میں زائد خوض کرنا کوئی ضروری نہیں ہے۔

㉗ مذاہب شریعت کے بارے میں صوفیہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ وہ فقہا کے درمیان اختلافی مسئلہ میں اپنے لیے احوط اور اوثق کو اخذ کرتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہو فریقین کے اجماع پر چلتے ہیں اور فقہا کے اختلاف کو درست جانتے ہیں اور ان میں سے کوئی دوسرے پر اعتراض نہیں کرتا۔ ان کے نزدیک ہر مجتہد مصیب ہے[1] اور جس شخص نے شرع میں ایک مذہب کا اعتقاد کیا ہے اور وہ مذہب اس طور پر اس کے نزدیک صحیح ہوا کہ اس کا مثل کتاب وسنت کی دلالت کے ساتھ صحیح ہوتا ہے اور وہ شخص اہلِ استنباط بھی ہے تو وہ اعتقاد مذکور میں مصیب ہے اور جو شخص اہلِ اجتہاد سے نہیں ہے تو وہ مفتی کا قول اخذ کرے، جس کسی فقیہ کو اس کا دل اعلم جانتا ہو تو مفتی کا یہ قول اس کے لیے حجت ہے انتہیٰ. مگر اس بات میں تامل ہے۔

㉘ ان کا اس بات پر اجماع ہے کہ یقین کے ساتھ وقت پر نماز کی تعجیل افضل ہے اور نمازی تمام مفروضات کو وجوب کے وقت عاجلاً ادا کرے اور اس میں تقصیر وتاخیر اور تفریط روا نہ رکھے، مگر کسی عذر کے ساتھ، البتہ سفر میں نماز قصر کرے اور جو شخص ہمیشہ سفر میں رہے اور اس کا کوئی مقر اور ٹھکانہ نہ ہو تو وہ پوری نماز پڑھا کرے۔[2] سفر میں روزہ رکھنا اور افطار کرنا دونوں جائز ہیں۔

---

① یہ قول مرجوح ہے۔ راجح بات یہ ہے کہ حق ایک ہی ہوتا ہے، متعدد نہیں۔ اس جگہ اگر یوں کہا جاتا کہ ہر مجتہد ثواب یافتہ ہے تو درست ہوتا، کیوں کہ مجتہد کو خطا پر بھی ایک اجر ملتا ہے، جس طرح صواب پر اسے دوہرا اجر ملتا ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

② ہمیں اس قول کی کوئی دلیل نہیں ملی۔ ظاہر حدیث جو مطلق سفر کے بارے میں آتی ہے، وہ اسی کا تقاضا کرتی ہے کہ سفر میں قصر کرنا ہی عزیمت ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

ان کے نزدیک حج کی استطاعت امکان ہے، وہ کسی وجہ سے کیوں نہ ہوں۔ یہ لوگ صرف زاد وراحلہ کو شرط قرار دیتے ہیں۔ ابن عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ استطاعت دو طرح پر ہے: حال اور مال، جسے حال نہ اٹھائے تو اس کا مال اسے پہنچا دے گا۔

۴۹ پیشے، تجارتیں اور کھیتی باڑی وغیرہ جنھیں شریعت نے مباح کیا ہے، ان مکاسب کی اباحت پر ان کا اجماع ہے، لیکن شبہات سے تیقظ اور تحرز کے ساتھ۔ اور یہ کوئی پیشہ اس لیے کرے کہ عمل پر مدد ملے، طمع کا مادہ قطع ہو، غیر کو فائدہ پہنچے اور ہمسایہ پر مہربانی کرے۔ ان کے نزدیک یہ پیشہ کرنا اس شخص کے لیے واجب ہے جس کا فرض نفقہ اور خرچ اس کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ امام جنید رحمہ اللہ کہتے ہیں: کسب اللہ تعالیٰ کے قریب کرنے والا ایک عمل ہے، پس جس قدر نوافل میں مشغول ہونا مندوب ہے اتنا ہی اس میں شغل کرے۔ یہ نہ سمجھے کہ جلبِ رزق اور جرِ منفعت فقط اسی میں ہے۔ اکیلے آدمی پر کسب کرنا مباح ہے، اس پر واجب نہیں ہے اور نہ یہ دین میں توکل کے منافی ہے، مگر وظائفِ حق کے ساتھ اشتغال اولیٰ اور احق ہے اور صحتِ توکل اور اللہ پر وثوق کے وقت اس سے اعراض اوجب ہے۔ سہل نے کہا: توکل والے محض اتباعِ سنت کے لیے کسب کرتے ہیں اور غیر متوکل تعاون کے لیے کرتے ہیں۔

صاحبِ تعرف فرماتے ہیں:

اہل تصوف کے یہی معتبر اور صحیح عقائد ہیں جو ہم نے ان کی کتابوں میں دیکھے ہیں اور ان کے اصول و مذاہب کو جاننے والے ثقات سے سنے ہیں۔ ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم.

گیارھویں فصل

شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ کی تالیف ''الیواقیت والجواہر'' کے مطابق شیخ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ کے عقیدے کا بیان

ہر مومن کے لائق یہ ہے کہ وہ اپنے عقیدے کی تصریح کرے اور سب کے سامنے پکار کر کہہ دے کہ میرا یہ اعتقاد ہے۔ اب اگر وہ اعتقاد صحیح ہوگا تو وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے اعتقاد کی گواہی دیں گے اور اگر یہ اعتقاد درست نہ ہوگا تو وہ لوگ اس کا فساد اور خرابی واضح کر دیں گے، تاکہ یہ شخص اس سے توبہ کرے۔

دیکھو! ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو اپنا گواہ مقرر کیا تھا، حالانکہ وہ لوگ مشرک تھے، اس کے باوجود ان کو اپنی جان پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک سے اپنی براءت اور اللہ کی وحدانیت کے اقرار پر گواہ ٹھہرایا تھا، کیونکہ ان کو یہ بات معلوم تھی کہ اللہ تعالیٰ جہان والوں کو اپنے سامنے کھڑا کر کے اس ہولناک موقف میں ان سے سوال کرے گا اور ہر گواہ کو اپنی گواہی ادا کرنی پڑے گی، وہاں پر امین اپنی امانت ادا کرے گا، موذن کے لیے ہر سامع گواہی دے گا۔ یہاں تک کہ کفار بھی گواہی دیں گے۔ لہٰذا شیطان اذان سننے کے وقت پشت پھیر کر گوز مارتا ہوا بھاگتا ہے تاکہ اذان نہ سنے اور اس کی گواہی نہ دینا پڑے اور وہ ان لوگوں میں سے نہ ٹھہرے جو اس کی سعادت میں سعی اور کوشش کرنے والے ہیں۔

یہ شیطان ـلعنہ اللّٰہـ ہمارا خالص دشمن اور عدو محض ہے، وہ کب ہماری بھلائی اور بہتری چاہتا ہے۔ پس دشمن کو اس بات سے چارہ نہیں ہے کہ جس بات پر تو نے اسے گواہ ٹھہرایا ہے، وہ اس کی گواہی دے، کیونکہ اس مشہد حق میں یہ بات سچ مچ ہوگی تو پھر تیرے دوست کا گواہی دینا جو تیرا ہم مذہب اور اچھا آدمی ہے، تجھے چاہیے کہ تو اس دار دنیا میں اپنے نفس پر وحدانیت اور ایمان کا اسے گواہ بنا لے۔

لہٰذا اے میرے اخوان واحباب! میں تمھیں اس بات پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اللہ تعالیٰ،

ملائکہ، انبیا اور روحانیین جو اس وقت حاضر ہیں یا جو کوئی اس وقت میری بات کو سنتا ہے، ان سب کو اس بات پر گواہ بنا لیا ہے کہ میں بطور جزم اپنے دل سے یہ کہتا ہوں:

اللہ تعالیٰ واحد ہے، کوئی اس کا ثانی نہیں ہے۔ وہ بیوی اور اولاد سے منزہ ہے۔ وہ مالک ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ وہ بادشاہ ہے، کوئی اس کا وزیر نہیں ہے۔ وہ صانع ہے اس کے ساتھ کوئی مدبر نہیں ہے۔ اپنی ذات سے موجود ہے۔ وہ کسی موجد کا، جو اسے ایجاد کرے، محتاج نہیں ہے، بلکہ ہر موجود جو اس کے سوا ہے، وہ اپنے وجود میں اس کا محتاج ہے۔ غرض کہ سارا جہاں اللہ کے سبب سے موجود ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وجود کا آغاز ہے نہ اس کی بقا کا انجام، بلکہ اس کی ہستی استمراری، دائمی اور مطلق ہے۔ وہ اپنے نفس سے قائم ہے نہ جوہر متحیز کہ اس کے لیے مکان کا اندازہ کیا جائے، نہ عرض ہے کہ اس پر بقا محال ٹھہرے، نہ جسم ہے کہ اس کے لیے کوئی جہت ہو۔[1] وہ تو جہات واقطار سے مقدس ہے۔ دلوں اور آنکھوں سے دنیا و آخرت میں دکھائی دینے والا ہے۔ وہ، جیسے اس کا فرمان ہے اور اس فرمان سے جس معنی کا اس نے ارادہ کیا ہے، عرش پر مستوی ہے۔ جس طرح کہ عرش اور جس کو وہ حاوی ہے، دنیا اور آخرت اس کے ساتھ مستوی ہے۔ اسی کے لیے ہے۔ اس کے لیے نہ کوئی مثل معقول ہے اور نہ عقول اس پر دلیل ہیں۔ اسے زمانہ محدود نہیں کر سکتا ہے اور نہ مکان اسے اپنے اندر لے سکتا ہے، بلکہ وہ تھا اور مکان نہ تھا، وہ اب بھی اسی حالت پر ہے جس پر وہ پہلے تھا، یعنی اب بھی وہ جوں کا توں ہے، اسی نے تمکن اور مکان پیدا کیا، زمان کو بنایا اور کہا میں وہ واحد حی ہوں جسے مخلوقات کی حفاظت نہیں تھکاتی ہے اور نہ مخلوقات کی کوئی ایسی صفت ہی اس کی طرف رجوع کرتی ہے جس پر وہ نہ تھا، وہ اس سے برتر ہے کہ اس میں حوادث حلول کریں یا وہ حوادث میں حال ہو یا حوادث اس سے پہلے ہوں یا وہ بعد حوادث کے ہو، بلکہ وہ تھا اور

[1] یہ وہی الفاظ ہیں جو متکلمین نے اہلِ فلسفہ کے ساتھ اختلاط کی وجہ سے باری تعالیٰ کی تنزیہ کے لیے تراشے ہیں۔ اگرچہ ان کا مضمون شریعت کے مخالف نہیں، لیکن یہ الفاظ شرع میں نہیں آئے۔ کیا ان الفاظ کے بغیر تقدیسِ باری تعالیٰ ممکن نہیں ہے یا ان الفاظ کا استعمال کرنا قرآن وحدیث کی کسی دلیل سے ثابت ہے؟ یہ درست ہے کہ جہت وتلقا کا لفظ شریعت میں وارد نہیں ہوا، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ استوا، علو اور فوق کتاب عزیز کی نصوص کے ساتھ اللہ علی واعلی تعالیٰ شانہ کے لیے ثابت ہے۔ ایسی نفی سے تو مذکورہ صفات کی نفی ہی متبادر ہوتی ہے، لہٰذا ایسے الفاظ کا ذکر نہ کرنا ہی اولیٰ اور احوط ہے۔ واللہ أعلم. [مولف رحمہ اللہ]

کوئی چیز نہ تھی، کیونکہ قبل اور بعد زمان کے صیغے ہیں اور زمان وہ ہے جسے اس نے اختراع کیا ہے، وہ ایسا قیوم ہے جو سوتا نہیں ہے اور قہار ہے اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ [الشوریٰ: ۱۱]

[اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے]

اس نے عرش کو پیدا کر کے استوا کی ایک حد ٹھہرائی اور کرسی بنا کر اسے آسمان وزمین کی وسعت دی، لوحِ محفوظ اور قلم کو اختراع کیا اور اسے جاری کر کے اپنے علم کے مطابق مخلوق کے حق میں فصل وقضا کے دن تک کا کاتب بنایا۔ سارے جہان کو کسی سابق مثال کے بغیر اختراع کیا، خلق کو پیدا کیا، اسے خلیفہ ٹھہرایا اور روحوں کو بدنوں میں اتارا اور امانت دار بنایا۔ پھر ان بدنوں کو، جن میں روحیں اتاری گئیں، زمین کا خلیفہ مقرر کیا اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اس سب کو ان خلفا کا مسخر ٹھہرایا اور یہ سب اسی کی طرف سے ہے۔ وہ قائم ہے، ایک ذرہ بھی اس کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا ہے۔ اس نے تمام مخلوق کو، بغیر اس کے کہ اسے مخلوق کی کچھ حاجت ہو، یا کسی نے اس کا پیدا کرنا اللہ پر واجب کیا ہو، پیدا کیا، لیکن اس کا علم سابق تھا تو اس معلوم کو پیدا کرنا ضروری ٹھہرا۔

اس کا فرمان ہے:

﴿هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ [الحدید: ۳]

[وہی سب سے پہلے ہے اور سب سے پیچھے ہے اور ظاہر ہے اور چھپا ہوا ہے اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے]

اس کا علم ہر چیز کو محیط اور ہر عدد کو شمار کرنے والا ہے، وہ ہر راز اور ہر پوشیدہ تر امر کا عالم ہے، وہ آنکھ کے اشارے اور دل کے اندر کی بات کو جانتا ہے، تو وہ اس چیز کو کیوں نہ جانے گا جسے اس نے پیدا کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ [الملک: ۱٤]

[کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے اور وہی تو ہے جو نہایت باریک بین ہے، کامل خبر رکھنے والا ہے]

جب اشیا نہ تھیں تب بھی اسے ان کا علم تھا۔ پھر اسی علم کے بہ موجب ان کو ایجاد کیا۔ غرض کہ

وہ ہمیشہ سے اشیا کا عالم تھا۔ اشیا کے موجود ہونے پر اسے کوئی نیا علم حاصل نہیں ہوا۔ ساری اشیا کا اتقان واِحکام اور ان پر حکمرانی کرنا اسی علم سے ہے، جسے چاہا اسے ان پر حاکم بنایا۔ اہلِ نظرِ صحیح کے اجماع کے ساتھ جس طرح کہ وہ علی الاطلاق کلیات کا عالم ہے، اسی طرح وہ جزئیات کا بھی عالم ہے اور وہی عالم غیب وشہادت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ [الأعراف: ١٩٠]

[پس اللہ اس سے بہت بلند ہے جو وہ شریک بناتے ہیں]

نیز فرمایا:

﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ [هود: ١٠٧] [کر گزرنے والا ہے جو چاہتا ہے]

ارادہ کرنے والا اور غیب وشہادت میں کائنات کا عالم وہی ہے۔ اس کی قدرت کسی چیز کے ایجاد سے متعلق نہیں ہوئی جب تک اس نے ارادہ نہیں کیا، جس طرح کہ اس نے ارادہ نہیں کیا تھا جب تک اس کو جان نہیں لیا، کیونکہ عقل میں یہ بات محال ہے کہ جس چیز کو نہ جانے اس کا ارادہ کرے یا جس چیز کو نہ کرنا چاہے اس کو نہ کرنے کا ارادہ کرے۔ جس طرح یہ بات محال ہے کہ یہ حقائق بغیر حی قیوم کے پائے جائیں یا یہ صفات بغیر ایک ذات کے، جو صفات بالا سے موصوف ہے، قائم رہ سکیں۔ وجود میں کوئی طاعت یا معصیت، فائدہ یا نقصان، عبد یا حُر، برد یا حَر، حیات یا موت، حصول یا فوت، نہار یا لیل، اعتدال یا میل، بر یا بحر، نفع یا ضر، شفع یا وتر، جوہر یا عرض، صحت یا مرض، فرح یا ترح، روح یا شج، ظلام یا ضیا، ارض یا سما، ترکیب یا تحلیل، کثیر یا قلیل، غداۃ یا اصیل، بیاض یا سواد، سہار یا رقاد، ظاہر یا باطن، متحرک یا ساکن، یابس یا رطب اور قشر یا لب نہیں ہے۔ اسی طرح نہ کوئی چیز متضاد یا مختلف یا متماثل ہے، لیکن وہ مرادِ حق تعالیٰ ہے اور وہ اس کی مراد کیوں کر نہ ہو، حالانکہ اسی نے اسے ایجاد کیا ہے، کہیں یہ ہو سکتا ہے کہ جو مراد نہ ہو وہ مختار پایا جائے؟

اس کے امر کو کوئی رد کرنے والا ہے نہ کوئی اس کے فیصلے کے خلاف فیصلہ کرنے والا ہے، جسے چاہتا ہے بادشاہی عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے بادشاہی چھین لیتا ہے، جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے، جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا گمراہ کرتا ہے، جو اللہ نے چاہا وہ ہو کر رہا اور جو اس نے نہ چاہا وہ نہ ہوا۔

اگر ساری دنیا اکٹھی ہو کر کسی چیز کا ارادہ کرے جو اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہے وہ نہیں کر سکتے، یا کوئی ایسی چیز کرے جسے ایجاد کرنے کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ نہیں کیا ہے یا اللہ تعالیٰ کی مراد کے خلاف کچھ کرنا چاہے تو ہر گز نہیں کر سکتے۔ انھیں یہ استطاعت نہیں ہے اور نہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس امر کی قدرت عطا کی ہے۔ کفر و ایمان، طاعت و عصیان سب اسی کی مشیت اور ارادے سے ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ارادے کے ساتھ ہمیشہ سے موصوف ہے، وہ معدوم کا عالم تھا، پھر اس نے عالم کو بلا تفکر و تدبر ایجاد کیا۔ وہ جاہل نہ تھا کہ تدبر و تفکر سے اسے علمِ مجہول حاصل ہوتا، اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند ہے، بلکہ اس نے اسی علمِ سابق اور ارادہ منزہ ازلیہ کی بنیاد پر عالم کو زمان و مکان اور اکوان والوان کے ساتھ ایجاد کیا۔ اس ذات پاک کے سوا کوئی موجود نہیں ہے، جو علی الحقیقت وجود میں مرید ہو، کیونکہ قائل اس قول کا ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ وہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح جانا حکم کیا، جو ارادہ کیا وہ خاص کیا، اسی نے مقدر کر کے ایجاد کیا، وہ ہر متحرک، ساکن اور ناطق کو، جو عالم اسفل سے لے کر عالم اعلا تک ہے، سنتا اور دیکھتا ہے، نہ بُعد اس کی سمع کو حاجب ہو، کیونکہ وہ قریب ہے، نہ قرب اس کے بصر کو محجوب کرے کیونکہ وہ بعید ہے۔ دل کی بات دل کے اندر سنتا ہے اور لمس کے وقت صوت خفیہ کو سماعت کرتا ہے، سیاہی کو اندھیرے میں اور پانی کو پانی کے اندر دیکھتا ہے۔ نہ امتزاج اسے حاجب ہو اور نہ ظلمات و انوار مانع ہوں، وہی سنتا دیکھتا ہے۔

اس نے تکلم کیا، لیکن نہ متقدم سکوت سے اور نہ سکوت متوہم سے۔ اس کا یہ کلام صفاتِ علم، ارادہ اور قدرت کی ساری صفات کی مانند قدیم ازلی ہے۔ اس نے موسیٰ علیہ السلام وغیرہ سے بات کی تو اس کا نام کسی تشبیہ و تکییف کے بغیر تنزیل، زبور، تورات، انجیل اور فرقان رکھا، اس کا کلام بغیر لہات ولسان ہے جس طرح اس کا سننا کانوں کے سوراخوں کے بغیر ہے۔ یا جس طرح کہ اس کی آنکھ پلکوں وغیرہ کے بغیر ہے، یا جیسے اس کا ارادہ بغیر قلب و جنان ہے: یا جیسے اس کا علم بغیر اضطرار ونظر کرنے کے برہان ہے، یا جیسے اس کی حیات تجویف قلب کے بغیر ہے جو ارکان کے امتزاج سے حادث ہوتا ہے۔ اس کی ذات نہ زیادتی کو قبول کرے نہ نقصان کو۔ وہ پاک ذات عظیم السلطان، عمیم الاحسان اور جسیم الامتنان ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ اسی کے وجود سے فائض ہوا ہے۔

اس کا فضل و عدل باسط و قابض ہے۔ جب اس نے جہاں کو ایجاد و اختراع کیا تو اس کی صنع کو

کامل اور بدیع بنایا۔ اس کے ملک میں کوئی شریک یا اس کے امر میں کوئی مدبر نہیں ہے۔ اگر انعام کرے اور نعمت دے تو یہ اس کا فضل ہے اور اگر نہ مانے اور عذاب کرے تو یہ اس کا عدل ہے۔ اس کے ملک میں کسی غیر کا کچھ تصرف نہیں ہے کہ اسے جور اور حیف کی طرف منسوب کریں۔ نہ اس پر کسی کا حکم چلتا ہے کہ وہ خوف میں مبتلا ٹھہرے، جو کچھ اس کے سوا ہے وہ زیر سلطان قہر خدا ہے اور اسی کے ارادہ وامر سے متصرف ہے۔ لوگوں کے اندر تقویٰ وفجور کا الہام کرنے والا وہی ہے۔ پھر جس کی سیئات اور گناہوں سے چاہے درگزر فرمائے اور جسے چاہے، اس دنیا میں یا قیامت کے دن، پکڑے۔ اس کا عدل اس کے فضل میں حکم کرے اور نہ اس کا فضل اس کے عدل میں حکمران ہو۔ عالم کو دو ہاتھوں میں نکالا اور ان کے لیے دو مرتبے رکھے، فرمایا:

«هٰؤُلَاءِ فِي الْجَنَّةِ وَلَا أُبَالِي وَهٰؤُلَاءِ فِي النَّارِ وَلَا أُبَالِي»[1]

[یہ لوگ جنت میں ہیں اور مجھے کوئی پروا نہیں اور یہ لوگ آگ میں ہیں اور مجھے کوئی پروا نہیں]

کسی معترض نے اس وقت کوئی اعتراض نہ کیا، کیونکہ اس وقت وہاں کوئی موجود نہ تھا، خود وہی موجود تھا، چنانچہ تمام لوگ اسماے الٰہی کی تصریف کے نیچے ہیں۔ ایک مٹھی زیر بلا ہے اور دوسری مٹھی زیر اسما ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر چاہتا کہ سارا جہاں سعادت مند ہو تو ایسا ہی ہوتا اور اگر چاہتا کہ تمام عالم بدبخت ہو تو ویسا ہی ہوتا، یہ سب اس کی شان تھی لیکن اس نے اس طرح نہ چاہا، بلکہ اس طرح ہوا جو اس نے چاہا کہ یہاں اور آخرت میں کوئی بدبخت ہے اور کوئی خوش نصیب۔ اب اس کے حکم کو بدلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، چنانچہ فرمایا کہ یہ پانچ نمازیں پچاس نمازوں کے برابر ہیں:

﴿مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾ [ق: ۲۹]

[میرے ہاں بات بدلی نہیں جاتی اور میں بندوں پر ہرگز کوئی ظلم ڈھانے والا نہیں]

کیونکہ ملک میں میرا ہی تصرف ہے اور میری ہی مشیت جاری ہے، اس کی حقیقت سے سر اور دل کی آنکھیں اندھی ہیں، افکار وضمائر کا اس پر گزر نہیں ہوتا، مگر وہب الٰہی اور جودِ رحمانی کے سبب جس بندے پر اس کی عنایت ہوتی ہے حضرت شہادت میں جس کے لیے یہ امر سابق ہو چکا ہے اسی کو یہ موہبت ملتی ہے۔ جس وقت الوہیت نے یہ تقسیم کی تھی، اس کو یہ معلوم تھا کہ یہ دقائق قدیم ہیں، اس

[1] مسند أحمد (٤/١٨٦) صحيح ابن حبان (٢/٥٠)

کے سوا کوئی فاعل نہیں ہے اور نہ کوئی موجود بذات خود ہے مگر وہی ایک۔ اللہ تعالیٰ ہی نے تمھیں اور تمھارے اعمال کو پیدا کیا۔ اس سے اس کے فعل کا سوال نہیں کیا جاتا، بلکہ یہی مخلوق جواب دہ ہے۔ حجت بالغہ اسی اللہ کے لیے ہے، وہ چاہے تو تم سب کو صحیح راہ پر لگا دے۔

فصل

میں نے جس طرح اللہ تعالیٰ، فرشتوں، اس کی ساری مخلوق اور تمھیں اپنے نفس پر اپنی توحید کا گواہ ٹھہرایا ہے، اسی طرح میں اللہ تعالیٰ، ملائکہ، ساری مخلوق اور تم کو اپنے نفس پر اپنی توحید اور اللہ تعالیٰ کے مصطفیٰ مختار اور مجتبیٰ ﷺ پر ایمان لانے کا گواہ بناتا ہوں۔ وہ ہمارے سید اور مولی محمد ﷺ ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ نے سب لوگوں کی طرف بشیر، نذیر، اپنے اذن سے داعی الی اللہ اور سراج منیر بنا کر بھیجا ہے۔ آپ ﷺ پر اللہ کی طرف سے جو کچھ نازل ہوا تھا وہ انھوں نے پہنچا دیا، امانت ادا کر دی، امت کی خیر خواہی کی۔ حجۃ الوداع کے موقع پر کھڑے ہو کر سارے حاضرین متبعین کو خطبہ سنایا، تذکیر فرمائی اور تحذیر کی، وعد و وعید پہنچائے، اس تذکیر کے ساتھ کسی کو خاص نہیں کیا اور یہ تذکیر اللہ احمد وصمد کے اذن سے تھی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟» [سنو کیا میں نے (پیغامِ الٰہی) پہنچا دیا؟] سب نے کہا: ہاں! تب آپ ﷺ نے فرمایا: «اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ»[1] [اے اللہ! گواہ رہنا]

میں ایمان لایا اس پر جو آپ ﷺ لائے ہیں، خواہ وہ مجھے معلوم ہے یا نہیں۔ آپ ﷺ جو [تعلیمات] لائے، ان میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ موت اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک اجل مسمی ہے جب آتی ہے تو وہ دیر نہیں کرتی۔ پس میرا اس پر ایمان ہے، اس میں کوئی شک وشبہہ نہیں ہے، جس طرح میں اس بات پر بھی ایمان لایا ہوں اور میں نے اقرار کیا ہے کہ منکر ونکیر کا سوال حق ہے، عذابِ قبر حق ہے، جسموں کا قبروں سے اٹھایا جانا حق ہے، اللہ تعالیٰ کے پاس پیش ہونا حق ہے، جنت حق ہے، آگ حق ہے، میزان حق ہے، حوض حق ہے، اعمال کے صحیفوں کا اڑنا حق ہے، صراط حق ہے، ایک فریق کا جنت میں اور ایک فریق کا دوزخ میں جانا حق ہے۔

اس دن ایک گروہ پر کرب حق ہے، ایک گروہ کو فزع اکبر کے حزن میں نہ ڈالنا حق ہے۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٢٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٧٩)

ملائکہ، انبیا، مومنین اور ارحم الراحمین کی شفاعت حق ہے۔ اہلِ کبائر سے مومنوں کی ایک جماعت جہنم میں جائے گی، پھر شفاعت سے باہر آئے گی، یہ سب حق ہے اور جو کچھ کتابوں میں آیا ہے اور رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں اس کا علم ہو یا جہل ہو، وہ حق ہے۔

ہر وہ شخص جس کے پاس میری یہ شہادت پہنچی، اس کے پاس یہ میرے نفس پر امانت ہے، چنانچہ وہ سوال کے وقت جہاں کہیں بھی وہ ہو اس امانت کو ادا کرے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمھیں اس ایمان سے نفع دے اور دارِ حیوان کی طرف منتقل ہوتے وقت ہمیں اس پر ثابت قدم رکھے اور ہمیں کرامت ورضوان کے گھر میں داخل کرے، ہمارے اور ان گھر والوں کے درمیان حائل ہو جائے جن کی قمیصیں گندھک کی ہوں گی اور ہمیں اس جماعت میں شامل کرے جس نے کتبِ الٰہیہ کو ایمان کے ساتھ لیا ہے، وہ حوض سے سیراب ہو کر لوٹا ہے، اس کی ترازو بھاری ہوگئی ہے اور اس کے پاؤں صراط پر جمے رہے وہی منعم محسان ہے، انتھیٰ۔

اس کے بعد شعرانی رحمہ اللہ نے دلائل سمعیہ شرعیہ سے مناسب تفصیل وتقریر کے ساتھ ہر جملہ عقیدہ کو ثابت کیا ہے اور اس کی تائید میں علما اور اولیا کے اقوال نقل کیے ہیں۔ ان عقائد میں وہ مسائل اتحاد وغیرہ، جن پر انتقاد کیا گیا ہے، مذکور نہیں ہوئے، اس لیے کہ شعرانی رحمہ اللہ نے کتاب فتوحات میں بتایا ہے کہ یہ شیخ کے حاسدوں نے ان کے ذمے لگائے ہیں اور تکفیر کی بنیاد انھیں مسائل پر ہے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت شیخ، امام اور ولی اللہ تھے، لہٰذا کسی مسلمان کو ان کی تکفیر کرنے کا حق نہیں پہنچتا ہے اور جس کسی عالم باللہ نے ان کی تکفیر کی ہے تو درحقیقت وہ ان کی تکفیر نہیں ہے بلکہ اس کا مرجع وہ کلمات ہیں جو بظاہر شرع سے مخالفت رکھتے ہیں۔ پس شیخ کا ان کلمات کے ساتھ بولنا اور تکلم کرنا بعید ہے اگرچہ حالت سکر ہی میں کیوں نہ ہو۔ وہ عبارات قابلِ تاویل ہیں اور ہر شخص کو تاویل کی قدرت حاصل نہیں ہوتی ہے۔ ہمارے شیخ امام محمد بن علی شوکانی رحمہ اللہ پہلے شیخ کے منکر تھے. پھر چالیس برس کے بعد رجوع کیا اور کہا کہ ان کے بعض الفاظ محتمل اور قابلِ تاویل ہیں اور انھوں نے تکفیر کو روا نہ رکھا، وللہ الحمد.

فائدہ:

شیخ نے فتوحات مکیہ میں لکھا ہے:

"إجماع المحققين على أن من شرط الكامل أن لا يكون عنده شطح عن ظاهر الشريعة أبدا بل يرى أن من الواجب عليه أن يحق الحق ويبطل الباطل ويعمل على الخروج من خلاف العلماء ما أمكن" انتهىٰ بلفظه.

[محققین کا اس بات پر اجماع ہے کہ کامل ولی کی شرط میں سے ہے کہ اس کے اقوال ظاہر شریعت سے کبھی ہٹے ہوئے نہ ہوں، بلکہ اس کا نظریہ یہ ہو کہ اس پر واجب ہے کہ وہ حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کرے اور جہاں تک ممکن ہو سکے، علما کے اختلاف سے نکل جائے]

امام شعرانی رحمہ اللہ نے "منن کبریٰ" میں مذکورہ بالا عبارت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

"ومن تأمله وفهمه عرف أن جميع المواضع التي فيها شطح في كتبه مدسوسة عليه، لاسيما كتاب الفتوحات المكية فإنه وضعه في حال كماله بيقين وقد فرغ منه قبل موته نحو ثلاث سنين، وبقرينة ما قاله في الفتوحات المكية في مواضع كثيرة من أن الشطح كله رعونة نفس لا يصدر قط من محقق، وبقرينة قوله أيضاً في مواضع من أراد أن لا يضل فلا يرم ميزان الشريعة من يده طرفة عين بل يستصحبها ليلا ونهارا عند كل قول وفعل واعتقاد." انتهى.[1]

[جس نے اس پر غور کیا اور اسے سمجھا تو اس نے پہچان لیا کہ ان کی کتابوں میں وہ تمام جگہیں جہاں پر خلاف حق اقوال موجود ہیں، دراصل وہ باتیں ان کے ذمے لگائی گئی ہیں، خاص طور پر کتاب "الفتوحات المكية" یقیناً انھوں نے اپنے کمال کی حالت میں یقین کے ساتھ وہ کتاب لکھی اور اپنی موت سے تقریباً تین سال پہلے اسے تحریر کر کے فارغ ہوئے اور اس قرینے کے ساتھ جو انھوں نے فتوحات مکیہ میں کئی ایک جگہوں پر لکھا ہے کہ خلاف حق باتیں سب رعونت ہیں، جو کسی محقق سے کبھی صادر نہیں ہو سکتیں۔ نیز کئی جگہ ان کے اس قول کے قرینے کے ساتھ کہ جو شخص گمراہ نہیں ہونا چاہتا تو وہ پلک جھپکنے کے وقت بھی شریعت کا میزان اپنے ہاتھ سے نہ گرائے، بلکہ دن رات ہر قول، فعل اور اعتقاد کے لیے اسے اپنے ساتھ رکھے]

[1] لطائف المنن والأخلاق (ص: ۳۹۰)

میں کہتا ہوں: مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ نے مکتوبِ اعتقاد میں کئی جگہ شیخ ابن عربی پر انتقاد کیا ہے، جیسا کہ ابھی اس کا بیان ہو گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ مجدد کو شعرانی رحمہ اللہ کے کلام کی اطلاع نہیں ہوئی ورنہ وہ ان عقائد کو، جن پر انھوں نے انتقاد کیا ہے، ان کے ذمے لگاتے ہوئے سمجھ لیتے، واللہ أعلم.

اس کے بعد شعرانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وبالجملة فلا يحل مطالعة كتب التوحيد الخاص إلا لعالم كامل أو من سلك طريق القوم وأما من لم يكن واحدا من هذين الرجلين فلا ينبغي له مطالعة شيئ من ذلك، خوفا عليه من إدخال الشبه التي لا يكاد الفطن يخرج منها، فضلا عن غير الفطن، ولكن من شأن النفس كثرة الفضول ومحبة الخوض فيما لا يعنيها، وقد أجمع أهل الحق على وجوب تأويل أحاديث الصفات كحديث ينزل ربنا إلى سماء الدنيا، وخالف في ذلك الكرامية المجسمة والحشوية المشبهة فمنعوا تأويلها، وحملوها على الوجه المستحيل في حقه تعالیٰ من التشبيه والتكييف، حتى أن بعضهم كان على المنبر فنزل درجاً منه، وقال: ينزل ربكم عن كرسيه إلى سماء الدنيا كنزولي من منبري هذا، وهذا جهل ليس فوقه جهل، وكل هؤلاء محجوجون بالكتاب والسنة ودلائل العقول، و إذا تعددت وجوه الحمل لآيات الصفات وجب الأخذ بالوجه الراجح عند الشيخ أبي الحسن الأشعري لقوله تعالیٰ: فاعتبروا يا أولي الأبصار، ولقوله تعالیٰ فبشر عباد الذين يستمعون القول فيتبعون أحسنه، وذهب سفيان الثوري والأوزاعي وغيرهما إلى أنه يطرح التشبيه والتكييف، و يقف عن تعيين وجه من وجوه التأويل" انتهى.[1]

[بالجملہ توحید خاص کی کتابوں کا مطالعہ کرنا صرف اسی شخص کے لیے حلال ہے جو کامل عالم ہے یا جو قوم [صوفیہ] کے طریقے پر چلا ہے، لیکن جو شخص ان دو قسم کے آدمیوں میں سے

[1] لطائف المنن والأخلاق (ص: ٣٩٤)

نہ ہو تو اسے یہ لائق نہیں ہے کہ وہ اس طرح کی کتابوں کا مطالعہ کرے، کیونکہ اس میں خدشہ ہے کہ وہ ایسے شک وشبہہ کا شکار ہو جائے گا جس سے ذہین وفطین آدمی کا بچنا بھی محال ہے، چہ جائے کہ ایک غیر فطین آدمی ہو، لیکن انسانی نفس کی شان یہ ہے کہ وہ لایعنی چیزوں میں فضول بحثیں کرتا ہے اور ان میں خوض و بحث کرنے کو پسند کرتا ہے۔ اہلِ حق [صوفیہ] نے احادیثِ صفات کی تاویل کرنے کے وجوب پر اجماع کیا ہے، جیسے یہ حدیث ہے کہ ہمارا رب آسمانِ دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے۔ مگر اس میں کرامیہ مجسمہ اور حشویہ مشبہہ نے مخالفت کی ہے۔ انھوں نے اس کی تاویل کو ناروا کہا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کے حق میں تشبیہ اور تکییف سے مستحیل وجہ پر محمول کیا ہے۔ حتی کہ ان میں سے ایک شخص منبر پر کھڑا تھا، پھر وہ ایک سیڑھی منبر سے نیچے اتر آیا اور کہا: تمھارا رب کرسی سے آسمانِ دنیا کی طرف اسی طرح نزول کرتا ہے جس طرح میں اپنے اس منبر سے ایک سیڑھی نیچے اترا ہوں۔[1] یہ ایسی جہالت ہے جس سے بڑی کوئی جہالت نہیں ہو سکتی۔ یہ تمام لوگ کتاب وسنت اور عقلی دلائل کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ جب آیاتِ صفات تاویل پر حمل کرنے کی متعدد وجوہ ہیں تو شیخ ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ کے نزدیک ان میں سے راجح صورت کو اختیار کرنا واجب ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ﴾ [الحشر: ۲] نیز اس کا ارشاد ہے: ﴿فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ﴾ [الزمر: ۱۷۔۱۸] چنانچہ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ اور امام اوزاعی رحمہ اللہ وغیرہ اس طرف گئے ہیں کہ وہ تشبیہ اور تکییف کو ترک کر دے اور تاویل کی متعدد وجوہ میں سے کسی ایک وجہ کی تعیین سے توقف کرے]

میں کہتا ہوں: وجوبِ تاویل سے شعرانی رحمہ اللہ کی مراد تشبیہ اور تکییف کی نفی کرنا ہے نہ کہ کچھ

[1] یہ ائمہ سلف اور اہلِ حدیث پر اتہام ہے جس کی کوئی معتبر تاریخی دلیل نہیں۔ ابن بطوطہ نے یہ بات امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے متعلق لکھی ہے۔ (رحلة ابن بطوطة، ص: ٦٨) لیکن یہ صریح بہتان ہے، کیوں کہ ابن بطوطہ کے دمشق میں داخل ہونے (جمعرات ۹ رمضان ۷۶۸ھ) سے پہلے ہی امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (شعبان ۷۲۸) جیل میں قید کر دیے گئے تھے اور وہیں انھوں نے (۲۰ ذوالقعدہ ۷۲۸ھ) وفات پائی اور وفات سے پہلے انھیں جیل سے رہا نہیں کیا گیا تھا، لہٰذا ابن بطوطہ نے انھیں مسجد میں منبر پر خطبہ دیتے ہوئے کیسے دیکھ لیا تھا..؟!

اور، چنانچہ کرامیہ اور حشویہ کا ذکر کرنا اس مراد پر قرینہ صحیحہ ہے۔ صفات کے بارے میں سلف کا مذہب وہی ہے جو اس جگہ سفیان ثوری رحمہ اللہ وغیرہ سے نقل کیا گیا ہے۔ سارے اہلِ حدیث اسی طریق پر گزرے ہیں اور اشعری کا قول مرجوح ہے۔ یہ اہلِ بدعت اہلِ سنت کو جو حشویہ کہہ دیتے ہیں تو یہ ان کی اہلِ حق پر استطالت اور دست درازی ہے۔

پھر شعرانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

"قلت: وقد اختصرت الفتوحات المكية، وحذفت منها كل ما يخالف ظاهر الشريعة، فلما أخبرت بأنهم دسوا في كتب الشيخ ما يوهم الحلول والاتحاد، ورد عليّ الشيخ شمس الدين المدني بنسخة في الفتوحات التي قابلها على خط الشيخ بقونيا فلم أجد فيها شيئا من ذلك الذي حذفته، ففرحت بذلك غاية الفرح، فالحمد لله على ذلك"[1] انتهى.

[میں کہتا ہوں: میں نے فتوحات مکیہ کا خلاصہ لکھا اور جتنی باتیں ظاہر شریعت کے خلاف تھیں، انھیں میں نے حذف کر دیا۔ پھر جب مجھے یہ خبر ہوئی کہ شیخ کی کتابوں میں جو باتیں ان کے حلول اور اتحاد کے عقیدے کا قائل ہونے کا وہم ڈالتی ہیں وہ سب ان کے ذمے لگائی گئی ہیں اور شیخ شمس الدین المدنی رحمہ اللہ نے مجھے فتوحات مکیہ کا وہ نسخہ عطا فرمایا جس کا انھوں نے قونیا میں شیخ کے نسخے سے تقابل کیا ہوا تھا تو مجھے اس میں وہ چیز نہ ملیں جو میں نے ان کی کتاب سے حذف کر دی ہوئی تھیں۔ تو مجھے اس پر انتہائی خوشی محسوس ہوئی، فالحمد لله على ذلك]

میں کہتا ہوں: میں نے کتاب فتوحات مکیہ کا مطالعہ کیا تو مجھے اس کتاب کی کئی جگہوں میں اتباع سنت کی تحریض اور ترکِ تقلید کی تحریض ملی، چنانچہ میں نے اس کتاب کو اعتقاد میں اہلِ حدیث کی مطابقت کرنے والی کتاب پایا، جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اتحاد وحلول کے مسائل اس کتاب میں داخل کر کے شیخ کے ذمے لگائے گئے ہیں، ورنہ اس کتاب میں کتاب وسنت کے اتباع پر برانگیختہ نہ کیا جاتا۔

---

[1] لطائف المنن (ص: ۳۹۵)

بارھویں فصل

”غنیۃ الطالبین“ کے مطابق اہلِ سنت کے عقائد کا بیان

① آیات ودلالات کے مطابق اختصار کے ساتھ صانع عزوجل کی معرفت کچھ یوں ہے کہ انسان یہ بات جانے اور یقین کرے کہ صانع عالم واحد، احد، فرد اور صمد ہے، چنانچہ اس نے فرمایا:

﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ [الإخلاص: ۳، ٤]

[نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا۔ اور نہ کبھی کوئی ایک اس کے برابر کا ہے]

مزید فرمایا:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ [الشوریٰ: ۱۱]

[اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے]

نہ اس کا کوئی شبیہ ونظیر ہے اور نہ کوئی عون وشریک، نہ کوئی ظہیر ووزیر ہے اور نہ کوئی ندومشیر۔ وہ جسم ممسوس ہے نہ جوہر محسوس، وہ عرض ہے نہ ترکیب اور نہ آلہ ماہیت اور تحدید والا ہے۔[1] وہی آسمان کو بلند کرنے اور زمین کو نیچے کرنے والا ہے۔ نہ وہ طبائع میں سے کوئی طبیعت ہے اور نہ طوالع میں سے کوئی طالع۔ نہ ظلمت ہے کہ ظاہر ہو، نہ نور ہے کہ باہر ہو۔ علم سے اشیا کے پاس حاضر ہے اور کسی مماست کے بغیر شاہد کائنات ہے۔ وہ عزیز، قاہر، حاکم، راحم، غافر، ساتر، معز، ناصر، رؤف، خالق، فاطر، اوّل، آخر، ظاہر، باطن، فرد، معبود، حی لا یموت، ازلی لا یفوت، ابدی الملکوت اور سرمدی الجبروت ہے۔ قیوم ہے وہ سوتا نہیں، عزیز ہے اس پر کوئی جور نہیں کرتا اور وہ منیع ہے کوئی اس کا قصد نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے اسمائے عظام اور مواہبِ کرام ہیں۔ اس نے ساری مخلوق پر فنا کا حکم لگایا اور فرمایا ہے:

① بے شک وہ ایسا ہی ہے۔ یہ الفاظ کلامیہ محض ایضاحِ تقدیس کے لیے لکھے جاتے ہیں، اگرچہ شرع میں یہ صراحتاً وارد نہیں، لیکن ان کا مقصود یہ ہے کہ ہر مومن اللہ کی تنزیہ کو بہ خوبی شرح وبسط کے ساتھ سمجھ لے اور کسی مبتدع گمراہ شخص کے دھوکے میں نہ آئے۔ [مولف رحمہ اللہ]

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ﴾
[الرحمٰن: ٢٦، ٢٧]

[ہر ایک جو اس (زمین) پر ہے، فنا ہونے والا ہے اور تیرے رب کا چہرہ باقی رہے گا، جو بڑی شان اور عزت والا ہے]

وہ جہتِ علو میں مستوی اور عرش پر محتوی ہے اور اس کا علم تمام اشیا کو محیط ہے۔ اچھے کلمات اور نیک اعمال اسی کی طرف چڑھتے ہیں۔ وہ آسمان کے اوپر سے زمین کی طرف ہر کام کی تدبیر کرتا ہے پھر وہ کام اسی کی طرف چڑھتا ہے۔ ایک ایسے دن میں جس کی مقدار ہماری گنتی سے ہزار سال کے برابر ہے، اسی نے مخلوق اور ان کے افعال کو پیدا کیا ہے، ان کی روزی اور اجل مقرر کی ہے۔ جو وہ موخر کر دے اسے کوئی مقدم کرنے والا نہیں اور جو وہ مقدم کر دے اسے کوئی موخر کرنے والا نہیں۔ عالم اور جو کچھ اہلِ عالم کرتے ہیں، اس میں اسی کا ارادہ کارگر ہے۔ اگر وہ ان کو گناہوں سے بچا کر رکھتا تو وہ ہرگز اس کے خلاف نہ کرتے اور اگر وہ چاہتا کہ سب اس کی طاعت کریں تو سب کے سب اس کے مطیع ہوتے۔ وہ پوشیدہ امور کا عالم اور علیم ذات الصدور ہے۔ اس کا فرمان ہے:

﴿اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ﴾ [الملك: ١٤]

[کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے اور وہی تو ہے جو نہایت باریک بین ہے، کامل خبر رکھنے والا ہے]

حرکت دینے والا اور ٹھہرانے والا سب وہی ہے۔ نہ اوہام اس کا تصور کر سکتے ہیں اور نہ اذہان اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اسے لوگوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، وہ اس سے جلیل تر ہے کہ وہ کسی مصنوع ومخلوق سے مشابہ ہو یا ان کی طرف اسے منسوب کیا جائے۔ وہ انفاس کا شمار کنندہ ہے اور ہر نفس پر اس کے اعمال کے ساتھ نگران ہے۔ اس کا فرمان ہے:

﴿لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۝ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا﴾
[مریم: ٩٤۔٩٥]

[بلاشبہہ یقیناً اس نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے اور انھیں خوب اچھی طرح گن کر شمار کر رکھا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک قیامت کے دن اس کے پاس اکیلا آنے والا ہے]

نیز فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى﴾ [طٰهٰ: ١٥]

[تاکہ ہر شخص کو اس کا بدلہ دیا جائے جو وہ کوشش کرتا ہے]

مزید فرمایا:

﴿لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى﴾ [النجم: ٣١]

[تاکہ وہ ان لوگوں کو جنھوں نے برائی کی، اس کا بدلہ دے جو انھوں نے کیا اور ان لوگوں کو جنھوں نے بھلائی کی، بھلائی کے ساتھ بدلہ دے]

وہ خلق سے غنی ہے، بریت کا رازق ہے، کھلاتا ہے کھاتا نہیں، دیتا ہے لیتا نہیں، پناہ دیتا ہے، کسی پناہ کی اسے ضرورت نہیں اور ساری خلق اس کی محتاج ہے۔ اس نے مخلوق کو جلب نفع یا دفع ضرر کے لیے پیدا نہیں کیا ہے نہ کسی کے کہنے اور سوچ بچار کے بعد اسے پیدا کیا ہے، بلکہ یہ تو محض اس کا ارادہ ہے۔ جسے وہ اصدق القائلین فرماتا ہے:

﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ۝ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ [البروج: ١٥، ١٦]

[عرش کا مالک ہے۔ بڑی شان والا ہے۔ کر گزرنے والا ہے جو چاہتا ہے]

وہ ذوات کی ایجاد، نفع ونقصان کی رسائی اور اعیان واحوال میں تصرف پر قدرت کے ساتھ متفرد ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ﴾ [الرحمٰن: ٢٩] [ہر دن وہ ایک (نئی) شان میں ہے]

جو بات اس نے جس وقت پر مقدر کی ہے، وہ اس کو اسی وقت پر کرتا ہے۔ وہ حیات کے ساتھ زندہ جاوید ہے، علم کے ساتھ عالم ہے، قدرت کے ساتھ قادر ہے، ارادے کے ساتھ مرید ہے، سمع کے ساتھ سمیع ہے، بصر کے ساتھ بصیر ہے، ادراک کے ساتھ مدرک ہے، کلام کے ساتھ متکلم ہے، امر کے ساتھ آمر ہے، نہی کے ساتھ ناہی ہے، خبر کے ساتھ مخبر ہے۔ وہ اپنے حکم وقضا میں عادل ہے، اپنے عطا وانعام میں محسن ومتفضل ہے۔ وہ مبدی، معید، محی، ممیت، محدث، موجد، مثیب اور معاقب ہے۔ وہ جواد ہے بخل نہیں کرتا۔ حلیم ہے عجلت نہیں فرماتا۔ حفیظ ہے بھولتا نہیں۔ بیدار ہے سہو نہیں کرتا۔ جاگتا ہے غافل نہیں ہوتا۔ وہ قابض ہے، باسط ہے، ہنستا ہے، خوش ہوتا ہے، محبوب ومکروہ رکھتا

ہے، ناخوش اور راضی ہوتا ہے، غضب وسخط فرماتا ہے، رحم کرتا ہے، بخشتا ہے، دیتا ہے، منع کرتا ہے۔

اس کے دو ہاتھ ہیں جو دونوں دستِ راست ہیں۔ اللہ جل وعلا نے فرمایا:

﴿وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ﴾ [الزمر: ٦٧]

[اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہوں گے]

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ زمینوں اور آسمانوں کو اپنی مٹھی میں لے لے گا اور ان کا کوئی کنارہ اس کے قبضے سے باہر نظر نہیں آئے گا۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: «كِلْتَا يَدَيْهِ يَمِيْنٌ»[2] [اس کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں] اس نے ابو البشر آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے بنایا۔ جنت عدن کو اپنے ہاتھ سے لگایا۔ طوبیٰ درخت کو اپنے ہاتھ سے بویا۔ تورات کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر موسیٰ علیہ السلام کو دیا اور ان سے کسی واسطے اور ترجمان کے بغیر بات چیت کی۔ بندوں کے دل رحمن کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے انھیں الٹ پلٹ کرتا ہے اور جو چاہتا ہے وہ انھیں یاد کرا دیتا ہے۔ قیامت کے دن آسمان وزمین اس کے کفِ دست میں ہوں گے، جس طرح حدیث میں آیا ہے وہ اپنا قدم جہنم میں رکھ دے گا، جہنم کے بعض اطراف بعض کی طرف سمٹ جائیں گے اور وہ کہے گی: بس، بس۔[3] پھر ایک قوم جہنم سے باہر آئے گی۔ جنت والے اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے اور اس کی رویت میں کوئی شک وشبہ نہ کریں گے، جس طرح حدیث میں آیا ہے:

«يَتَجَلّٰى لَهُمْ وَيُعْطِيهِمْ مَا يَتَمَنَّوْنَ»

[وہ ان کے سامنے نمودار ہوگا اور انھیں وہ کچھ عطا کرے گا جس کی وہ تمنا کریں گے]

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾ [يونس: ٢٦]

[جن لوگوں نے نیکی کی انھی کے لیے نہایت اچھا بدلہ اور کچھ زیادہ ہے]

اس آیت میں "حسنیٰ" سے مراد جنت ہے اور "زیادہ" سے اللہ تعالیٰ کے وجہ کریم کی طرف

---

[1] تفسير مقاتل بن سليمان (١٣٩/٣)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٢٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٤٨)

دیکھنا مراد ہے۔ نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ [القيامة: ٢٢، ٢٣]

[اس دن کئی چہرے تروتازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھنے والے]

فیصلے کے دن بندے اس کے سامنے پیش کیے جائیں گے اور وہ خود ان کے حساب کا متولی ہو گا، کسی غیر کو اس کا متولی نہ بنائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اوپر نیچے سات آسمان اور سات زمینیں بنائیں۔ اوپر والی زمین سے آسمان تک پانچ سو سال کا راستہ ہے۔ اسی طرح ہر آسمان کے درمیان دوسرے آسمان تک پانچ سو برس کا فاصلہ ہے۔ پانی ساتویں آسمان پر ہے۔ رحمان کا عرش پانی پر ہے۔ اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہے۔ اس کے سامنے ستر ہزار نور کے پردے ہیں اور جو کچھ اسے معلوم ہے۔ عرش کے اٹھانے والے فرشتے ہیں جو اسے اٹھائے ہوئے ہیں۔ اللہ عزوجل کا فرمان ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ﴾ [المؤمن: ٧]

[وہ (فرشتے) جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو اس کے اردگرد ہیں، اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے بخشش کی دعا کرتے ہیں جو ایمان لائے: اے ہمارے رب! تو نے ہر چیز کو رحمت اور علم سے گھیر رکھا ہے، تو ان لوگوں کو بخش دے جنھوں نے توبہ کی اور تیرے راستے پر چلے اور انھیں بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب سے بچا]

عرش کی ایک حد ہے جو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ﴾ [الزمر: ٧٥]

[اور تو فرشتوں کو دیکھے گا عرش کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے]

یہ عرش سُرخ یاقوت کا ہے، اس کی وسعت آسمانوں اور زمینوں کی وسعت کے مثل ہے۔ کرسی عرش کے پاس ہے، جیسے ایک کڑا کسی بیابان زمین میں پڑا ہو۔ اسے ہر اس چیز کا علم ہے جو آسمانوں کے درمیان اور ان کے نیچے ہے اور جو کچھ زمینوں پر، ان کے درمیان اور جو کچھ تحت الثریٰ اور

دریاؤں کی تہ میں ہے اور ہر بال کی جڑ میں ہے۔ وہ ہر درخت اور ہر اگنے والی کھیتی کو جانتا ہے، نیز وہ ہر پتے کے گرنے کو جانتا ہے۔ وہ پتوں کی تعداد اور سنگریزے اور ریت کی گنتی کو جانتا ہے۔ وہ پہاڑوں کے وزن، دریاؤں کے ماپ، بندوں کے اعمال، ان کے اسرار وانفاس اور کلام کا علم رکھتا ہے۔ وہ ہر چیز کا عالم ہے، اس پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ وہ خلق کی مشابہت سے پاک ہے، اس کے علم سے کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ اس کا وصف یوں بیان کرنا کہ وہ ہر جگہ ہے، جائز نہیں ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ آسمان میں بالائے عرش ہے جس طرح اس نے خود ارشاد فرمایا ہے:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [طٰه: ٥] [وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا]

نیز اس کا قول ہے:

﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ [الأعراف: ٥٤] [پھر وہ عرش پر بلند ہوا]

مزید فرمایا:

﴿إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ﴾ [الفاطر: ١٠]

[اسی کی طرف ہر پاکیزہ بات چڑھتی ہے اور نیک عمل اسے بلند کرتا ہے]

رسول اللہ ﷺ نے اس کنیز کے مسلمان ہونے کا فیصلہ دیا جس سے آپ ﷺ نے سوال کیا تھا: اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ تو اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا تھا۔[1] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ كَتَبَ كِتَاباً عَلٰى نَفْسِهِ وَهُوَ عِنْدَهُ فَوْقَ الْعَرْشِ إِنَّ رَحْمَتِي غَلَبَتْ غَضَبِي»[2]

[جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا تو اس نے اپنے ذمے ایک تحریر لکھی اور وہ تحریر اس کے پاس عرش کے اوپر ہے، کہ یقیناً میری رحمت میرے غضب پر غالب ہو گئی]

تو اب لفظ ''استوا'' کا اطلاق کسی تاویل کے بغیر ہونا چاہیے۔ یہ ذات کا عرش پر استوا ہے نہ کہ قعود ومماست کے معنی میں جس طرح کہ مجسمہ اور کرامیہ کہتے ہیں، اور نہ یہ علو اور رفعت کے معنی

---

1. صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٧)
2. صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥١)

میں ہے جیسا کہ اشعریہ کہتے ہیں، اور نہ استیلا اور غلبے کے معنی میں ہے جس طرح معتزلہ کہتے ہیں، کیونکہ یہ معنی شرع میں نہیں آئے ہیں اور نہ یہ معنی صحابہ وتابعین، سلف صالح اور اصحاب الحدیث میں سے کسی ایک سے منقول ہیں، بلکہ ان سے تو یہی حمل علی الاطلاق منقول ہے۔

سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا، نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ نے کہا ہے:

"الاستواء غير مجهول، والكيف غير معقول، والإقرار به واجب، و الجحود به كفر"[1]

[استوا غیر مجہول ہے اور کیفیت نا قابل فہم ہے اور اس کا اقرار کرنا واجب ہے اور اس کا انکار کرنا کفر ہے]

اسی طرح سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں یہی مضمون پایا جاتا ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے فوت ہونے سے پہلے کہا تھا:

"أخبار الصفات تمر كما جاءت بلا تشبيه ولا تعطيل"

[اخبارِ صفات کو اسی طرح تشبیہ اور تعطیل کے بغیر جاری کرنا چاہیے جس طرح وہ وارد ہوئی ہیں]

ان سے دوسرے الفاظ یوں مروی ہیں کہ انھوں نے کہا:

"لست بصاحب كلام، ولا أرى الكلام في شيئ من هذه الأماكن في كتاب الله عزوجل أو حديث عن النبي ﷺ أو عن أصحابه رضى الله عنهم أو عن التابعين"

[میں صاحب کلام نہیں ہوں اور نہ ان جگہوں یعنی اللہ عزوجل کی کتاب یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث میں یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا تابعین عظام رحمہم اللہ کے کلام میں کوئی ایسی چیز میری نظر سے گزری ہے]

تیسرے مقام پر ان کے الفاظ یہ ہیں:

"نحن نؤمن بأن الله عزوجل على العرش كيف شاء، وكما شاء، بلا حد ولا صفة، يبلغها واصف أو يحده حاد"

[ہم ایمان رکھتے ہیں کہ یقیناً اللہ تعالیٰ عرش پر ہے جیسے اور جس طرح چاہے کسی قید اور

[1] الإبانة لابن بطة (٣/١٦٣)

صفت کے بغیر جس کو کوئی بیان کر سکے یا کوئی حد بندی کرنے والا اس کی حد بندی کرے]

کعب احبار کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تورات میں فرمایا ہے:

"أنا الله فوق عبادي، وعرشي فوق جميع خلقي، وأنا علی عرشي، عليه أدبر عبادي ولا يخفی علي شيئ من عبادي"

[میں اللہ اپنے بندوں کے اوپر ہوں، میرا عرش میری ساری مخلوق کے اوپر ہے اور میں عرش کے اوپر ہوں، اس عرش پر سے میں اپنے بندوں کی تدبیر کرتا ہوں اور میرے بندوں سے کوئی چیز مجھ پر مخفی نہیں ہے]

شیخ جیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل کا عرش پر ہونا ہر آسمانی کتاب میں، جو کسی نبی مرسل پر اتری ہے، بلا کیف مذکور ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے علو، قدرت، استیلا اور ساری مخلوق پر، کیا عرش اور کیا غیر، غلبے کے ساتھ موصوف ہے۔ تو اب عرش پر استوا کو اس معنی پر محمول نہیں کرنا چاہیے۔ یہ استوا اس کی صفتِ ذات ہے، اس کے بعد کہ اس نے ہمیں اس امر کی خبر دی، سات آیات میں اسے موکد فرمایا اور یہ سنت ماثورہ میں بیان ہوئی۔ یہ صفت اس کو لازم اور اس کے شایان شان ہے جیسے وجہ، ید، عین، سمع، بصر، حیات، قدرت وغیرہ صفات ہیں یا جیسے وہ خالق، رازق، محیي اور ممیت ہے اور ان صفات کے ساتھ موصوف ہے۔ ہم کسی طرح کتاب وسنت سے خروج نہیں کر سکتے ہیں، بلکہ آیت وخبر کو پڑھ کر ان پر ایمان لاتے ہیں اور صفات میں کیفیت کو علمِ الٰہی کے سپرد کرتے ہیں جیسا کہ امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے:

"كما وصف الله تعالیٰ نفسه في كتابه، فتفسيره قراءته، لا تفسير له غيرها، ولم نتكلف غير ذلك فإنه غيب لا مجال للعقل في إدراكه، ونسأل الله العفو والعافية، ونعوذ به من أن نقول فيه وفي صفاته ما لم يخبرنا به هو أو رسوله ﷺ"

[جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنے نفس کے متعلق بیان کیا ہے، اس کی تفسیر صرف اس کی قراءت وتلاوت ہے، اس کے سوا اس کی تفسیر نہیں ہے اور نہ ہمیں اس کے سوا کا مکلف ہی ٹھہرایا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ وہ غیب ہے جس کے ادراک میں عقل کی کوئی مجال اور دخل نہیں ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے معافی اور عافیت کا سوال کرتے ہیں اور ہم اس

بات سے اس کی پناہ طلب کرتے ہیں کہ ہم اس کے متعلق اور اس کی صفات کے متعلق وہ کچھ کہیں جس کی ہمیں اس نے یا اس کے رسول ﷺ نے خبر نہیں دی ہے]

اللہ تعالیٰ ہر رات آسمان دنیا پر، جیسے اور جس طرح وہ چاہتا ہے، نزول فرماتا ہے اور اپنے بندوں میں سے جس گناہ گار، خطا کار اور نافرمان کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔ یہ نزول، نزولِ رحمت اور ثواب کے معنی میں نہیں ہے جس طرح معتزلہ اور اشعریہ یہ دعویٰ کرتے ہیں، بلکہ سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے:

«فَيَكُوْنُ كَذٰلِكَ إِلٰى أَنْ يَّطْلُعَ الصُّبْحُ وَيَعْلُوَ عَلٰى كُرْسِيِّهٖ»[1]

[پھر وہ صبح ہونے تک اسی طرح رہتا ہے اور اپنی کرسی پر بلند ہوتا ہے]

یہ حدیث مختلف الفاظ سے ابو ہریرہ، جابر، علی، ابن مسعود، ابو الدرداء، ابن عباس اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ ان سب نے اس حدیث کو رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے۔ اسی لیے وہ آخری رات کی نماز کو پہلی رات کی نماز پر فضیلت دیتے تھے۔ اسی طرح نصف شعبان کی رات کو رحمن کا نزول ہوتا ہے۔ امام اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ سے کہا گیا:

"ما هذه الأحاديث التي تحدث بها أن الله تعالىٰ ينزل إلى السماء الدنيا وإليه يصعد ويتحرك؟"

[یہ کیا احادیث ہیں جو تم بیان کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے اور اس کی طرف چڑھتا ہے اور حرکت کرتا ہے؟]

انھوں نے سائل سے فرمایا:

"تقول إن الله يقدر على أن الله ينزل ويصعد ولا يتحرك؟ قال: نعم"

[کیا تو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حرکت کے بغیر نزول فرماتا ہے اور چڑھتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں!]

انھوں نے کہا: "فلم تنكره" [پھر تو اس کا انکار کیوں کرتا ہے؟]

یحییٰ بن معین کہتے ہیں: جب تم سے کوئی جہمی یہ کہے: "كيف ينزل؟" [وہ کیسے نزول فرماتا

[1] المعجم الأوسط (١٥٩/٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ويحيى بن إسحاق لم يسمع من عبادة" (مجمع الزوائد: ١٥٤/١٠)

ہے؟] تو اسے یہ کہو: "کیف صعد؟" [وہ کیسے چڑھتا ہے؟]

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ نے کہا: جب کوئی جہمی تم سے یہ کہے کہ "أنا کافر برب ینزل" [میں اس رب کا انکار کرتا ہوں جو نزول فرماتا ہے] تو تم یوں کہو: "أنا مؤمن برب یفعل ما یشاء" [میں اس رب پر ایمان لاتا ہوں کہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے]

② ہم یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس کی کتاب، خطاب اور وحی ہے، جسے جبریل لے کر رسول اللہ ﷺ پر اترے تھے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی لغت میں نازل ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کلام یہی قرآن مجید ہے، جو مخلوق نہیں ہے۔ یہ پڑھا جائے، تلاوت کیا جائے اور لکھا جائے۔ یہ متفرق طور پر اللہ تعالیٰ کی صفتِ ذات ہے یہ محدث ہے نہ مبدل، نہ مغیر نہ مؤلف نہ منقوص، مصنوع اور نہ مزاد فیہ ہے۔ یہ اسی کی طرف سے آیا ہے اور اسی کی طرف لوٹے گا۔ یہ حافظین کے سینوں میں، ناطقین کی زبانوں پر، کاتبین کے کف دست پر، ناظرین کے مشاہدے میں، اہلِ اسلام کے مصاحف میں اور بچوں کے الواح میں محفوظ ہے اور جہاں کہیں بھی ہے یہ مرئی اور موجود ہے۔ جو شخص یہ اعتقاد کرے کہ یہ کلام اللہ مخلوق ہے یا اس کی عبارت یا تلاوت غیر متلو ہے یا یوں کہے کہ قرآن کی تلاوت کے ساتھ میرے الفاظ مخلوق ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے والا ہے اور اگر وہ توبہ نہ کرے تو واجب القتل ہے، امام احمد رحمہ اللہ اسی طرف گئے ہیں۔

③ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ قرآن مجید سمجھے جانے والے حروف اور سنی جانے والی آوازیں ہیں، کیونکہ انھیں سے گونگا اور خاموش آدمی متکلم اور ناطق ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کلام حروف اور اصوات سے منفک نہیں ہوتا، جو شخص اس کا انکار کرے وہ کور باطن اور مکابر حس ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "الم" "حم" "طسم" "تلك آيات الكتب" ان حروف کو ذکر کر کے کتاب ٹھہرایا اور فرمایا: ﴿مَا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ﴾ [لقمان: ۲۷] [اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی] مزید فرمایا: ﴿لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ﴾ [الكهف: ۱۰۹] [یقیناً سمندر ختم ہو جائے گا اس سے پہلے کہ میرے رب کی باتیں ختم ہوں] اور حدیث میں آیا ہے:

«لَا أَقُوْلُ الم حَرْفٌ وَلٰكِنْ اَلِفٌ حَرْفٌ وَ مِيْمٌ حَرْفٌ وَ لَامٌ حَرْفٌ»[1]

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۹۱۰)

[میں نہیں کہتا کہ ''الم'' ایک ہی حرف ہے، بلکہ الف ایک حرف ہے، میم ایک حرف ہے اور لام ایک حرف ہے]

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أُنزِلَ الْقُرْآنُ عَلىٰ سَبْعَةِ أَحْرُفٍ كُلُّهَا شَافٍ»①

[قرآن مجید سات قراءتوں پر نازل کیا گیا ہے، ہر قراءت شافی ہے]

صحیح بخاری میں سیدنا عبد اللہ بن انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«يَحْشُرُ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ الْعِبَادَ فَيُنَادِيهِمْ بِصَوْتٍ يَّسْمَعُهُ مَنْ بَعُدَ كَمَا يَسْمَعُهُ مَنْ قَرُبَ: أَنَا الْمَلِكُ أَنَا الدَّيَّانُ»②

[اللہ سبحانہ وتعالیٰ بندوں کو اکٹھا کرے گا، پھر انھیں ایک ایسی آواز کے ساتھ بلائے گا جسے دور والا بھی اسی طرح سنے گا جس طرح اسے قریب والا سنے گا (اللہ تعالیٰ کہے گا) میں بادشاہ ہوں، میں حکمران ہوں]

دوسری روایت میں یوں آیا ہے:

«إِذَا تَكَلَّمَ اللّٰهُ بِالْوَحْيِ سَمِعَ صَوْتَهُ أَهْلُ السَّمَاءِ فَيَخِرُّوْنَ سُجَّداً»③

[جب اللہ تعالیٰ وحی کے ساتھ کلام کرتا ہے تو اہلِ آسمان اس کی آواز سن کر سجدے میں گر جاتے ہیں]

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ الفاظ مروی ہیں:

«صَوْتاً كَصَوْتِ الْحَدِيْدِ إِذَا وَقَعَ عَلَى الصَّفَا فَيَخِرُّوْنَ لَهُ سُجَّداً»④

[لوہے (زنجیر وغیرہ) کی آواز کی طرح جب وہ کسی صاف پتھر پر لگتا ہے، آواز آتی ہے تو وہ (فرشتے) سجدے میں گر جاتے ہیں]

محمد بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ جب تم سے تمھارے رب

---

① المعجم الكبير (۲۰/۱۵۰) المعجم الأوسط (۱۴۲/۶)

② صحيح البخاري (۲۷۱۹/۶)

③ السنة لعبد الله بن أحمد (۴۶۰)

④ العلو للعلي الغفار للذهبي (۲۲۱)

نے بات کی تو تم نے رب تعالیٰ کی آواز کو کس چیز کے مشابہ پایا؟ انھوں نے کہا:

"شبهت صوت ربي بصوت الرعد حين لا يرتجع"

[میں نے اپنے رب تعالیٰ کی آواز کو کڑک کی آواز کے ساتھ مشابہ پایا جب وہ پلٹتی نہیں]

اس کے بعد شیخ جیلی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

"وهذه الآيات والأخبار تدل على أن كلام الله صوت لا كصوت الآدميين... إلىٰ قوله: وقد نص أحمد على إثبات الصوت في رواية جماعة من الأصحاب رضى الله عنهم"

[یہ آیات واخبار اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ کا کلام آواز سے ہوتا ہے لیکن آدمیوں کی آواز کی مانند نہیں ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے ایک جماعت کی روایت کے مطابق آواز کے ثبوت کی صراحت کی ہے]

اشعریہ کے قول کے خلاف کہ اللہ کا کلام نفسی ہے: "والله حسيب كل مبتدع ضال مضل" [اور اللہ تعالیٰ ہر بدعتی، گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے والے کا حساب لینے والا ہے]

الغرض اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمیشہ سے متکلم ہے اور اس کا کلام امر، نہی اور استخبار کے سارے معانی کو محیط ہے۔ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے:

"كلام الله تعالىٰ متواصل لا سكوت فيه ولا صمت"

[اللہ تعالیٰ کا کلام متواصل ہے اس میں سکوت وصمت نہیں ہے]

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ یہ کہنا جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ پر سکوت روا ہے؟ انھوں نے جواباً کہا:

"لو ورد الخبر بأنه سكت لقلنا به، ولكنا نقول أنه متكلم كيف شاء بلا كيف ولا تشبيه"

[اگر کوئی حدیث وارد ہوتی کہ اس نے سکوت کیا ہے تو ہم اس کے قائل ہوتے، لیکن ہم کہتے ہیں کہ وہ بلا کیف اور بلا تشبیہ جیسے وہ چاہے متکلم ہے]

④ اسی طرح حروف معجم غیر مخلوق ہیں، خواہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں ہوں یا انسانوں کے کلام میں،

اہلِ سنت کا یہی مذہب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ [یٰس: ۸۲]

[اس کا حکم تو، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سوانہیں ہوتا کہ اسے کہتا ہے ''ہو جا'' تو وہ ہو جاتی ہے]

لفظ ''کن'' دو حرف ہیں، اگر یہ مخلوق ہوتے تو دوسرے ''کن'' کے محتاج ہوتے جس سے تخلیق ممکن ہو اور یہ ایک لا متناہی سلسلہ چل نکلتا۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اپنے رسالے میں حروفِ ہجا کے قِدم کی صراحت کی ہے۔ یہ رسالہ انھوں نے اہلِ نیسا پور اور جرجان کی طرف لکھا تھا اور اس میں انھوں نے کہا ہے:

''ومن قال: إن حروف التهجي محدثة فهو كافر بالله، ومتى حكم إن ذلك مخلوق فقد جعل القرآن مخلوقا''

[اور جس نے یہ کہا کہ یقیناً حروفِ تہجی محدث ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے والا ہے، اور جب اس نے یہ حکم لگایا کہ بلا شبہہ یہ مخلوق ہے تو اس نے قرآن کو مخلوق ٹھہرا دیا]

امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

''لا تقولوا بحدوث الحروف فإن اليهود أول ما هلكت بهذا، ومن قال بحدوث حرف من الحروف فقد قال بحدوث القرآن''

[حروف کو محدث نہ کہو، کیونکہ یہودی سب سے پہلے اسی کے قائل ہو کر ہلاک ہوئے تھے۔ جو شخص حروف میں سے کسی حرف کے حدوث کا قائل ہوا تو بلا شبہہ وہ حدوثِ قرآن کا قائل ہوا]

جب یہ بات قرآن میں ثابت ہوئی تو اسی طرح غیر قرآن میں بھی ثابت ہے۔

⑤ ہم اس بات کے معتقد ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو کوئی انھیں حفظ کر لے گا وہ بہشت میں جائے گا۔ یہ بات بخاری وغیرہ میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً بیان ہوئی ہے۔ یہ سارے نام قرآن مجید کی سورتوں میں متفرق طور پر موجود ہیں، چنانچہ سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہ نے ہر سورت سے نام بہ نام انھیں نکال کر بتایا ہے۔ ''غنية الطالبين'' میں یہ نام مذکور ہیں۔[1]

---

[1] غنية الطالبين (۱/۹۲)

عبداللہ بن امام احمد رحمہ اللہ نے اس تعداد سے زائد اسما کا ذکر بھی کیا ہے۔ ابو بکر نقاش نے "تفسیر الأسماء والصفات" میں امام جعفر صادق رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے:

"إن لله ثلاث مائة وستين اسما" [بلا شبہ اللہ تعالیٰ کے تین سو ساٹھ نام ہیں]

بعض نے کہا ہے کہ ایک سو چودہ نام ہیں۔ یہ سب اس بات پر محمول ہے کہ انھوں نے قرآن پاک میں مکرر سہ کرر نام پائے اور ان سب کو اسما جانا۔ صحیح قول وہی ہے جو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے۔ انتہیٰ

میں کہتا ہوں: ترمذی کی حدیث میں ننانوے نام مذکور ہیں اور وہی معتبر ہیں۔[1] کتاب "الجوائز والصلات" میں اللہ تعالیٰ کے اسما وصفات کے معانی ذکر کیے گئے ہیں جو لائقِ مطالعہ ہے۔

٦ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ ایمان قول باللسان، معرفت بالجنان اور عمل بالارکان ہے جو طاعت سے بڑھتا اور عصیان سے گھٹتا ہے، علم سے قوی ہوتا، جہل سے کمزور ہوتا ہے اور توفیق سے واقع ہوتا ہے۔ ایمان کی کمی بیشی پر کئی آیات واحادیث دلیل ہیں۔ عبداللہ بن عباس، ابو ہریرہ اور ابو الدرداء رضی اللہ عنہم کہتے ہیں:

"الإيمان يزيد وينقص" [ایمان زیادہ ہوتا ہے اور کم ہوتا ہے]

اشعریہ ایمان کی زیادتی اور نقصان کے منکر ہیں۔ لغت میں ایمان تصدیقِ قلب کے معنی میں ہے اور مصدق بہ کے ساتھ علم کو متضمن ہے۔ شریعت میں ایمان اس تصدیق کو کہتے ہیں جس میں ساری طاعات، واجبات، نوافل زلات ومعاصی سے اجتناب کے ساتھ ہوں۔ یہ کہنا بھی جائز ہے کہ ایمان دین، شریعت اور ملت کا نام ہے، کیونکہ دین محظورات ومحرمات سے اجتناب کے ساتھ طاعات سے عبارت ہے اور ایمان کی صفت ہے۔ رہا اسلام تو وہ من جملہ ایمان کے ہے، چنانچہ ہر ایمان اسلام ہوتا ہے اور ہر اسلام ایمان نہیں ہوتا، کیونکہ اسلام انقیاد واستسلام کے معنی میں ہے۔ ہر مومن اللہ تعالیٰ کا مستسلم اور منقاد ہوتا ہے اور ہر مسلم مومن باللہ نہیں ہوتا، اس لیے کہ وہ کبھی تلوار کے خوف سے اسلام لے آتا ہے۔ ایمان ایک ایسا نام ہے جو افعالاً واقوالاً بہت سے مسمیات کو شامل ہے، اس لیے وہ جمیع طاعات کو عام ہے۔ اسلام طمانیتِ قلب اور عباداتِ خمسہ کے ہمراہ شہادتین سے عبارت

[1] سنن الترمذي (٣٥٠٧) یہ روایت "ولید بن مسلم" کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے۔

ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے علی الاطلاق کہا ہے کہ ایمان حدیثِ جبریل رضی اللہ عنہ، جو سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی روایت سے مرفوعاً مروی ہے، کے مطابق غیر اسلام ہے۔ حدیثِ جبریل میں اسلام، ایمان اور احسان کی تعریف الگ الگ آئی ہے اور اس حدیث کے آخر پر آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

«فَإِنَّهُ جِبْرِيلُ أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ۔ وَفِي لَفْظٍ: لِيُعَلِّمَكُمْ أَمْرَ دِينِكُمْ»[1]

[بلا شبہ وہ جبریل تھا جو تمھیں تمھارا دین سکھانے آیا تھا، ایک حدیث میں ہے: وہ تمھارے پاس اس لیے آیا ہے تاکہ تمھیں تمھارے امر دین کی تعلیم دے]

ایک حکایت:

امام احمد رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ ایمان مخلوق ہے یا غیر مخلوق تو انھوں نے جواب میں فرمایا: جس نے ایمان کو مخلوق کہا وہ کافر ہے، اس لیے کہ اس میں قرآن کے ساتھ ایہام و تعریض ہے، اور جس نے کہا کہ وہ غیر مخلوق ہے وہ مبتدع ہے کیونکہ اس میں اس بات کا ایہام ہے کہ راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا اور افعالِ ارکان مخلوق نہیں ہیں۔ غرض کہ امام رحمہ اللہ نے دونوں جماعتوں پر انکار کیا۔ اس مذہب کی وجہ یہ ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ کے طریقے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ جس چیز کے ساتھ قرآن ناطق نہیں ہوا اور نہ وہ چیز سنت و حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہوئی، اسی طرح صحابہ کا دور گزر گیا اور ان میں سے کسی ایک سے بھی یہ قول منقول نہ ہوا تو اس چیز کے متعلق کلام کرنا بدعت ہے۔ انتھیٰ۔

میں کہتا ہوں: یہ قاعدہ بہت سے آفاتِ عقائد سے امن و عافیت بخشتا ہے۔ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اس ضابطے کو مضبوطی سے پکڑ کر ان امور میں بحث، کلام اور خوض کرنے سے باز رہے جن میں صحابہ، تابعین اور تبع تابعین رضی اللہ عنہم نے خاموشی اختیار کی تھی۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ ایسا شخص ہالک نہ ہوگا اور ایمان کی سلامتی کے ساتھ دنیا سے جائے گا۔

⑦ مومن کو یہ سمجھنا جائز نہیں کہ "أنا المؤمن حقا" [میں حق سچ مومن ہوں] بلکہ اس کے لیے واجب یہ ہے کہ یوں کہے "أنا المؤمن إن شاء الله" [ان شاء اللہ میں مومن ہوں] معتزلہ کے خلاف کیونکہ وہ قولِ اول کو جائز کہتے ہیں۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٩٩٠)

”من زعم أنه مؤمن فهو كافر“[1]

[جس نے یہ گمان کیا کہ وہ یقیناً مومن ہے تو وہ کافر ہے]

مومن کو چاہیے کہ وہ خائف، امید وار، مصلح، ڈرنے والا اور مترقب رہے۔ یہاں تک کہ جب اسے موت آئے تو وہ کسی عمل خیر پر ہو۔

⑧ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور ان بندوں کے کسب ہیں، وہ خیر یا شر، حسن یا قبیح اور طاعت یا معصیت کچھ بھی ہوں، لیکن اس معنی سے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے معصیت کا حکم کیا ہے، بلکہ اس معنی سے کہ وہ اس کی قضا وقدر ہے اور ایسا اس کے قصد سے ہوا ہے۔ اسی نے قسمت اور رزق بھی مقدر کیا ہے، کوئی شخص اس سے مانع نہیں ہوسکتا۔ اس کا زائد ناقص ہے نہ ناقص زائد، نہ ناعم خشن ہو اور نہ خشن ناعم، کل کا رزق آج کے دن کوئی نہیں کھا سکتا اور نہ زید کی قسمت عمرو کی طرف جا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جس طرح رزقِ حلال دیتا ہے اسی طرح اس معنی میں رزقِ حرام بھی دیتا ہے کہ اسے بدن کی غذا اور جسم کا قوام کر دیتا ہے نہ اس معنی میں کہ اس نے حرام کو مباح کر دیا ہے۔ اسی طرح قاتل نے مقتول کی اجل مقدر کو منقطع نہیں کیا بلکہ وہ مقتول اپنی موت سے مرا۔ یہی حال غریق کا اور اس شخص کا ہے جو کسی دیوار کے نیچے دب کر مر گیا ہے یا کسی اونچی جگہ سے گر کر فوت ہوا ہے یا اسے کسی درندے نے کھا لیا ہے۔

اسی طرح مسلمانوں اور مومنوں کی ہدایت اور کافروں اور منافقوں کی گمراہی اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، یہ سب اللہ تعالیٰ کا فعل ہے۔ بادشاہت میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ ہم نے بندے کو کاسب اس لیے کہا ہے کہ وہ توجہ، امر ونہی اور خطاب کا محل ہے، لیکن وہ وعد وضمان کے سبب ثواب وعقاب کا استحقاق رکھتا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [السجدة: ١٧]

[اس عمل کی جزا کے لیے جو وہ کیا کرتے تھے]

نیز فرمایا: ﴿بِمَا صَبَرْتُمْ﴾ [الرعد: ٢٤] [اس کے بدلے جو تم نے صبر کیا]

ایک جگہ جنتیوں کی جہنمیوں سے گفتگو کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ۝ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ

[1] بغية الباحث عن زوائد مسند الحارث (١٧)

الْمِسْكِيْنَ﴾ [المدثر: ٤٢۔٤٤]

[تمھیں کس چیز نے سقر میں داخل کر دیا؟ وہ کہیں گے ہم نماز ادا کرنے والوں میں نہیں تھے۔ اور نہ ہم مسکین کو کھانا کھلاتے تھے]

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ﴾ [الطور: ١٤]

[یہی ہے وہ آگ جسے تم جھٹلاتے تھے]

مزید فرمایا:

﴿ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ﴾ [الحج: ١٠]

[یہ اس کی وجہ سے ہے جو تیرے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا]

اس کے سوا بھی اس مضمون کی بہت سی آیات ہیں۔ غرض کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جزا کو ان کے افعال پر معلق کیا ہے اور ان کے لیے کسب ثابت فرمایا ہے۔ برخلاف جہمیہ کے کہ وہ بندوں کے لیے کسب نہیں بتلاتے ہیں، بلکہ اسے دروازے کی مثل ٹھہراتے ہیں کہ اسے بند کیا اور کھولا یا جیسے درخت کہ وہ حرکت کرتا ہے۔ پس یہ لوگ حق کا انکار کرنے والے اور کتاب وسنت کو رد کرنے والے ہیں۔ قدریہ فرقے کے لوگ بندوں کو خالق افعال بتاتے ہیں۔ ان کے لیے ہلاکت ہو۔ یہ قدریہ اس امت کے مجوسی ہیں، انھوں نے اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہرائے اور اللہ تعالیٰ کو عجز کی طرف منسوب کیا، گویا اس کی بادشاہت میں وہ کام بھی ہوتے ہیں جو اس کی قدرت اور ارادے میں داخل نہیں ہیں۔ تعالیٰ الله عن ذلك علوا كبيرا. حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ [الصافات: ٩٦]

[حالانکہ اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا اور اسے بھی جو تم کرتے ہو]

ایک جگہ اور فرمایا:

﴿جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [السجدة: ١٧]

[اس عمل کی جزا کے لیے جو وہ کیا کرتے تھے]

پس جب ان کے اعمال پر جزا واقع ہوئی تو ان کے اعمال و افعال بھی مخلوق ہوئے۔ سیدنا

حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمانِ رسول ﷺ ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ كُلَّ صَانِعٍ وَ صَنْعَتَهٗ حَتّٰى خَلَقَ الْجَزَّارَ وَ جَزَارَتَهٗ»[1]

[یقیناً اللہ تعالیٰ نے ہر صانع اور اس کی صنعت کو پیدا کیا ہے، حتیٰ کہ اسی نے گوشت کاٹنے والے اور اس کے گوشت کاٹنے کے پیشے کو پیدا کیا ہے]

(9) ہمارا ایک عقیدہ یہ ہے کہ اگر چہ مومن صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کا مرتکب ہو، لیکن وہ کافر نہیں ہوتا ہے گو وہ دنیا سے توبہ کے بغیر چلا جائے، بشرطے کہ اس کی موت توحید خالص پر ہوئی ہو۔ اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے، چاہے اسے معاف کر دے اور جنت میں لے جائے اور چاہے تو اُسے عذاب کرے اور آگ میں لے جائے۔ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے درمیان دخل اندازی نہیں کرتے ہیں جس کے انجام سے متعلق اللہ تعالیٰ نے ہمیں خبر نہیں دی ہے۔

(10) ہمارا یہ بھی اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو کسی کبیرہ گناہ کے سبب ایمان کے ہمراہ جہنم میں داخل کرے گا تو وہ ہمیشہ دوزخ میں نہ رہے گا، بلکہ اللہ تعالیٰ اسے جہنم سے باہر نکال لے گا، کیونکہ اس کے حق میں آگ دنیا میں قید خانے کی مانند ہے، لہٰذا وہ اپنے کبیرہ گناہ اور اپنے جرم کی مقدار کے مطابق سزا پوری کر کے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے باہر نکلے گا اور اس میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ آگ اس کے چہرے کو جھلسائے گی نہ اعضائے سجود ہی آگ میں جھلسیں گے، کیونکہ ایسا کرنا آگ پر حرام ہے۔ اس شخص کی اللہ تعالیٰ سے طمع، جب تک وہ آگ میں ہے، منقطع نہ ہو گی یہاں تک کہ وہ دوزخ سے نکل کر جنت میں چلا جائے گا اور دنیا میں جو طاعت بجا لاتا تھا اس کی مقدار میں وہ جنت میں درجہ پائے گا۔ قدریہ کے برخلاف کہ ان کے نزدیک کبیرہ گناہ طاعات تباہ کرنے والا ہے، چنانچہ اسے ان کے نزدیک اس طاعت کا ثواب نہیں ملے گا، اور اسی طرح خوارج کا موقف ہے، اللہ تعالیٰ انھیں برباد کرے۔

(11) ہم اس بات پر بھی ایمان لاتے ہیں کہ خیر و شر، میٹھا اور کڑوا تقدیر سے ہے۔ جو مصیبت بھی آئی وہ احتیاط کرنے سے چوکنے والی نہ تھی اور جو اسباب چوک گئے وہ طلب کرنے سے ملنے والے

[1] خلق أفعال العباد للبخاري (ص: ٧٣) مستدرك الحاكم (١/ ٣١) اس حدیث کے آخری الفاظ «حَتّٰى خَلَقَ الْجَزَّارَ وَجَزَارَتَهٗ» تو نہیں مل سکے البتہ اس روایت میں امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ الفاظ «إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ صَانِعَ الْخَزَمِ وَصَنْعَتَهٗ» نقل کیے ہیں۔ واللہ اعلم

نہ تھے۔ جو کچھ گذشتہ زمانے میں ہوا اور جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کی قضا وقدر سے ہے، کسی مخلوق کو اس کی قدر و قضا سے پناہ نہیں ہے۔ وہ پہلے ہی سے لوحِ محفوظ میں لکھا جا چکا ہے۔ ساری مخلوق اگر اس بات کی کوشش کرے کہ کسی شخص کو کوئی نفع پہنچائے جسے اللہ تعالیٰ نے طے نہیں کیا ہے تو وہ ہرگز اس کی قدرت نہیں رکھتے اور اگر سب مل کر کسی کو ضرر پہنچانے کی کوشش کریں جسے اللہ نے اس کے مقدر میں نہیں کیا ہے تو وہ یہ بھی نہیں کر سکتے۔ جس طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ یُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ﴾ [یونس: ۱۰۷]

[اور اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اسے کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ کرلے تو کوئی اس کے فضل کو ہٹانے والا نہیں، وہ اسے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے پہنچا دیتا ہے]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی وہ حدیث جس میں شکمِ مادر میں خلقِ انسان کا ذکر آیا ہے اور عملِ جنت جو عملِ نار میں بدل جاتا ہے[2] اور حدیث «كُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ... الخ»[3] تقدیر کے خیر وشر پر دلیل ہیں۔

⑫ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں کہ معراج کی رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اللہ عزوجل کو انھیں سر کی آنکھوں سے دیکھا ہے، نہ دل سے اور نہ خواب میں، چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی قول ہے۔[4] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نفی کرتی ہیں اور گذشتہ قول میں اس کا اثبات ہے۔ پس اثبات نفی پر مقدم ہے۔ ابو بکر بن سلیمان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ عزوجل کو گیارہ

---

① اس سے مراد وہ حدیث ہے جو "جامع الترمذي" (۲۵۱۶) میں مروی ہے۔

② صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۰۳۶) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۶۴۳)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (۴۶۶۶) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۶۴۷)

④ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو اپنے دل سے دیکھا ہے۔ (صحیح مسلم: ۱۷۶) کسی روایت میں یہ مروی نہیں کہ انھوں نے کہا ہے کہ شبِ معراج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو آنکھوں سے دیکھا ہو۔

بار دیکھا، نو بار شبِ معراج میں جس وقت آپ ﷺ موسیٰ علیہ السلام اور حق سبحانہ وتعالیٰ کے درمیان آتے جاتے رہے اور پینتالیس نمازیں کم کروائیں جو سنت وحدیث سے ثابت ہے۔ جبکہ دو بار دیکھنا کتاب اللہ سے ثابت ہے، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴾ [النجم: ١٣]

[حالانکہ بلاشبہہ یقیناً اس نے اسے ایک اور بار اترتے ہوئے بھی دیکھا ہے][1]

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«رَأَيْتُ رَبِّي مُشَافَهَةً لَّا شَكَّ فِيهِ»[2]

[میں نے بالمشافہ اپنے رب تعالیٰ کو دیکھا ہے، اس رویت میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے]

دوسری رویت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَ مَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ ﴾ [بني إسرائيل: ٦٠]

[اور ہم نے وہ منظر جو تجھے دکھایا، نہیں بنایا مگر لوگوں کے لیے آزمائش]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے:

"رویا عین أریها النبي ﷺ لیلة الإسراء به"

[یہ وہ آنکھ کی رویت ہے جو نبی ﷺ کو معراج کی رات ہوئی تھی]

⑬ ہم ایمان رکھتے ہیں کہ انبیا کے سوا منکر ونکیر ہر شخص کے پاس آتے ہیں، اس سے سوال کرتے ہیں اور اصولِ دین میں اس کا امتحان لیتے ہیں۔ جب وہ قبر میں آتے ہیں تو مردے میں روح آجاتی ہے اور وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی روح سے بلا الم سوال کیا جاتا ہے۔ مردہ اپنے زائر کو پہچانتا ہے خصوصاً جمعہ کے دن طلوعِ فجر کے بعد اور طلوعِ شمس سے پہلے۔[3] اہلِ معاصی وکفر کے لیے عذابِ قبر اور ضغطہ قبر پر ایمان لانا واجب ہے۔ اسی طرح اہلِ طاعت وایمان کے لیے نعیمِ قبر پر ایمان لانا واجب ہے۔ برخلاف معتزلہ کے کہ وہ مسئلہ منکر ونکیر اور عذاب ونعیمِ قبر کے منکر ہیں۔

⑭ قبروں سے زندہ ہو کر اٹھنے اور عدالتِ الٰہی میں پیشی پر ایمان لانا واجب ہے، کیونکہ جس اللہ کو

---

① متعدد روایات میں مروی ہے کہ اس وقت آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا تھا۔ دیکھیں: مسند أحمد (١/ ٤٠٧)

② إبطال التأويلات لأيات الصفات لأبي يعلى (٧)

③ یہ کسی صحیح حدیث میں مروی نہیں ہے۔

انشائے خلق پر قدرت ہے اسے اعادۂ خلق پر بھی قدرت ہے، معطلہ نے اس کا انکار کیا ہے، اللہ تعالیٰ انھیں ہلاک کرے۔

⑮ اس بات پر ایمان لانا کہ اللہ تعالیٰ اہلِ کبائر کے حق میں رسول اللہ ﷺ کی شفاعت قبول کرے گا، واجب ہے۔ آپ ﷺ کی یہ شفاعت دخولِ نار سے پہلے تمام مومن امتوں کے حق میں حساب شروع کروانے کے لیے ہوگی اور دخولِ نار کے بعد اپنی امت کے لیے خاص ہوگی۔ آپ ﷺ کی شفاعت اور مومنوں کی شفاعت سے لوگ دوزخ سے نکلیں گے یہاں تک کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا اور جس نے ساری عمر میں ایک بار اللہ عزوجل کے لیے اخلاص کے ساتھ "لا إله إلا الله" کہا ہوگا، وہ جہنم میں باقی نہ رہے گا قدریہ اس کے منکر ہیں، حالانکہ کتاب اللہ اور سنتِ رسولِ اللہ ﷺ میں ان کی تکذیب ہے۔

⑯ صراطِ جہنم پر ایمان لانا واجب ہے۔ یہ پل [صراط] بال سے زیادہ باریک، چنگاری سے زیادہ گرم اور تلوار سے زیادہ تیز ہوگا۔ اس کی لمبائی آخرت کے سالوں سے تین سو برس کی مسافت ہے یا آخرت کے سالوں سے تین ہزار برس کی راہ ہے۔

⑰ اہلِ سنت کا یہ اعتقاد ہے کہ قیامت میں رسول اللہ ﷺ کا ایک حوض ہوگا جس سے کافر نہیں بلکہ مومن پانی پئیں گے۔ یہ حوض پل صراط عبور کرنے کے بعد اور جنت میں داخل ہونے سے پہلے ملے گا۔ اس کی چوڑائی ایک مہینے کی مسافت تک ہے، اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہوگا۔ اس حوض میں جنت سے، ایک چاندی کا اور ایک سونے کا، دو پرنالے بہتے ہیں۔

⑱ اہلِ سنت کا یہ اعتقاد ہے کہ قیامت کے دن اللہ اپنے رسول ﷺ کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھائے گا نہ کہ سارے انبیا و رسل کو، چنانچہ مقام محمود پر فائز کرنے سے اللہ تعالیٰ کا یہی تخت پر اپنے ہمراہ بٹھانا مراد ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں فرمانِ مصطفیٰ ﷺ ہے:

«وَعَدَنِي رَبِّي الْقُعُوْدَ عَلَى الْعَرْشِ»[1]

[میرے رب نے مجھے عرش پر بٹھانے کا وعدہ کیا ہے]

ایسے ہی عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حجاج کے بیان کردہ الفاظ یہ ہیں:

«إِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ نَزَلَ الْجَبَّارُ عَلَى عَرْشِهِ وَقَدَمَاهُ عَلَى الْكُرْسِيِّ وَيُؤْتَى

[1] دیکھیں: إبطال التأويلات لأبي يعلى (٤٥٢ وما بعده)

بِنَبِيِّكُم فَيُقْعَدُ بَيْنَ يَدَيْهِ عَلَى الْكُرْسِيِّ»[1]

[جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ جبار اپنے عرش پر نزول فرمائے گا اور اس کے قدم کرسی پر ہوں گے اور تمھارے نبی ﷺ کو لا کر اس کے سامنے کرسی پر بٹھا دیا جائے گا]

امام حمیدی رحمہ اللہ سے کہا گیا: جب آپ ﷺ کرسی پر ہوئے تو اللہ تعالیٰ کے ہمراہ ہی ہوں گے؟ انھوں نے کہا: ہاں!

(۱۹) اہلِ سنت کا ایک عقیدہ یہ ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کا حساب لے گا اور اسے اپنے پاس بلائے گا اور اپنا بازو اس پر رکھے گا یہاں تک کہ وہ لوگوں سے چھپ جائے گا، پھر اس سے اپنے گناہوں کا اقرار کروائے گا، پھر فرمائے گا:

''اے میرے بندے! میں نے تیرے ان گناہوں پر دنیا میں پردہ ڈالے رکھا اور آج کے دن میں تیرے وہ گناہ معاف کرتا ہوں۔''[2]

محاسبے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندے کو اس کی سیئات اور حسنات سب کچھ اسے دکھا کر اعمال کے ثواب و عذاب کی مقادیر سے آگاہ کرے گا۔ معطلہ نے محاسبے کا انکار کیا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ان کی تکذیب کر رہا ہے:

﴿إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ﴾ [الغاشية: ٢٥۔٢٦]

[یقیناً ہماری ہی طرف ان کا لوٹ کر آنا ہے۔ پھر بے شک ہمارے ہی ذمے ان کا حساب ہے]

(۲۰) اہلِ سنت کا ایک اعتقاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں میزان اور ترازو ہے جس میں وہ قیامت کے دن حسنات وسیئات کا وزن کرے گا۔ اس میزان کے دو پلڑے اور ایک زبان ہوگی۔ لیکن معتزلہ، مرجیہ اور خوارج اس کے منکر ہیں۔

ان کے نزدیک میزان سے مراد عدل ہے۔ حالانکہ کتاب و سنت میں ان کی تکذیب موجود ہے۔ یہ میزان رحمن کے ہاتھ میں یا جبریل علیہ السلام کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس ترازو کے بانٹ رائی کے دانے اور ذرے کے برابر ہوں گے۔ حسنات کا پلڑا نور اور سیئات کا پلڑا ظلمت اور اندھیرا ہوگا۔ ارتفاع کی علامت ترازو کا ثقل اور انحطاط کی علامت اس کی خفت اور ہلکا ہونا ہے موازین دنیا کے

---

(1) دیکھیں: إبطال التأويلات لأبي يعلى (٤٥٢ وما بعده)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٥١٤)

خلاف۔ پھر ایمان اور قول شہادتین کے سبب میزان میں ثقل ہوگا اور شرک اس کی خفت کا سبب بنے گا۔ جب پلڑا اونچا ہوگا تو بندہ جنت میں جائے گا اس لیے کہ وہ عالی ہے اور جب خفیف ہوا تو دوزخ میں جائے گا، اس لیے کہ وہ اسفل سافلین ہے۔

اس وزن میں لوگ تین طرح کے ہوں گے۔ ایک وہ جن کی حسنات سیئات پر راجح ہوں گی، ان کے حق میں جنت کے داخلے کا حکم ہوگا۔ دوسرے وہ جن کی سیئات حسنات پر راجح ہوں گی، ان کے لیے جہنم میں داخلے کا فیصلہ ہوگا۔ تیسرے وہ کہ ان کی سیئات وحسنات میں سے کسی کو بھی رجحان نہ ہوگا تو وہ اہلِ اعراف ہیں، پھر جب اللہ تعالیٰ چاہے گا اپنی رحمت سے انھیں جنت میں داخل کرے گا۔ جس شخص کے ننانوے رجسٹر ہوں گے، اس کا بھی وزن ہوگا، یہ بات نقل وسمع سے ثابت ہے۔ رہے مقربین تو وہ بے حساب جنت میں جائیں گے جس طرح کہ حدیث میں آیا ہے کہ ستر ہزار آدمی بے حساب جنت میں جائیں گے اور ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار اور ہوں گے۔[1] باقی رہے کفار تو وہ دوزخ میں بغیر حساب جائیں گے، پھر مومنوں میں سے کسی کا حساب آسان ہوگا، اسے جنت میں جانے کا حکم ملے گا، کسی سے مناقشہ کیا جائے گا جو اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہے، چاہے جنت میں پہنچے، چاہے دوزخ میں۔ علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے:

«يُحَاسَبُ كُلُّ الْخَلْقِ إِلَّا مَنْ أَشْرَكَ بِاللّٰهِ فَإِنَّهُ لَا يُحَاسَبُ وَيُؤْمَرُ بِهِ إِلَى النَّارِ»[2]

[سارے لوگوں کا حساب ہوگا سوائے اس شخص کے جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرایا۔ یقیناً اس کا حساب نہ ہوگا اور اسے بلا حساب آگ میں دھکیل دیا جائے گا]

(۲۱) اہلِ سنت کا ایک عقیدہ یہ ہے کہ جنت اور جہنم پیدا ہو چکی ہیں۔ یہ دو گھر ہیں، ایک کو اللہ نے اہلِ طاعت وایمان کے واسطے نعیم وثواب مقرر کیا ہے۔ دوسرے گھر کو اہلِ معاصی وطغیان کے لیے عقاب ونکال ٹھہرایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب سے ان دونوں گھروں کو بنایا ہے، تب سے اب تک باقی ہیں جو کبھی فنا نہ ہوں گے۔ یہ وہی جنت ہے جس میں آدم وحوا علیہما السلام اور ابلیس تھے،[3] پھر

---

① موطأ الإمام مالك (۳/۳۸۶)

② بعض شیعی مراجع میں یہ روایت مروی ہے۔ دیکھیں: بحار الأنوار (۷/ ۱۱۰)

③ اس بحث کو حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''حادی الارواح'' میں بہت بسط وشرح کے ساتھ لکھا ہے اور فریقین کے دلائل ذکر کر کے کسی جانب کو واضح ترجیح نہیں دی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ فریقین کے دلائل ←

وہاں سے نکالے گئے۔ معتزلہ اس کے منکر ہیں۔ یہ معتزلہ جنت میں نہیں جائیں گے، بلکہ آگ میں رہیں گے، اس لیے کہ وہ اس کے منکر ہیں اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ مومن موحد جو ستر برس تک اللہ تعالیٰ کا مطیع رہا ہے، وہ ایک کبیرہ گناہ کے سبب جنت میں نہ جائے گا۔ کتاب وسنت ان کے عقیدے کو جھٹلاتے ہیں۔

الحاصل جنت اور جہنم اس وقت مخلوق اور موجود ہیں۔ جنت کی نعمتوں میں سے ایک نعمت حور عین ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے جنت میں پیدا کیا ہے۔ وہ بقا کے لیے ہیں، انھیں کبھی فنا نہ ہوگی۔ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا میں جب کوئی عورت اپنے شوہر کو تکلیف دیتی ہے تو حور عین میں سے اس کی زوجہ کہتی ہے: تجھے اللہ ہلاک کرے! اسے ایذا نہ پہنچاؤ، وہ تو تیرے پاس عارضی ہے، جلد ہی وہ تجھے چھوڑ کر ہمارے پاس آ جائے گا۔[1] پس جب جنت، جہنم اور ان میں جو کچھ ہے اس کو فنا نہیں ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کسی کو جنت سے نکالے گا، اہلِ جنت پر موت کو مسلط کرے گا اور نہ نعیمِ جنت کو زوال ہوگا، بلکہ ابد الآباد تک ہر دن اس کی نعمتوں میں اضافہ ہوتا رہے گا اور تمامِ نعمت یہ ہے کہ اللہ کے حکم سے موت اس فصیل پر ذبح کی جائے گی جو جنت اور جہنم کے درمیان ہے، جس طرح صحیح حدیث میں آ چکا ہے۔[2]

(۴۴) تمام اہلِ اسلام کا ایک اعتقاد یہ ہے کہ محمد بن عبد اللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سید المرسلین اور خاتم النبیین ہیں اور تمام جنوں اور انسانوں کی طرف مبعوث ہوئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ معجزات ملے جو اور انبیا کو ملے تھے، بلکہ ان سے زیادہ۔ بعض اہلِ علم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہزار معجزے شمار کیے ہیں۔ ان معجزات میں سے ایک قرآنِ منظوم ہے جو کلام عرب کے تمام اوزان کا مفارق ہے جس کی نظم وترتیب، بلاغت وفصاحت ایسی ہے کہ ہر فصیح کی

← بہت صاف اور درست ہیں، لیکن اس مسئلے میں وقوف اولیٰ اور بہتر ہے، کیوں کہ کوئی نص صریح اس بارے میں نہیں آئی ہے جس کی بنیاد پر ہم اس بات کا قطعی حکم لگا سکیں کہ آدم علیہ السلام والی جنت وہی جنت المعاد ہے۔ اگرچہ اس قول کی بابت کوئی استبعاد نہیں ہے، کیونکہ جنت ونار موجود ہیں۔ اگر آدم علیہ السلام اسی جنت سے نکالے گئے تو یہ بعید نہیں اور اگر کسی اور جنت سے ان کا اخراج ہوا جو جنت زمین پر تھی تو اللہ ہی زیادہ جانتا ہے۔ [مولف رحمہ اللہ]

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٧٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠١٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٥٠)

فصاحت اور ہر بلیغ کی بلاغت سے متجاوز ہے۔ عرب اس طرح کا کلام لا سکے نہ ایک سورت ہی ایسی بنا سکے، حالانکہ وہ اپنے زمانے میں فصاحت وبلاغت میں سب سے زیادہ تھے۔ اسی لحاظ سے یہ قرآن آپ ﷺ کے حق میں معجزہ ٹھہرا، جیسے لاٹھی موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھی یا مردوں کو زندہ کرنا اور مادر زاد اندھے اور پھل بہری کے مریض کو شفا یاب کرنا عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کی بعثت جادوگروں کے دور میں اور عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت حذاق اور ماہر اطبا کے زمانے میں ہوئی تھی۔

(۴۳) اہلِ سنت کا ایک اعتقاد یہ ہے کہ محمد ﷺ کی امت تمام امتوں سے بہتر اور اہلِ قرون میں سے سب سے افضل ہے۔ ان میں سے اہلِ بیعت رضوان افضل اہلِ قرون ہیں، یہ ایک ہزار چار سو افراد تھے۔ پھر اہلِ بدر افضل ہیں، یہ اصحابِ طالوت کی تعداد کے برابر تین سو تیرہ آدمی تھے۔ پھر ان میں سے چالیس اشخاص اہلِ دارِ خیزران، جو سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے ساتھ پورے ہوئے، افضل ہیں۔ پھر ان چالیس میں سے عشرہ مبشرہ افضل ہیں اور وہ مندرجہ ذیل ہیں: خلفاے اربعہ، طلحہ، زبیر، عبدالرحمن بن عوف، سعد، سعید اور ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم۔ ان عشرہ مبشرہ میں سے خلفاے اربعہ خلفاے راشدین افضل ہیں۔ پھر ان چاروں میں سے افضل ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر عمر پھر عثمان اور پھر علی رضی اللہ عنہم ہیں۔ انھی چاروں نے رسول اللہ ﷺ کے بعد تیس برس تک خلافت کی، چنانچہ ابوبکر رضی اللہ عنہ دو برس سے کچھ اوپر خلیفہ رہے، عمر رضی اللہ عنہ دس برس، عثمان رضی اللہ عنہ بارہ برس اور علی رضی اللہ عنہ چھ برس تک خلیفہ رہے پھر انیس برس معاویہ رضی اللہ عنہ والی رہے، اس سے پہلے عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو شام پر والی بنایا تھا۔ ائمہ اربعہ کی یہ خلافت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اختیار اور اصحاب رضی اللہ عنہم کے اتفاق ورضا سے ہوئی تھی اور اس وجہ سے بھی کہ ان میں سے ہر ایک اپنے زمانے میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے افضل تھا۔ یہ تلوار اور جبر وقہر یا اپنے سے افضل سے خلافت چھین کر خلیفہ نہیں ہوئے تھے۔

شیخ جیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”وقد روي عن إمامنا أحمد بن حنبل رحمه الله أن خلافة أبي بكر ثبتت بالنص الجلي والإشارة، وهو مذهب الحسن البصري وجماعة من

أصحاب الحديث رحمهم الله تعالىٰ"

[ہمارے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ یقیناً ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت واضح نص اور اشارے سے ثابت ہوتی ہے اور یہی مذہب امام حسن بصری رحمہ اللہ اور اصحاب الحدیث رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا ہے]

عمر رضی اللہ عنہ کو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بنایا تھا اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس معاملے میں ان کی اطاعت کی اور ان کا نام امیر المومنین رکھا۔ عمر رضی اللہ عنہ کے بعد سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عثمان رضی اللہ عنہ پر اتفاق کیا اور سب سے پہلے عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ان سے بیعت کی۔ پھر علی رضی اللہ عنہ نے اور پھر بالاتفاق سب لوگوں نے ان کی بیعت کی۔ وہ اپنی وفات تک خلیفہ برحق تھے، ان میں کوئی ایسا عیب نہیں تھا جو ان پر زبان درازی، فسق اور قتل کے اقدام کو جائز قرار دیتا ہو، روافض کے خلاف جو ان کے بارے میں ایسا کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کرے۔

پھر علی رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے، ان کی خلافت بھی اتفاق اور صحابہ کے اجماع سے ہوئی۔

وہ بھی اپنی وفات تک خلیفہ برحق تھے۔ خوارج کے خلاف جو کہتے ہیں، کہ ان کی امامت درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو برباد کرے۔

رہا علی رضی اللہ عنہ کا طلحہ، زبیر، عائشہ اور معاویہ رضی اللہ عنہم سے قتال کرنا تو امام احمد رحمہ اللہ نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ ان مشاجرات سے، جو منازعت، منافرت اور خصومت کے باعث بنے، اپنی زبان کو روکنا لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن، اس معاملے کو ان کے درمیان سے زائل کر دے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ﴾

[الحجر: ٤٧]

[اور ہم ان کے سینوں میں جو بھی کینہ ہے، نکال دیں گے، بھائی بھائی بن کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے]

کیونکہ علی رضی اللہ عنہ اس قتال میں حق پر تھے اور ان کی امامت صحیح تھی۔ اہلِ حل وعقد کے ان کی امامت پر اتفاق کے بعد جس نے ان پر خروج کیا وہ باغی اور خارجی ہے، اس سے قتال کرنا جائز ہے۔

جس نے علی رضی اللہ عنہ سے لڑائی کی، جیسے معاویہ، طلحہ اور زبیر تو اصل میں وہ عثمان رضی اللہ عنہ کا انتقام اور قصاص کا مطالبہ کرنے والے تھے، کیونکہ انھیں ظلماً شہید کیا گیا تھا اور یہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ لشکر مرتضوی میں شامل تھے، لہٰذا ان میں سے ہر ایک کی تاویل صحیح اور درست تھی۔ سب سے بہتر یہ ہے کہ ہم ان سے متعلق اپنی زبانوں کو روک کر رکھیں اور ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں جو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے اور ہم خود اپنے عیوب ونقائص کی اصلاح اور ظاہر و باطن کی صفائی میں مشغول رہیں۔

رہی خلافتِ معاویہ رضی اللہ عنہ تو وہ علی رضی اللہ عنہ کی وفات اور حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی خلافت سے دست بردار ہونے کے بعد ثابت اور صحیح ہے۔ پس معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت حسن رضی اللہ عنہ کے معاہدے کے ساتھ صحیح ہوگئی اور اس سال کا نام جماعت ٹھہرا، کیونکہ اس سال سب کے درمیان سے اختلاف اٹھ گیا، اور سب کے سب معاویہ رضی اللہ عنہ کے تابع ہو گئے اور امرِ خلافت میں کوئی جھگڑنے والا باقی نہ رہا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کا ذکر اس حدیث میں ہے:

«تَدُوْرُ رُحَى الْإِسْلَامِ خَمْساً وَّ ثَلَاثِيْنَ أَوْ سِتًّا وَّ ثَلَاثِيْنَ أَوْ سَبْعاً وَّ ثَلَاثِيْنَ»[1]

[اسلام کی چکی پینتیس یا چھتیس یا سینتیس سال گھومے گی]

اس حدیث میں چکی گھومنے سے مراد قوتِ دین ہے۔ یہ پانچ برس جو تیس برس سے جدا ہیں، یہ من جملہ خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہیں، انیس سال اور چند ماہ تک، کیونکہ تیس برس کو علی رضی اللہ عنہ نے پورا کیا تھا۔

(۴۴) ہمیں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے ساتھ حسن ظن ہے اور ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ وہ مومنوں کی مائیں ہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا جہان کی تمام عورتوں سے افضل ہیں، اللہ تعالیٰ نے ملحدین کے قول سے انھیں بری کیا، جس کی تلاوت قیامت تک ہوتی رہے گی۔ اسی طرح فاطمہ رضی اللہ عنہا جہانوں کی عورتوں سے افضل ہیں، ان کی موالات اور محبت ویسے ہی واجب ہے جیسے ان کے باپ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت واجب ہے۔ پس یہی اہلِ قرآن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر کتابِ عزیز میں کیا ہے اور ان پر ثنا فرمائی ہے۔ یہی مہاجرین وانصار ہیں جنھوں نے دونوں قبلوں کی طرف نماز ادا کی ہے۔ آیتِ کریمہ:

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٥٤)

رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾

[الفتح: ۲۹]

[محمد اللہ کا رسول ہے اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں کافروں پر بہت سخت ہیں، آپس میں نہایت رحم دل ہیں، تو انھیں اس حال میں دیکھے گا کہ رکوع کرنے والے ہیں، سجدے کرنے والے ہیں، اپنے رب کا فضل اور (اس کی) رضا ڈھونڈتے ہیں، ان کی شناخت ان کے چہروں میں (موجود) ہے، سجدے کرنے کے اثر سے۔ یہ ان کا وصف تورات میں ہے اور انجیل میں ان کا وصف اس کھیتی کی طرح ہے جس نے اپنی کونپل نکالی، پھر اسے مضبوط کیا، پھر وہ موٹی ہوئی، پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی، کاشت کرنے والوں کو خوش کرتی ہے، تاکہ وہ ان کے ذریعے کافروں کو غصہ دلائے، اللہ نے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے بڑی بخشش اور بہت بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے]

سے مراد عشرہ مبشرہ ہیں۔ اہلِ سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے باہمی جھگڑے پر بات کرنے سے باز رہنا، ان کے ناپسندیدہ اعمال سے متعلق بات نہ کرنا، ان کے فضائل ومحاسن کا اظہار کرنا اور ان کے معاملے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سونپنا واجب ہے۔ طلحہ، زبیر، عائشہ اور معاویہ رضی اللہ عنہم میں جو اختلاف ہوا، اسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، ہمیں چاہیے کہ ہر صاحبِ فضل کو اس کا فضل عطا کریں، جیسے فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِينَ جَاءُوا مِن بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾

[الحشر: ۱۰]

[اور (ان کے لیے) جو ان کے بعد آئے، وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اور

ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان لانے میں ہم سے پہل کی اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ جو ایمان لائے، اے ہمارے رب! یقیناً تو بے حد شفقت کرنے والا، نہایت رحم والا ہے]

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [البقرة: ١٣٤]

[یہ ایک امت تھی جو گزر چکی، اس کے لیے وہ ہے جو اس نے کمایا اور تمھارے لیے وہ جو تم نے کمایا اور تم سے اس کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے]

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«لَا يَدْخُلُ النَّارَ أَحَدٌ بَايَعَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ»[1]

[(حدیبیہ میں) درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں میں سے کوئی بھی آگ میں نہیں جائے گا]

نیز اہلِ بدر کے حق میں ارشاد فرمایا:

«اِطَّلَعَ اللّٰهُ عَلٰى أَهْلِ بَدْرٍ فَقَالَ: اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ»[2]

[اللہ تعالیٰ نے اہلِ بدر کی طرف دیکھ کر فرمایا: جو چاہے عمل کرو، میں نے تمھیں بخش دیا ہے]

سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"من نطق في أصحاب رسول الله ﷺ بكلمة فهو صاحب هوى"

[جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف کوئی کلمہ کہا تو سمجھ لو کہ وہ بدعتی ہے]

٢٥ اہلِ سنت کا ائمہ مسلمین اور ان کے امرا کی سمع و طاعت پر اور ہر نیک و بد، عادل و ظالم کے پیچھے نماز پڑھنے پر، جسے لوگوں نے والی و نائب مقرر کیا ہو، اجماع ہے۔ نیز اس بات پر بھی اجماع ہے کہ کسی اہلِ قبلہ کے لیے قطعاً جنت یا جہنم کا حکم نہ لگائیں خواہ وہ مطیع ہو یا عاصی، ہدایت یافتہ ہو یا گمراہ، مگر جب اس کی کسی بدعت و ضلالت پر اطلاع ہو۔ اس پر بھی اجماع ہے کہ انبیا کے

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٥٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٤)

معجزات اور اولیا کی کرامات کو تسلیم کریں، اور اس بات پر کہ گرانی وارزانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے نہ کہ مخلوق میں سے کسی شخص کی طرف سے، وہ سلاطین ملوک ہوں یا کواکب جیسا کہ قدریہ اور نجومی لوگ کہتے ہیں۔

(۳۶) مومن، دانا اور ہوش مند کو یہ چاہیے کہ وہ متبع ہو نہ کہ مبتدع اور وہ غلو، تعمق اور تکلف نہ کرے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ گمراہ ہو جائے اور پھر ہلاک ہو جائے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:

"اتبعوا و لا تبتدعوا فقد كفيتم"[1]

[متبع بنو اور مبتدع نہ بنو، کیونکہ تمھیں تسلی بخش راہ دکھا دی گئی ہے]

مومن پر سنت و جماعت کا اتباع کرنا واجب ہے۔ سنت وہ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسنون کیا ہے اور جماعت وہ ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ائمہ اربعہ کی خلافت میں اتفاق کیا ہے، وہ اہلِ بدعت سے دوستی اور زیادہ تعلقات نہ بنائے اور انھیں سلام نہ کرے، اس لیے کہ ہمارے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

"من سلم على صاحب بدعة فقد أحبه"

[جس نے صاحبِ بدعت کو سلام کہا تو یقیناً اس نے اس کے ساتھ محبت کی]

لہٰذا نہ خود اہلِ بدعت کے پاس بیٹھے اور نہ انھیں اپنے پاس بٹھائے، نہ اعیاد اور اوقاتِ سرور میں انھیں مبارک باد پیش کرے، نہ ان کی نمازِ جنازہ میں شرکت کرے، نہ ان پر رحم کرے، بلکہ ان سے جدا رہے اور انھیں اللہ کے دشمن جانے اور ان کے مذہب کے بطلان کا معتقد رہے اور اللہ تعالیٰ سے ثوابِ جزیل اور اجرِ کبیر کی امید رکھے۔ امام فضیل بن عیاض رحمہ اللہ نے کہا ہے:

"إذا علم الله من رجل أنه مبغض لصاحب بدعة رجوت الله أن يغفر ذنوبه وإن قل عمله"

[جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے متعلق یہ جان لے کہ یقیناً وہ بدعتی سے بغض رکھتا ہے تو مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ اس کے گناہ بخش دے گا، اگرچہ اس کے اعمال تھوڑے ہوں]

---

[1] السنة للمروزي (ص:٢٨)

امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے:

"من تبع جنازة مبتدع لم يزل في سخط الله حتى يرجع"

[جس شخص نے کسی بدعتی کے جنازے میں شرکت کی تو وہ واپس لوٹنے تک اللہ تعالیٰ کے غصے میں ہوتا ہے]

رسول اللہ ﷺ نے مبتدع پر لعنت کی ہے اور فرمایا ہے:

« مَنْ أَحْدَثَ حَدَثاً أَوْ آوىٰ مُحْدِثاً فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ مِنْهُ الصَّرْفَ وَالْعَدْلَ »[1]

[جس شخص نے کوئی بدعت ایجاد کی یا کسی بدعتی کو پناہ دی، اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا فرض قبول کرے گا نہ نفل]

اس حدیث میں "صرف" سے مراد فریضہ اور "عدل" سے مراد نفل ہے۔ ابو ایوب سختیانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"إذا حدثت الرجل بالسنة فقال: دعنا من هذا، وحدثنا بما في القرآن فاعلم أنه ضال"

[جب تم کسی شخص سے سنت وحدیث کی بات کرو تو وہ کہے: ہمیں اس سنت سے معاف ہی رکھو اور اس کے بجائے ہمیں وہ کچھ بیان کرو جو قرآن میں ہے تو جان لو کہ وہ شخص گمراہ ہے]

میں کہتا ہوں: صرف قرآن کو حجت سمجھنا اور سنت وحدیث کو نہ ماننا بدعتِ خوارج ہے۔

شیخ رحمہ اللہ کی اہلِ بدعت سے مراد بہتر (۷۲) گمراہ فرقے ہیں، چنانچہ بدعت کی مذمت پر مشتمل احادیث انھیں پر محمول ہیں۔ ان تمام فرقوں کو رسول اللہ ﷺ نے جہنمی قرار دیا ہے اور فرقۂ اہلِ سنت وجماعت کو ناجی کہا ہے۔ پھر اگر ان کی کوئی بدعت فرقہ ناجیہ میں پائی جائے تو اس کے ساتھ بھی وہی معاملہ کرنا لازم ہے جو اہلِ بدعت کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اسی لیے شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہلِ بدعت کی چند ایک علامات ہیں جن سے وہ پہچانے جاتے ہیں:

ایک علامت تو یہ ہے کہ وہ اہلِ اثر یعنی اصحابِ حدیث رحمہم اللہ کی بدگوئی کرتے ہیں۔ زنادقہ کی علامت یہ ہے کہ وہ اہلِ اثر رحمہم اللہ کا نام حشویہ رکھتے ہیں۔ اس سے ان کی مراد آثار یعنی احادیث کو

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۰۰۸)

باطل قرار دینا ہے۔ فرقہ قدریہ کی علامت یہ ہے کہ وہ اہلِ اثر کا نام "مجبرہ" رکھتے ہیں۔ فرقہ جہمیہ کی علامت یہ ہے کہ وہ اہلِ سنت کو "مشبہہ" کہتے ہیں۔ فرقہ رافضہ کی علامت یہ ہے کہ وہ اہلِ اثر کو "ناصبہ" کہتے ہیں۔ بہر حال یہ سب اہلِ سنت کے لیے عصبیت اور بغض کا مظاہرہ ہے، حالانکہ ان کا کوئی نام نہیں ہے سوائے ایک نام کے اور وہ ہے "اصحاب الحدیث" اہلِ بدعت نے ان کے جو نام رکھے ہیں ان میں سے کوئی نام بھی ان پر صادق نہیں آتا۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ پر کفارِ مکہ کا رکھا ہوا کوئی نام، جیسے ساحر، شاعر، مجنون، مفتون اور کاہن چسپاں نہیں ہوا، حالانکہ آپ کا نام اللہ تعالیٰ، ملائکہ، انس و جن اور تمام مخلوق کے نزدیک صرف رسول اور نبی تھا اور آپ ﷺ ان سب عیوب والقابات سے بری تھے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا﴾

[بني اسرائيل: ٤٧]

[دیکھ! انھوں نے کس طرح تیرے لیے مثالیں بیان کیں۔ پس گمراہ ہوگئے، سو وہ کسی راہ پر نہیں آسکتے]

اس کے بعد جناب شیخ رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

"هذا آخر ما ألفنا في باب معرفة الصانع والاعتقاد على مذهب أهل السنة والجماعة على الاختصار والقدرة" انتهى.[1]

[اہلِ سنت و جماعت کے مذہب پر حسب استطاعت اختصار کے ساتھ جو کچھ ہم نے لکھا ہے یہاں پر اس کا اختتام ہوا چاہتا ہے]

میں کہتا ہوں: میں نے ان اعتقادات کے دلائل کو الا ماشاء اللہ حذف کر دیا ہے، اگر کسی کو ان دلائل پر اطلاع مقصود ہو تو اس سلسلے میں اصل کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

اس کے بعد شیخ رحمہ اللہ نے ایک فصل ان امور کے بیان میں لکھی ہے جن کا اطلاق باری تعالیٰ پر جائز ہے یا صانع کی طرف ان صفات کی اضافت مستحیل ہے، جیسے جہل، شک، ظن، غلبہ، ظن، سہو، نسیان، اونگھ، نوم، غلبہ، غفلت، عجز، موت، خرس، صمم، عمی، شہوت، نفور، میل، حرد، غیظ، حزن، تاسف،

[1] الغنية لطالبي طريق الحق للجيلي (١/ ١١٦)

کمد، حسرت، تلہف، الم، لذت، نفع، مضرت، تمنی، عزم اور کذب وغیرہ۔

اب مومن مخلص پر واجب ہے کہ اگر وہ فرقہ ناجیہ میں شامل ہونا چاہے تو وہ ان بیاناتِ صحیحہ کے مطابق مکمل طور پر اپنا اعتقاد درست کر لے۔ اگر وہ اپنے کسی عقیدے میں ان عقائد کے خلاف ہو گا تو پھر وہ اہلِ سنت میں نہ سمجھا جائے گا، چاہے وہ اپنے سنی ہونے کا دعوی کرتا رہے۔

تیرھویں فصل

مکتوب (۲۶۶) کے مطابق حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے عقائد کا بیان

① اللہ تعالیٰ اپنی ذاتِ مقدس کے ساتھ خود موجود ہے اور تمام اشیا اس کی ایجاد سے موجود ہیں۔ حق تعالیٰ اپنی ذات وصفات اور افعال میں یگانہ ہے اور فی الحقیقت کسی امر میں بھی، وجودی ہو یا غیر وجودی، کوئی بھی اس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ (اس کی جناب میں) مشارکتِ اسمی اور مناسبتِ لفظی بحث سے خارج ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات اور افعال اس کی ذات کی طرح بے مثل ہیں۔ ممکنات کی صفات اور افعال کے ساتھ کچھ مناسبت نہیں رکھتے، جیسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفتِ علم ایک ایسی قدیم اور بسیط حقیقی صفت ہے، جس میں تعدد اور تکثر کو ہرگز دخل نہیں ہے، اگرچہ وہ تکثر تعددِ تعلقات کے اعتبار ہی سے کیوں نہ ہو، کیونکہ وہاں ایک ہی بسیط انکشاف ہے کہ ازل وابد کی معلومات اسی انکشاف سے منکشف ہوتی ہیں اور وہ (حق تعالیٰ) تمام اشیا کو ان کے موافق ومخالف احوال کے ساتھ کُلّی وجُزئی طور پر ہر ایک کے اوقاتِ مخصوصہ کے ساتھ آنِ واحد میں بسیط جانتا ہے۔ یعنی اسی ایک آن میں "زید" کو موجود بھی جانتا ہے اور معدوم بھی اور جنین ماں کے پیٹ میں بھی، طفل، جوان اور بوڑھا بھی، زندہ اور مردہ بھی، کھڑا ہوا اور بیٹھا بھی، تکیہ لگائے ہوئے اور لیٹا ہوا بھی، ہنستا ہوا اور روتا ہوا بھی، لذت پانے والا اور تکلیف پانے والا بھی، عزت والا اور ذلیل بھی، برزخ میں بھی اور عرصۂ قیامت میں بھی، جنت میں بھی اور اس کی لذات ونعمتوں میں بھی جانتا ہے، لہٰذا تعددِ تعلق بھی اس مقام میں مفقود ہے، کیونکہ تعددِ تعلقات تعددِ اوقات اور وقت کی کثرت چاہتا ہے اور وہاں

① مکتوباتِ مجدد الف ثانی (۲/۲۵۱-۲۹۴)

ازل سے ابد تک صرف ایک ہی آنِ واحد بسیط ہے جس میں کسی قسم کا تعدد نہیں ہے، کیونکہ حق تعالیٰ پر زمانہ جاری ہے اور نہ تقدم و تاخر کے احکام اس پر جاری ہو سکتے ہیں، لہٰذا اس کے علم میں اگر ہم معلومات کے ساتھ تعلق کا اثبات کریں تو وہ صرف ایک تعلق ہوگا جو تمام معلومات کے ساتھ متعلق ہے اور وہ تعلق بھی مجہول الکیفیت ہے یعنی اس تعلق کی کیفیت معلوم نہیں اور صفتِ علم کی طرح بے مثل ہے۔

ہم اس تصور کے استبعاد یعنی قیاس اور فہم سے دُور اور بعید ہونے کو ایک مثال کے ذریعے زائل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک شخص ایک ہی وقت میں ایک "کلمہ" کو اس کی مختلف اقسام، متفرق احوال اور مخالف اعتبارات سے جانتا ہے، لہٰذا اسی ایک وقت میں اس "کلمہ" کو اسم بھی جانتا ہے اور فعل بھی، حرف بھی اور ثلاثی بھی، رباعی بھی اور معرب بھی، مبنی بھی، متمکن اور غیر متمکن بھی، منصرف بھی اور غیر منصرف بھی، معرفہ بھی اور نکرہ بھی، ماضی بھی اور مستقبل بھی، امر بھی اور نہی بھی جانتا ہے، بلکہ اس شخص کے لیے جائز ہے کہ وہ کہے کہ میں "کلمہ" کے تمام اقسام اور اعتبارات کو کلمہ کے آئینے میں بیک وقت تفصیل کے ساتھ دیکھتا ہوں، جبکہ ممکن کے علم میں بلکہ ممکن کی دید میں اضداد کا جمع ہونا متصور ہے تو پھر اس واجب تعالیٰ ﴿وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾ [النحل: ٦٠] [اور اللہ کے لیے سب سے اونچی مثال ہے] کے علم میں یہ بات کس طرح بعید معلوم ہوتی ہے۔

اس جگہ اگرچہ بہ ظاہر جمع ضدین ہے، لیکن حقیقت میں ان کے درمیان تضاد مفقود ہے، کیونکہ اگرچہ حق تعالیٰ "زید" کو آنِ واحد میں موجود اور معدوم جانتا ہے، لیکن اسی آن میں یہ بھی جانتا ہے کہ اس کے وجود کا وقت مثلاً ہزار سال سنہ ہجری کے بعد ہے اور س کے وجود سے عدمِ سابق کا وقت اس سال معین سے پہلے ہے اور اس کے عدم لاحق کا وقت گیارہ سو سال کے بعد ہے۔ لہٰذا حقیقت میں ان دونوں کے درمیان زمانے کی تبدیلی کی وجہ سے کوئی تضاد نہیں ہے آپ باقی احوال کو بھی اسی پر قیاس کر سکتے ہیں۔

اس تحقیق سے واضح ہو گیا کہ حق تعالیٰ کا علم اگرچہ تغیر پانے والی جزئیات سے متعلق ہو، لیکن اس کے علم میں تغیر کا شائبہ بھی راہ نہیں پاتا اور حدوث کا گمان اس کی صفت میں پیدا نہیں ہوتا، جیسا کہ فلاسفہ نے گمان کیا ہے، کیونکہ تغیر اسی صورت میں متصور ہو سکتا ہے جب کہ ایک کو دوسرے کے

بعد جانا ہو، جب سب کو آنِ واحد میں جان لے تو پھر تغیر وحدوث کی گنجایش نہیں ہے۔

پس اس کی کچھ حاجت نہیں ہے کہ ہم اس کے لیے متعدد تعلقات کا اثبات کریں، تاکہ تغیر و حدوث ان تعلقات کے ساتھ راجع ہو، نہ کہ صفتِ علم کی طرف، جیسا کہ بعض متکلمین نے فلاسفہ کے شبہے کو دور کرنے کے لیے کیا ہے۔ ہاں اگر معلومات کی جانب تعددِ تعلقات کا اثبات کریں تو اس کی گنجایش ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک صفتِ بسیط کلام ہے اور وہ ازل سے ابد تک اسی ایک کلام کے ساتھ ناطق ہے۔ اگر امر ہے تو وہ بھی وہیں سے پیدا ہوا ہے اور اگر نہی ہے تو وہ بھی وہیں سے ہے، اگر خبر ہے تو بھی وہیں سے ماخوذ ہے، اگر استفہام ہے تو وہ بھی وہیں سے، اگر تمنی یا ترجی ہے تو وہ بھی وہیں سے مستفاد ہے۔

تمام نازل شدہ کتابیں اور بھیجے ہوئے صحیفے اس کلام بسیط کا ایک ورق ہیں۔ اگر تورات ہے تو وہ بھی وہیں سے لکھی گئی ہے، انجیل ہے تو اس نے بھی وہیں سے صورتِ لفظی حاصل کی ہے، اگر زبور ہے تو وہ بھی وہیں سے مسطور ہوئی ہے اور اگر فرقان ہے تو وہ بھی وہیں سے نازل ہوا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ایک ہی فعل ہے اور اسی ایک فعل کے ذریعے اولین و آخرین کی مصنوعات وجود میں آرہی ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ﴾ [القمر: ٥٠]

[اور ہمارا حکم تو صرف ایک بار ہوتا ہے، جیسے آنکھ کی ایک جھپک]

اس آیت کریمہ میں مذکورہ حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اگر زندہ کرنا یا مارنا ہے تو وہ اسی ایک فعل سے مربوط ہے۔ ایلام ہو یا انعام اسی ایک فعل سے وابستہ ہے، اسی طرح ایجاد ہو یا اعدام، وہ بھی اسی ایک فعل سے پیدا ہوا ہے۔

لہٰذا حق سبحانہ و تعالیٰ کے فعل میں بھی تعددِ تعلقات ثابت نہیں ہے، بلکہ ایک ہی تعلق سے مخلوقاتِ اولین و آخرین اپنے وجود کے اوقاتِ مخصوصہ میں وجود پذیر ہو رہی ہیں اور یہ تعلق بھی حق تعالیٰ کے فعل کے مانند بے مثل ہے، کیونکہ چوں کو بے چوں کے ساتھ کوئی راہ نہیں ہے۔ بادشاہوں کی بخشش ان کے اونٹ ہی اٹھا سکتے ہیں۔

اشعری رحمہ اللہ چونکہ حق ۔جل سلطانہ۔ کے فعل کی حقیقت سے واقف نہ تھے، اس لیے تکوین کو حادث کہہ دیا اور اللہ تعالیٰ کے افعال کو بھی حادث جان لیا اور انھوں نے یہ نہیں جانا کہ یہ سب حق سبحانہ تعالیٰ کے فعلِ ازلی کے آثار ہیں نہ کہ اس کے افعال۔ اسی قبیل سے یہ ہے کہ بعض صوفیہ جنھوں نے افعال کی تجلی کا اثبات کیا ہے، اس مقام میں ممکنات کے افعال کے آئینے میں سوائے فعلِ واحد ۔جل سلطانہ۔ کے کچھ نہیں دیکھا، وہ تجلی حقیقت میں حق سبحانہ کے فعل کے آثار کی تجلی ہے نہ کہ اس کے فعل کی تجلی، کیونکہ اس کے فعل بے مثل اور قدیم ہیں اور اس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں، جس کو ''تکوین'' کہتے ہیں۔ محدثات کے آئینے میں اس کی گنجایش اور ممکنات کے مظاہر میں اس کا کوئی ظہور نہیں۔

در تنگنائے صورت معنی چگونہ گنجد

در کلبۂ گدایاں سلطان چہ کار دارد

[صورت کے تنگ گھر میں معنی کہاں سے آئے۔ بھکاری کی جھونپڑی میں بادشاہ کیوں جائے؟]

اس فقیر کے نزدیک افعال وصفات کی تجلی، ذات تعالیٰ و تقدس کی تجلی کے بغیر متصور نہیں ہے، کیونکہ افعال وصفات اس کی ذاتِ مقدس سے جدا نہیں ہیں، تا کہ ان کی تجلی ذات کی تجلی کے بغیر متصور ہو سکے۔ جو کچھ ذاتِ تعالیٰ و تقدس سے جدا ہے وہ اس کی صفات و افعال کے ظلال ہیں، لہٰذا ان کی تجلی افعال و صفات کے ظلال کی تجلی ہوئی نہ کہ افعال و صفات کی تجلی۔ لیکن ہر شخص کی سمجھ اس کمال تک نہیں پہنچ سکتی۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾ [الجمعة: ٤]

[یہ اللہ کا فضل ہے، وہ اسے اس کو دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے]

(۲) اللہ تعالیٰ کسی چیز میں حلول کرتا ہے نہ کوئی چیز اس میں حلول کر سکتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ تمام اشیا کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے اور ان کے ساتھ قرب و معیت رکھتا ہے وہ احاطہ قرب و معیت ایسا نہیں ہے جو ہماری فہم قاصر میں آ سکے، کیونکہ یہ اس کی جنابِ قدس کے شایانِ شان نہیں ہے۔ صوفیہ جو کچھ کشف و شہود سے معلوم کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے بھی منزہ ہے، کیونکہ

ممکن (بشر وغیرہ) کو حق تعالیٰ کی ذات وصفات اور افعال کی حقیقت سے سوائے جہل و نادانی اور حیرت کے کچھ نصیب نہیں ہے۔ غیب پر ایمان لانا چاہیے اور جو کچھ مکشوف ومشہود ہو، اس کو "لَا" کی نفی کے تحت لانا چاہیے۔

عنقا شکار کس نشود دام باز چنیں
کایں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

[(اٹھا لے جال) شکارِ عنقا محال ہے۔ بس یہاں جال کا یہی مآل ہے]

حضرت ایشاں (خواجہ باقی باللہ رحمہ اللہ) کی مثنوی کا ایک شعر اس مقام کے مناسب ہے:

ہنوز ایوانِ استغنا بلند است
مرا فکرِ رسیدن ناپسند است

[ابھی تک بے نیازی کا محل بلند ہے۔ ابھی تک میرا وہاں پہنچنا مشکل ہے]

ہم ایمان لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیا کو محیط ہے اور ان سے قریب اور ان کے ساتھ ہے، لیکن اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ساتھ اس احاطے اور قرب ومعیت کے معنی (وحقیقت) اس تعالیٰ کے ساتھ کیا ہیں؟ وہ ہم نہیں جانتے۔ اس کو احاطہ اور قرب علمی کہنا بھی تاویلات کے متشابہ سے ہے اور ہم اس تاویل کے قائل نہیں ہیں۔

③ حق تعالیٰ کسی چیز کے ساتھ متحد نہیں ہے، اسی طرح کوئی چیز بھی اس کے ساتھ متحد نہیں ہو سکتی۔ بعض صوفیہ کی عبارات سے جو کچھ اتحاد کا مفہوم لیا جاتا ہے، وہ ان کی مراد کے خلاف ہے، کیونکہ ان کی مراد اُس کلام سے، جس سے اتحاد کا وہم ہوتا ہے: "إِذَا تَمَّ الْفَقْرُ فَهُوَ اللّٰهُ" یہ ہے کہ جب فقر تمام ہو جائے اور نیستی محض حاصل ہو جائے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا، نہ یہ کہ وہ فقیر خداے تعالیٰ کے ساتھ متحد ہو جاتا ہے اور خدا بن جاتا ہے، کیونکہ یہ کفر اور زندقہ ہے۔ تعالیٰ اللّٰه سبحانه عما يتوهم الظالمون علوا كبيرا [اللہ تعالیٰ سبحانہٗ ظالموں کے وہم وگمان سے بہت بلند اور بڑا ہے]

ہمارے حضرت خواجہ (باقی باللہ رحمہ اللہ)۔قدس سرہ۔ فرمایا کرتے تھے کہ "انا الحق" سے یہ مراد نہیں ہے کہ "میں حق ہوں" بلکہ مطلب یہ ہے کہ "میں نہیں ہوں، حق سبحانہٗ تعالیٰ ہی موجود ہے۔"

④ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور افعال میں تغیر وتبدل کو کوئی راہ نہیں ہے۔ ”فسبحان من لا یتغیر بذاته ولا صفاته ولا في أفعاله بحدوث الأكوان“ [پس پاک ہے وہ ذات جو اپنی ذات و صفات اور افعال میں کائنات کے حدوث سے متغیر نہیں ہوتی]

صوفیہ وجودیہ نے جو تنزلاتِ خمسہ کے بارے میں اثبات کیا ہے، وہ مرتبہ وجوب میں تغیر وتبدل کی قسم سے نہیں ہے، کیونکہ وہ کفر وگمراہی ہے، بلکہ ان تنزلات کو حق تعالیٰ کے کمال کے ظہورات کے مراتب میں اعتبار کیا ہے بغیر اس بات کے کہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات اور افعال میں کوئی تغیر وتبدل راہ پائے۔

⑤ حق تعالیٰ اپنی ذات و صفات اور افعال میں غنی مطلق ہے اور کسی کام میں بھی کسی چیز کا محتاج نہیں ہے، جس طرح وہ وجود میں محتاج نہیں ہے، اسی طرح ظہور میں بھی محتاج نہیں ہے۔

صوفیہ کی بعض عبارات سے جو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے اسما وصفات کے کمالات کے ظہور میں ہمارا محتاج ہے؛ یہ بات فقیر پر بہت گراں ہے، بلکہ یہ جانتا ہے کہ ان مخلوقات کی پیدایش سے مقصود خود ان کے اپنے کمالات کا حاصل ہونا ہے نہ کہ وہ کمال جو حق تعالیٰ و تقدس کی بارگاہ کی طرف عائد ہو سکے۔ آیتِ کریمہ:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ [الذريات: ٥٦] ”أي ليعرفون“ [اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔ یعنی اپنی معرفت کے لیے]

اسی مطلب کی تائید کرتی ہے، لہٰذا جن وانس کی پیدایش سے مقصود ان کو معرفت کا حصول عطا کرنا ہے جو ان کے لیے کمال ہے، نہ یہ کہ ایسا امر جو حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی بارگاہ کی طرف عائد ہو سکے۔ حدیثِ قدسی میں جو آیا ہے: «فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِأُعْرَفَ»[1] [میں نے مخلوق کو اس لیے پیدا کیا ہے تا کہ میں پہچانا جاؤں] اس جگہ بھی ان کی اپنی معرفت مراد ہے نہ یہ کہ میں (حق تعالیٰ) معروف ہو جاؤں اور ان کی معرفت کے توسل سے کمال حاصل کروں۔ تعالیٰ اللہ عن ذلك علوا

[1] ائمہ حدیث کے ہاں یہ حدیث ثابت نہیں ہے جس طرح کتبِ موضوعات کی طرف مراجعت سے ثابت ہوتا ہے۔ [مولف رحمہ اللہ] نیز دیکھیں: مجموع الفتاویٰ لابن تیمیة (۱۸/ ۱۲۲) السلسلة الضعیفة (۱/ ۱٦٦)

کبیرا [اللہ تعالیٰ ان باتوں سے بہت بلند اور سب سے بڑا ہے]

⑥ اللہ تعالیٰ تمام صفاتِ نقص اور حدوث کے تمام نشانات سے منزہ اور مبرا ہے۔ جس طرح وہ جسم وجسمانی نہیں ہے مکانی وزمانی بھی نہیں ہے، بلکہ تمام صفاتِ کمال اسی کے لیے ثابت ہیں، جن میں سے آٹھ صفاتِ کمال وجود ذاتِ باری تعالیٰ پر وجودِ زائد کے ساتھ موجود ہیں۔[1] وہ آٹھ صفات یہ ہیں: ① حیات ② علم ③ قدرت ④ ارادہ ⑤ سمع ⑥ بصر ⑦ کلام ⑧ تکوین۔ یہ صفات خارج میں موجود ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وجودِ ذات پر وجودِ زائد کے ساتھ علم میں موجود ہیں اور خارج میں نفسِ ذات تعالیٰ وتقدس ہیں، جیسا کہ بعض صوفیہ وجودیہ نے گمان کیا ہے اور کہا ہے:

از روئے تعقل ہمہ غیر اند صفات
با ذاتِ تو از روئے تحقق ہمہ عین

[عقل کہتی ہے تیری ساری صفات اغیار ہیں۔ سچ یہ ہے کہ وہ تیری ذات کے ساتھ عین ہیں]

کیونکہ اس میں حقیقتِ صفات کی نفی ہے، اس لیے صفات کی نفی کرنے والے یعنی معتزلہ اور فلاسفہ نے بھی اسے تغائرِ علمی اور اتحادِ خارجی کہا ہے۔ انھوں نے تغایرِ علمی سے انکار نہیں کیا اور یہ نہیں کہا کہ علم کا مفہوم عین مفہومِ ذات تعالیٰ وتقدس ہے، یا عین مفہومِ قدرت وارادہ ہے، بلکہ عینیت وجودِ خارجی کے اعتبار سے کہا ہے، لہٰذا جب تک یہ صوفیہ وجودِ خارجی کے تغایر کا اعتبار نہ کریں، صفات کے انکار کرنے والوں میں سے نہیں نکلتے، کیونکہ تغایرِ اعتباری کچھ نفع نہیں دیتا۔

⑦ اللہ تعالیٰ قدیم اور ازلی ہے اور اس کے سوا کسی کے لیے "قِدم وازل" ثابت نہیں تمام ملتوں کا اس پر اجماع ہے۔ جو شخص بھی حق جل وعلا کے سوا کسی غیر کے قدم وازلیت کا قائل ہوا، وہ کافر ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے اسی وجہ سے ابنِ سینا اور فارابی اور ان جیسے عقائد والوں کی تکفیر کی ہے، کیونکہ یہ لوگ عقول ونفوس کے قدم کے قائل ہیں اور ہیولیٰ اور صورت کے قدیم ہونے کا گمان رکھتے ہیں، نیز انھوں نے آسمانوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، ان کو بھی قدیم جانا ہے۔

[1] ائمہ حدیث کے نزدیک یہ بحث کہ صفات زائد علی الذات ہیں یا نہیں؟ اسے ترک کر دینا ہی اولیٰ ہے۔ کیوں کہ اس مسئلے میں کتاب وسنت بالکل خاموش ہیں، واللہ تعالیٰ أعلم بذاته وصفاته. [مولف رحمہ اللہ]

ہمارے خواجہ حضرت (باقی باللہ) ۔قدس سرہ۔ فرماتے تھے کہ شیخ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ کاملین کی ارواح کے قدیم ہونے کے قائل ہیں۔ اس بات کو ظاہر کی طرف سے پھیر کر تاویل پر محمول کرنا چاہیے، تاکہ اہلِ ملت کے اجماع کے مخالف نہ ہو۔

⑧ اللہ تعالیٰ قادر و مختار ہے۔ وہ ایجاب کی آمیزش اور اضطرار کے گمان سے منزہ اور مبرا ہے۔ بے عقل فلاسفہ نے کمال کو ایجاب میں جان کر واجب تعالیٰ سے اختیار کی نفی کر کے اس کے ایجاب کا اثبات کیا ہے اور ان بے عقلوں نے ذات واجب تعالیٰ و تقدس کو بیکار سمجھا ہے، سوائے ایک مصنوع کے کہ وہ بھی ایجاب سے ہے۔ زمین و آسمان کے خالق سے صادر نہ جان کر حوادث کے وجود کو عقلِ فعال کی طرف منسوب کیا ہے، جس کا وجود ان کے وہم کے علاوہ کہیں ثابت نہیں ہے اور ان کے فاسد زعم میں حق سبحانہٗ و تعالیٰ سے ان کو کچھ کام نہیں ہے۔ لازمی طور پر چاہیے تھا کہ اضطراب و اضطرار کے وقت اپنی عقلِ فعال کی طرف التجا کرتے اور حضرت حق سبحانہٗ کی طرف رجوع نہ کرتے، کیونکہ ان کے نزدیک حوادث کے وجود میں اُس کی کوئی مداخلت نہیں ہے اور کہتے ہیں کہ عقلِ فعال ہی حوادث کی ایجاد سے تعلق رکھتی ہے، بلکہ وہ تو عقلِ فعال سے بھی رجوع نہیں کرتے، کیونکہ ان کے نزدیک بلیات کے دفع کرنے میں بھی اس کا اختیار نہیں ہے۔ یہ بدنصیب فلاسفہ اپنی بے وقوفی اور حماقت میں گمراہ فرقوں سے بھی آگے بڑھ گئے، حالانکہ کافر ان بدبختوں کے برخلاف اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ سے التجا کرتے ہیں اور بلاؤں کے دفعیے کو اسی سے طلب کرتے ہیں۔

تمام گمراہ اور بے دین فرقوں کی نسبت ان بدبختوں میں دو چیزیں زیادہ ہیں۔ ایک یہ کہ احکام منزلہ کا کفر اور انکار کرتے ہیں اور اخبارِ مرسلہ کے ساتھ عداوت و دشمنی رکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اپنے بے ہودہ اور واہی مطالب اور مقاصد کے ثابت کرنے میں بے ہودہ مقدمات کو ترتیب دیتے اور جھوٹے دلائل اور باطل شواہد کو عمل میں لاتے ہیں۔ اپنے مطالب و مقاصد کو ثابت کرنے میں جس قدر ان کو خبط لاحق ہوا ہے، کسی بے وقوف کو بھی لاحق نہیں ہوا۔ آسمان اور ستارے جو ہر وقت بے قرار اور سرگرداں ہیں اپنے کاموں کا مدار ان کی حرکات اور اوضاع پر رکھا ہے اور آسمانوں کے خالق اور ستاروں کے موجد و محرک اور مدبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور اسے دور از معاملہ

سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ کیا ہی بے خرد اور کتنے بے وقوف ہیں۔ ان سے بھی زیادہ بے وقوف اور احمق وہ شخص ہے جو ان کو دانا سمجھتا اور عقلمند جانتا ہے۔ ان کے مرتب کردہ علوم میں سے ایک علم ہندسہ ہے، جو محض لایعنی، بے ہودہ اور لا طائل ہے۔ بھلا مثلث کے تینوں زاویوں کا دو زاویۂ قائمہ کے برابر ہونا کس کام آئے گا؟ شکلِ عروسی اور مامونی، جو ان کے نزدیک بڑی مشکل اور جانکاہ ہے، کس غرض کے لیے ہے؟ علمِ طب و نجوم اور علم تہذیبِ اخلاق جو ان کے تمام علوم میں سے بہترین علوم ہیں، انھوں نے سابقہ انبیا۔علی نبینا وعلیهم الصلوات والتسلیمات۔ کی کتابوں سے چُرا کر اپنے باطل اور بے ہودہ علوم کو رائج کیا ہے، جیسا کہ امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنے رسالے "المنقذ عن الضلال" میں اس امر کی تصریح کی ہے۔

اہلِ ملت اور انبیا۔علیهم الصلاۃ والسلام۔ کے متبعین اگر دلائل و براہین میں غلطی کریں تو کچھ ڈر نہیں، کیونکہ ان کے کام کا مدار انبیا۔علیهم الصلاۃ والسلام۔ کی تقلید پر ہے اور اپنے مطالبِ عالیہ کے ثبوت کے دلائل و براہین کو صرف بطورِ تبرع اور بطورِ احسان لاتے ہیں۔ یہی تقلید ان کے لیے کافی ہے، برخلاف ان بدبختوں کے جو تقلید سے نکل کر صرف دلائل کے ساتھ اپنے مطالب کو ثابت کرنے کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ضلوا فأضلوا [یہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا]۔

عیسیٰ۔علیٰ نبینا وعلیه الصلاۃ والسلام۔ کی نبوت کی دعوت جب افلاطون کو پہنچی جو ان بدنصیبوں کا سب سے بڑا سردار ہے تو اس نے کہا: نحن قوم مهتدون لا حاجة بنا إلى من يهدينا. [ہم ہدایت یافتہ قوم ہیں اور ہم کو ایسے شخص کی حاجت نہیں ہے جو ہم کو ہدایت دے] اس بے وقوف کو چاہیے تھا کہ ایسے شخص کو جو مردوں کو زندہ کر دیتا ہے، مادر زاد اندھے کو بینا اور کوڑھی کو اچھا کر دیتا ہے، جو ان کی حکمت کے قانون سے ناممکن ہے، یہ پہلے ان کو دیکھتا اور ان کے حالات دریافت کرتا، پھر جواب دیتا۔ دیکھے بغیر جواب دینا کمال درجہ دشمنی اور کمینہ پن ہے۔

فلسفہ چوں اکثرش باشد سفہ پس کُل آں
ہم سفہ باشد کہ حکم کل حکم اکثر است

[فلسفہ اکثر سفہ ہے، بس سفہ کُل کا حکم آخر ہے اکثر کا حکم]

نجانا الله سبحانه عن ظلمات معتقداتهم السوء. [اللہ سبحانہٗ ان کے برے عقائد کی

تاریکی سے ہم کو نجات دے]

ان ہی ایام میں میرے فرزند محمد معصوم نے "جواہر شرح مواقف" کو پورا کیا ہے۔ اثنائے سبق میں ان بے وقوفوں (فلاسفہ) کی برائیاں واضح طور پر سامنے آئیں اور ان کی وجہ سے بہت فائدے مرتب ہوئے۔

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَ مَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْ لَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ﴾ [الأعراف: ٤٣]

[سب تعریف اللہ کی ہے جس نے ہمیں اس کی ہدایت دی اور ہم کبھی نہ تھے کہ ہدایت پاتے، اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ نے ہمیں ہدایت دی، بلاشبہہ یقیناً ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے]

شیخ محی الدین ابنِ عربی رحمہ اللہ کی بعض عبارتیں بھی ایجاب کی طرف ناظر ہیں اور قدرت کے معنی میں فلسفے کے ساتھ موافقت رکھتی ہیں کہ وہ اس کے ترک کی صحت قادر (حق تعالیٰ) سے تجویز نہیں کرتے اور فعل کی جانب کو لازم جانتے ہیں۔

عجب معاملہ ہے کہ شیخ محی الدین مقبولین میں سے نظر آتے ہیں، لیکن ان کے اکثر علوم جو اہلِ حق کی آرا کے مخالف ہیں خطا اور نا درست ظاہر ہوتے ہیں، شاید ان کو خطاے کشفی کے باعث معذور رکھا گیا ہے اور خطاے اجتہادی کی طرح ان سے ملامت دُور کر دی گئی ہے۔

شیخ محی الدین کے حق میں فقیر کا اعتقاد یہی ہے کہ ان کو مقبولین میں سے جانتا ہے اور ان کے ان علوم کو جو اہلِ حق کے مخالف ہیں، خطا اور ضرر رساں دیکھتا ہے۔ اس گروہِ صوفیہ کے بعض لوگ ایسے ہیں کہ شیخ (موصوف) کو طعن و ملامت بھی کرتے ہیں اور ان کے علومِ مخالفہ کو بھی غلط اور نادرست سمجھتے ہیں۔ اس گروہ کے بعض لوگ شیخ موصوف کی تقلید اختیار کر کے ان کے تمام علوم کو درست جانتے ہیں اور دلائل و شواہد سے ان علوم کی حقیقت کو ثابت کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان ہر دو فریق نے افراط و تفریط کا راستہ اختیار کیا ہے اور میانہ روی سے دور ہو گئے ہیں۔

شیخ موصوف کو، جو اولیائے مقبولین میں سے ہیں، خطاے کشفی کے باعث کس طرح رد کر دیا جائے اور ان کے علوم کو جو صحت و صواب سے دور ہیں اور اہلِ حق کی رائے کے مخالف ہیں، تقلید کی وجہ سے کس طرح قبول کیا جا سکتا ہے۔ پس حق اسی میانہ روی میں ہے جس کی توفیق اللہ سبحانہٗ نے

اپنے فضل و کرم سے مجھے بخشی ہے۔

ہاں مسئلہ ''وحدت الوجود'' میں اس گروہِ صوفیہ کی ایک بڑی جماعت شیخ کے ساتھ شریک ہے، اگرچہ شیخ موصوف اس مسئلے میں بھی ایک خاص طرز رکھتے ہیں، لیکن اصل بات میں وہ سب لوگ شیخ کے ساتھ شریک ہیں۔ یہ مسئلہ بھی اگرچہ ظاہر میں اہلِ حق کے عقائد کے مخالف ہے، لیکن توجہ کے قابل اور تطبیق دینے کے لائق ہے۔ اس فقیر نے اللہ سبحانہٗ کی عنایت سے اپنے حضرت (خواجہ باقی باللہ رحمہ اللہ) کی ''شرح رباعیات'' کی شرح میں اس مسئلے کو اہلِ حق کے عقائد کے ساتھ تطبیق دی ہے اور فریقین کے نزاع کو لفظ کی طرف پھیرا ہے اور طرفین کے شکوک و شبہات کو اس طرح حل کیا ہے کہ اس میں کسی شک و شبہہ کی گنجایش نہیں رہی، جیسا کہ اس کو دیکھنے والے پر پوشیدہ نہیں ہے۔

⑨ تمام ممکنات جواہر ہوں یا اعراض، اجسام و عقول ہوں یا نفوس، افلاک ہوں یا عناصر، سب اسی قادر مختار کے ایجاد کیے ہوئے ہیں۔ وہی ان کو نہاں خانۂ عدم سے معرضِ وجود میں لایا ہے۔ جس طرح یہ سب اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں، اسی طرح بقا میں بھی اللہ کے محتاج ہیں۔ اُس نے اسباب و وسائل کے وجود کو اپنے فعل کا روپوش بنا دیا ہے اور حکمت کو اپنی قدرت کے پردے بنا دیے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اسباب کو اپنے فعل کے ثبوت کے دلائل قرار دے کر حکمت کو اپنی قدرت کے وجود کا وسیلہ فرمایا ہے، کیونکہ وہ عقل مند حضرات جنھوں نے حضرات انبیا۔علیھم الصلوات والتسلیمات۔ کی متابعت میں اپنی بصیرت کو سرگیں اور روشن کر لیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ اسباب و وسائل اپنے وجود و بقا میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے محتاج ہیں اور اپنا ثبوت و قیام اسی تعالیٰ و تقدس سے اور اسی کے ساتھ رکھتے ہیں۔ ورنہ حقیقت میں وہ جمادِ محض ہیں۔ وہ کس طرح دوسرے میں جو ان کے مثل ''جماد'' ہے، اثر انداز ہو سکتے ہیں اور کس طرح ان میں احداث و اختراع کر سکتے ہیں؟ بلکہ ان کے علاوہ ایک اور قادر ہے جو ان کو ایجاد کرتا ہے اور ہر ایک کے لائق و مناسب کمالات ان کو عطا فرماتا ہے، جیسا کہ عقل مند آدمی جمادِ محض سے فعل کو دیکھ کر اس کے فاعل اور محرک کا سراغ لگا لیتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ فعل اس جماد کے حال کے لائق نہیں ہے، بلکہ اس کے علاوہ کوئی اور فاعل ہے جو اس فعل کو اس میں ایجاد کرتا ہے، لہٰذا عقل مندوں کے نزدیک جماد کا فعل، فاعلِ حقیقی کے فعل کا روپوش ہونا ثابت نہیں ہوا،

بلکہ اس کی جمادیت کی طرف نظر کرنے کے لحاظ سے اس کا وہ فعل فاعلِ حقیقی کے وجود پر دلیل ہو گیا۔ پس یہاں بھی اسی طرح ہے۔ البتہ اس بے وقوف کے فہم میں جماد کا فعل فاعلِ حقیقی کے فعل کا روپوش بن گیا جس نے اپنی حد درجہ بے وقوفی کی وجہ سے جمادِ محض کو اس ظاہری فعل کے سبب صاحبِ قدرت جان لیا ہے اور فاعلِ حقیقی کا منکر ہو گیا ہے، فرمانِ باری تعالیٰ:

﴿ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ﴾ [البقرة: ٢٦]

[وہ اس کے ساتھ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ بہتوں کو ہدایت دیتا ہے]

یہ معرفت مشکاتِ نبوت سے مقتبس ہے، لیکن ہر شخص کی فہم اس تک نہیں پہنچتی۔ ایک جماعت اس کمال کو اسباب دور کرنے میں معاون جانتی ہے۔ شروع ہی سے چیزوں کو اسباب کے بغیر رفع کرنے میں حکمت ختم ہو جاتی ہے جس کے ضمن میں بہت سی مصلحتیں مدنظر ہیں۔ ارشاد ہے:

﴿ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ﴾ [آل عمران: ١٩١]

[اے ہمارے رب! تو نے یہ بے مقصد پیدا نہیں کیا]

انبیا۔ علیهم الصلوات والتسليمات۔ بھی اسباب کی رعایت کرتے ہیں اور باوجود اس رعایت کے اپنے کام کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی مراعات سے جانتے ہیں، جیسا کہ یعقوب۔ علی نبيّنا و عليه الصلاة والسلام۔ نے نظرِ بدلگ جانے کے خیال سے اپنے لڑکوں کو وصیت فرمائی تھی:

﴿ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّ ادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ﴾ [يوسف: ٦٧]

[اے میرے بیٹو! ایک دروازے سے داخل نہ ہونا اور الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا]

یعقوب علیہ السلام نے اس احتیاطی تدبیر کی رعایت کے باوجود اپنے حکم کو اللہ جل و علا کے سپرد کر کے فرمایا:

﴿ وَ مَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ عَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴾ [يوسف: ٦٧]

[اور میں تم سے اللہ کی طرف سے (آنے والی) کوئی چیز نہیں ہٹا سکتا، حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں، اسی پر میں نے بھروسا کیا اور اسی پر پس لازم ہے کہ بھروسا کرنے والے بھروسا کریں]

اللہ تعالیٰ نے ان کی اس معرفت کو پسند فرما کر اس بات کو اپنی طرف منسوب کر کے فرمایا:

﴿يَاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [الأنفال: ٦٤]

[اے نبی! آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہ مومنین بھی جو آپ کی اتباع کرتے ہیں][1]

باقی رہا یہ کہ اسباب کی تاثیر روا ہے، تو بعض اوقات اللہ تعالیٰ اسباب میں بھی تاثیر فرما دیتا ہے تاکہ وہ موثر ہو جائیں اور بعض اوقات ان میں تاثیر پیدا نہیں فرماتا، لہٰذا ناچار اس کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہم روزمرہ اسباب میں اس حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ کبھی ان اسباب پر مسببات کا وجود مرتب ہوتا ہے اور کبھی کوئی اثر ان سے ظاہر نہیں ہوتا۔ اسباب کی تاثیر سے مطلقاً انکار کرنا لغو و باطل ہے۔ تاثیر کو ماننا چاہیے، لیکن اس تاثیر کو بھی اس کے سبب کی طرح اللہ تعالیٰ کی ایجاد سے جاننا چاہیے۔ فقیر کی رائے اس مسئلے میں یہی ہے، واللہ سبحانه الملهم.

اس بیان سے واضح ہو گیا کہ اسباب کا واسطہ توکل کے منافی نہیں، جیسا کہ ناقصوں نے خیال کیا ہے، بلکہ اسباب میں توسط کا خیال کرنا کمالِ توکل ہے، جیسا کہ یعقوب۔ علی نبینا و علیه الصلاة والسلام۔ نے اسباب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے معاملے کو حق جل و علا کے سپرد کرنے کو توکل فرمایا:

﴿عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ عَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ﴾ [يوسف: ٦٧]

[اسی پر میں نے توکل کیا اور اسی پر توکل کرنے والوں کو توکل (بھروسا) کرنا چاہیے]

(۱۰) اللہ تعالیٰ خیر و شر کا ارادہ کرنے والا بھی ہے اور دونوں کا پیدا کرنے والا بھی، لیکن وہ خیر سے راضی ہوتا ہے اور شر سے ناراض۔ ارادے اور رضا کے درمیان یہ ایک بڑا باریک فرق ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اہلِ سنت کو ہدایت عطا فرمائی ہے۔ باقی تمام فرقے اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اسی وجہ سے معتزلہ نے بندے کو اپنے افعال کا خالق کہا ہے اور کفر و معاصی کی ایجاد کو اس سے منسوب کیا ہے۔

---

[1] محققین موحدین کے نزدیک حرف "مَنْ" کا کاف پر عطف ہے نہ کہ اسم جلالہ پر۔ جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ وغیرہ نے اس کی صراحت کی ہے۔ اس کے باوجود اسباب کا توسط توکل کے منافی نہیں ہے۔

گفت پیغمبر باآواز بلند
بر توکل زانوے اشتر بہ بند

[پیغمبر ﷺ نے بیانگ دہل کہا: اونٹ کا گھٹنا باندھ کر توکل کرو] [مولف رحمہ اللہ]

شیخ محی الدین رحمہ اللہ اور ان کے متبعین کے کلام سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح ایمان و عمل صالح اسم الہادی کے پسندیدہ ہیں، اسی طرح کفر و معاصی بھی اسم المضل کے پسندیدہ ہیں۔ شیخ کی یہ بات بھی اہلِ حق کے خلاف ہے اور ایجاب کی طرف میلان رکھتی ہے جو رضا کا منشا ہوتی ہے، جیسا کہ کہتے ہیں کہ آفتاب کا کام روشنی پھیلانا ہے اور اس میں اس کی مرضی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو قدرت و ارادہ عطا کیا ہے اور وہ اپنے اختیار سے اپنے افعال کا کسب کرتے ہیں۔ افعال کا پیدا کرنا اللہ کی طرف منسوب ہے اور ان افعال کا کسب بندوں کی جانب منسوب ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی عادت اسی طرح جاری ہے کہ بندہ جب اپنے فعل کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس فعل کو پیدا کر دیتا ہے، جبکہ بندے کا فعل اپنے اختیار سے صادر ہوتا ہے۔ جنھوں نے یہ کہا ہے کہ بندے کا اختیار کمزور اور ضعیف ہے، اگر تو انھوں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قوتِ اختیار کے اعتبار سے اس بندے کے اختیار کو ضعیف کہا ہے تو مسلم ہے اور اگر اس معنی میں کہا گیا ہے کہ جس کام کے کرنے میں اس کو مامور کیا گیا ہے وہ قوت و اختیار کافی نہیں ہے، تو یہ بات صحیح نہیں، پس بیشک اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ایسے کام کی تکلیف نہیں دیتا جو بندے کی وسعت سے باہر ہو، بلکہ وہ تو آسانی کا ارادہ کرتا ہے اور تنگی کا ارادہ نہیں کرتا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ چند روزہ زندگی کے فعل پر دائمی عذاب کا مقرر کرنا حق تعالیٰ کے حوالے اور سپرد ہے، جس نے کفرِ موقت کی سزا اس کے اعمال کے موافق عذابِ مخلّد کی صورت میں عطا فرمائی اور بہشت اور جو کچھ اس میں ہے، زندگی بھر کے ایمان کے ساتھ اسے وابستہ کر دیا۔

﴿ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾ [الأنعام: ٩٦]

[یہ اس زبردست غالب، سب کچھ جاننے والے کا مقرر کردہ اندازہ ہے]

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی توفیق سے اس قدر تو ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو ظاہری اور باطنی نعمتوں کا دینے والا اور آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور جس کی بارگاہِ قدس کے لیے ہر قسم کی بزرگی اور کمال ثابت ہے، اس کی نسبت کفر اختیار کرنے کی سزا بھی ایسی ہی ہونی چاہیے جو سخت ترین سزاؤں میں سے ہو اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہنا ہے۔ اسی طرح اس منعم بزرگ و برتر پر ایمان بالغیب لانا اور نفس و شیطان کی مزاحمت کے باوجود اس کو راست گو جاننے کی جزا بھی ویسی ہی ہونی چاہیے جو

سب جزاؤں سے بہتر اور اعلیٰ درجے کی ہو اور وہ دائمی نعمتوں اور لذتوں میں رہنا ہے۔

بعض مشائخ نے فرمایا ہے کہ درحقیقت بہشت میں داخل ہونا محض اللہ تعالیٰ کے فضل پر موقوف ہے اور اس کو ایمان کے ساتھ مربوط کرنا اس وجہ سے ہے کہ اعمال کی جزا لذیز ترین معلوم ہو۔ اس فقیر کے نزدیک حقیقتاً بہشت میں داخل ہونا ایمان کی وابستگی پر موقوف ہے، لیکن ایمان بھی اس اللہ تعالیٰ کا فضل اور عطیہ ہے۔ جہنم میں داخل ہونا کفر کے ساتھ وابستہ ہے اور کفر نفسِ امارہ کی خواہشات سے پیدا ہوتا ہے۔ فرمانِ خداوندی ہے:

﴿ وَ مَآ اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ﴾ [النساء: ۷۹]

[جو کوئی بھلائی تجھے پہنچتی ہے سو اللہ کی طرف سے ہے اور جو کوئی برائی تجھے پہنچے سو تیرے نفس کی طرف سے ہے]

بہشت کے داخلے کو ایمان کے ساتھ مربوط کرنا حقیقت میں ایمان کی تعظیم اور تکریم ہے، بلکہ ''مومن بہ'' یعنی جس پر ایمان لایا گیا ہے، اس کی تعظیم ہے۔ جس پر اس قدر بڑا عظیم الشان اجر مرتب ہوا ہے۔ اسی طرح دوزخ میں داخل ہونے کو کفر کے ساتھ وابستہ کرنے میں کفر کی تحقیر ہے اور اس ذات کی تعظیم ہے جس کی نسبت یہ کفر وقوع میں آیا اور اس پر اس طرح کا دائمی عذاب مترتب ہوا برخلاف اس بات کے جو بعض مشائخ نے کہی ہے وہ اس دقیقے سے خالی ہے۔ نیز دوزخ میں داخل ہونا بھی انصاف کے تقاضے پر ہے اور کوئی مثال اس طرح پر جاری نہیں ہے، کیونکہ جہنم میں داخل ہونا حقیقت میں کفر کے ساتھ مربوط ہے۔ و اللّٰہ سبحانہ الملھم.

⑪ اہلِ ایمان آخرت میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو بے جہت،[1] بے کیف اور بے شبہ و بے مثال جنت میں دیکھیں گے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں اہلِ سنت کے علاوہ تمام اہلِ ملت اور غیر اہلِ ملت سب اس کے منکر ہیں اور بے جہت و بے کیف رویت کو جائز نہیں سمجھتے، حتی کہ شیخ محی الدین بن العربی رحمہ اللہ بھی آخرت کی رویت کو تجلی صوری کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور اس تجلی صوری کے علاوہ کچھ تجویز نہیں کرتے۔

ایک روز ہمارے حضرت (خواجہ باقی باللہ رحمہ اللہ) شیخ سے نقل کرتے تھے کہ اگر معتزلہ رویت کو

[1] ان الفاظ مخترعہ اور مباحث کلامیہ کی تردید گذشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔

تنزیہ کے مرتبے میں مقید نہ کرتے اور تشبیہ کے بھی قائل ہو جاتے اور اسی رویت کو تجلی صوری سمجھ لیتے تو ہرگز رویت کا انکار نہ کرتے اور محال نہ سمجھتے۔ یعنی ان کا انکار بے جہتی اور بے کیفی کی وجہ سے ہے جو تنزیہ کے مرتبے کے ساتھ مخصوص ہے، برخلاف اس تجلی کے جس میں جہت اور کیف ملحوظ ہے۔

یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ آخرت کی رویت کو تجلی صوری کی طرح بیان کرنا فی الحقیقت خاص رویت کا انکار کرنا ہے، کیونکہ وہ تجلی صوری اگرچہ دنیاوی تجلیاتِ صوریہ سے مختلف ہے، لیکن حق تعالیٰ کی رویت نہیں ہے۔

یراه المؤمنون بغیر کیف
و إدراك وضرب من مثال

[جنتی کو دیدِ حق کی ہوگی سیر، کیف و ادراک اور مثالوں کے بغیر]

⑫ انبیا۔علیهم الصلوات والتسلیمات۔ کی بعثت تمام جہان کے لیے سراسر رحمت ہے۔ اگر ان بزرگوں کے وجود کا وسیلہ نہ ہوتا تو ہم جیسے گمراہوں کو واجب الوجود تعالیٰ و تقدس کی ذات و صفات کی معرفت کی طرف کون ہدایت فرماتا؟ ہمارے اَفہامِ نا تمام ان بزرگوں کی اتباع کے بغیر اس معاملے میں عاجز و بے بس ہیں۔

گر نہ ہوتی ذات پاک انبیا
حق سے باطل کس طرح ہوتا جدا

بے شک عقل اگرچہ ایک حجت ہے، لیکن یہ ایک نا تمام حجت ہے جو مرتبہ بلوغ تک نہیں پہنچی ہے۔ دلیلِ کامل انبیا۔علیهم الصلوات والتسلیمات۔ کی بعثت ہے جس پر آخرت کا دائمی عذاب و ثواب وابستہ ہے۔

سوال جب آخرت کا دائمی عذاب بعثت پر موقوف ہے تو پھر بعثت کو رحمتِ عالمیان کہنے کا کیا معنی ہوگا؟

جواب بعثتِ انبیا علیہم السلام عین رحمت ہے، کیونکہ یہ واجب الوجود تعالیٰ و تقدس کی ذات و صفات کی معرفت کا سبب ہے جس میں دنیا و آخرت کی سعادتیں ہیں۔ اسی بعثت کی بدولت معلوم ہو گیا کہ فلاں چیز حق تعالیٰ کی بارگاہ قدس کے مناسب ہے اور فلاں نامناسب، کیونکہ ہماری لنگڑی اور اندھی عقل امکان و حدوث کے داغ سے داغ دار ہے۔ وہ کیا سمجھے کہ اس حضرت وجوب

کے لیے جس کے واسطے قِدم لازم ہے، اس کے اسما و صفات کا اطلاق کیا جائے اور نامناسب سے پرہیز کیا جائے۔ بعض اوقات ہماری اندھی عقل اپنے نقص کی وجہ سے کمال کو نقص جانتی ہے اور نقص کو کمال سمجھنے لگتی ہے۔

فقیر کے نزدیک یہ مناسب و نا مناسب کا امتیاز تمام ظاہری اور باطنی نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔ وہ شخص بڑا ہی بد بخت ہے جو نا مناسب امور کو اللہ تعالیٰ کی پاک بارگاہ کی طرف منسوب کر دے اور ناشائستہ چیزوں کو اس کے ساتھ نسبت دے۔

یہ بعثتِ انبیا ہی کا کارنامہ ہے جس نے حق کو باطل سے جدا کر دیا۔ بعثت ہی کی وجہ سے غیر مستحقِ عبادت اور مستحقِ عبادت کے درمیان تمیز ہوئی۔ یہ بعثت ہی ہے جس کے ذریعے حق جل و علا کے راستے کی طرف دعوت دی جاتی ہے جو بندوں کو مولیٰ جل سلطانہ کے قرب اور وصل کی سعادت تک پہنچاتی ہے۔ بعثت ہی کے وسیلے سے مولیٰ جل شانہ کی مرضیات کی اطلاع میسر ہوتی ہے۔ بعثت ہی کے طفیل اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ملک میں تصرف کے جواز و عدم جواز کی تمیز حاصل ہوتی ہے، بہر حال بعثت کے فوائد کی مثالیں کثرت سے ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ انبیا کی بعثت سراپا رحمت ہے اور جو شخص اپنے نفسِ امارہ کا مطیع ہو گیا اور شیطان لعین کے حکم سے بعثت کا انکار کرتا ہے اور بعثت کے تقاضوں کے مطابق عمل نہیں کرتا تو اس میں بعثت کا کیا گناہ اور بعثت کس طرح رحمت نہ ہو گی؟

سوال ہر چند عقل اپنی ذات کی حد تک احکامِ الٰہی جل شانہ کی بجا آوری میں ناقص و نا تمام ہے، لیکن ایسا کیوں نہیں ہو سکتا کہ تصفیہ اور تزکیہ حاصل ہونے کے بعد عقل کو مرتبۂ وجوبِ تعالیٰ و تقدس کے ساتھ ایک بے تکیف مناسبت اور اتصال پیدا ہو جائے کہ جس مناسبت اور اتصال کے سبب وہ احکام کو وہاں سے اخذ کر لے اور اس کو اس بعثت کی جو فرشتے کے واسطے سے ہے، کوئی حاجت نہ رہے۔

جواب اگرچہ عقل یہ مناسبت اور اتصال پیدا کر لے، لیکن وہ تعلق جو اس کا جسمانی بدن کے ساتھ ہے وہ بالکل ختم نہیں ہوتا اور کامل طور پر علاحدگی حاصل نہیں ہوتی، لہٰذا قوتِ واہمہ ہمیشہ دامنگیر رہتی ہے اور قوتِ متخیلہ ہرگز اس کا خیال نہیں چھوڑتی قوتِ غضبیہ و شہویہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے اور حرص و لالچ کے رذائل ہر وقت اسکے ہم نشین رہتے ہیں۔ سہو و نسیان جو نوعِ انسانی

کے لوازمات میں سے ہیں، اس کی عقل سے مکمل طور پر جدا نہیں ہوتے اور غلطی و خطا جو اس جہان کا خاصا ہے اس سے جدا نہیں ہوتے۔ لہٰذا عقل اعتماد کے لائق نہیں ہے، اس سے ماخوذ احکام وہم اور تصرفِ خیال کے غلبے سے محفوظ نہیں رہتے اور نسیان و خطا کے گمان کی آمیزش سے محفوظ نہیں رہتے، برخلاف فرشتے کے وہ ان اوصاف سے پاک اور ان رذائل سے مبرا ہے تو لازماً وہ اعتماد کے قابل ہے اور اس سے ماخوذ احکام وہم و خیال کی آمیزش اور نسیان و خطا کے گمان سے محفوظ ہیں۔

بعض اوقات وہ علوم جو روحانی تلقی سے اخذ کیے ہوئے ہوتے ہیں، ان کے متعلق تبلیغ کے دوران میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قویٰ و حواس کے ساتھ بعض مقدماتِ مسلمہ غیر صادقہ جو وہم و خیال یا کسی اور ذریعے سے حاصل ہوئے ہیں، بے اختیار ان علوم کے ساتھ اس طرح غلط ملط ہو جاتے ہیں کہ اس وقت ہرگز تمیز ممکن نہیں رہتی اور دوسرے وقت میں ایسا ہوتا ہے کہ اس تمیز کا علم دے دیا جاتا ہے اور کبھی نہیں دیا جاتا، لہٰذا لازمی طور پر وہ علوم ان مقدمات کے مل جانے کی وجہ سے کذب کی ہیئت پیدا کر لیتے ہیں اور اعتماد کے قابل نہیں رہتے، یا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تصفیے اور تزکیے کا حاصل ہونا اعمالِ صالحہ کے بجا لانے پر موقوف ہے جو مرضیاتِ مولیٰ سبحانہ ہیں اور یہ معنی بعثتِ انبیا سے وابستہ ہیں جیسا کہ بیان ہو چکا۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ بعثت کے بغیر تصفیے اور تزکیے کی حقیقت میسر نہیں ہوتی اور وہ صفائی جو کفار اور اہلِ فسق کو حاصل ہوتی ہے وہ نفس کی صفائی ہے نہ کہ قلب کی صفائی۔ نفس کی صفائی سوائے گمراہی کے کچھ نہیں بڑھاتی اور سوائے نقصان کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ بعض غیبی امور کا کشف جو نفس کی صفائی کے وقت کفار اور اہلِ فسوق کو حاصل ہو جاتا ہے وہ استدراج ہے جس سے مقصود اس جماعت کا نقصان ہے۔

اس تحقیق سے واضح ہو گیا کہ تکلیف شرعی جو بعثتِ انبیا کی راہ سے ثابت ہوئی ہے وہ بھی رحمت ہی ہے، نہ کہ جس طرح تکلیفِ شرعی کے منکروں یعنی ملحدوں اور زندیقوں نے گمان کیا ہے اور تکلیفِ شرعی کو مصیبت جان کر غیر معقول اور ناپسند قرار دیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ کون سی مہربانی ہے کہ بندوں کو امورِ شاقہ کی تکلیف دی جائے، پھر ان سے کہا جائے کہ اگر تم اس تکلیف کے مطابق عمل

کرو گے تو بہشت میں جاؤ گے اور اگر اس کے خلاف کرو گے تو دوزخ میں جاؤ گے، ان کو ایسے امور کی کیوں تکلیف دیتے ہیں اور ان کو کیوں نہیں چھوڑ دیتے کہ کھائیں پئیں اور سوئیں اور جس طرح چاہیں اپنے طور پر زندگی بسر کریں؟

یہ منکرین بدنصیب اور بے عقل یہ نہیں جانتے کہ از روے عقل شکرِ منعم ادا کرنا واجب ہے اور یہ تکلیفاتِ شرعیہ اس شکر کے بجا لانے کا بیان ہے۔ لہٰذا تکلیفِ شرعی عقل کی رو سے بھی واجب ہے اور اسی طرح نظامِ عالم تکلیفاتِ شرعیہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر ہر ایک کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو شرارت و فساد کے سوائے کچھ ظہور میں نہ آتا اور ہر بوالہوس دوسرے کے جان و مال میں دست درازی کرتا اور خباثت و شرارت سے پیش آتا، اس طرح خود بھی ضائع ہوتا اور دوسروں کو ضائع کرتا۔ عیاذا باللہ سبحانہ۔ اگر سختی اور شرعی موانع حائل نہ ہوتے تو معلوم نہیں کہ کس قدر شرارت و فساد ظاہر ہوتا۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ [البقرة: ١٧٩]

[اور تمھارے لیے بدلہ لینے میں ایک طرح کی زندگی ہے]

اگر چوبِ حاکم نباشد زپے
کند زنگئے مست در کعبہ قے

[اگر چوبِ حاکم کا ہوتا نہ خوف۔ شرابی تو کعبے میں کر دیتا قے]

یا ہم یہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ زمین و آسمان اور ہر چیز کا خود مختار مالک ہے اور تمام بندے اس کے مملوک اور غلام ہیں۔ لہٰذا جو حکم و تصرف وہ ان میں فرماتا ہے وہ عین خیر و صلاح ہے اور ظلم و فساد کی آمیزش سے منزہ و مبرا ہے، اس کا ارشاد ہے:

﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ﴾ [الأنبياء: ٢٣] [جو کچھ وہ کرتا ہے، اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا]

کرا زہرۂ آنکہ از بیم تو
کشاید زباں جز بہ تسلیم تو

[تیرے خوف سے کس کو ہے حوصلہ کہ تسلیم و رضا سے ہٹ کے کھولے زباں]

اگر وہ سب کو دوزخ میں ڈال دے اور دائمی عذاب کا حکم فرمائے تو کسی اعتراض کی کیا مجال

ہے اور یہ غیر کی ملک میں تصرف نہیں ہے کہ اس میں ظلم و ستم کا شائبہ ہو، بر خلاف ہماری املاک کے جو فی الحقیقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی املاک ہیں۔ ان املاک میں ہمارے تمام تصرفات سوائے ان کے جو جائز ہیں، عین ستم ہیں، کیونکہ صاحبِ شرع نے بعض مصالح کی بنا پر ان املاک کی نسبت ہماری طرف کر دی ہے، لیکن حقیقت میں وہ سب اسی کی ملکیت ہیں۔ لہٰذا ان میں ہمارا تصرف اسی قدر جائز ہے جس قدر بالکلیہ مالک حق تعالیٰ نے اس میں تصرف کی اجازت دی اور مباح فرمایا، کیونکہ ان انبیا ۔علیھم الصلوات والتسلیمات۔ نے حق جل و علا کے احکام کے بارے میں خبریں دی ہیں اور جو احکام بیان فرمائے ہیں وہ سب سچے اور واقعے کے مطابق ہیں۔ علما نے احکامِ اجتہادیہ میں ان انبیا ۔علیھم الصلوات والتسلیمات والتحیات۔ سے اگرچہ خطا کو تجویز کیا ہے، لیکن خطا کے برقرار رکھنے کو ان کے حق میں جائز نہیں رکھا اور فرمایا ہے کہ وہ خطا پر جلدی متنبہ کر دیے جاتے ہیں اور ان کی خطا کا تدارک صواب سے کر دیا جاتا ہے، لہٰذا اس غلطی کا کوئی شمار و اعتبار نہیں۔

⑬ قبر کا عذاب خاص طور پر کافروں کے لیے اور بعض گناہ گار اہلِ ایمان کے لیے حق ہے کیونکہ مخبر صادق ۔علیه وعلی آله الصلوات والتسلیمات۔ نے اس کی خبر دی ہے۔

⑭ قبر میں مومنوں اور کافروں سے منکر نکیر کا سوال بھی حق ہے، کیونکہ دنیا اور آخرت کے درمیان قبر ایک برزخ ہے۔ اس کا عذاب بھی ایک وجہ سے دنیاوی عذاب سے مناسبت رکھتا ہے اور ختم ہونے والا ہے اور دوسری وجہ سے اس کو عذابِ اخروی کے ساتھ مناسبت ہے، کیونکہ وہ حقیقت میں آخرت کے عذابوں میں سے ہے۔ آیتِ کریمہ میں یوں آیا ہے:

﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا﴾ [المؤمن: ٤٦]

[وہ صبح و شام آگ (دوزخ) پر پیش کیے جاتے ہیں]

یہ آیت عذابِ قبر سے متعلق نازل ہوئی ہے اور اسی طرح قبر کی راحت بھی دو حیثیتیں رکھتی ہے۔ وہ شخص بہت ہی سعادت مند ہے جس کی لغزشوں اور گناہوں کو اللہ تعالیٰ کمال کرم اور مہربانی سے معاف فرما دیں اور ہرگز اس سے مواخذہ نہ کریں اور اگر مقامِ مواخذہ میں آ جائے تو بھی اپنی کمالِ رحمت سے دنیاوی آلام و مصائب کی تکالیف کو اس کے گناہوں کا کفارہ قرار دے دیں۔ اگر کچھ باقی رہ جائے تو قبر کی تنگی اور ان تکلیفوں کو جو اس مقام میں مقرر ہیں، ان سے کفارہ کر دیں

تاکہ وہ پاکیزہ ہو کر حشر میں کھڑا ہو۔ جس کسی کے لیے ایسا نہ کریں اور اس کا مواخذہ آخرت پر چھوڑ دیں تو یہ بھی عین عدل ہے، لیکن گناہ گاروں اور شرم ساروں کے حال پر افسوس ہے۔ ہاں اگر وہ گناہ گار اہلِ اسلام سے ہے تو اس کا انجام رحمت سے ہے اور وہ عذاب ابدی سے محفوظ ہے، یہ بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ ﴿رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾.

⑮ روزِ قیامت حق ہے۔ اس روز آسمان، ستارے، زمین، پہاڑ، سمندر، حیوان، نباتات اور معدنیات سب کے سب معدوم و ناچیز ہو جائیں گے۔ آسمان شق ہو جائیں گے اور ستارے منتشر ہو کر گر جائیں گے۔ زمین اور پہاڑ پراگندہ ذرات ہو جائیں گے۔ یہ تمام توڑ پھوڑ اور فنا کا تعلق نفخۂ اولیٰ سے ہے۔ نفخۂ ثانیہ (دوسرے صور) پر لوگ قبروں سے اٹھ کر محشر کی طرف روانہ ہوں گے۔ فلاسفہ آسمانوں اور ستاروں کے نیست و نابود ہونے کو نہیں مانتے اور ان کا فانی اور فاسد ہونا جائز نہیں سمجھتے، وہ ان کو ازلی اور ابدی کہتے ہیں۔ اس امر کے باوجود ان میں سے متاخرین اپنی بے وقوفی کی وجہ سے اپنے آپ کو زمرہ اہلِ اسلام میں شمار کرتے ہیں اور اسلام کے بعض احکام بھی بجا لانے کا دعوی کرتے ہیں۔ زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض اہلِ اسلام ان کی ان باتوں پر یقین رکھتے ہیں اور جرأت و دلیری کے ساتھ ان کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ بعض مسلمان ان لوگوں میں سے بعض کے اسلام کو کامل جانتے ہیں اور اگر کوئی ان پر طعن و تشنیع کرے تو اس کو بہت برا سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ لوگ نصوصِ قطعیہ کے منکر ہیں اور انبیا۔ علیھم الصلوات والتسلیمات۔ کے اجماع کا انکار کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ﴾ [التکویر: ۱، ۲]

[جب آفتاب بے نور ہو جائے گا اور ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑیں گے]

نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ﴾ [الانشقاق: ۱، ۲]

[جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کا حکم سن لے گا اور وہ اسی لائق ہے]

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ﴾ [النبأ: ١٩]

[اور آسمان کھل جائے گا اور اس میں دروازے ہو جائیں گے]

اس قسم کی مثالیں قرآن مجید میں کثرت سے موجود ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ صرف کلمہ شہادت زبان سے ادا کر لینا اسلام میں کافی نہیں ہے، بلکہ ان تمام چیزوں کی تصدیق بھی ضروری ہے جن کا بجا لانا دین کی ضروریات میں سے ہے اور کفر سے تبرا اور بے زار ہونا بھی ضروری ہے، تاکہ اسلام متصور ہو، وگرنہ یہ معاملہ بہت مشکل ہے۔

⑯ حساب، میزان اور پل صراط حق ہے کہ مخبرِ صادق ﷺ نے ان کی خبر دی ہے۔ نبوت کے اطوار سے ناواقفیت کی بنا پر بعض جاہلوں کا ان امور کو بعید از عقل سمجھنا درجہ اعتبار سے ساقط ہے، کیونکہ نبوت کے اطوار عقل کے اطوار سے بالاتر ہیں۔ حقیقت میں انبیاے کرام علیہم السلام کی سچی خبروں کو عقل کی نظر کے موافق کرنے کی کوشش کرنا طورِ نبوت سے انکار ہے، کیونکہ یہاں معاملہ صرف اتباعِ انبیا پر مبنی ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ طورِ نبوت طورِ عقل کے مخالف ہے، بلکہ طورِ عقل انبیا ۔علیهم الصلوات والتسليمات۔ کے اتباع کی تائید کے بغیر اس عالی مطلب کی طرف ہدایت حاصل نہیں کر سکتی۔ مخالفت دوسری چیز ہے اور رسائی نہ ہونا دوسری بات ہے، کیونکہ مخالفت رسائی کے بعد متصور ہوتی ہے۔

⑰ بہشت و دوزخ موجود ہیں۔ قیامت کے دن حساب کے بعد ایک گروہ بہشت میں بھیجا جائے گا اور دوسرا گروہ دوزخ میں۔ مومنوں کے لیے ثواب اور کفار کے لیے عذاب دائمی و ابدی ہو گا جو کبھی ختم ہونے والا نہیں، جیسا کہ قطعی اور موکدہ نصوص اس امر پر دلالت کرتے ہیں۔ صاحبِ فصوص (محی الدین ابن عربی) کہتے ہیں کہ سب کا انجام رحمت ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ رَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ [الأعراف: ١٥٦] [اور میری رحمت سب چیزوں کو گھیرے ہوئے ہے]۔

کفار کے لیے دوزخ کا عذاب تین حقبہ (ایک حقبہ اسی (۸۰) برس کی مدت) تک ثابت ہے۔ اس کے بعد کہتے ہیں کہ "آگ ان کے حق میں "بَرْدًا وَّسَلَامًا" [ٹھنڈی اور سلامتی والی] ہو

جائے گی، جیسا کہ ابراہیم ۔علی نبینا و علیہ الصلاۃ والسلام۔ پر ہوگئی تھی۔ وہ حق جل و علا کی وعید میں خلاف کرنے کو جائز سمجھتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ اہلِ دل (صوفیہ) میں سے کوئی بھی کفار کے دائمی عذاب کی طرف نہیں گیا ہے۔

اس مسئلے میں بھی وہ راہِ حق سے دور جا پڑے ہیں اور انھوں نے یہ نہیں جانا کہ مومنوں اور کافروں کے حق میں وسعتِ رحمت صرف اسی دنیا میں مخصوص ہے، لیکن آخرت میں کافروں کو رحمت کی بُو تک نہیں پہنچے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ اِنَّهٗ لَا يَاْيْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ [یوسف: ۸۷]

[بے شک اللہ کی رحمت سے سوائے کافروں کے کوئی مایوس (نا امید) نہ ہوگا]

جیسا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ﴿ وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ کے بعد فرمایا:

﴿ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ﴾
[الأعراف: ١٥٦]

[پھر میں اپنی رحمت کو ان لوگوں کے لیے لکھوں گا جو متقی ہیں اور زکات دیتے ہیں اور ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں]

شیخ (ابنِ عربی) نے آیت کے اول حصے کو تو پڑھ لیا اور آخری حصے سے کوئی سروکار نہ رکھا۔

حق تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ [الأعراف: ٥٦]

[بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت محسنین کے قریب ہے]

نیز آیتِ کریمہ:

﴿ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ﴾ [إبراهيم: ٤٧]

[پس ہرگز گمان نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرے گا)

بھی وعدہ خلافی کی خصوصیت پر دلالت نہیں کرتی اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس جگہ وعدہ خلافی نہ ہونے کا اقتصار و انحصار اس وجہ سے ہو کہ وعدے سے مراد رسولوں کی نصرت اور کفار پر ان کا غلبہ ہے اور یہ بات وعدہ و وعید دونوں کو متضمن ہے، یعنی رسولوں کے لیے وعدہ ہے اور کفار کے لیے وعید، لہٰذا

اس آیتِ کریمہ میں بھی وعدہ خلافی کی نفی ہوتی ہے اور خلفِ وعید کی بھی۔[1] لہٰذا آیتِ مذکورہ شیخ کے خلاف ہے تائید میں نہیں، اسی طرح وعید میں خلاف ہونا بھی وعدہ خلافی کے مانند جھوٹ کو مستلزم ہے اور یہ اس کے شایانِ شان نہیں ہے، کیونکہ جب وہ ازل ہی میں جانتا تھا کہ کفار کو دائمی عذاب نہیں دوں گا، تو پھر باوجود اس کے کسی مصلحت کی بنا پر اپنے علم کے خلاف فرما دیا کہ میں ان پر دائمی عذاب مسلط کر دوں گا۔ اس بات کو جائز کرنا نہایت ہی برا ہے:

﴿سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ﴾ [الصافات: ۱۸۰]

[تمھارا بڑی عزت والا رب ان باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں]

کفار کے لیے دائمی عذاب کے نہ ہونے پر اہلِ دل (صوفیہ) کا اجماع صرف شیخ کا اپنا کشف ہے اور کشف میں خطا اور غلطی کی بہت گنجایش ہے، خصوصاً وہ کشف جو مسلمانوں کے اجماع کے مخالف ہو، اس لیے اس کا کچھ اعتبار و اعتماد نہیں ہے۔

⑱ فرشتے، خداوند جل سلطانہٗ کے بندے ہیں جو گناہوں سے پاک اور خطا و نسیان سے بھی محفوظ ہیں، جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ [التحريم: ٦]

[اللہ تعالیٰ جو حکم ان کو کرتا ہے وہ اس میں اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم ہوتا ہے]

وہ کھانے پینے اور مرد و زن ہونے سے منزہ اور مبرا ہیں۔ قرآن مجید میں ان کے لیے مذکر ضمیروں کا استعمال اس اعتبار سے ہے کہ صنفِ ذکور کو صنفِ نسا کے مقابلے میں شرف حاصل ہے، چنانچہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے بھی مذکر ضمیروں کا استعمال کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بعض

---

[1] بلاشبہہ جمہور اہلِ علم کا یہی مسلک ہے۔ بعض حنفیہ جیسے ملا علی قاری وغیرہ خلفِ وعید کی طرف گئے ہیں اور کہتے ہیں:

و إني إذا أوعدته أو وعدته
فمخلف ميعادي و منجز موعدي

[اور بلاشبہہ جب میں اس سے وعدہ کروں یا اسے دھمکی دوں، تو میں اپنی دھمکی کی خلاف ورزی اور اپنے وعدے کو پورا کرنے والا ہوں]

لیکن یہ نزاع، نزاعِ لفظی کی طرف راجع ہو سکتا ہے۔ فتأمل. [مولف رحمہ اللہ]

فرشتوں کو رسالت کے لیے منتخب کیا ہے، جیسا کہ بعض انسانوں کو رسالت کی دولت سے مشرف فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ﴾ [الحج: ۵۷]

[اللہ تعالیٰ فرشتوں اور انسانوں میں سے بعض کو رسالت کے لیے منتخب فرما لیتا ہے]

جمہور علمائے اہلِ حق اس بات پر متفق ہیں کہ خاص فرشتے خاص انسانوں سے افضل ہیں اور جو کچھ اس فقیر پر ظاہر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ فرشتے کی ولایت نبی کی ولایت سے افضل ہے، لیکن نبوت و رسالت میں نبی کے لیے ایک ایسا درجہ ہے جس تک فرشتہ نہیں پہنچا ہے اور وہ درجہ عنصرِ خاک کی وجہ سے ظاہر ہوا ہے جو بشر کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس فقیر پر یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ کمالاتِ ولایت کمالاتِ نبوت کے مقابلے میں کسی گنتی میں نہیں ہیں، کاش کہ ان کے درمیان وہ نسبت ہی ہوتی جو قطرے کو دریائے محیط کے ساتھ ہے، مگر ایسا نہیں ہے۔ پس وہ فضیلت جو نبی کو نبوت کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے وہ اس فضیلت سے کئی گنا زائد ہے جو ولایت کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے، لہٰذا فضیلتِ مطلق انبیائے کرام علیہم السلام کا حصہ ہے اور جزئی فضیلت ملائکہ کرام کے لیے ہے۔ پس درست وہی ہے جو علمائے کرام رحمہم اللہ نے فرمایا ہے۔ اس تحقیق سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے درجات میں سے کسی نبی کے درجے تک کوئی ولی نہیں پہنچتا، بلکہ اس ولی کا سر ہمیشہ اس نبی کے قدم کے نیچے ہوتا ہے۔

ان مسائل میں سے ہر ایک مسئلے میں جن میں علما اور صوفیہ کا اختلاف ہے، جب اچھی طرح غور اور ملاحظہ کیا جاتا ہے تو حق علما کی جانب معلوم ہوتا ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ علما کی نظر نے انبیا علیہم السلام کی متابعت کے باعث نبوت کے کمالات اور اس کے علوم میں نفوذ کیا ہے اور صوفیہ کی نظر ولایت کے کمالات اور اس کے معارف تک محدود رہتی ہے۔ لہٰذا وہ علم جو مشکاتِ نبوت سے حاصل کیا جائے وہ لازماً اس علم سے جو مرتبہ ولایت سے اخذ کیا گیا ہو، کئی درجے زیادہ صحیح اور حق ہوگا۔

⑲ ایمان سے مراد، جو کچھ دینی امور سے متعلق ضرورت اور تواتر کے طریق پر ہم تک پہنچا ہے، اس کی دل سے تصدیق کرنا ہے، نیز زبان سے اقرار کرنا بھی ایمان کا رکن ہے، جیسا کہ علما نے کہا ہے، کیونکہ اس کے بغیر ایمان کے منہدم ہونے کا احتمال ہے۔ اس تصدیق کی علامت کفر، کافری اور اس چیز سے بیزار ہونا ہے جو کافری کے لوازم و خصائص ہیں، جیسے زنار باندھنا اور

اس کے مانند دوسری چیزوں سے بے زاری کا اظہار کرنا ہے۔ عیاذاً باللّٰہ۔ اگر کوئی اس تصدیق کا بھی دعوی کرے اور کفر سے بیزاری کا اظہار نہ کرے تو وہ دو دینوں کا تصدیق کرنے والا بن جائے گا جو ارتداد کے داغ سے داغ دار ہوگا اور حقیقت میں اس کا حکم منافق کا حکم ہے:

﴿ لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ وَ لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ ﴾ [النساء: ۱۴۳] [نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے]

لہٰذا ایمان کی تحقیق میں کفر سے بیزاری کا اظہار کیے بغیر چارہ نہیں۔ تبرا کا ادنی درجہ دل سے بے زاری کرنا ہے اور تبرا کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ دل اور جسم دونوں سے ہو۔ تبرا سے مراد حق جل و علا کے دشمنوں کے ساتھ دشمنی رکھنا ہے۔ خواہ دشمنی قلب سے ہو جب کہ ان سے نقصان پہنچنے کا خوف ہو، خواہ دل اور جسم دونوں سے ہو، جبکہ ان سے ضرر کا خوف نہ ہو۔ آیتِ کریمہ:

﴿ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ ﴾ [التوبۃ: ۷۳]

[اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ]

کیونکہ خدائے عزوجل کی محبت اور اس کے رسول ﷺ کی محبت ان کے دشمنوں کی دشمنی کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ اس جگہ یہ مصرع صادق آتا ہے:

تولی بے تبری نیست ممکن

[حُبِّ حق کے واسطے ہے غیر سے نفرت ضرور]

شیعہ نے جو یہ قاعدہ اہلِ بیت کی محبت اور دوستی میں جاری کیا ہے اور تینوں خلفا رضی اللہ عنہم اور ان کے علاوہ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم پر تبرا کرنا اہلِ بیت کی دوستی کی شرط قرار دیا ہے، نا مناسب ہے، کیونکہ دوستوں کی محبت کے لیے شرط ہے کہ ان کے دشمنوں سے تبرا کیا جائے، نہ کہ مطلق طور پر دشمنوں کے علاوہ دوسروں سے بھی ہو۔ کوئی عقل مند منصف اس بات کو تجویز نہیں کرتا کہ پیغمبر ﷺ کے اصحاب، پیغمبر ﷺ کے اہلِ بیت کے دشمن ہوں، حالانکہ ان اصحاب نے آپ ﷺ کی محبت میں اپنے اموال اور جانوں کو صرف کر دیا اور اپنی عزت و حکومت کو برباد کر دیا تو اہلِ بیت سے ان کی دشمنی کس طرح منسوب کی جا سکتی ہے، جبکہ نصِ قطعی سے رسول اللہ ﷺ کے قرابت داروں کی محبت ثابت ہے اور دعوت کی اجرت کو ان کی محبت قرار دیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی وَمَنْ یَّقْتَرِفْ حَسَنَةً

نَزِدْ لَهُ فِيهَا حُسْنًا﴾ [الشوریٰ: ٢٣]

[آپ ان سے کہہ دیجیے کہ میں تم سے اہلِ قرابت کی دوستی کے علاوہ کوئی بدلہ نہیں چاہتا، اور جو شخص ایک نیکی کمائے گا ہم اس کی نیکیوں میں اور زیادتی کر دیں گے]

ابراہیم خلیل ـ الرحمٰن علی نبینا و علیہ الصلاۃ والسلام ـ کو جو یہ بزرگی حاصل ہوئی اور شجرۂ انبیا بن گئے، یہ سب اللہ کے دشمنوں کے ساتھ علی الاعلان تبرا کرنے کی وجہ سے ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيٓ إِبْرَٰهِيمَ وَٱلَّذِينَ مَعَهُۥٓ إِذْ قَالُوا۟ لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءَٰٓؤُا۟ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ٱلْعَدَٰوَةُ وَٱلْبَغْضَآءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَحْدَهُۥٓ﴾ [الممتحنة: ٤]

[تمھارے لیے ابراہیم علیہ السلام میں اور ان لوگوں میں جو ان کے ساتھ تھے، ایک عمدہ نمونہ ہے جبکہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو ان سے بے زار ہیں اور ہم تمھارے منکر ہیں اور ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لیے عداوت اور بغض ظاہر ہو گیا، جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ]

اس فقیر کی نظر میں رضائے حق جل و علا حاصل کرنے کے لیے اس بیزاری کے اظہار کے برابر کوئی عمل نہیں ہے۔ یہ فقیر اپنے ذوق میں پاتا ہے کہ حضرت حق اللہ تعالیٰ کو کفر و کافری کے ساتھ ذاتی عداوت ہے اور یہ آفاقی آلہہ مثلاً لات وعزّیٰ اور ان کی پوجا کرنے والے ذاتی طور پر حق جل سلطانہ کے دشمن ہیں۔ دوزخ کا دائمی عذاب اس برے فعل کی سزا ہے اور خواہشِ نفسانی کے آلہہ اور تمام برے اعمال یہ نسبت نہیں رکھتے، کیونکہ ان کی عداوت اور غضب ذاتی نسبت سے نہیں ہے۔ اگر غضب ہے تو وہ صفات کی طرف منسوب ہے، اور اگر عقاب وعتاب (عذاب وغصہ) ہے تو افعال کی طرف راجع ہے، لہٰذا دوزخ کا دائمی عذاب اُن کے گناہوں کی سزا نہ ہوئی بلکہ حق تعالیٰ نے ان کی مغفرت کو اپنی مشیت اور ارادے پر منحصر رکھا ہے۔

جب کفر اور کافروں کے ساتھ ذاتی عداوت تحقیق ہو چکی تو لازماً رحمت و رافت جو صفاتِ جمال میں سے ہے، آخرت میں کافروں کو نہ پہنچے گی اور رحمت کی صفت ذاتی عداوت کو دور نہیں کرے گی،

کیونکہ جو چیز ذات کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اس چیز کی نسبت جو صفت سے تعلق رکھتی ہے، زیادہ قوی اور بلند ہے، لہٰذا مقتضائے صفت مقتضائے ذات کی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ یہ جو حدیثِ قدسی میں آیا ہے: «سَبَقَتْ رَحْمَتِي عَلٰى غَضَبِي»[1] [میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی] تو اس غضب سے مراد غضبِ صفائی سمجھنا چاہیے جو گناہ گار مومنوں کے ساتھ مخصوص ہے نہ کہ غضبِ ذاتی جو مشرکوں کے ساتھ مخصوص ہے۔

سوال اگر یہ کہا جائے کہ دنیا میں کافروں کو رحمت سے حصہ حاصل ہے، جیسا کہ تو نے مندرجہ بالا عبارت میں تحقیق کی ہے تو پھر دنیا میں رحمت کی صفت نے ذاتی عداوت کو کیسے دور کر دیا؟

جواب میں کہتا ہوں کہ دنیا میں خاص کافروں کو رحمت کا حاصل ہونا ظاہری طور پر اور صورت کے اعتبار سے ہے، لیکن حقیقت میں وہ ان کے حق میں استدراج اور کید ہے، ان کے حق میں آیتِ کریمہ:

﴿ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ۝ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ٥٥، ٥٦]

[کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم مال اور بیٹوں میں سے جن چیزوں کے ساتھ ان کی مدد کر رہے ہیں۔ ہم انھیں بھلائیاں دینے میں جلدی کر رہے ہیں؟ بلکہ وہ نہیں سمجھتے]

اور آیتِ کریمہ:

﴿ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ۝ وَ اُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ۝ اَوَ لَمْ يَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾

[الأعراف: ١٨٢، ١٨٣]

[ہم ضرور انھیں آہستہ آہستہ کھینچ کر لے جائیں گے، جہاں سے وہ نہیں جانتے اور میں انھیں مہلت دوں گا، بے شک میری تدبیر بہت مضبوط ہے۔ اور کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ ان کے ساتھی میں جنون کی کون سی چیز ہے؟ وہ تو ایک کھلم کھلا ڈرانے والے کے سوا کچھ نہیں]

ان ہی معنی پر شاہد ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧١١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥١)

فائدہ جلیلہ:

سوال دوزخ کا دائمی عذاب کفر کی جزا ہے۔ اگر پوچھیں کہ ایک شخص ایمان کے باوجود کفر کی رسمیں بجا لاتا اور اہلِ کفر کی رسموں کی تعظیم کرتا ہے علما اس پر کفر کا حکم لگاتے ہیں اور مرتد سمجھتے ہیں جیسا کہ ہندوستان کے اکثر مسلمان اس بلا میں مبتلا ہیں۔ لہٰذا چاہیے تو یہ کہ علما کے فتوے کے مطابق وہ شخص آخرت کے ابدی عذاب میں گرفتار ہو، حالانکہ صحیح احادیث میں آ چکا ہے کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو گا اس کو دوزخ سے باہر نکال لیں گے اور دائمی عذاب میں نہ رہنے دیں گے۔ آپ کے نزدیک اس مسئلہ کی کیا تحقیق ہے؟

جواب میں کہتا ہوں: اگر وہ شخص کافر محض ہے تو دائمی عذاب اس کا نصیب ہے، عیاذاً باللہ اور اگر کفر کی رسومات بجا لانے کے باوجود ذرہ برابر ایمان بھی رکھتا ہے تو وہ دوزخ کے عذاب میں مبتلا تو ہو گا لیکن اس ذرہ برابر ایمان کی برکت سے امید ہے کہ ابدی عذاب سے خلاصی ہو جائے گی اور دائمی گرفتاری سے نجات پا لے گا۔

ایک حکایت:

یہ فقیر ایک مرتبہ ایک شخص کی مزاج پرسی کے لیے گیا، جس کا معاملہ نزع وموت کے قریب پہنچ چکا تھا۔ جب فقیر اس کے حال پر متوجہ ہوا تو معلوم ہوا کہ اس کا قلب بہت زیادہ ظلمتوں میں گھرا ہوا ہے، ہر چند اُن ظلمتوں کے دور کرنے میں متوجہ ہوا، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا، پھر بہت زیادہ توجہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ ظلمات اور تاریکیاں صفاتِ کفر کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں، جو اس میں پوشیدہ ہیں اور یہ کدورتیں اس کے کفر اور اہلِ کفر کے ساتھ دوستی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں توجہ کرنے سے یہ ظلمتیں دور نہیں ہو سکتیں، بلکہ ان ظلمات کا تنقیہ دوزخ کے عذاب پر وابستہ ہے جو کفر کی جزا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ذرہ برابر ایمان رکھتا ہے جس کی برکت سے آخر کار اس کو دوزخ سے نکال لیا جائے گا۔ جب اس کے حال کو مشاہدہ کر لیا تو اب دل میں آیا کہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے یا نہیں؟ توجہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ نماز ادا کرنی چاہیے۔ لہٰذا وہ مسلمان جو ایمان کے باوجود اہلِ کفر کی رسومات بجا لاتے ہیں اور ہندوؤں کے تہواروں کے ایام کی تعظیم کرتے ہیں، ان کی نمازِ جنازہ پڑھنی چاہیے اور ان کو کفار کے ساتھ نہیں ملا دینا چاہیے، جیسا کہ آج کل علما کا معمول ہے، بلکہ امیدوار رہنا

چاہیے کہ آخر کار ایمان کی برکت کی وجہ سے دائمی عذاب سے اسے نجات حاصل ہو جائے گی۔ پس معلوم ہوا کہ اہلِ کفر کے لیے عفو اور مغفرت نہیں ہے، جیسے فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ ﴾ [النساء: ٤٨]

[بے شک اللہ اس کو نہیں بخشے گا جس نے اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا]

لیکن اگر وہ محض کافر ہے تو عذابِ ابدی اس کے کفر کی جزا ہے اور اگر وہ ذرہ برابر بھی ایمان رکھتا ہے تو اس کی جزا وقتی عذاب ہے۔ باقی تمام کبیرہ گناہوں کو اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو بخش دے اور چاہے عذاب دے۔ فقیر کے نزدیک عذابِ دوزخ خواہ وقتی ہو یا دائمی، کفر اور صفاتِ کفر کے ساتھ مخصوص ہے، جیسا کہ آگے تحقیق سے معلوم ہو گا۔ کبیرہ گناہ والے جن کے گناہ توبہ، شفاعت یا صرف عفو و احسان کے ساتھ مغفرت کے قابل نہیں ہوتے یا جن کبیرہ گناہوں کا کفارہ دنیاوی تکالیف یا سختیوں اور سکراتِ موت سے نہیں ہوا، امید ہے کہ ایسے لوگوں میں سے بعض کو قبر کا عذاب کفایت کرے گا اور بعض کے لیے قبر کی سختی کے باوجود قیامت کا خوف اور اس دن کی تکالیف کافی ہوں گی اور ان کے گناہوں میں سے کوئی گناہ باقی نہیں چھوڑیں گی جس کی وجہ سے دوزخ کے عذاب کے مستحق ہوں۔ چنانچہ آیتِ کریمہ:

﴿ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ ﴾ [الأنعام: ٨٢]

[وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو بڑے ظلم کے ساتھ نہیں ملایا، یہی لوگ ہیں جن کے لیے امن ہے]

اسی مضمون کی تائید کرتی ہے، کیونکہ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے۔ واللّٰہ سبحانه أعلم بحقائق الأمور كلها.

اگر یہ کہا جائے کہ کفر کے علاوہ بعض گناہوں کی سزا بھی عذابِ دوزخ آئی ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا ﴾ [النساء: ٩٣]

[جو شخص کسی مومن کو قصداً قتل کرے پس اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا]

نیز احادیث میں آیا ہے کہ جو شخص قصداً ایک فرض نماز قضا کرے تو اس کو ایک حقبہ (۸۰ سال) دوزخ میں عذاب دیا جائے گا، لہٰذا دوزخ کا عذاب صرف کافروں کے لیے ہی مخصوص نہ رہا،

جبکہ تم کہتے ہو کہ دوزخ کا عذاب کافروں کے لیے ہی مخصوص ہے؟

میں کہتا ہوں کہ یہ عذاب اس قاتل کے لیے مخصوص ہے جو قتل کو حلال جانے، کیونکہ قتل کو حلال جاننے والا کافر ہے، جیسا کہ مفسرین نے بیان کیا ہے۔ کفر کے علاوہ دوسرے گناہوں کے لیے بھی دوزخ کا عذاب آیا ہے۔ وہ بھی صفاتِ کفر کے شائبہ سے خالی نہیں ہے، جیسا کہ اس گناہ کو معمولی سمجھنا اور اس کے ارتکاب کے وقت بے پروائی کرنا اور شرعی اوامر و نواہی کو بے کار و خوار سمجھنا وغیرہ وغیرہ۔ حدیث میں ہے:

«شَفَاعَتِي لِأَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ أُمَّتِي»[1]

[میری شفاعت میری امت کے کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لیے ہوگی]

دوسری جگہ فرمایا ہے:

«أُمَّتِي أُمَّةٌ مَرْحُومَةٌ لَا عَذَابَ لَهَا فِي الْآخِرَةِ»[2]

[میری امت، امت مرحومہ (رحم کی ہوئی) ہے، اس کے لیے آخرت میں عذاب نہیں ہے]

نیز فرمانِ باری تعالیٰ:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ﴾ [الأنعام: ٨٢]

[وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو بڑے ظلم کے ساتھ نہیں ملایا، یہی لوگ ہیں جن کے لیے امن ہے]

بھی اس معنی کی تائید کرتا ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ مشرکوں کے بچوں کے احوال، پہاڑوں پر رہنے والے اور پیغمبروں کے زمانۂ فترت کے مشرکوں کا حال اس مکتوب (مکتوب ۲۵۹) میں، جو میرے فرزند محمد سعید رحمہ اللہ کے نام تحریر ہوا ہے، مفصل مذکور ہو چکا ہے، وہاں ملاحظہ کر لیں۔

ایمان کے کم اور زیادہ ہونے میں علما کا اختلاف ہے۔ امام اعظم کوفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "الإیمان لا یزید ولا ینقص" [ایمان زیادہ ہوتا ہے نہ کم]۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یزید و ینقص [ایمان زیادہ اور کم ہوتا ہے] اس میں شک نہیں کہ ایمان سے مراد تصدیق اور یقین قلبی ہے جس میں زیادتی اور کمی کی گنجایش نہیں، لہٰذا جو ایمان کی کمی اور زیادتی کو تسلیم کرے وہ دائرہ ظن میں

---

[1] سنن أبي داوٗد، رقم الحدیث (٤٧٣٩) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٤٣٥) سنن ابن ماجه (٤٣١٠)

[2] سنن أبي داوٗد، رقم الحدیث (٤٢٧٨)

داخل ہے نہ کہ یقین کے درجے میں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اعمالِ صالحہ کا بجا لانا اس یقین کو جلا بخشتا ہے اور غیر صالح اعمال کا بجا لانا یقین کو مکدر کر دیتا ہے۔ لہٰذا ایمان کی کمی اور زیادتی اعمال کے اعتبار سے اس یقین کو روشن کرنے میں ثابت ہوئی نہ کہ نفسِ یقین میں۔

ایک جماعت جس نے یقین کو جلا یافتہ اور روشن معلوم کیا تو اس نے اس یقین کی نسبت جو جلا یافتہ اور روشن نہیں، زیادت کہہ دیا۔ گویا بعض لوگوں نے غیر متجلی یقین کو یقین ہی نہیں سمجھا، انھی میں سے بعض نے متجلی کو یقین جان کر غیر متجلی کو ناقص کہہ دیا۔ دوسرے گروہ نے جو نظر کی تیزی اور بصیرت رکھتے تھے، دیکھا کہ یہ کمی اور زیادتی یقین کی صفات کی طرف راجع ہے نہ کہ نفسِ یقین کی طرف۔ اس وجہ سے انھوں نے یقین کو غیر زائد اور ناقص کہہ دیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے دو آئینے جو باہم برابر ہوں، لیکن روشنی اور نورانیت میں تفاوت رکھتے ہوں، جب ایک شخص اس آئینے کو دیکھتا ہے جس میں جلا اور روشنی زیادہ ہے اور وہ نور اور روشنی کی نمایندگی زیادہ کرتا ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے کہ یہ آئینہ دوسرے آئینے سے زیادہ روشن ہے، کیونکہ دوسرے آئینے میں جلا اور روشنی زیادہ نہیں ہے۔ دوسرا شخص یہ کہتا ہے کہ یہ دونوں آئینے کمی و زیادتی میں برابر ہیں، البتہ فرق صرف جلا کی نمایندگی کا ہے جو ان دونوں کی صفات ہیں۔ پس دوسرے کی نظر صائب ہے، وہ شے کی حقیقت تک رسائی رکھتا ہے اور پہلے شخص کی نظر ظاہر پر ہے، لہٰذا کوتاہ ہے جو صفت سے ذات تک نہیں پہنچی ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ﴾ [المجادلة: ١١]

[اللہ تم میں ایمان والوں کے اور ان لوگوں کے جن کو علم عطا ہوا ہے درجے بلند کر دے گا]

اس تحقیق سے جس کے اظہار کے لیے اس فقیر کو توفیق بخشی گئی، مخالفین کے اعتراضات جو انھوں نے ایمان کے زیادہ اور کم نہ ہونے پر کیے تھے زائل ہو گئے۔ عام مومنوں کا ایمان تمام وجوہ میں انبیا علیہم السلام کے ایمان کے مثل نہیں، کیونکہ انبیا علیہم السلام کا ایمان تمام تر جلا یافتہ و نورانی ہے جو کئی گنا (زیادہ) ثمرات و نتائج رکھتا ہے اُن عام مومنوں کے ایمان کے مقابلے پر جو اپنے اپنے درجات کے فرق کے لحاظ سے بہت سی ظلمتیں اور کدورتیں رکھتا ہے۔ اسی طرح ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایمان جو وزن میں تمام امت کے ایمان سے زیادہ ہے، اس کو بھی جلا اور نورانیت کے اعتبار سے سمجھنا چاہیے۔ اور زیادتی کو صفات کاملہ کی طرف منسوب کرنا چاہیے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ انبیا علیہم السلام نفسِ انسانیت میں

عام لوگوں کے ساتھ برابر ہیں اور حقیقت اور ذات میں سب باہم متحد ہیں، لیکن صفاتِ کاملہ کے اعتبار سے ان کو دوسرے انسانوں پر فضیلت حاصل ہے؟ جس میں صفاتِ کاملہ نہیں ہیں، گویا وہ اس نوع سے خارج اور اس کے فضائل و خصائص سے محروم ہے، لیکن اس تفاوت کے باوجود نفسِ انسانیت میں زیادتی و کمی واقع نہیں اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی انسانیت زیادتی اور نقصان کے قابل ہے۔ واللّٰه سبحانه الملهم للصواب.

اسی طرح بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ تصدیقِ ایمانی سے مراد ان کے نزدیک تصدیق منطقی ہے جو ظن اور یقین میں دونوں کو شامل ہے، اس صورت میں نفسِ ایمان میں کمی و زیادتی کی گنجایش ہے، لیکن صحیح یہی ہے کہ اس جگہ تصدیق سے مراد یقین و اذعانِ قلبی ہے نہ کہ عام معنی میں جس میں ظن بھی شامل ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: أنا مؤمن حقا [میں یقیناً مومن ہوں] امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "أنا مؤمن إن شاء اللّٰه تعالی" [میں مومن ہوں اگر اللہ تعالیٰ چاہے] حقیقت میں ان کا یہ اختلاف نزاعِ لفظی ہے۔ مذہبِ اول کا تعلق ایمانِ حال سے ہے اور مذہبِ ثانی کا تعلق مآل و عاقبتِ کار سے ہے، لیکن صورتِ استثنا سے پرہیز کرنا اولیٰ و احوط ہے، کما لا یخفی علی المنصف.[1]

⑳ اولیاء اللہ کی کرامات حق ہیں۔ ان سے بہ کثرت خوارقِ عادات واقع ہونے کی وجہ سے ان کی یہ بات دائمی عادت بن گئی ہے۔ کرامات کا انکار کرنے والا علم عادی اور ضروری کا انکار کرنے والا ہے۔ نبی کا معجزہ نبوت کے دعوے سے ملا ہوا ہوتا ہے اور ولی کی کرامت اس معنی میں خالی ہے، بلکہ اس نبی کی پیروی کے اعتراف کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے۔ فلا اشتباه بین المعجزة والكرامة كما زعم المنكرون.

㉑ خلفاے راشدین کے درمیان افضلیت کی ترتیب خلافت کی ترتیب کے مطابق ہے، لیکن شیخین کی افضلیت صحابہ اور تابعین کے اجماع سے ثابت ہوتی ہے، چنانچہ اکابرین ائمہ کی ایک جماعت نے، جن میں امام شافعی رحمہ اللہ بھی ہیں، اس بات کو نقل کیا ہے کہ امام ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت پھر عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت بقیہ تمام امت پر قطعی

---

[1] نہیں! بلکہ استثنا ہی اولیٰ واحوط ہے۔ اس کی تقریر امام غزالی اور دیگر علماے ربانی نے بجائے خود اچھی طرح کی ہے اور جب اس مسئلے میں نزاع لفظی ممکن ہے تو پھر عدمِ استثنا کی کوئی وجہ احوط و اولیٰ نہیں ہے، واللہ اعلم. [مولف رحمہ اللہ]

ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول ان کی خلافت کے زمانے میں آپ کے متبعین میں سے ایک جمِ غفیر کے سامنے تواتر کے ساتھ منقول ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ تمام امت میں افضل ہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ اس روایت کو اسی (۸۰) سے زیادہ راویوں نے علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ رافضیوں کا برا کرے، یہ کیسے جاہل ہیں؟[1]

امام بخاری نے علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

"خير الناس بعد النبي ﷺ أبو بكر ثم عمر ثم رجل آخر، فقال ابنه محمد بن الحنفية: ثم أنت فقال: إنما أنا رجل من المسلمين"[2]

[نبی مکرم ﷺ کے بعد تمام لوگوں میں بہتر ابو بکر رضی اللہ عنہ پھر عمر رضی اللہ عنہ ہیں پھر ایک اور شخص۔ (اس پر) آپ کے صاحبزادے محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ پھر آپ؟ (اس پر) علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تو مسلمانوں میں سے ایک فرد ہوں]

امام ذہبی رحمہ اللہ وغیرہ نے علی رضی اللہ عنہ سے بسند صحیح روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ لوگ مجھے ان دونوں (شیخین) پر فضیلت دیتے ہیں، لہٰذا جو بھی مجھ کو ان پر فضیلت دیتا ہے وہ جھوٹا ہے اور اس کے لیے وہ سزا ہے جو ایک مفتری کی ہوتی ہے۔[3] دارقطنی نے علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ میں جس کو پاؤں گا کہ وہ ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ پر مجھے فضیلت دیتا ہے تو میں اس کو اتنے کوڑے لگاؤں گا جتنے ایک مفتری کو لگنے چاہییں۔[4] اس قسم کی اور بہت سی روایتیں خود علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے علاوہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کثرت اور تواتر سے آئی ہیں جس میں کسی کو انکار کی مجال نہیں، حتی کہ عبدالرزاق جو اکابر شیعہ سے ہے،[5] کہتا ہے:

"أفضل الشيخين بتفضيل علي إياهما على نفسه وإلا لما فضلتهما كفى

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٦٨)

[2] الصواعق المحرقة لابن حجر الهيتمي المكي (١/ ١٢٤) نیز دیکھیں: سير أعلام النبلاء (١٦/ ٨٦)

[3] تاريخ الإسلام للذهبي (٣/ ١١٥)

[4] الصواعق المحرقة (١/ ١٢٤)

[5] امام عبدالرزاق بن ہمام صنعانی رحمہ اللہ کا شیعہ ہونا درست نہیں، بلکہ وہ اکابر ائمہ اہلِ سنت میں سے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: سير أعلام النبلاء (٤/ ٥٦٣)

بي وزرا أن أحبه ثم أخالفه"[1]

[میں شیخین کو اس لیے فضیلت دیتا ہوں کہ خود علی رضی اللہ عنہ نے اپنے اوپر اُن کو فضیلت دی ہے، ورنہ میں ان (شیخین) کو کبھی فضیلت نہ دیتا۔ میرے نزدیک یہ گناہ ہے کہ میں اُن سے محبت کا دعویٰ کروں اور پھر ان کے اقوال کی مخالفت کروں]

یہ سب روایات ''صواعق محرقہ''[2] سے لی گئی ہیں۔

اب رہی عثمان رضی اللہ عنہ کی علی رضی اللہ عنہ پر فضیلت تو اکثر علماے اہلِ سنت اس مسلک پر ہیں کہ شیخین کے بعد عثمان رضی اللہ عنہ افضل ہیں پھر ان کے بعد علی رضی اللہ عنہ۔ ائمہ اربعہ مجتہدین کا مذہب بھی یہی ہے۔ بعض لوگوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کی فضیلت کے بارے میں امام مالک رحمہ اللہ سے جو توقف نقل کیا ہے، اس کے متعلق قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ امام مالک نے اس توقف سے عثمان رضی اللہ عنہ کی فضیلت کی طرف رجوع کر لیا ہے۔ قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ ان شاء اللہ یہی اصح ہے۔ اسی طرح وہ توقف جو بعض نے امام اعظم رحمہ اللہ کی اس عبارت سے سمجھا ہے:

''من علامات السنة والجماعة تفضيل الشيخين ومحبة الختنين''

[اہلِ سنت والجماعت کی علامت میں سے یہ بھی ہے کہ شیخین کو فضیلت دی جائے اور ختنین (دونوں داماد عثمان و علی رضی اللہ عنہما) سے محبت کی جائے]

اس فقیر کے نزدیک اس عبارت کے اختیار کرنے میں ایک دوسرا محل ہے کہ حضرات ختنین کی خلافت کے زمانے میں بہت زیادہ فتنے و فساد پیدا ہو گئے تھے جس کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں بہت کدورت پیدا ہو گئی تھی۔ اس لیے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اس بات کو مدنظر رکھ کر ان کے حق میں محبت کا لفظ اختیار کیا ہے اور ان کی دوستی کو علاماتِ اہلِ سنت سے قرار دیا ہے، بغیر اس امر کے کہ کسی قسم کا توقف ملحوظ ہو اور کیسے توقف ہو سکتا ہے، کیونکہ حنفیوں کی کتابیں ایسے مضامین سے بھری پڑی ہیں کہ ان خلفاے راشدین کی فضیلت ان کی ترتیب، ترتیب خلافت کے مطابق ہے۔

مختصر یہ کہ شیخین کی افضلیت یقینی ہے اور عثمان رضی اللہ عنہ کی افضلیت اُن سے کم درجے کی ہے۔

---

[1] سير أعلام النبلاء (۹/۵۷۳)

[2] الصواعق المحرقة (۱/۱۲۵) اس سے مراد امام شہاب الدین احمد بن حجر الہیتمی المکی کی تصنیف "الصواعق المحرقة في الرد على أهل البدعة والزندقة" ہے۔

لیکن زیادہ احتیاط اسی میں ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ کی افضلیت کے منکر کو بلکہ شیخین کی افضلیت کے منکر کے لیے بھی ہم کفر کا حکم نہ لگائیں، البتہ ان کو بدعتی و گمراہ جانیں، کیونکہ ان کی تکفیر میں علما کا اختلاف ہے اور اس اجماع کے قطعی ہونے میں بہت قیل وقال ہے، اس کا منکر بدنصیب یزید کا ساتھی ہے۔ اسی احتیاط کی بنا پر یزید کے لعن طعن کرنے میں توقف کیا ہے۔ وہ ایذا جو پیغمبر علیہ السلام کو خلفاے راشدین کو ایذا رسانی کی جہت سے پہنچی ہے وہ ایسی ہے جیسی حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ کو ایذا رسانی کی جہت سے پہنچی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِيْ أَصْحَابِيْ لَاتَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضاً مِنْ بَعْدِيْ فَمَنْ أَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّيْ أَحَبَّهُمْ وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِيْ أَبْغَضَهُمْ وَمَنْ آذَاهُمْ فَقَدْ آذَانِيْ وَمَنْ آذَانِيْ فَقَدْ آذَى اللّٰهَ وَمَنْ آذَى اللّٰهَ فَيُوْشِكُ أَنْ يَّأْخُذَهُ»[1]

[میرے اصحاب کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ میرے بعد ان کو نشانۂ ملامت نہ بنانا، جس نے ان کو دوست رکھا۔ اس نے گویا میری محبت کے باعث ان کو دوست رکھا اور جس نے ان سے بغض رکھا اس نے گویا میری دشمنی کی وجہ سے ان سے بغض رکھا۔ جس نے ان کو ایذا دی، اس نے گویا مجھ کو ایذا دی اور جس نے مجھ کو ایذا دی، اس نے گویا اللہ تعالیٰ کو ایذا دی اور جس نے اللہ تعالیٰ (اور رسول علیہ الصلاۃ والسلام) کو ایذا دی، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے مواخذہ کرے گا]

اللہ تعالیٰ عزوجل نے فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ﴾ [الأحزاب: ٥٧]

[بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں، اُن پر دنیا اور آخرت میں اللہ کی لعنت ہے]

جو کچھ مولانا سعد الدین نے شرح عقائد نسفی میں اس فضیلت کے بارے میں انصاف سمجھا ہے وہ انصاف سے دُور ہے اور جو تردید انھوں نے کی ہے وہ سراسر لا حاصل ہے، کیونکہ علما کے نزدیک یہ بات مقرر ہے کہ اس جگہ افضلیت سے وہ مراد ہے جو خداے جل و علا کے نزدیک کثرت

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٦٢)

ثواب کے اعتبار سے ہے، نہ کہ وہ افضلیت جو فضائل و مناقب بکثرت ظاہر ہونے کے اعتبار سے ہو، کیونکہ ایسی فضیلت عقلمندوں کے نزدیک اعتبار کے لائق نہیں ہے۔

سلفِ صحابہ و تابعین نے جس قدر فضائل و مناقب حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے نقل کیے ہیں وہ اور کسی صحابی کی نسبت منقول نہیں، حتی کہ امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا: ''جو فضائل علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں آئے ہیں، وہ کسی اور صحابی کی نسبت نہیں آئے۔'' اس کے باوجود وہ تینوں خلفا کی فضیلت کے بارے میں حکم کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ افضلیت کی وجہ ان فضائل و مناقب کے علاوہ کچھ اور ہے، اُس افضلیت کی اطلاع دولت وحی کا مشاہدہ کرنے والوں کو میسر ہے جنھوں نے صریح طور پر یا قرائن سے معلوم کیا ہے اور وہ خود پیغمبر علیہ السلام کے صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ لہٰذا جو کچھ شارح عقائد نسفی نے بیان کیا ہے کہ افضلیت سے مراد کثرتِ ثواب ہے تو وہ توقف کی گنجایش سے ساقط ہے. کیونکہ توقف کے لیے اس وقت گنجایش ہوتی ہے جبکہ اس افضلیت کو صاحبِ شریعت سے صراحتاً یا دلالتاً معلوم نہ کر لیا ہو اور جب معلوم کر لیا ہے تو پھر توقف کیوں اور اگر معلوم نہیں کیا تو افضلیت کا حکم کیوں کریں؟ جو شخص سب کو برابر سمجھتا ہے اور ایک دوسرے پر افضلیت دینا بے کار سمجھتا ہے وہ فضول اور لا حاصل ہے۔ وہ عجیب احمق ہے جو اہلِ حق کے اجماع کو فضول و بے کار سمجھتا ہے۔ شاید فضل کا لفظ اس کو فضولی کی طرف لے گیا ہے۔ جو کچھ صاحبِ فتوحاتِ مکیہ کہتے ہیں کہ ان کی خلافت کی ترتیب کا سبب ان کی عمروں کی مدتوں سے ہے۔ یہ بات ان کی فضیلت میں مساوات پر دلالت نہیں کرتی، کیونکہ خلافت کا معاملہ دوسرا ہے اور افضلیت کی بحث دوسری۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو یہ اور اس قسم کی دوسری باتیں جو ان (شیخ اکبر) کی شطحیات سے ہیں ان کی شان کے لائق نہیں ہیں، ان کے اکثر کشفیہ معارف جو اہلِ سنت کے علوم سے جدا واقع ہوئے ہیں، وہ صواب سے دور ہیں، لہٰذا ایسی باتوں کی متابعت وہی شخص کر سکتا ہے جس کا دل بیمار ہے یا وہ مقلدِ محض ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان جو لڑائی جھگڑے واقع ہوئے، ان کی اچھے معنوں میں تاویل کرنی چاہیے اور نفسانی خواہش و تعصب سے دور رکھنا چاہیے تفتازانی رحمہ اللہ علی کرم اللہ وجہ کی افراط محبت کے باوجود فرماتے ہیں: ''جو جنگ و جدال صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان واقع ہوئے ہیں وہ خلافت کا نزاع نہ تھا بلکہ اجتہادی خطا کے سبب سے تھا۔'' شرح عقائد کے حاشیہ خیالی میں ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر نے علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت سے بغاوت کی اور ساتھ ہی اس امر کا اعتراف بھی کیا کہ علی رضی اللہ عنہ تمام

اہلِ زمانہ سے افضل ہیں اور وہ امامت کے ان سے زیادہ حق دار ہیں۔ ایک شبہے کی وجہ سے کہ علی رضی اللہ عنہ نے، عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص نہ لیا تھا۔ حاشیۂ قرہ کمال (الدین اسمعیل) میں علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہمارے جن بھائیوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی وہ فاسق و کافر نہیں ہیں، کیونکہ ان کے لیے تاویل ہے اور اس میں شک نہیں کہ خطاے اجتہادی ملامت اور طعن و تشنیع سے بہت دور ہے۔

خیر البشر علیہ السلام کے حقوقِ صحبت کی رعایت کر کے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نیکی کے ساتھ یاد کرنا چاہیے اور پیغمبر علیہ السلام کی دوستی کی وجہ سے ان کو دوست رکھنا چاہیے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ أَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّي أَحَبَّهُمْ وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِي أَبْغَضَهُمْ»[1]

[جس نے اُن (صحابہ رضی اللہ عنہم) کو دوست رکھا، اس نے میری محبت کی وجہ سے ان کو دوست رکھا اور جس نے ان سے بغض رکھا اُس نے میرے ساتھ بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھا]

یعنی وہ محبت جو میرے اصحاب سے متعلق کی گئی ہے ایسی ہی محبت ہے جیسی مجھ سے متعلق ہے اور اسی طرح وہ بغض جو ان سے تعلق رکھتا ہے، ایسا ہی بغض ہے جیسا کہ مجھ سے کیا جائے۔

ہم کو حضرت امیر (علی رضی اللہ عنہ) کے ساتھ جنگ کرنے والوں سے کوئی دوستی نہیں ہے، بلکہ مناسب ہے کہ ہم ان سے بیزار ہوں، لیکن چونکہ وہ سب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابِ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، لہٰذا ہم کو اُن کے ساتھ محبت رکھنے کا حکم ہے اور ہم اُن کے ساتھ بغض و ایذا رسانی سے روک دیے گئے ہیں۔ اس لیے لازماً ہم بھی پیغمبر علیہ السلام کی دوستی کی وجہ سے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو دوست رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ بغض و ایذا رسانی سے دور رہتے ہیں، کیونکہ ان سے بغض و ایذا کا معاملہ سرور عالم تک پہنچتا ہے، لیکن جو حق پر ہے ہم اس کو حق والا ہی کہیں گے اور مخطی کو مخطی۔ امیر (علی رضی اللہ عنہ) حق پر تھے اور ان کے مخالف خطا پر۔ اس سے زیادہ کہنا فضول ہے۔ انتهى كلام المجدد رحمه الله والله أعلم.

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٦٢)

چودھویں فصل

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے "حسن عقیدہ"[1] کا بیان

حمد ونعت کے بعد شاہ صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ میں اللہ اور ملائکہ، جن اور انس کو جو حاضر ہیں، گواہ کرتا ہوں کہ تہ دل سے میرا یہ عقیدہ ہے:

① اس جہاں کا ایک قدیم صانع ہے جو ہمیشہ تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کا وجود واجب اور اس کا عدم محال ہے۔ وہ کبیر ومتعال اور تمام صفاتِ کمال سے متصف ہے۔ وہ ساری صفاتِ نقص و زوال سے منزہ ہے، ساری مخلوقات کا وہی خالق ہے، جمیع معلومات کا عالم ہے، سارے ممکنات پر قادر ہے، جمیع کائنات کا مرید ہے، وہ سمیع وبصیر ہے، اس کا کوئی شبہ ہے نہ ضد اور نہ مثل۔

② اس کے وجوبِ وجود میں کوئی شرکت رکھتا ہے نہ استحقاق عبادت اور خلق و تدبیر میں کوئی اس کا شریک ہے۔ عبادت یعنی انتہا درجے کی تعظیم کا وہی مستحق ہے، وہی مرض سے شفا دیتا، رزق عطا کرتا اور ضرر کو دور کرتا ہے نہ کہ کوئی اور۔ جب وہ کسی چیز کو "کن" کہتا ہے تو وہ ہو جاتی ہے، لیکن اس معنی میں نہیں کہ یہ عام ظاہری اور عادی سبب کی طرح ہوتا ہے، جس طرح لوگ کہا کرتے ہیں کہ طبیب نے بیمار کو شفا دی اور امیر نے لشکر کو رزق دیا، کیونکہ یہ اور بات ہے، اگرچہ لفظ میں مماثلت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی ظہیر یعنی پشت پناہ نہیں ہے، وہ اپنے غیر میں حلول کرتا ہے اور نہ کسی غیر کے ساتھ متحد ہوتا ہے۔ اس کی ذات کے ساتھ کوئی حادث قائم ہے اور نہ اس کی ذات میں کسی طرح کا حدوث ہے۔ حدوث تو متعلقاتِ صفات کے ساتھ تعلق صفات میں ہے، اسی سے افعال وجود پذیر ہوتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تعلق بھی حادث نہیں ہے، بلکہ حادث تو معلَّق ہے۔ اسی جگہ سے متعلقات کے تفاوت کے حسب حال احکامِ تعلق کا ظہور

[1] اس سے مراد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی کتاب "الاعتقاد الصحیح" ہے، جس کی مولف رحمہ اللہ نے "الانتقاد الرجیح" کے نام سے شرح لکھی ہے۔

متفاوت ہوا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام وجوہ سے حدوث اور تجدد سے بری ہے۔ وہ جوہر ہے عرض ہے اور نہ جسم ہے۔ وہ حیز میں ہے اور نہ کسی جہت میں۔ یہاں اور وہاں کے الفاظ سے اس کی طرف اشارہ نہیں ہوسکتا۔[1] حرکت وانتقال اس پر وارد ہوتے ہیں اور نہ اس کی ذات وصفت میں تبدل یا جہل یا کذب آتا ہے۔ وہ عرش کے اوپر اسی طرح ہے جس طرح اس نے اپنے نفس کا وصف بیان کیا ہے، لیکن اس کا عرش کے اوپر ہونا تحیز، جہت کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس تفوق اور استوا کی حقیقت صرف اللہ تعالیٰ اور وہ لوگ جانتے ہیں جو علم میں راسخ ہیں اور جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس سے علم دیا ہے۔

③ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مومنوں کو سر کی آنکھوں سے دو طرح پر نظر آئے گا۔ ایک یہ کہ ان پر ایک تام اور بلیغ انکشاف ہوگا جو نری عقلی تصدیق سے زیادہ ہے، تو گویا یہ آنکھ ہی سے دیکھنا ہوا، مگر یہ رویت آمنے سامنے ہونے جہت، رنگ اور شکل کے بغیر ہوگی، چنانچہ معتزلہ وغیرہ رویت کی اس صورت کے قائل ہیں۔ پس یہ حق ہے اور معتزلہ کی خطا صرف اتنی بات میں ہے کہ وہ رویت کی تاویل صرف اسی معنی کے ساتھ کرتے ہیں یا یوں کہیے کہ وہ رویت کو اسی معنی

---

[1] بارہا گزر چکا ہے کہ یہ الفاظ متکلمین کے تراشے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سلفِ امت اہلِ حدیث کو ان الفاظ کے استعمال سے محفوظ رکھا ہے۔ وہ لوگ نہ جوہر کو جانتے ہیں نہ عرض کو پہچانتے ہیں۔ وہ تو تنزیہ کے لیے صرف: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ اور ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ [الشوریٰ: ۱۱] پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ ہاں "جہت" کا لفظ صراحتاً کسی دلیل میں نہیں آیا ہے، اسی وجہ سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اس لفظ کے استعمال سے منع کیا اور اس لفظ کو بدعت قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ علو، فوق اور استوا کے الفاظ کتاب وسنت میں ثابت ہیں، جن سے ذاتِ باری تعالیٰ کے لیے جہتِ علو ثابت ہوتی ہے۔

گو اللہ تعالیٰ کی طرف اینجا اور آنجا جیسے الفاظ کے ساتھ اشارہ نہیں ہوسکتا ہے، کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کا مکان میں ہونا لازم آتا ہے، مگر حدیثِ جاریہ میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے اس لونڈی سے سوال کیا: «أَيْنَ اللّٰهُ؟» [اللہ تعالیٰ کہاں ہیں؟] تو اس نے جواب میں کہا تھا: «فِي السَّمَاءِ» [آسمان میں] اس پر رسول اللہ ﷺ نے اسے ایمان والی قرار دیا تھا۔ اسی طرح حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے روبرو آپ ﷺ نے انگلی کے ذریعے سے آسمان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: «اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ» [اے اللہ! گواہ رہنا] یہ حدیث کیف ومکان کے بغیر علو، فوق اور استوا کے ثبوت پر دلالت کرتی ہے۔ ہمارے لیے اس کی حدود وقیود میں رہنا سلامتی کا موجب ہے اور الفاظ مبتدعہ سے احتراز کرنا لازم ہے۔ واللہ اعلم۔ [مولف رحمہ اللہ]

میں منحصر سمجھتے ہیں۔ رویتِ الٰہی کی دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت سی صورتوں میں متمثل ہو، جس طرح حدیث میں آیا ہے۔ اس وقت اہل ایمان اسے شکل، لون اور آمنے سامنے اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے، جس طرح خواب میں واقع ہوتا ہے اور رسول ﷺ نے اس کی خبر دی ہے:

«رَأَيْتُ رَبِّي فِي أَحْسَنِ صُورَةٍ»[1]

[میں نے اپنے رب تعالیٰ کو بہترین صورت میں دیکھا]

پس جو کچھ وہ دنیا میں خواب کے اندر دیکھتے ہیں، وہاں اسے حقیقتاً دیکھیں گے۔ ہم رویت کی انھی دو وجہوں کو سمجھتے اور اعتقاد کرتے ہیں۔ اگر اللہ اور رسول کی مراد اس رویت سے مذکورہ دو وجہوں کے سوا کچھ اور ہو تو ہم ایمان لاتے ہیں، اگرچہ ہمیں بعینہٖ وہ مراد معلوم نہ ہو۔

④ اللہ تعالیٰ نے جو چاہا سو ہوا اور جو نہ چاہا نہ ہوا۔ سارے کفر اور معاصی اسی کی خلق اور ارادے سے ہوتے ہیں نہ کہ اس کی رضا سے۔ وہ اپنی ذات وصفات میں کسی چیز کا محتاج ہے اور نہ کوئی اس پر حاکم ہے اور نہ کوئی چیز کسی کے واجب کرنے سے اس پر واجب ہوتی ہے۔ ہاں وہ وعدہ کر کے پورا کرتا ہے، جس طرح حدیث میں آیا ہے:

«فَهُوَ ضَامِنٌ عَلَى اللّٰهِ»[2] [پس وہ اللہ کے ذمے ہے]

اس کے سارے افعال حکمت کو متضمن ہیں، چنانچہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا﴾ [المؤمنون: ١١٥]

[تو کیا تم نے گمان کر لیا کہ ہم نے تمھیں بے مقصد ہی پیدا کیا ہے؟]

وہ افعال ایسی مصلحت کلیہ کو متضمن ہیں جسے بس وہی جانتا ہے۔ اس پر کسی جزئی خاص کا لطف یا اصلح خاص واجب نہیں۔ اس سے کوئی قبیح فعل صادر ہوتا ہے اور نہ وہ اپنے فعل وحکم میں کسی جور وظلم کی طرف منسوب ہو سکتا ہے، بلکہ خلق وامر میں حکمت کی رعایت فرماتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ کسی چیز سے اپنے نفس کو مستکمل کرتا ہو یا اسے کوئی حاجت وغرض لگی ہو، کیونکہ یہ ضعف اور قبح ہے۔ اس کے سوا کوئی حاکم نہیں ہے۔ عقل کو اشیا کے حسن وقبح میں کوئی حکم اور دخل نہیں ہے اور نہ اس بات میں کوئی دخل ہے کہ ثواب وعقاب میں فعل سبب کیوں ہے، بلکہ اشیا کا حسن وقبح اللہ تعالیٰ کی قضا وحکم سے

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٣٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٩٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٢٠) سنن ابن ماجه (٢٧٥٤)

ہے، اسی نے لوگوں کو مکلف ٹھہرایا ہے۔ پھر ایسے ہوتا ہے کہ عقل کسی بات کی وجہ سے مصلحت کو پا لیتی ہے اور ثواب وعقاب کے لیے اس کی مناسبت کو سمجھ جاتی ہے۔ بعض امور ایسے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے بتائے بغیر دریافت نہیں ہو سکتے۔

⑤ اللہ تعالیٰ کی ہر صفت حسب تعلق وتجدد واحد بالذات اور غیر متناہی ہے۔ اگر یہ تجدد ہے تو مذکورہ معنی کے ساتھ تعلق میں ہے۔

اینجا ز فیض پیر مغان بزم وحدت ست
در پردہ دار دیدۂ کثرت نمائی را

[اس جگہ پیر طریقت کے فیض سے نگران کی کثرت نما آنکھ میں وحدت کی بزم جمی ہوئی ہے]

⑥ اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں، جو بلند اور مقرب ہیں۔ وہ کتابتِ اعمال اور بندوں کی ہلاکتوں سے حفاظت کرنے کی ذمے داری پر مقرر ہیں۔ وہ نیکیوں کی طرف بلاتے ہیں، وہ بندے کو خیر اور بھلائی کی رغبت دلاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے مقام معلوم ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے، بلکہ اس کا جو بھی حکم ہوتا ہے، اسے بجا لاتے ہیں۔

⑦ شیاطین بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، یہ بنی آدم کو شر اور برائی کا وسوسہ ڈالتے ہیں۔

⑧ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جسے اس نے بطور وحی ہمارے رسول ﷺ پر نازل فرمایا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ﴾ [الشوریٰ: ۵۱]

[اور کسی بشر کے لیے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے، یا پردے کے پیچھے سے، یا یہ کہ وہ کوئی رسول بھیجے، پھر اپنے حکم کے ساتھ وحی کرے جو چاہے]

وحی کی حقیقت یہی ہے۔

⑨ اللہ تعالیٰ کے اسما وصفات میں الحاد اور تحریف کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ ان کا اطلاق شرع پر موقوف ہے۔

⑩ معاد جسمانی حق ہے۔ اجساد میں روح لوٹائی جائے گی اور وہ اکٹھے ہوں گے۔ وہ بدن یہی بدن

ہوں گے جو شرعاً اور عرفاً تھے، اگرچہ طویل یا قصیر ہوں، جس طرح یہ بیان ہوا ہے کہ کافر کا دانت احد پہاڑ کے برابر ہو گا۔ یا وہ بدن پہلے سے زیادہ لطیف ہوں گے جس طرح اہلِ جنت کی صفت میں بیان ہوا ہے۔ یہ ویسی بات ہے جیسے بچہ جوان بوڑھا ہو جاتا ہے، گو اس میں ہزار بار اجزا کا تبدل ہو۔

⑪ مجازات، حساب اور پل صراط حق ہیں۔ جنت اور جہنم بھی حق ہیں۔ یہ دونوں آج کے دن موجود ہیں اور باقی رہیں گی، لیکن نص میں ان کے مکان کی تصریح نہیں آئی ہے، بلکہ جس جگہ اللہ تعالیٰ نے چاہا وہاں وہ موجود ہیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور عوالم کا کچھ احاطہ نہیں ہے۔

⑫ کبیرہ گناہ کا مرتکب مسلمان ہمیشہ دوزخ میں نہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾ [النساء: ۳۱]

[اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچو گے جن سے تمھیں منع کیا جاتا ہے تو ہم تم سے تمھاری چھوٹی برائیاں دور کر دیں گے]

کبائر سے عفو کرنا اور انھیں بخش دینا جائز ہے۔ پس اتنی بات ہے کہ دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے افعال دو طرح پر ہوا کرتے ہیں۔ ایک مخلوق اور بندوں کے درمیان جاری سنت کے موافق اور دوسرے خرق عادت کے طور پر۔ پس توبہ کے بغیر مرنے والے کبائر کے مرتکب شخص کو بخش دینا بطور خرق عادت کے جائز ہے۔ ظاہری نظر میں جو نصوص متعارض نظر آتی ہیں، ان کے درمیان یہی تطبیق ہے۔

⑬ جس کسی کے لیے اللہ تعالیٰ اجازت دے گا، اس کے حق میں شفاعت کا ہونا حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا اپنی امت کے اہلِ کبائر کے لیے شفاعت کرنا ثابت ہے۔ آپ ﷺ پہلے شفاعت کرنے والے ہیں جن کی شفاعت قبول ہو گی۔ جہاں شفاعت کی نفی آئی ہے اس سے مراد وہ شفاعت ہے جو اللہ تعالیٰ کے اذن اور رضا کے بغیر ہو گی۔

⑭ مومن کے لیے قبر کا عذاب، قبر کی تنعیم اور منکر ونکیر کا سوال حق ہے۔ رسولوں کا مخلوق کی طرف مبعوث ہونا اور اللہ تعالیٰ کا رسولوں کی زبانی اپنے بندوں کو امر و نہی کا مکلف ٹھہرانا حق اور ثابت ہے۔

⑮ اللہ تعالیٰ کے رسول چند امور میں ممتاز ہیں جو امور ان کے علاوہ دوسروں میں اکٹھے موجود نہیں ہوتے ہیں اور وہی امور ان کی نبوت پر دلیل ہیں، جیسے خرق عادات یعنی معجزات اور

سلامتِ فطرت اور کمال اخلاق وغیرہ۔

⑯ انبیا علیہم السلام کفر اور کبائر سے محفوظ ہیں اور فواحش اور قبائح پر اصرار کرنے سے معصوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ تین طرح پر ان کی عصمت فرماتا ہے۔ ایک یہ کہ انھیں سلامتِ فطرت اور اخلاق کے کمالِ اعتدال پر پیدا کرتا ہے اور انھیں سرے ہی سے معاصی میں کوئی رغبت نہیں ہوتی، بلکہ وہ معاصی سے متنفر رہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ انھیں اس بات کی وحی کرتا ہے کہ معاصی پر عقاب کیا جاتا ہے اور طاعات پر ثواب دیا جاتا ہے، چنانچہ یہ وحی انھیں معاصی سے روکتی اور باز رکھتی ہے۔ تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کوئی لطیفہ غیبی پیدا فرما کر ان رسولوں اور ان معاصی کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، جس طرح یوسف علیہ السلام کے قصے میں یعقوب علیہ السلام کی صورت ظاہر ہوئی تھی۔[1]

⑰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور ان کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ ان کی دعوت سارے انسانوں اور جنوں کے لیے عام ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس خاصے اور دیگر خواص کی وجہ سے انبیا میں سب سے افضل نبی اور رسول ہیں۔

⑱ اولیا کی کرامات حق ہیں۔ اولیا وہ مومن ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کے عارف اور اپنے ایمان میں محسن ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، اس کا اکرام کرتا ہے، چنانچہ اس کا ارشاد ہے:

﴿وَ اللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾ [البقرة: ١٠٥]

[اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے خاص کر لیتا ہے]

⑲ ہم عشرہ مبشرہ، فاطمہ، خدیجہ، عائشہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کے لیے جنت اور خیر کی گواہی دیتے ہیں اور تمام صحابہ واہل بیت کی توقیر و تعظیم کرتے ہیں اور اسلام میں ان کے بہت بڑے مقام کے معترف ہیں۔ اسی طرح ہم اہلِ بدر اور اہلِ بیعت رضوان کے لیے جنت کی شہادت دیتے ہیں۔

⑳ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ امامِ حق ہیں۔ پھر عمر، عثمان اور پھر علی رضی اللہ عنہم ہیں اور اس

[1] قرآن کریم میں فقط اتنا آیا ہے: ﴿لَوْ لَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ [يوسف: ٢٤] [اگر یہ نہ ہوتا کہ اس نے اپنے رب کی دلیل دیکھ لی] رہی یہ بات کہ وہ "برہان" یعقوب علیہ السلام کی صورت تھی یا کوئی اور چیز تو کسی حدیث میں اس کا ذکر نہیں آیا ہے۔ ہمارے لیے بس رویتِ برہان پر ایمان لانا کافی ہے، اس کی تعیینِ مراد کی کوئی حاجت وضرورت نہیں۔ كما قال الشوكاني رحمه الله في فتح القدير. [مولف رحمہ اللہ]

کے بعد خلافت اپنے اختتام کو پہنچ گئی اور بادشاہی کا آغاز ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ سب سے افضل انسان ہیں۔ ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اس طرح من جمیع الوجوہ افضلیت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ فضیلتِ نسب، شجاعت، قوت، علم اور اس جیسی دیگر خوبیوں اور کمالات کو بھی عام اور شامل ہو، بلکہ اس فضیلت سے مراد نفعِ اسلام میں زیادہ ہونا ہے۔ اشاعتِ حق میں ہمت بالغہ کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کے دو امیر امامت اور وزیر امت یہی ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما تھے، کیونکہ آپ ﷺ دو جہتیں رکھتے تھے۔ ایک جہت سے اللہ تعالیٰ سے اخذ کرتے اور دوسری جہت سے مخلوق کو دیتے۔ پس ان دونوں صاحبوں کو اعطائے خلق کی بابت اس تالیف، جمع اور تدبیرِ حرب میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس اعتبار سے انھیں دوسروں پر فضیلت حاصل ہے۔ یوں تو سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دین میں ہمارے امام اور پیشوا ہیں، چنانچہ انھیں برا کہنا حرام اور ان کی تعظیم کرنا واجب ہے۔

(۴۱) اہلِ قبلہ میں سے ہم کسی کو کافر نہیں کہتے، مگر اس امر میں جس میں صانع، قادر اور مختار کی نفی ہو، یا غیر اللہ کی عبادت ہو، یا انکارِ معاد یا نبی اور تمام ضروریاتِ دین کا انکار ہو۔

(۴۲) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے بشرطے کہ وہ کسی فتنے میں مبتلا نہ کرے اور یہ گمان ہو کہ وہ امر و نہی مقبول ہو گی۔

"فهذه عقيدتي أدين الله تعالىٰ بها ظاهرا وباطنا، والحمد لله أولا وآخرا" انتهىٰ حسن العقيدة.

[پس یہ (مذکورہ بالا) میرا عقیدہ ہے، ظاہر و باطن میں، میں ان عقائد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دین کا تعلق رکھتا ہوں، اول و آخر سب تعریف اللہ کے لیے ہے]

اس اعتقاد کے بعض الفاظ پر کتاب "الانتقاد الرجيح بشرح الاعتقاد الصحيح" میں تنقید کی گئی ہے، واللہ أعلم.

شرک کی حقیقت:

چونکہ عقیدے کا دار و مدار ردِ شرک، اختیارِ توحید اور مسئلۂ صفات پر ہے، اس لیے یہاں "حجۃ اللہ البالغہ" کو "حسن العقیدہ" کا ضمیمہ بنایا گیا ہے۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

عبادت انتہائی درجے کی عاجزی اور انکساری کو کہتے ہیں۔ کسی کی طرف سے یہ انتہائی عاجزی یا تو صورتاً ہوتی ہے جیسے قیام یا سجود کرنا یا ارادتاً جیسے اس فعل سے ایسی تعظیم کی نیت ہو جیسی بندے اپنے مولیٰ (اللہ تعالیٰ) کی تعظیم کرتے ہیں یا جس طرح رعایا بادشاہوں کی یا تلامذہ اساتذہ کی تعظیم کیا کرتے ہیں۔ ان دو صورتوں کے سوا تعظیم کی کوئی تیسری صورت نہیں ہے۔ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو اور برادرانِ یوسف علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو سجدہ تحیت کیا تھا اور یہ معلوم ہے کہ بلاشبہہ یہ سجدہ تعظیم کی اعلیٰ صورت ہے، لہٰذا یہ بات واجب ٹھہری کہ صرف نیت ہی سے اس کی تمیز ہوگی۔ جو نبی اپنی قوم میں مبعوث ہوا، اس نے لازمی طور پر انھیں شرک کی حقیقت سمجھائی اور ان دونوں درجوں میں تمیز کر کے بتائی۔ پھر وہ لوگ جو شرک کے مرض میں مبتلا تھے، وہ کئی طرح پر تھے۔ ان میں سے ایک وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے جلال اور بزرگی کو بالکل بھول گئے اور انھوں نے شرکا کے سوا کسی کو نہ پوجا، انھوں نے اپنی ہر حاجت انھیں کے سامنے پیش کی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سرے سے کوئی التفات اور توجہ نہ کی، اگرچہ یقینی دلیل سے وہ یہ بات جانتے تھے کہ سلسلہ وجود کی انتہا اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہے۔ کسی نے یہ اعتقاد کیا کہ سید و مدبر اللہ تعالیٰ ہے، لیکن کبھی وہ اپنے کسی بندے کو خلعتِ شرف دے کر بعض خاص امور میں اسے متصرف کر دیتا ہے اور اپنے بندوں کے حق میں اس کی شفاعت قبول فرماتا ہے، جس طرح ملک الملوک اقطار ارض میں اپنی طرف سے ایک ایک بادشاہ مقرر کر کے بڑے بڑے امور کے سوا ملک کی تدبیر اس کے سپرد کر دیتا ہے، اس لیے اس کی زبان ان کو اللہ کے بندے کہنے سے لڑکھڑاتی ہے، ناچار وہ انھیں اللہ تعالیٰ کے برابر ٹھہراتا ہے۔ پھر وہ اس سے بھی عدول وانحراف کر کے ان کا نام "أبناء الله" اور "أحباء الله" رکھتا ہے اور اپنے آپ کو ان کا بندہ کہنے لگتا ہے جیسے عبدالمسیح اور عبدالعزیٰ وغیرہ۔ جمہور یہود ونصاریٰ، مشرکین اور امتِ اسلام کے بعض غالی قسم کے منافقوں کا اب تک یہی مرض ہے۔ چونکہ شریعت کی بنا اس پر ہوا کرتی ہے کہ شبہ کی چیز کو بجائے اصل کے قرار دیں۔ اسی لیے اشیاے محسوسہ کو، جن میں شرک کا گمان تھا، کفر ٹھہرایا ہے، جیسے بتوں کو سجدہ کرنا، ان کے لیے قربانی کرنا اور ان کے نام کی قسم کھانا وغیرہ۔ الغرض شرک کی حقیقت یہ ہے کہ انسان بعض ان لوگوں میں، جن کی تعظیم کی جاتی ہے، صادر ہونے والے آثارِ عجیبہ کو یہ اعتقاد کر کے کہ ان آثار کا

صدور اس لیے ہوا ہے کہ وہ شخص ان صفاتِ کمال میں سے کسی ایک صفت کے ساتھ متصف ہے، جو صفت جنسِ انسان میں موجود نہیں ہے، بلکہ وہ واجب تعالیٰ ۔جل مجدہ۔ کے ساتھ مختص ہے، کسی غیر میں نہیں پائی جاتی، مگر یہ کہ وہ خود اپنے غیر کو خلعتِ الوہیت پہنا دے یا اسے اپنی ذات میں ملا لے یا ایسا ہی بیہودہ گمان کوئی اور ہو جس کا مشرکین اعتقاد کیا کرتے ہیں۔

شرک کی اقسام:

من جملہ ان امور کے جنھیں اللہ تعالیٰ نے شریعتِ محمدیہ میں مظنات شرک اور اس کے مواقع ٹھہرایا ہے، ایک یہ ہے کہ وہ لوگ اصنام و نجوم کو سجدہ کرتے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ﴾ [فصلت: ٣٧]

[نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو اور اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے انھیں پیدا کیا]

اشراک فی السجدہ کو اشراک فی التدبیر بھی لازم ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ اپنی حاجات میں غیر اللہ سے استعانت کرتے تھے، جیسے شفاے مریض اور غناے فقیر، اور وہ مطلب برآری کے لیے ان کی نذر مانتے تھے اور برکت کی امید پر ان کے نام جپتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر واجب قرار دیا کہ تم اپنی نمازوں میں یوں کہو:

﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ [الفاتحة: ٤]

[ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں]

نیز فرمایا:

﴿فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا﴾ [الجن: ١٨] [پس اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو]

اس جگہ دعا سے مراد استعانت ہے۔

تیسرے یہ کہ وہ بعض شرکا کا نام بنات اللہ اور ابناء اللہ رکھتے تھے، چنانچہ انھیں سختی کے ساتھ اس سے منع کیا گیا۔

چوتھے یہ کہ انھوں نے اپنے مولویوں اور درویشوں کو اللہ تعالیٰ کے سوا ارباب ٹھہرایا تھا۔ یعنی وہ اس بات کے معتقد تھے کہ جس چیز کو وہ حلال اور حرام کر دیں، وہی نفس الامر میں حلال و حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [التوبة: ٣١]

[انھوں نے اپنے عالموں اور اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا]

پانچویں یہ کہ وہ ذبح سے اصنام و نجوم کا تقرب حاصل کرتے تھے۔ کبھی تو ذبح کے وقت ان کا نام پکارتے اور کبھی انصاب مخصوصہ پر ذبح کرتے، چنانچہ انھیں اس کام سے منع کر دیا گیا۔

چھٹے یہ کہ وہ سائبہ اور بحیرہ نامی جانور چھوڑتے، تاکہ شرکا کا تقرب حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق فرمایا:

﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّ لَا سَآئِبَةٍ﴾ [المائدة: ١٠٣]

[اللہ نے نہ کوئی کان پھٹی اونٹنی مقرر فرمائی ہے اور نہ کوئی سانڈ چھٹی ہوئی]

ساتویں یہ کہ کچھ لوگوں کے حق میں ان کا یہ اعتقاد تھا کہ ان کے نام مبارک اور معظم ہیں اور ان کے نام کی جھوٹی قسم کھانا مال و اہل میں نقصان و حرمان کو واجب کرتا ہے، اسی لیے وہ دوسروں کو ان کی قسم دلاتے۔ پس انھیں ان باتوں سے یوں منع کیا گیا کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ أَشْرَكَ»[1] [جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی، اس نے شرک کیا]

بعض محدثین نے کہا ہے کہ یہ حدیث تغلیظ اور تہدید کے معنی میں ہے، لیکن میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ میرے نزدیک اس سے مذکورہ اعتقاد کے ساتھ غیر اللہ کے نام کی یمین منعقدہ اور یمین غموس مراد ہے۔

آٹھویں یہ کہ وہ متبرک جگہوں میں، جو شرکا کے لیے مختص تھیں، غیر اللہ کے لیے حج کرتے تھے اور ان جگہوں میں ان کا تقرب حاصل کرنے کے لیے پڑاؤ کرتے تھے۔ شریعت نے اس سے بھی منع فرمایا، چنانچہ رسول ﷺ نے فرمایا:

«لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ»[2]

[صرف تین مساجد کی طرف رختِ سفر باندھا جائے]

نویں یہ کہ وہ اپنی اولاد کا نام عبدالعزیٰ اور عبدالشمس وغیرہ رکھتے تھے، حدیث میں آیا ہے کہ

---

[1] سنن أبي داؤد، رقم الحديث (٣٢٥١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٣٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٩٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٩٧)

حوا نے اپنے بیٹے کا نام عبدالحارث رکھا تھا اور یہ شیطان کی وحی تھی[1]

یہ شرک کے مقامات و مواضع ہے، جس سے شارع نے منع کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات پر ایمان:

جس طرح اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا واجب ہے، اسی طرح اس کی صفات پر ایمان لانا فرض ہے۔ یعنی انسان اس بات کا معتقد ہو کہ اللہ تعالیٰ صفات علیا کے ساتھ متصف ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان ایک دروازہ کھل جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بزرگی اور کبریائی کا انکشاف ہوتا ہے۔ سارے آسمانی مذاہب کا صفات کے بیان اور ان عبارات کے استعمال پر جس طرح وہ وارد ہوئی ہیں اور اس بات پر کہ ان میں زیادہ بحث نہ کریں، اجماع ہے اور خیر القرون اسی پر گزری ہیں۔ پھر مسلمانوں کے ایک گروہ نے ان سے متعلق بحث کی اور کسی نص اور قطعی دلیل کے بغیر ان کے معانی کی تحقیق میں لگ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: تم مخلوق میں غور وفکر کرو نہ کہ خالق میں۔[2]

اور اس آیت:

﴿وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی﴾ [النجم: ٤٢]

[اور یہ کہ بے شک تیرے رب ہی کی طرف آخر پہنچنا ہے]

کے بارے میں فرمایا کہ رب تعالیٰ کے متعلق کوئی غور وفکر نہ کرنا چاہیے۔ پس اللہ تعالیٰ کی صفات مخلوقات اور محدثات نہیں ہیں اور ان کے متعلق اسی قدر غور وفکر کرنے کی گنجایش ہے کہ ان صفات کے ساتھ حق تعالیٰ کس طرح متصف ہوا ہے اور خالق کے متعلق گویا یہی تفکر ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے حدیث: «يَدُ اللهِ مَلْأَى»[3] کے بارے میں فرمایا ہے:

---

[1] مسند أحمد (١١/٥) اس کی سند میں موجود راوی ''عمر بن ابراہیم البصری'' کے متعلق امام ابو حاتم رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''لا يحتج به'' ''وہ قابل حجت نہیں''۔ پھر جیسے کہ دوسری سند سے ثابت ہے کہ یہ روایت سمرہ بن جندب پر موقوف ہے مرفوع نہیں ہے، علاوہ ازیں اس کی سند میں حسن بصری رحمہ اللہ مدلس ہیں اور عن سے روایت کرتے ہیں۔ نیز حسن بصری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر مذکورہ تفسیر کے خلاف کی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: ٢٧٤/٤) اگر ان کے ہاں مذکورہ روایت مرفوع ہوتی تو وہ اسے کبھی نہ چھوڑتے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ مسند احمد اور سنن الترمذی کی مذکورہ روایت پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔

[2] العظمة لأبي الشيخ (٥) یہ روایت مرسل ہے۔ دیکھیں: الزهد لهناد بن السري (٩٣٩) ضعيف الجامع (٢٤٧٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٩٣)

"قال الأئمة: نؤمن كما جاء من غير أن يفسر أو يتوهم، هكذا قال غير واحد من الأئمة، منهم سفيان الثوري ومالك بن أنس وابن عيينة وابن المبارك أنه تروى هذه الأشياء ويؤمن بها ولا يقال كيف"

[ائمہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ہم (صفاتِ الٰہیہ پر) اسی طرح ان کی تفسیر اور ان کے متعلق کسی وہم میں مبتلا ہوئے بغیر ایمان لاتے ہیں جس طرح وہ صفات وارد ہوئی ہیں۔ یہی مذہب ہے کئی ایک ائمہ کرام رحمہم اللہ کا جن میں سفیان ثوری، مالک بن انس، ابن عیینہ اور ابن المبارک رحمہم اللہ شامل ہیں کہ اس طرح کی چیزوں کو روایت اور بیان کیا جائے اور ان پر ایمان لایا جائے، مگر یہ نہ کہا جائے کہ وہ کیسے ہیں]

امام ترمذی رحمہ اللہ نے دوسری جگہ فرمایا ہے:

"إن إجراء هذه الصفات كما هي ليس بتشبيه، وإنما التشبيه أن يقال سمع كسمع وبصر كبصر"[1]

[ان صفاتِ (الٰہیہ) کو اسی طرح جاری کرنا جس طرح وہ وارد ہوئی ہیں، یہ تشبیہ نہیں ہے۔ تشبیہ تو یہ ہے کہ کہا جائے کہ اس کا سننا دوسروں کے سننے اور اس کا دیکھنا دوسروں کے دیکھنے کی طرح ہے]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لم ينقل عن النبي ﷺ ولا عن أحد الصحابة من طريق صحيح التصريح بوجوب تأويل شيئ من ذلك يعني المتشابهات، ولا المنع من ذكره، ومن المحال أن يأمر الله نبيه بتبليغ ما أنزل إليه من ربه وينزل عليه ﴿ٱلۡيَوۡمَ أَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِينَكُمۡ﴾ ثم يترك هذا الباب فلا يميز ما يجوز نسبته إليه تعالىٰ مما لا يجوز مع حثه على التبليغ عنه بقوله: «ليبلغ الشاهد الغائب» حتى نقلوا أقواله وأفعاله وأحواله وما فعل بحضرته فدل على أنهم اتفقوا على الإيمان بها على الوجه الذي أراد الله تعالىٰ منها وأوجب تنزيهه عن مشابهة المخلوقات بقوله: ﴿لَيۡسَ كَمِثۡلِهِۦ شَيۡءٞ﴾،

[1] سنن الترمذي (٣/٥٠)

فمن أوجب خلاف ذلك بعدهم فقد خالف سبيلهم"[1] انتهى.

[نبی ﷺ اور کسی صحابی رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ یہ تصریح ثابت نہیں ہے کہ متشابہات میں سے کسی چیز کی تاویل کرنا واجب ہے اور نہ اس بات کی تصریح منقول ہے کہ ان کا ذکر منع ہے۔ کیوں کہ یہ بات ویسے ہی محال ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو ہر اس چیز کی تبلیغ کا حکم دے، جو اس کی طرف اس کے رب تعالیٰ کی طرف سے نازل کی گئی اور اس پر یہ آیت بھی نازل کرے: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ [المائدة: ٣] پھر آپ ﷺ اس باب کو ترک کر دیں اور اس بات کی تمیز ہی نہ کریں کہ کس چیز کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا جائز ہے اور کس چیز کی نسبت کرنا جائز نہیں ہے، باوجود اس کے کہ آپ ﷺ نے یہ کہہ کر تبلیغ پر برانگیخت کیا تھا: «لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ» حتی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کے اقوال، افعال، احوال اور وہ جو کچھ آپ ﷺ کی موجودگی میں کیا گیا اسے نقل کیا ہے۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ وہ سب اس پر متفق تھے کہ ان پر اسی طرح ایمان لایا جائے جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان سے ارادہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان کے ساتھ اپنے آپ کو مخلوقات کے ساتھ مشابہت دینے سے منع کر دیا ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ پس جس شخص نے ان کے بعد اس کے خلاف کوئی چیز واجب کی تو یقیناً اس نے ان کے راستے کی مخالفت کی]

میں کہتا ہوں کہ سمع و بصر، قدرت وضحک اور کلام و استوا کے درمیان کچھ فرق نہیں ہے، کیونکہ اہلِ لسان کے نزدیک ان سب کا مفہوم جنابِ قدس تعالیٰ کے لائق نہیں ہے۔ کیا ضحک میں کچھ استحالہ [محال ہونا، کسی چیز کا مشکل ہونا] ہے مگر اسی جہت سے کہ وہ منہ کا تقاضا کرتا ہے۔ اسی طرح کلام، گرفت اور نزول میں کوئی استحالہ نہیں ہے مگر اسی لحاظ سے کہ یہ دونوں دست وپا کے خواہاں ہیں، یہی حال سمع و بصر کا ہے کہ یہ مستدعی اذن وعین ہیں، واللّٰہ أعلم.

اس کے بعد شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

''ان خوض کرنے والے لوگوں نے گروہ اہلِ حدیث پر یوں زبان درازی کی کہ انھیں مجسمہ اور مشبہہ کے نام دیے اور کہا کہ وہ عدم کیفیت کا سہارا لے کر چھپے ہوئے ہیں۔ یقیناً

[1] فتح الباري (٣٩٠/١٣)

مجھ پر یہ بات واضح ہوئی ہے کہ ان کی یہ زبان درازی کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے اور روایتاً اور درایتاً وہ اپنی اس بات میں اور ائمہ ہدیٰ پر طعن کرنے میں خطا کار ہیں۔"[1]

عبادت اللہ کا بندوں کے ذمے حق ہے:

عبادت اللہ کا بندوں پر حق ہے، اس لیے کہ منعم حقیقی وہی ہے اور وہی اپنے ارادے سے ان کو جزا دے گا۔ یہ عبادت بندوں سے مطلوب ہے جس طرح کہ تمام اہلِ حقوق دوسروں سے اپنے اپنے حقوق کا مطالبہ کیا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے شعائر کی تعظیم:

شرائع کی تعظیم اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا حصہ ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہوتا ہے، چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مَنْ يُعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾ [الحج: ٣٢]

[اور جو اللہ کے نام کی چیزوں کی تعظیم کرتا ہے تو یقیناً یہ دلوں کے تقوے سے ہے]

میں کہتا ہوں کہ شعائر اور شرائعِ الٰہیہ کی تعظیم اسی جگہ پائی جاتی ہے جہاں کسی انسان کی طرف سے شریعت میں کوئی زیادتی اور نقصان ظاہر نہیں ہوتا ہے اور جس جگہ اہلِ بدعت نے اپنی مستحسنات کو شرع کے ساتھ ملا دیا ہے، وہاں یہ تعظیم بالکل مفقود ہے۔ آیتِ کریمہ:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ [المائدۃ: ٣]

[آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا]

بلند آواز سے یہ پکارتی ہے کہ دین کامل، نعمتِ دین تمام اور اسلام مرضیِ خالقِ انام ہے، اس میں اب کوئی کمی اور بیشی نہیں ہو سکتی ہے۔ اب جس کسی نے آرائے رجال یا اہلِ ہوا کی قیل وقال کو اپنا پسندیدہ دین ٹھہرایا وہ اس آیت کا مخالف ہے، اس نے اس شریعت کی اور اللہ تعالیٰ کے شعائر کی کوئی وقعت نہ سمجھی۔ اس نے تو گویا اپنے ہوائے نفس کو اپنا معبود بنایا اور وہ مشرک یا مبتدع ہو گیا۔

[1] حجة الله البالغة (ص: ١/ ١٣٣)

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿أَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ﴾ [الفرقان: ٤٣]

[کیا تو نے وہ شخص دیکھا جس نے اپنا معبود اپنی خواہش کو بنا لیا]

یہ آیت ردِ تقلید پر بھی ایک حجت بالغہ ہے۔ واللہ أعلم.

پندرھویں فصل

فارسی کتاب ''مالا بدمنہ'' کے مطابق حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ کے عقیدے کا بیان

صفاتِ باری تعالیٰ:

اللہ تعالیٰ اپنی ذات پاک سے موجود ہے، ساری چیزیں اس کی ایجاد سے موجود ہیں اور وہ اپنے وجود وبقا میں اس کی محتاج ہیں، جب کہ وہ کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔

وہ اپنی ذات، صفات اور افعال میں سب سے یگانہ ہے، کسی کی اس کے ساتھ کسی امر میں شرکت نہیں ہے۔ اس کا وجود اور حیات اشیا کے وجود وحیات جیسے نہیں ہیں۔ اس کا علم مخلوق کے علم سے مشابہ نہیں ہے۔ اس کا سمع وبصر، ارادہ وقدرت اور اس کا کلام مخلوقات کے کلام، قدرت ارادے، سننے اور دیکھنے کے مانند نہیں ہے، ہاں اگر ان میں مشارکت ومجانست ہے تو صرف نام کی، اس کے سوا انھیں اس کے ساتھ کوئی مجانست ومشارکت نہیں ہے۔ اس کی صفات اور افعال اس کی ذات کی طرح بلا کیف اور بلا تشبیہ ہیں، مثلاً اس کا علم ایک ایسی قدیم صفت اور بسیط انکشاف ہے کہ وہ ساری معلوماتِ ازل وابد کو ان کے متناسب ومتضاد [موافق ومخالف] کلیہ وجزئیہ اور ہر چیز کے اوقاتِ مخصوصہ کو جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ زید فلاں وقت تک بقید حیات رہے گا اور فلاں وقت مر جائے گا وغیرہ۔ اسی طرح اس کا کلام ایک بسیط کلام ہے جس کی تفصیل یہ تمام نازل شدہ کتابیں ہیں۔

پیدا کرنا اور وجود میں لانا ایک ایسی صفت ہے جو اس کے ساتھ مختص ہے، ممکن کی کیا ہستی ومجال ہے کہ وہ کسی دوسرے ممکن کو پیدا کر سکے۔ جوہر ہوں یا عرض یا بندوں کے افعال اختیاریہ سب اسی کی مخلوق ہیں۔ اس نے اپنے کارِ تخلیق کو اسباب وذرائع کے پردے میں پوشیدہ کر دیا ہے، بلکہ انھیں اپنے فعل کے ثبوت پر دلیل ٹھہرایا ہے، چنانچہ عقل مند لوگ جمادات کی حرکت سے حرکت

دینے والی ذات تک پہنچ جاتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان جمادات کی حرکت بذاتہ نہیں، بلکہ انھیں اپنی مرضی کے مطابق کوئی حرکت دینے والی ذات ہے۔ اسی طرح وہ اصحابِ عقل ودانش، جن کی بصیرت میں شریعت کا سرمہ ہے، جانتے ہیں کہ ایک ممکن دوسرے ممکن کو، گو وہ منجملہ افعال میں سے کوئی فعل ہو یا منجملہ اعراض کے کوئی عرض ہو، پیدا نہیں کر سکتا ہے۔ ہاں افعالِ اختیاریہ اور جمادات کی حرکت میں اتنا [قدرے] فرق ثابت ہے اور اس کے ساتھ ایمان لانا واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو قدرت وارادے کی ایک شکل عطا فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عادت یوں ہی جاری ہے کہ جب کوئی بندہ کسی فعل کا قصد وارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس فعل کو پیدا کر دیتا اور وجود میں لے آتا ہے۔ اسی ارادہ وقدرت کی بنیاد پر بندے کو ''کاسب'' [اپنے ارادے اور اختیار سے کام کرنے والا] کہتے ہیں اور اس پر مدح، ذم، ثواب اور عذاب مرتب ہوتا ہے۔ حرکتِ جماد اور حرکتِ حیوان کے درمیان فرق کا انکار کرنا کفر ہے، نیز یہ شرع اور عقل کے خلاف ہے۔ غیر اللہ کو کسی چیز کا خالق جاننا بھی کفر ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرقہ قدریہ کو اس امت کا مجوس قرار دیا ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ کسی چیز میں حلول کرتا ہے اور نہ کوئی چیز اس میں حلول کرتی ہے۔ وہ ذاتی احاطے کے ساتھ ساری اشیا کو گھیرے ہوئے ہے اور اشیا کے ساتھ قرب اور معیت رکھتا ہے،[1] لیکن وہ احاطہ وقرب ایسا نہیں ہے جو ہم اپنی ناقص سمجھ کے مطابق سمجھ لیتے ہیں کہ اس طرح کا احاطہ اور قرب ذاتِ باری تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ کشف ومشاہدہ کے ذریعے [صوفیہ] جو کچھ معلوم کرتے ہیں وہ اس سے بھی منزہ ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ غیب پر ایمان لائے، رہے مکشوف ومراقبہ تو وہ سب مشابہ اور مماثل کوئی چیز ہے، چنانچہ وہ اسے لائے نفی کے نیچے رکھے، [صوفیہ] حضرات نے اسی طرح فرمایا ہے۔

ہمیں اس پر ایمان لانا چاہیے کہ حق تعالیٰ جملہ اشیا کو محیط ہے اور قریب ہے۔ ہم اس کے

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٩١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٢)

[1] یہ کہنا کہ احاطے سے مراد قرب ومعیت ذاتی ہے، یہ ائمہ سلف کے بالکل خلاف ہے اور دوسرا عقیدہ کہ قرب ومعیت سے مراد علم ہے، اس میں اختلاف ہے۔ ائمہ سلف متقدمین اور عامہ محدثین ومفسرین آیات کے سیاق کے مطابق معیت، قرب اور احاطے کی تفسیر علم ومعونت وغیرہ سے کرتے ہیں، لیکن بعض محققین متاخرین نے تحقیق کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ قرب اور معیت وغیرہ آیات کی علم، معونت اور نصر وغیرہ سے تاویل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، فقط ان پر ایمان لانا ہی کافی ہے۔ رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ ذات کے اعتبار سے قریب وہمراہ ہے یا صفت کے اعتبار سے تو اس کا علم اسی ذاتِ باری تعالیٰ کو ہے۔ واللہ اعلم۔ [مولف رحمہ اللہ]

احاطے قرب اور معیت کے معنی کو نہیں جانتے کہ وہ کیا ہیں۔ اسی طرح اس کا عرش پر مستوی ہونا، مومن کے دل میں سمانا، آخری رات آسمان دنیا پر اترنا، جیسا کہ احادیث ونصوص میں آیا ہے، اسی طرح ہاتھ اور منہ جس کے متعلق نصوص ناطق ہیں، سب پر ایمان لانا چاہیے۔ انسان ان کو ظاہری معنی پر محمول کرے اور ان کی تاویل میں نہ پڑے، بلکہ ان کی تاویل وتوجیہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے، تاکہ غیر حق کو حق نہ سمجھ لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات وافعال میں سوائے جہل وحیرت کے بشر کو کچھ حصہ نہیں ہے، بلکہ ملائکہ کو بھی کچھ نصیب نہیں۔ نصوص کا انکار کرنا کفر ہے اور ان کی تاویل جہلِ مرکب۔

دور بینانِ بارگاہِ الست
غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

[دوربین بارگاہِ الست میں (وہ مجلس جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ سوال کیا: ﴿الست بربکم﴾ [کیا میں واقعی تمھارا رب نہیں ہوں؟]) ہست (لوگوں کا اللہ کے سوال کے جواب میں یہ کہنا ﴿بلیٰ شھدنا﴾ [کیوں نہیں؟ ہم نے شہادت دی]) کے سوا کوئی جواب نہیں دیتے]

اللہ تعالیٰ کے قرب ومعیت کی ایک اور قسم بھی ہے جس کی پہلی نوع کے قرب ومعیت سے محض نام میں مشارکت ہے اور وہ قرب ومعیت خاص بندوں، جیسے ملائکہ، انبیا اور اولیا کو نصیب ہے۔ عام مومن بھی اس طرح کے قرب سے محروم نہیں ہیں۔ اس قرب کے درجات بے انتہا ہیں، وہ کسی حد پر نہیں ٹھہرتے ہیں۔ مولانا روم فرماتے ہیں:

ای برادر بے نہایت در گہی ست
ہرچہ بر وے می رسی بر وے ما یست

[اے بھائی! اس کے قرب کے مراتب بے شمار ہیں، جسے قرب کا جو درجہ حاصل ہو گیا وہی اس کے لائق ہے]

جو خیر وشر وجود میں آتا ہے اور بندہ جس کفر، ایمان، طاعت اور عصیان کا مرتکب ہوتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے ارادے سے ہے، لیکن حق تعالیٰ کفر ومعصیت سے خوش نہیں ہے، بلکہ اس نے کفر ومعصیت پر عذاب مقرر فرمایا ہے۔ طاعت وایمان پر وہ راضی ہے جس پر اس نے ثواب کا وعدہ کیا ہے، لہٰذا ارادہ اور چیز ہے اور رضا ایک اور چیز۔

ملائکہ، انبیا اور کتب سماویہ پر ایمان:

اگر انبیا علیہم السلام مبعوث نہ ہوتے تو کوئی شخص راہِ ہدایت نہ پاتا اور صحیح علوم تک نہ پہنچتا۔ سارے انبیاء برحق ہیں۔ سب سے پہلے نبی آدم علیہ السلام ہیں اور سب انبیا سے افضل محمد ﷺ خاتم النبیین ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کا واقعہ معراج، مکہ سے مسجد اقصیٰ تک اور پھر وہاں سے ساتویں آسمان اور سدرۃ المنتھی تک تشریف لے جانا حق ہے۔ آسمانی کتابیں جو انبیا علیہم السلام پر نازل ہوئیں جیسے تورات، انجیل، زبور، قرآن مجید اور ابراہیم کے صحیفے وغیرہ سب حق ہیں، لہٰذا تمام انبیا اور اللہ تعالیٰ کی تمام کتابوں پر ایمان لانا چاہیے، لیکن اس ایمان میں انبیا اور کتابوں کی مقرر گنتی ملحوظ نہ رکھی جائے، کیونکہ ان کی گنتی قطعی دلیل سے ثابت نہیں ہے۔ تمام انبیا صغائر اور کبائر سے معصوم ہیں۔ جو بات رسول اللہ ﷺ سے قطعی دلیل کے ساتھ ثابت ہو چکی ہے اس پر ایمان لانا چاہیے۔

نیز اس پر بھی ایمان لانا چاہیے کہ فرشتے اللہ کے بندے ہیں، گناہوں سے معصوم ہیں، مردانہ اور زنانہ خصوصیات سے بری ہیں، کھانے پینے کے محتاج نہیں ہیں، وحی کو پہنچاتے ہیں، عرش کو اٹھاتے ہیں اور جس کام پر مقرر ہیں اسے انجام دینے پر قائم ہیں۔ انبیا اور ملائکہ باوجود اس کے کہ وہ مخلوقات میں سے اشرف اور مقربین درگاہ ہیں لیکن دیگر ساری مخلوقات کی طرح صرف اتنا ہی علم اور قدرت رکھتے ہیں جو علم اللہ تعالیٰ نے انھیں دیا ہے اور جو قدرت ان کو عطا کی ہے۔ یہ انبیا اور ملائکہ بھی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر ویسا ہی ایمان رکھتے ہیں جیسا ایمان سارے مسلمان رکھتے ہیں اور اس کی کنہ وحقیقت کے ادراک سے عاجز ہونے اور وہاں تک رسائی نہ ہونے کے معترف ہیں اور توفیقِ الٰہی کے ساتھ حقوقِ بندگی ادا کرنے پر شکر گزار ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں [انبیا وغیرہ] کو اللہ تعالیٰ کی واجبی صفات میں شریک قرار دینا اور ان کو عبادت میں شریک کرنا کفر ہے۔ جس طرح دوسرے کفار انبیا کے انکار کے سبب کافر ہو گئے، اسی طرح نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا اور مشرکین عرب نے ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کی لڑکیاں کہا اور ان کے لیے علم غیب تسلیم کیا اور وہ کافر ہو گئے۔ انبیا اور ملائکہ کو صفات الٰہیہ میں شریک نہیں کرنا چاہیے اور غیر انبیا کو صفات انبیا میں شریک نہیں بنانا چاہیے، اسی طرح انبیا اور ملائکہ کے سوا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اہلِ بیت اور اولیا کو معصوم ثابت نہ کرنا چاہیے اور کلیتاً انبیا کی پیروی کرنی چاہیے۔

احوالِ برزخ و آخرت پر ایمان:

رسول اللہ ﷺ نے جس بات کی خبر دی ہے اس پر ایمان لانا، جو کچھ فرمایا ہے اس پر عمل کرنا

اور جس سے منع کیا ہے اس سے باز رہنا چاہیے۔ جس کسی کا قول وفعل پیغمبر ﷺ کے قول وفعل سے بال برابر مخالفت رکھتا ہو اسے رد کر دینا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ قبر میں منکر ونکیر کا سوال حق ہے۔ کافروں اور بعض گناہ گاروں کے لیے قبر کا عذاب حق ہے۔ موت کے بعد قیامت کے دن اٹھنا حق ہے۔ مارنے اور زندہ کرنے کے لیے صور میں پھونکا جانا حق ہے۔ پہلی دفعہ صور میں پھونکنے سے آسمانوں کا پھٹنا، ستاروں کا بکھرنا، پہاڑوں کا اڑنا اور زمین کا ویران ہونا اور دوسری دفعہ صور پھونکنے سے مُردوں کا قبر سے نکلنا اور جہان کا نئے سرے سے پیدا ہونا حق ہے۔ قیامت کے دن کا حساب، اعمال کا ترازو میں تولنا، اعضا کا گواہی دینا، پل صراط سے گزرنا، جو جہنم کی پشت پر ہوگا، تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک، حق ہے۔ کوئی شخص تو پل صراط سے بجلی کی طرح، کوئی ہوا کی طرح، کوئی تیز رفتار گھوڑے کی طرح اور کوئی آہستہ سے گزرے گا اور کوئی دوزخ میں گرے گا۔

انبیا اور اولیا کا شفاعت کرنا حق ہے۔ حوضِ کوثر حق ہے۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔ اس حوض پر ستاروں کی مانند برتن ہوں گے، جو شخص اس کا پانی پیے گا وہ پھر کبھی پیاسا نہ ہوگا۔

گناہ گار مسلمان کا مستقبل:

اللہ تعالیٰ چاہے تو توبہ کے بغیر گناہ کبیرہ بخش دے اور چاہے تو صغیرہ پر عذاب کرے۔ البتہ جو شخص اخلاص سے توبہ کرتا ہے تو وعدہ الٰہی کے موافق اس کا گناہ ضرور بخش دیا جاتا ہے۔ کافر ہمیشہ جہنم میں مبتلائے عذاب رہیں گے۔ گناہ گار مسلمان اگر دوزخ میں جائیں گے تو بالآخر جلد یا بدیر اس سے باہر نکل آئیں گے، پھر بہشت میں داخل ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ مسلمان کبیرہ گناہ کرنے سے کافر ہوتا ہے اور نہ ایمان ہی سے خارج ہوتا ہے۔

دوزخ کا عذاب اور جنت کی نعمتیں برحق ہیں:

دوزخ کے عذاب کی وہ انواع واقسام جن کی رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے جیسے سانپ، بچھو، زنجیر، طوق، آگ، گرم پانی، زقوم، یعنی تھوہر اور پیپ جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور قرآن حکیم میں جن کا ذکر ہے اور جنت کی نعمتوں کی انواع واقسام جیسے طرح طرح کے کھانے پینے اور حور وقصور وغیرہ یہ سب حق ہیں۔ جنت کی سب سے عمدہ نعمت اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے۔ مسلمان اللہ تعالیٰ کو بہشت میں کسی پردے اور رکاوٹ کے بغیر بے جہت، بے کیف اور بے مثال دیکھیں گے۔

ایمان کیا ہے؟

ایمان گرویدہ ہونے اور تصدیقِ زبانی کے ساتھ ساتھ تصدیقِ دل سے عبارت ہے، لیکن ضرورت کے وقت زبان کی تصدیق ساقط ہو جاتی ہے۔

خلفاے راشدین اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عادل تھے۔ اگر ان میں سے کسی سے بعض اوقات معصیت کا ارتکاب ہوا تو توبہ کر کے وہ مغفرت یاب ہو گیا۔ قرآن وحدیث کی متواتر نصوص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مدح سے لبریز ہیں۔ خود قرآن مجید ہی میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ وہ باہم محبت اور رحمت رکھتے تھے اور وہ کافروں کے مقابلے میں سخت اور درشت تھے۔ جو شخص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایک دوسرے کا دشمن اور باہم بے الفت جانے وہ قرآن کا منکر ہے۔ جو کوئی ان کے ساتھ دشمنی اور غصہ رکھے تو ایسے شخص کو قرآن مجید میں کافر کہا گیا ہے۔ یہ لوگ وحی اٹھانے والے اور قرآن کی روایت کرنے والے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے منکر کے لیے قرآن مجید اور ایمانیات ومتواترات پر ایمان رکھنا ممکن نہیں ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع اور نصوص سے ثابت ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے افضل ہیں اور ان کے بعد عمر رضی اللہ عنہ۔ سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سب سے افضل جان کر بیعت کی۔ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کے اشارے سے ان کے فوت ہونے کے بعد عمر رضی اللہ عنہ کے فضل کے سبب ان کی خلافت پر اجماع کیا۔ عمر رضی اللہ عنہ کے بعد تین دن تک مشورہ کر کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عثمان کو افضل جان کر ان کی خلافت پر اجماع کیا پھر ان سے بیعت کی۔ عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد مدینہ طیبہ میں جتنے مہاجرین وانصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، انھوں نے علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے بیعت کی، جس شخص نے علی رضی اللہ عنہ سے جھگڑا کیا وہ غلطی پر ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ بدگمانی نہ کرنی چاہیے اور ان کے باہمی اختلاف کی کوئی اچھی تاویل کر لینی چاہیے اور ہر ایک صحابی کے ساتھ محبت کا اعتقاد رکھنا چاہیے۔ یہ اہلِ حق کے عقائد ہیں۔ انتہیٰ.

حضرت قاضی صاحب رحمہ اللہ نے اس عقیدے کے اکثر مبانی ومعانی حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے مکتوب ۲۶۶ سے اخذ کیے ہیں، جیسا کہ اصل کتاب کی طرف رجوع کرنے سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے، واللہ أعلم.

سولھویں فصل

شیخ محمد فاخر زائر عباسی الہ آبادی ثم المکی رحمہ اللہ کے "رسالہ نجاتیہ" کے مطابق اسلام کے بنیادی عقائد کا بیان

طالبِ نجات پر جو سب سے پہلی بات لازم ہے وہ کتاب وسنت کے مطابق کسی کے قول کی طرف جھکے بغیر عقائد کی تصحیح اور درستی ہے، یہ بات بہت دشوار ہے، کیونکہ اہلِ دنیا کی کمزور عقلیں علومِ فلاسفہ کی ضلالت اور اہلِ کلام کی آراء میں اس قدر منہمک ہیں کہ کوئی شخص کتاب وسنت کی طرف سر نہیں اٹھاتا، بلکہ وہ قرآن وحدیث کو اپنے کام اور مقصد سے الگ جانتا ہے اور جو شخص کتاب وسنت کے مطابق بات کرتا ہے اسے سنت سے بے گانہ شمار کرتا ہے، وإلی اللہ المشتکی، ثم إلی اللہ المشتکی.

مگر جب کتاب وسنت سے موافقت حاصل ہو جائے تو پھر کسی کے قول کی مخالفت سے بالکل نہ ڈرے، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔

إذا رضیت عني کرام عشیرتي
فلا زال غضبانا علي لئامها

[جب میرے خاندان کے باعزت لوگ مجھ سے راضی ہوں گے تو اس کے گھٹیا اور کمینے لوگ ضرور مجھ سے نالاں ہی ہوں گے]

مومن کتاب وسنت کے مفہوم ومنطوق کا مکلف ہے، اسے اوروں کی رائے کی پیروی کرنا منظور نہیں۔

ذات وصفاتِ الٰہیہ کا بیان:

سلف صالحین یعنی صحابہ وتابعین، تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین اور ان کے تلامذہ کا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات کے اعتبار سے ویسا ہی ہے جیسا اس نے قرآن مجید میں اپنا وصف بیان کیا ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ اس نے اپنی ذات کو جس چیز کے ساتھ متصف کیا ہے اس کے

ساتھ اللہ تعالیٰ کو متصف جانے اور جس چیز سے اپنی ذات کو مقدس اور منزہ فرمایا ہے اس سے وہ اللہ تعالیٰ کو منزہ اور مقدس رکھے۔ اثبات ونفی میں قرآن وحدیث کی پیروی کرنا چاہیے، چنانچہ اس میں جو ثابت ہے، اسے ثابت اور جو منفی ہے اس کی نفی کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ایک ہے، ازل سے ابد تک موجود ہے، وہ جمیع صفاتِ کمال کے ساتھ متصف ہے۔ وہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے، جنتا ہے نہ جنا گیا ہے، اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ وہ حکیم ہے جو کچھ کرتا ہے حکمت سے کرتا ہے، وہ جو چاہے سو کرے۔ اس کے سارے کمالات بالفعل ہیں۔ وہ قدیم، ازلی اور ابدی ہے۔ اس کے لیے قائم بالذات صفاتِ قدیمہ ثابت ہیں، جیسے حیات، علم، قدرت، سمع، بصر، ارادہ، تکوین اور کلام۔

سمع وبصر دو مستقل صفات ہیں:

علم کے علاوہ سمع وبصر اللہ تعالیٰ کی دو الگ مستقل صفتیں ہیں، چنانچہ قرآن مجید کا تتبع اسی پر گواہی دیتا ہے، کیونکہ علم کو معلومات کے ذکر میں وارد کیا گیا ہے، سمع کو مسموعات کے بیان میں ذکر کیا گیا ہے اور بصر کو مبصرات کے بیان میں عیاں فرمایا گیا ہے۔ سمیع اور بصیر کو علیم بمسموعات اور علیم بمبصرات کی طرف راجع کرنے میں قرآن وحدیث کی تحریف لازم آتی ہے اور جس کسی سے سمع وبصر کی نفی ہوگی، اسے سمیع وبصیر نہ کہیں گے، چنانچہ اس قول کی قباحت پوشیدہ اور مخفی نہیں ہے۔

صفتِ کلام کا بیان:

یہ جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام حرف وصوت نہیں رکھتا ہے تو ان کا یہ قول کتاب وسنت اور عقل کے بھی خلاف ہے کہ اللہ کا کلام حرف وصوت نہ رکھتا ہو۔ کلام اللہ کا بے حرف وآواز ہونا سمجھ میں نہیں آتا جس طرح انسان کے سارے اعضا جدا کر دیے جائیں تو اسے انسان نہیں سمجھا جاتا۔ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جو مخلوق نہیں ہے۔ اس کا آغاز اسی کی طرف سے ہوا اور اسی کی طرف یہ لوٹ جائے گا۔ اس کے الفاظ ومعانی سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، جبریل علیہ السلام صرف ناقل ہیں اور محمد ﷺ اس کے مبلغ ہیں۔ جس کسی کی زبان پر یہ کلامِ مقدس جاری ہوا وہ اللہ تعالیٰ ہی کا کلام تھا جس کے ساتھ اس نے تکلم کیا۔ جبریل علیہ السلام نے واقعی سن کر اسے اتارا اور یقیناً وہ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ جو شخص یہ کہے کہ وہ کسی فرشتے یا بشر کا کلام ہے، اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تکلم کا

طریقہ اللہ ہی جانتا ہے کوئی اور کیا جانے، اس کی کیفیت اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے، اللہ تعالیٰ کا اپنی ذات وصفات میں مخلوقات کے مشابہ ہونا محال ہے

کلام اللہ کا طریقہ:

یہ گمان کرنا کہ کلام کا جو طریق حیوانات میں معروف ہے اسی میں منحصر ہے، ٹھیک نہیں ہے۔ اسی گمان نے بہت سے لوگوں کو تاویل کے ورطۂ ہائلہ میں ڈال کر ساحلِ نجات سے دور لے جا کر اضطراب کے گرداب میں غرق کر دیا ہے۔ ساحلِ نجات یہ ہے کہ جو کچھ کتاب وسنت میں آیا ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے۔ پتھر، سنگریزے اور درخت کا تسبیح پڑھنا اور تکلم کرنا، جو منجملہ رسول اللہ ﷺ کے معجزات کے ہیں، تکلم کے غیر معروف طریق پر تھا۔ پس اگر اللہ تعالیٰ، جو ہر چیز پر قادر ہے، معروف طریقے سے بے نیاز ہو کر کلام فرمائے تو اس میں کیا محال لازم آتا ہے۔ کتب اشاعرہ میں یہ جو کلام نفسی مذکور ہے، کتاب وسنت سے اس کی بو تک محسوس نہیں ہوتی ہے۔ اور اس کے اور اللہ تعالیٰ کی صفت علم کے مابین بجز اعتباری فرق کے تمیز کرنا مشکل ہے۔

اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کا بیان:

اللہ تعالیٰ آسمانوں کے اوپر عرش پر ہے۔ عرش اور اس کے آس پاس کی سب چیزیں اس کے ہاتھ میں یوں ہی ہیں جس طرح ایک شخص کے ہاتھ میں رائی کا دانہ ہوتا ہے۔ اس کا علم بلند اور پست ہر قسم کی موجودات کو محیط ہے۔ جو کچھ ہو چکا یا جو آئندہ ہوگا سب اس کے احاطے میں ہے، چنانچہ اس نے خود کتابِ محکم میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [طٰہٰ: ٥] [وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا]

اللہ تعالیٰ کے عرش پر استوا کا ذکر قرآن مجید میں سات جگہ آیا ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ جو چیز جس طرح پر وارد ہے اور قرآن میں آئی ہے اسے اسی طرح پر اعتقاد کرنا چاہیے، اس کی تاویل نہ کرنا چاہیے اور اسے اس کی صورت سے پھیرنا نہ چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾ [الطلاق: ١٢]

[اللہ نے ہر چیز کو علم سے گھیر رکھا ہے]

قرآن مجید میں استوا کا ثبوت:

قرآن مجید کی مندرجہ ذیل مختلف آیات مسئلہ استوا پر صراحتہ دلالت کرتی ہیں:

﴿اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ﴾ [الفاطر: ١٠]

[اسی کی طرف ہر پاکیزہ بات چڑھتی ہے]

﴿رَافِعُكَ اِلَیَّ﴾ [آل عمران: ٥٥] [تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں]

﴿بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ﴾ [النساء: ١٥٨] [بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا]

﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَیْهِ﴾ [المعارج: ٤]

[فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں]

﴿یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ﴾ [السجدة: ٥]

[وہ آسمان سے زمین تک (ہر) معاملے کی تدبیر کرتا ہے، پھر وہ (معاملہ) اس کی طرف اوپر جاتا ہے]

﴿یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ﴾ [النحل: ٥٠]

[وہ اپنے رب سے، جو ان کے اوپر ہے، ڈرتے ہیں]

﴿تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ﴾ [الزمر: ١]

[اس کتاب کا اتارنا اللہ کی طرف سے ہے جو سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے]

﴿ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ﴾ [الملك: ١٦]

[کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے]

جب موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میرا اللہ آسمان پر ہے تو فرعون کی طرف سے بطورِ اعتراض اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے:

﴿یٰهَامٰنُ ابْنِ لِیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓی اِلٰهِ مُوْسٰی وَاِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا﴾ [المؤمن: ٣٦، ٣٧]

[اے ہامان! میرے لیے ایک بلند عمارت بنا، تاکہ میں راستوں پر پہنچ جاؤں۔ آسمانوں کے راستوں پر، پس موسیٰ کے معبود کی طرف جھانکوں اور بے شک میں اسے یقیناً جھوٹا گمان کرتا ہوں]

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ علو کے ثبوت میں اس طرح کے کئی ایک دلائل موجود ہیں، چنانچہ یہ دلائل اس امر پر نص یا ظاہر ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر اپنی مخلوقات سے اس طرح جدا اور الگ ہے جس طرح کہ اس کی ذاتِ قدس کے لائق ہے اور ان کی تاویل کرنا نص یا ظاہر کو اس کے معنی سے نکالنے کے مترادف ہے جو صرف اسی وقت جائز ہے جب کوئی اس جیسی نص یا ظاہر اس کے خلاف آ جائے، وگرنہ درست نہیں اور یہاں کسی مخالف دلیل کا وجود نہیں اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [الشورىٰ: ١١] [اس کی مثل کوئی چیز نہیں] بھی اس کے منافی نہیں ہے، کیوں کہ یا تو جمیع وجوہ کے ساتھ مماثلت مراد ہے جس طرح اہلِ سنت کہتے ہیں یا اخص اوصاف میں جس طرح معتزلہ کا قول ہے۔ پس مماثلت کی یہ دونوں صورتیں اس جگہ مفقود ہیں اور اس سے باری تعالیٰ کا ایک حال سے دوسرے حال پر تغیر، جو امارات حدوث ہے، لازم نہیں آتا ہے، کیوں کہ جس طرح ایجادِ عالم اور تسمیہ بالموجد سے کوئی تغیر نہیں ہوا ہے، اسی طرح عرش کو پیدا کرنے اور اس پر مستوی ہونے سے بھی کوئی تغیر نہیں ہوتا ہے۔

احادیث میں استوا کا ثبوت:

احادیث نبویہ میں یہی حکم پایا جاتا ہے۔ لہٰذا جو کچھ ان احادیث میں بیان ہوا ہے اس سب پر ایمان لانا چاہیے اس میں کسی طرح کی تاویل و تحریف کرنا ہرگز جائز نہیں۔ اس موضوع کے دلائل مندرجہ ذیل احادیث بھی ہیں:

① بخاری و مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس لوحِ محفوظ کے حق میں مروی ہے جس پر یہ لکھا گیا ہے:

«سَبَقَتْ رَحْمَتِي عَلَى غَضَبِي فَهُوَ عِنْدَهُ فَوْقَ الْعَرْشِ»[1]

[میری رحمت میرے غضب پر سبقت کر گئی، پس یہ (تحریر) اس کے پاس عرش کے اوپر ہے]

دوسری روایت میں لفظ «مَوْضُوعٌ» اور تیسری روایت میں «مَكْتُوبَةٌ عِنْدَهُ»[2] آیا ہے۔

② بخاری میں معراج کے قصے میں انس رضی اللہ عنہ سے یوں مروی ہے:

«دَنَا الْجَبَّارُ رَبُّ الْعِزَّةِ وَتَدَلّٰى»

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٧٥١)

[2] الفوائد المنتقاۃ لابن أبي الفوارس (٥٤) نیز دیکھیں: صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٧٠٠)

[اللہ جبار رب العزت آپ ﷺ کے قریب ہوا اور اترا]

اسی قصے میں یہ بھی ہے:

«قَالَ لَهُ مُوسٰی اِرْجِعْ إِلٰی رَبِّكَ»

[آپ (ﷺ) کو موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: اپنے رب تعالیٰ کی طرف پلٹ جاؤ]

یہ الفاظ بھی اس قصے میں ہیں:

«فَعَلَا بِهِ إِلَی الْجَبَّارِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی فَقَالَ وَهُوَ مَكَانَهُ»[1]

[پس وہ اللہ کی طرف بلند ہوئے اور اس نے اپنی جگہ پر ٹھہر کر فرمایا]

③ صحیح مسلم میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک لونڈی سے دریافت کیا: «أَيْنَ اللّٰهُ؟ فَقَالَتْ: فِي السَّمَاءِ، قَالَ: إِنَّهَا مُؤْمِنَةٌ»[2] [اللہ کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا: آسمان میں، آپ ﷺ نے فرمایا: یقیناً یہ مومنہ ہے]

④ شیخین (بخاری و مسلم) کے نزدیک ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

«أَنَا أَمِينُ مَنْ فِي السَّمَاءِ»[3] [میں آسمان والے کا امین ہوں]

⑤ صحیح بخاری میں زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«زَوَّجَنِيَ اللّٰهُ فَوْقَ سَبْعِ سَمٰوَاتٍ»[4]

[اللہ تعالیٰ نے ساتوں آسمانوں کے اوپر سے میرا نکاح (رسول اللہ ﷺ سے) کر دیا]

⑥ ابوداؤد میں یوں منقول ہے:

«رَبَّنَا الَّذِي فِي السَّمَاءِ تَقَدَّسَ اسْمُكَ»[5]

[اے ہمارے آسمان میں موجود رب! تیرا نام پاکیزہ ہے]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٧٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٨٤)

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٩٦)

[6] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٤١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٢٤)

⑦ ترمذی میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«اِرْحَمُوا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ»[6]

[تم اہلِ زمین پر رحم کرو، تم پر عرش بریں والا رحم کرے گا]

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔

⑧ مسند شافعی میں جمعہ کے فضائل کی بابت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے:

«وَهُوَ الْيَوْمُ الَّذِي اسْتَوىٰ فِيهِ رَبُّكَ تَبَارَكَ وَتَعَالىٰ عَلَى الْعَرْشِ»[1]

[اور یہی ہے وہ دن جس میں تیرا رب تبارک وتعالیٰ عرش پر مستوی ہوا]

⑨ ابن ماجہ میں جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے:

«فَإِذَا الرَّبُّ قَدْ أَشْرَفَ عَلَيْهِمْ مِنْ فَوْقِهِمْ»[2]

[ناگہاں رب تعالیٰ نے انھیں ان کے اوپر سے جھانکا]

⑩ صحیح بخاری میں شفاعت کی بابت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے:

«فَأَدْخُلُ عَلىٰ رَبِّي وَهُوَ عَلىٰ عَرْشِهِ»

[میں اپنے رب تعالیٰ پر داخل ہوں گا جبکہ وہ اپنے عرش پر ہوگا]

بخاری میں بعض جگہ یہ الفاظ ہیں:

«فَأَسْتَاذِنُ رَبِّي فِي دَارِهِ»[3]

[میں اپنے رب تعالیٰ سے اس حال میں اجازت مانگوں گا جب وہ اپنے دار (گھر) میں ہوگا]

⑪ اللہ تعالیٰ کا ہر رات آسمانِ دنیا کی طرف نزول فرمانا ثابت ہے۔[4]

غرض کہ اس باب میں بہت سی احادیث مروی ہیں جن کا استقصا اور احاطہ کرنا اس مختصر سی تحریر میں دشوار ہے، اس کی بسط وتفصیل کسی اور مقام پر بیان ہوگی۔ انتہیٰ.

میں کہتا ہوں: استوا کے مسئلے پر میری اردو کتاب "الاحتواء علی مسئلة الاستواء" اور

---

[1] مسند الشافعي (٣٠٨) اس کی سند میں "ابراہیم بن محمد" متروک راوی ہے۔

[2] سنن ابن ماجه (١٨٤) اس کی سند میں "الفضل بن عیسی الرقاشي" راوی سخت ضعیف ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٠٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٥٨)

عربی کتاب "الانتقاد الرجیح بشرح الاعتقاد الصحیح" میں کتاب وسنت کی روشنی میں اچھی خاصی بحث مذکور ہے، بہت سے صحیح دلائل اور ائمہ سلف کے اقوال کے ساتھ مرقوم ہے۔

صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین اور تلامذہ ائمہ کے اقوال اس بارے میں بڑی کثرت سے مروی ہیں۔ امام محمد بن محسن عطاس رحمہ اللہ کی تالیف "تنزيه الذات والصفات من درن الإلحاد والشبهات" میں کسی قدر وہ اقوال منقول ہیں، لیکن آیات واحادیث ان اقوال سے مستغنی اور بے پروا کر دیتی ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: "الصباح يغني عن المصباح" یعنی صبح انسان کو ہر طرح کے چراغ سے بے پروا کر دیتی ہے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ حق تعالیٰ آسمان میں ہے نہ کہ زمین میں، اور خود امام صاحب نے فقہ اکبر میں فرمایا ہے: اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں نہیں جانتا کہ میرا رب آسمان میں ہے یا زمین میں تو وہ کافر ہو گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [طٰه: ٥] [وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا]

اس کا عرش ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے۔ شیخ ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ نے کتاب "ابانہ" میں اس عقیدے کی شرح کی ہے اور وہ اس کے قائل ہیں۔ شیخ عبدالقادر جیلی رحمہ اللہ جو قطب الاولیا ہیں، اسی عقیدے پر تھے۔ کتاب "غنیۃ الطالبین" میں، جو ان کی تحریرات مقدسہ میں سے ہے، انھوں نے اس اعتقاد کو بیان فرمایا ہے۔ پس جو لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر ایمان رکھتے ہیں، ان پر یہ لازم ہے کہ وہ بال برابر بھی اس عقیدے سے تجاوز نہ کریں اور اس عقیدے کے لوگوں کے ہمرنگ ہو جائیں اور دوسروں کی آرا اور اہوا کی طرف نہ جھکیں۔

رویتِ باری تعالیٰ کا بیان:

آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار، جس طرح چودھویں کا چاند دکھائی دیتا ہے، حق ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ رویت مکان میں ہوگی نہ جہت میں، مقابلہ واتصال شعاع کے ساتھ اور نہ رائی اور مرئی کے درمیان ثبوتِ مسافت کے ساتھ مگر کتاب وسنت اس سے خاموش ہیں۔ رویتِ باری تعالیٰ کی احادیث تواتر سے مروی ہیں اور آیتِ کریمہ:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ [القیامة: ۲۲، ۲۳]
[اس دن کئی چہرے تروتازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھنے والے]
بھی اس پر دلیل ہے۔ سلف صالحین اور ائمہ مجتہدین نے اس پر اجماع کیا ہے۔

صفاتِ الٰہیہ میں جہمیہ کی گمراہی:

جہمیہ نے اللہ تعالیٰ کو ایسی صفات کے ساتھ متصف بتایا ہے جو عدمِ محض کے سوا کہیں نہیں ملتیں۔ انھوں نے رویت، استوا اور تمام صفات کی نفی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں ذلیل و رسوا کرے۔ ائمہ اہلِ سنت ہمیشہ اثباتِ حق اور تردیدِ باطل میں جدوجہد کرتے رہتے ہیں، جملہ اہلِ اسلام کے لیے ان کا اتباع لازم ہے۔ فإنهم مركز الحق.

صفاتِ الٰہیہ ذاتِ الٰہیہ کا عین ہے یا غیر؟

کتاب اللہ میں اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ خدا تعالیٰ کی صفات خدا تعالیٰ کی ذات کا عین ہیں یا اس سے کوئی شے زائد ہیں، مگر اسی قدر کہ اللہ تعالیٰ صفاتِ کمال کے ساتھ متصف ہے، اس لیے صفات کی نفی کرنے والے کے حق میں بڑا خوف اور خدشہ ہے۔ جو لوگ صفات کو اللہ تعالیٰ کی ذات کا عین کہتے ہیں، جو نہ عین اور نہ غیر کہتے ہیں، اور جو صفات کو ذات پر زائد اعتبار کرتے ہیں، یہ سب لوگ ایسی باتیں کہہ رہے ہیں جن کے وہ مکلف نہیں ہیں اور اعتقادات میں وہ وہ چیزیں داخل کر رہے ہیں جو ہرگز عقائد میں داخل نہیں ہیں۔ عفا الله تعالىٰ عنا وعنهم.

دنیا حادث ہے:

عالم اپنے جمیع اجزا کے ساتھ حادث ہے۔ وہ اجزا جو موجود ہونے سے پہلے اپنا وجود نہیں رکھتے تھے ان کا ایک ایک فرد اللہ تعالیٰ کے اختیار سے کتم عدم سے منصہ شہود پر جلوہ گر ہوا ہے اور اس کے علم و قدرت سے ہی خلعتِ وجود حاصل کی ہے۔ کسی چیز کے لیے اپنی مقرر حد سے تجاوز کرنا ممکن نہیں۔ وہ ہر روز کسی نہ کسی کام میں رہتا ہے۔ اس کی ساختِ کمال میں بے کاری کی گنجائش نہیں ہے۔

بندے کی خود مختاری:

بندے اپنے افعال میں اختیار رکھتے ہیں اور اسی کے سبب انھیں ثواب ملتا اور عذاب ہوتا ہے۔ نیک اعمال اللہ تعالیٰ کی رضا مندی اور محبت سے ہوتے ہیں اور بد اعمال اس کی رضا اور محبت

سے نہیں ہیں بلکہ محض اس کے ارادے سے ہوتے ہیں۔ حسنات پر ثواب دینا اور سیئات پر عقاب کرنا اس کا عدل ہے۔ کسی نے اس پر کوئی کام واجب نہیں کیا ہے الا یہ کہ وہ خود اپنے اوپر واجب کر لے۔ یقیناً اس نے اپنے اوپر رحمت کو لکھ لیا ہے، چنانچہ متعدد آیات و احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں۔

تکلیف کا اعتبار عقل، تمیز اور بلوغ پر ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ استطاعت فعل کے ہمراہ ہے تو گزارش یہ ہے کہ قرآن و حدیث اس پر ناطق نہیں ہیں۔ بندے کو اس چیز کی تکلیف نہیں دی جاتی جو چیز اس کی وسعت اور طاقت میں نہ ہو۔

بندوں کے افعال ... اللہ کی مخلوق:

افعالِ عباد اللہ کی مخلوق اور بندے کا فعل ہے۔ آیتِ کریمہ ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ [الصافات: ٩٦] [حالانکہ اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا اور اسے بھی جو تم کرتے ہو] اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ خالق نے خلق کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اور عمل کا انتساب لوگوں کی طرف کیا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ فعل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور کسب بندے کی طرف سے تو یہ بات عقل میں نہیں سماتی ہے اور کتاب و سنت اس کی موافقت نہیں کرتے ہیں۔

ہر شخص اپنی موت مرتا ہے:

مقتول اپنی اجل ہی سے فوت ہوتا ہے اور اجل ایک ہی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا﴾ [المنافقون: ١١]

[اور اللہ کسی جان کو ہرگز مہلت نہیں دے گا جب اس کا وقت آ گیا]

کئی آیات کریمات میں یہی ارشاد ہوا ہے۔

لوگ حلال و حرام سے جو کچھ بھی کھاتے ہیں وہ رزق ہے اور ہر شخص اپنا رزق پورا کرتا ہے۔ آیتِ کریمہ: ﴿وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ [هود: ٦] [اور زمین میں کوئی چلنے والا (جاندار) نہیں مگر اس کا رزق اللہ ہی پر ہے] کا اطلاق اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

عذابِ قبر حق ہے:

کافروں اور گناہ گار مومنوں کے لیے عذابِ قبر، اہلِ طاعت کے لیے قبروں میں نعمتوں کا حاصل ہونا، منکر و نکیر کا سوال، مردوں کا دوبارہ جی اٹھنا، اعمال کا وزن، کتاب کا ملنا، سوال و حساب

ہونا، حوض پر جانا اور پل صراط سے گزرنا سب حق ہے۔

شفاعت کا بیان:

پروردگار جل جلالہ کے اذن واجازت کے ساتھ پیغمبروں اور نیکوں کا اہلِ کبائر وغیرہ کے لیے شفاعت کرنا حق ہے۔ جو لوگ انبیا اور صلحا کی قبروں پر حاضری دے کر ان کا وسیلہ ٹھہراتے ہیں اور ان کی شفاعت کے خواہاں ہوتے ہیں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، کیونکہ یہ شفاعت کرنے والے ہرگز یہ قدرت نہیں رکھتے کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر شفاعت کریں۔ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کی عزت افزائی کرنا چاہے گا تو ان سے فرما دے گا کہ تم اس بندے کی شفاعت کرو، تب وہ اس کی شفاعت کریں گے۔ یہ لوگ اگر سالہا سال قبر پر حاضری دیتے رہیں اور صاحبِ قبر سے شفاعت چاہیں تو وہ ہرگز شفاعت نہیں کر سکتا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ﴾ [البقرۃ: ٢٥٥]

[کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے]

نیز فرمایا:

﴿مَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا شَفِیْعٍ﴾ [السجدۃ: ٤]

[اس کے سوا تمھارا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی سفارش کرنے والا]

قرآن مجید میں اسی طرح کی مزید آیات موجود ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اجازت کے ساتھ شفاعت پر دلالت کرتی ہیں۔ لہٰذا بندہ جو کچھ مانگے صرف اس اللہ ہی سے مانگے، جو ہر قریب سے زیادہ قریب ہے، اسی کی رحمت اور بخشش چاہے اور اسی سے اپنے لیے کوئی سفارشی طلب کرے جو اس کی اجازت سے اس کا کام کر دے۔ یہ باتیں اگرچہ آج کل کے گور پرستوں پر گراں گزریں، لیکن کیا کیا جائے حق بات ہی اطاعت کے لائق ہے۔

جنت وجہنم، معراج اور قیامت کی نشانیوں کا بیان:

بہشت ودوزخ اس وقت بالفعل موجود ہیں اور ہمیشہ باقی رہیں گی، یہ دونوں یا ان میں رہنے والے ہرگز فنا نہیں ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ کی معراج حالت بیداری میں اسی جسدِ اطہر کے ساتھ مسجد حرام سے مسجد اقصی کی طرف پھر آسمانوں کی طرف اور سدرۃ المنتہیٰ کی طرف حق ہے۔ قیامت کی

نشانیاں جن کی خبر رسول اللہ ﷺ نے دی ہے، جیسے خروجِ دجال، دابۃ الارض، یاجوج ماجوج، عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نزول، آفتاب کا مغرب سے طلوع اور ظہور مہدی رحمہ اللہ وغیرہ سب حق ہیں۔

انبیا کی معصومیت:

کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر نہیں ہے۔ مقلد کا ایمان صحیح ہے، لیکن ترکِ استدلال کے سبب وہ گناہ گار ضرور ہے۔ انبیا علیہم السلام اجماعاً تبلیغِ رسالت میں نیز کبائر وصغائر اور صغائر کے عمداً ارتکاب سے معصوم ہیں۔ قرآن مجید سے بعض انبیا کے حق میں جو صغائر کا صدور معلوم ہوتا ہے تو قرآن کی تحریف نہ کرنا چاہیے، بلکہ ﴿وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا﴾ [الأحزاب: ۳۸] [اور اللہ کا حکم ہمیشہ سے اندازے کے مطابق ہے، جو طے کیا ہوا ہے] کو نظر میں رکھنا چاہیے۔

فضائل و درجاتِ صحابہ کا بیان:

انبیا میں سے سب سے افضل محمد ﷺ ہیں۔ ملائکہ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، نر و مادہ کے وصف سے پاک ہیں، وہ گناہ نہیں کرتے ہیں، نافرمان نہیں بنتے ہیں اور وہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں۔ اولیا کی کرامات حق ہیں۔ کوئی ولی نبی کے درجے کو نہیں پہنچتا ہے۔ اولیا میں سے افضل ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، پھر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، پھر عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ اور پھر علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ۔ خلافت بھی اسی ترتیب پر ہے۔ عشرہ مبشرہ، سیدۃ النسا فاطمہ زہرا، حسن، حسین اور وہ سب لوگ جنھوں نے رسول اللہ ﷺ سے جنت کی بشارت پائی ہے ان کے حق میں جنت کی گواہی دینا چاہیے، لیکن کسی اور کے حق میں ایسی یقینی گواہی دینا درست نہیں۔

مسلمانوں کے امام کی صفات وغیرہ کا ذکر:

مسلمانوں کے لیے ایک قریشی امام کا ہونا ضروری ہے جو احکامِ اسلام کی تنفیذ پر قادر ہو اور وہ مسلمان، آزاد اور مکلّف ہو۔ امام جور وفسق سے معزول نہیں ہوتا ہے۔ ہر نیک اور فاجر کے پیچھے نماز ادا کرنا جائز ہے اور ان میں سے ہر ایک کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے۔ سفر میں تین شب وروز اور مقیم کے لیے ایک رات اور دن موزوں پر مسح کرنا جائز ہے۔ جادو واقع ہو جاتا ہے۔ انبیا اور غیر انبیا پر اس کا چل جانا جائز ہے۔ نظر کا لگ جانا بھی جائز ہے۔

نصوصِ شرعیہ کو ظاہر پر محمول کیا جائے:

مجتہد کبھی خطا کرتا ہے پھر بھی ایک اجر پاتا ہے اور کبھی صواب کو پہنچتا ہے اور دو اجر پاتا ہے،

کیونکہ حق تو ایک اور معین ہے۔ کتاب وسنت کی نصوص شرعیہ اپنے ظاہر پر محمول ہیں جو کچھ ان میں سے سمجھ میں آئے اور اس کا اطلاق عرف میں جائز ہو، اس کا عقیدہ رکھے اور جو موہم جسمیت وغیرہ ہو اس کا بھی ظاہر کے مطابق اعتقاد کرے، لیکن اس کے لازم متبادر سے بیزاری اختیار کرے اور اللہ ورسول کی مراد پر اسے مقبول رکھے۔ ان صفات کے اطلاق سے، جو شریعت میں وارد ہوئی ہیں، وہم لزوم کے سبب کسی دوسری چیز سے کنارہ کشی اختیار نہ کرے۔ جو صفت جس لفظ کے ساتھ آئی ہے اس کا اطلاق اسی طرح پر بے تکییف کرے۔ بعض مسائل میں ہر فرقے نے یہ بات اختیار کی ہے، چنانچہ اشاعرہ وغیرہ نے رویت وغیرہ امور میں، جو آخرت کے متعلق ہیں، راہِ تاویل کو بند کر دیا ہے اور جو کچھ وارد ہوا ہے وہ اسے بے کیف قبول کرتے ہیں۔ معتزلہ حیات کی نفی نہیں کرتے ہیں، حالانکہ ان کے اس قاعدے سے جسمیت لازم آتی ہے، ناچار سلبِ کیفیت کے قائل ہو کر ان صفات پر ایمان لانا چاہیے، جس طرح کہ یہ قرآن وحدیث میں وارد ہوئی ہیں۔

صفات سے متعلق اہلِ حدیث کا عقیدہ:

اہلِ حدیث، جو قدوۂ اہلِ سنت ہیں، ہر باب میں یہی اعتقاد رکھتے ہیں، جو کچھ وارد ہوا ہے اس پر ایمان لاتے ہیں اور اوہامِ عوام میں جو کچھ لازم آتا ہے اس پر نظر نہیں کرتے ہیں۔ تم انھی کو اپنے لیے نمونہ بناؤ، کیوں کہ وہی اہلِ رسول ہیں۔

أهل الحديث هم أهل النبي وإن
لم يصحبوا نفسه أنفاسه صحبوا

[اہل الحدیث اہلِ نبی ہیں، اگرچہ وہ بذات خود آپ ﷺ کی صحبت میں نہیں رہے، لیکن انھیں آپ ﷺ کی سانسوں (حدیثوں) کی صحبت میسر آئی ہے]

اس جماعت پر افسوس ہے جو قرآن وسنت میں وارد ہونے والے الفاظ پر ایمان لانے کو صرف اس لیے کفر جانتی ہے کہ اس سے جسمیت، مکان اور جہت کا وہم ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتی، کیونکہ جو شخص مذکورہ ظواہر الفاظ پر ایمان لایا ہے اس نے اپنی طرف سے کچھ ایجاد نہیں کیا، آخرت میں اگر اس سے اس بات پر مواخذہ کیا جائے گا تو یہ ظلم ہوگا اور آیتِ کریمہ: ﴿وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾ [آل عمران: ۱۸۲] [بے شک اللہ بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں]

اس مواخذے سے منکر ہے۔ فاسد آرا کے ساتھ چند عقائد مقرر کرنا اور اس کے سوا کو کفر جاننا، گو وہ الفاظ ظواہر قرآن وحدیث میں ہوں، اصل میں قرآن وحدیث کو غلط قرار دینا ہے۔ حق تعالیٰ نے بیان کے لیے قرآن کریم نازل فرمایا ہے اور رسول اللہ ﷺ افصح الناس تھے، پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ ظاہر میں ایسے الفاظ کا اطلاق کرتے جن پر اعتقاد لانا کفر ہوتا۔ یہ جرأت ہوئی تو ایسی جماعت کو کہ ان میں بچہ جوان ہو گیا اور جوان بوڑھا ہو گیا اور عادت، جو ایک طبیعت ثانی ہے، اس سے جاملی اور حقیقت کی تفتیش کیے بغیر اندھے اور بہرے کی مانند اس کے اذعان و اعتقاد کی طرف دوڑ پڑے اور اپنے ایمان کو برباد کر دیا۔

خبردار! ان کی تقلید کی راہ پر ہرگز نہ چلنا چاہیے، اگرچہ وہ لوگوں کی نظر میں اعلم زمان اور شیخ المشائخ ہی کیوں نہ ہوں۔ بخدا! حق تعالیٰ عادل ہے، وہ اس شخص سے جو کتاب وسنت کے ظاہر کے مطابق کہتا ہے اور واضح قرآن وحدیث پر ایمان لایا ہے، ہرگز ناخوش نہ ہو گا۔ اس کا عدل ظلم کا مقتضی نہیں ہے۔ بے کیف ظواہر پر ایمان لانا صحابہ، تابعین اور ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ کا مذہب ہے۔ اگر کوئی یہ چاہے کہ وہ سلف کی اس جماعت سے ایک حرف بھی اس کے خلاف نقل کرے تو وہ ہرگز نہیں کر سکتا۔

وزنِ اعمال:

قیامت کے دن میزان، اعمال کا وزن، پل صراط اور سوال وجواب وغیرہ امور حسیہ سے ہوں گے۔ معانی واعراض جسم اور جواہر کی صورت اختیار کر لیں گے، چنانچہ نیکوکار مومنوں کے دائیں ہاتھ میں اعمال نامے دیے جائیں گے اور کفار وفجار کے اعمال نامے بائیں ہاتھ میں یا پشت کے پیچھے سے دیے جائیں گے۔

تقوی اور اس کی اہمیت:

جب اس اعتقاد کے ساتھ، جو کتاب وسنت کا خلاصہ ہے، شاہدِ ایمان کا چہرہ نورانی ہو جائے تو اب طالبِ نجات کو یہ چاہیے کہ وہ تقوی وپرہیز گاری کو، جو اعمال کی بنیاد ہے، اختیار کرے اور جس کام کو پیش نہاد خاطر رکھتا ہو، اس میں اس تقوے سے انحراف نہ کرے۔ کتاب اللہ کی وہ آیات جو تقوے کی فضلیت پر دلالت کرتی ہیں ڈیڑھ سو سے زیادہ ہیں اور چالیس سے زیادہ آیات میں تقوے کا حکم دیا گیا ہے۔ خصائلِ خیر میں ذکر وثنا کے اعتبار سے کوئی چیز تقوے سے بڑھ کر نہیں ہے۔ اسی طرح

احادیث مبارکہ میں بھی تقوے کے بارے میں تفصیلِ خیر بیان ہوئی ہے۔ ﴿ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ﴾ [الحجرات: ١٣] جو شخص متقی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا محب، ولی اور مزکی وناصر رہتا ہے، اس کے لیے حسن عاقبت اور حسن مآب مہیا ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کا مقرب ہے، اس کے حق میں جنت کا وعدہ ہے، یہ تقویٰ اس کا زاد ولباس ہے۔

ثواب، دفعِ کید، امداد، مغفرت، رحمت، گناہوں کے کفارے اور حصولِ برکات کی شرط اور سبب ہے اور حق وباطل کے درمیان ایک تفرقہ اور فرق ہے، تنگی معاش سے خروج ہے اور رزق کا اس جگہ سے ملنا ہے جہاں سے گمان بھی نہ ہو اور یہ اس کے لیے اجرِ عظیم، صلاحِ عمل، فلاح حال اور شکر کا موجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم دیا ہے کہ وہ تقوے میں ایک دوسرے کے معاون رہیں۔ جو شخص اس تقوے کا حکم دیتا ہے اس کی مدح کی ہے اور سارے اولین وآخرین کو اسی تقوے کی وصیت کی ہے۔ اگر طالبِ نجات اور سالکِ سبیل آخرت طلبِ سکون کے دعوے میں سچا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ عاشقِ تقویٰ رہے اور ایسے انداز میں اس کا شیفتہ وفریفتہ ہو کہ پھر کوئی چیز اسے تقوے سے نہ روک سکے، اگرچہ سارے جن وانس اس کے خلاف جمع ہو جائیں۔

شیطان کی عداوت:

شیطان انسان کا ایک قوی دشمن ہے، اس کی فریب کاریوں سے کتاب وسنت کے توسل کے بغیر امن حاصل نہیں ہوسکتا۔ نفسِ امارہ شیطان کا خادم ہے وہ جس طرح چاہتا ہے اسے کھینچ لیتا ہے۔ آدمی کو تقوے کی ظاہری صورت دکھا کر تقوے کے معنی سے عاری کر دیتا ہے جس طرح کہ اکثر اہلِ دعویٰ کے حالات سے ظاہر ہے، لہٰذا مکائدِ نفس سے بھی پرہیز کرنا ضروری اور لازم ہے۔

تقوے کا معنی ومفہوم:

تقوے کے معنی کو خوب پہچان لینا چاہیے، تاکہ اس کا استعمال آسان ہو جائے۔ لغوی لحاظ سے تقویٰ پرہیز گاری کو کہتے ہیں، جبکہ شریعت میں اس کے ایک عام معنی ہیں اور ایک خاص۔ عام معنی اس چیز سے اجتناب کرنا ہے جو آخرت میں مضر ہو، یہ صورت زیادت اور نقصان کو قبول کرتی ہے، اس کا ادنا درجہ یہ ہے کہ وہ شرک سے بچے جو آگ کو واجب کرنے اور دوزخ میں ہمیشہ رہنے کا سبب ہے۔ اس کا اعلا درجہ یہ ہے کہ جو چیز سالک کو حق تعالیٰ سے باز رکھے اور منقطع الی اللہ ہونے سے مانع

ہو اس سے گریز کرے، اسی کو حقیقی تقوی کہتے ہیں، چنانچہ آیتِ کریمہ: ﴿اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ [آل عمران: ۱۰۲] سے یہی تقوی مراد ہے اور دوسرا تقوی شرع میں مشہور ہے۔ جب تقوے کا اطلاق کیا جاتا ہے اور کوئی قرینہ موجود نہیں ہوتا تو اس سے یہی تقوی مراد ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو ہر اس چیز سے بچائے جس سے وہ سزا کا مستحق ہو جاتا ہے، خواہ وہ چیز قول ہو یا فعل یا ترک۔ اس تقوے میں کبائر سے اجتناب کرنا لازم ہوا اور صغائر میں قدرے اختلاف ہے۔ یہ تقوی تب ہی حاصل ہوتا ہے جب بندہ منکرات اور امورِ منہیہ سے اجتناب کرے اور معروفات اور امورِ مامورہ کو بجا لائے۔ ان منکرات اور معروفات کا ہر ایک عضو سے تعلق ہے۔ لہٰذا طالبِ نجات کو چاہیے کہ وہ ان چیزوں کی طرف آنکھ نہ اٹھائے جن کی طرف دیکھنا منع ہے، ایسی چیز پر کان نہ لگائے جس کا سننا حرام ہے، وہ نہ پکڑے جس کا پکڑنا گناہ ہے، وہ نہ کھائے جس کی اجازت نہیں ہے، وہ نہ پیئے جس کا پینا ناجائز ہے، بے فائدہ اور بے ہودہ بات منہ سے نہ نکالے، وہ راستہ نہ چلے جس سے منع کیا گیا ہے، وہ نہ پہنے جس کا پہننا حرام ہے۔ ایسے ہی وہ حرام سجدے سے بچے اور اپنی شرمگاہ کو محرمات میں استعمال نہ کرے، وعلی هذا القیاس.

اصلاحِ قلب اور اس کی اہمیت:

منکرات میں سے اعظم اور بڑا منکر انسان کا دل ہے، کیونکہ اس کے فساد و بگاڑ سے سارا بدن فاسد ہو جاتا ہے، لہٰذا اس کی اصلاح کرنا تمام اشیا سے زیادہ اہم ہے، کیوں کہ سارے اعضا اسی کے تابع ہیں۔ دل کا فساد اخلاقِ سیئہ سے ہوا کرتا ہے اور اس کی اصلاح اخلاقِ حسنہ سے ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے چاہیے کہ وہ ہر بدعت کو اس کے مقابل نیک عادت سے تبدیل کرے، چنانچہ وہ کفر کو ایمان سے، نفاق کو اخلاص سے، غضب کو رضا سے، اشتغال بالغیر کو اشتغال بالحق سے تبدیل کرے۔ علی ہذا القیاس جب ہر کام میں تقوی مدنظر ہوگا تو رفتہ رفتہ یہ منکرات معروفات سے بدل جائیں گی اور بدعادتیں نیک خصلتوں کے ساتھ بدل جائیں گی۔ فضائل حاصل ہوں گے اور رزائل ایک ایک کر کے دور ہو جائیں گے۔ پھر تھوڑا تھوڑا کر کے اشتغال بالغیر کم ہونے لگے گا اور اس کی بجائے اشتغال بالحق قوت پکڑے گا، یہاں تک کہ دل اشتغال بالغیر سے بالکل نجات پا جائے گا اور تمام و کمال جنابِ حق تعالیٰ کی طرف مائل ہو جائے گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ معرفتِ حقیقی کا دریچہ دل پر کھول دیں گے اور بطریق

علم جو کچھ معلوم کیا ہے وہ سب بطور کشف وعیان کے مشاہدہ ہونے لگے گا، استدلال بداہت ہو جائے گا اور کتاب وسنت میں جو کچھ ہے اس کی طرف زیادہ مائل ہو جائے گا۔ اس کی حقیقت کا اعتقاد ترقی پکڑنے لگے گا اور وہ بدعت اور اہلِ بدعت سے انحراف کرے گا۔

دادیم ترا ز گنج مقصود نشان
گر ما نرسیدیم تو بارے برسی

[ہم نے تجھے مقصود کے خزانے سے ایک نشانی اور علامت بتا دی ہے، اگر ہم اس تک نہیں پہنچ پائے تو ایک دفعہ اس تک ضرور پہنچ جانا]

اس مختصر کلام کا نام ''رسالہ نجاتیہ'' ہے۔ وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین، وصلی الله علی سیدنا محمد وعلی آله وصحبه أجمعین.

سترھویں فصل

کتاب ''سبع سنابل'' مولفہ میر عبد الواحد بلگرامی رحمہ اللہ کے مطابق مذاہبِ صوفیہ صافیہ رحمہم اللہ کے عقائد کا بیان

علمائے کرام کے، جو انبیا علیہم السلام کے وارث ہیں، تین گروہ ہیں: ① اصحابِ حدیث، ② فقہا، ③ صوفیہ۔ اصحابِ حدیث نے کتاب اللہ کے ساتھ اعتصام کرنے کے بعد ظاہر حدیث کا مذہب اختیار کیا ہے اور یہی علم دینِ اسلام کی اساس ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ [الحشر: ۷]

[اور رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے تو رک جاؤ]

ان اصحابِ حدیث کا شغل یہ ہے کہ یہ حدیث کو سنیں، نقل کریں، لکھیں، صحیح وسقیم میں تمیز کریں اور آحاد، مشہور اور متواتر احادیث میں فرق کریں۔ احادیث کو کتاب اللہ سے موافقت بخشیں۔ پس یہ گروہ دین کا نگاہ بان ہے۔ فقہا نے علومِ اصحابِ حدیث کے استیفا کے بعد ایک اور خصوصیت اور فضلیت حاصل کی ہے کہ وہ حدیث سے فقہ کا استنباط کرتے ہیں اور دقائقِ نظر کے ساتھ حقائق حدیث کو دریافت کر کے احکام وحدود کی ترتیب اور ناسخ ومنسوخ، مطلق ومقید، مجمل ومفسر، خاص وعام اور محکم ومتشابہ کی تمیز عمل میں لاتے ہیں۔[1] یہ لوگ حکام دین اور اَعلام شرع مبین ہیں۔ ان کا اجتہاد ایک شرعی اصل ہے۔ معتقدات اور قبولِ علوم میں طائفہ صوفیہ ان دونوں گروہوں کے ساتھ متفق ہے۔ معانی ورسوم دونوں میں ان کے مخالف نہیں ہیں۔ جن احکام میں ان دونوں گروہوں کا اجماع ہے

① ائمہ محدثین حفظِ حدیث اور تدوینِ سنت کے ساتھ ساتھ فقہ الحدیث اور اس سے متعلق دیگر علوم میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں جیسا کہ ان کی ترتیب شدہ مصنفات سے عیاں ہے۔ کیوں کہ ان کی مولفات میں احادیث سے فقہی مسائل کا استنباط، ناسخ ومنسوخ اور دیگر تمام علوم کی معرفت بہ آسانی ممکن ہے، البتہ وہ ایسی خود ساختہ ''فقہ'' سے یقیناً بے زار ہوتے ہیں جس میں آراء الرجال اور قیل وقال کی کثرت اور دور از کار فرضی مسائل کا ذخیرہ ہوتا ہے۔

صوفیہ بھی ان کے اجماع پر قائم ہیں، جن احکام میں ان کا اختلاف ہے، وہاں پر صوفیہ احسن اور اولیٰ کو اختیار کرتے ہیں، چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ﴾ [الزمر: ١٧، ١٨]

[سو میرے بندوں کو بشارت دے دے۔ وہ جو کان لگا کر بات سنتے ہیں، پھر اس میں سب سے اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں]

اسی جگہ سے یہ بات لی گئی ہے کہ طریقت شریعت کا خلاصہ اور نچوڑ ہے اس کے علاوہ یہ کوئی اور چیز نہیں ہے۔

صوفیہ مذکورہ بالا دو گروہوں کے فروعی اختلاف کے منکر نہیں ہیں، کیونکہ علما کا اختلاف رحمت ہے۔ کسی صوفی سے پوچھا گیا کہ وہ کون سے اہلِ علم ہیں جن کا اختلاف رحمت ہے؟ اس نے جواب دیا:

"هم المعتصمون بكتاب الله تعالىٰ، المجاهدون في متابعة رسول الله ﷺ المقتدون بالصحابة"

[جو لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامنے والے، رسول اللہ ﷺ کی متابعت میں مجاہدہ کرنے والے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اقتدا کرنے والے ہیں]

دین کی فروع میں اختلاف رحمت ہے اور اصولِ دین میں بدعت اور ضلالت۔[1]

صفاتِ الٰہیہ کا بیان:

اصل اعتقاد کا بیان یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی جب کہ ان میں سے نجات پانے والا صرف ایک گروہ ہوگا۔ پوچھا گیا: وہ کون سا گروہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: «مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِيْ»[2] [جو میرے اور میرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقے پر گامزن ہوگا] یعنی وہ گروہ اہلِ سنت وجماعت کا گروہ ہے۔

---

[1] اختلاف و افتراق بہر حال مذموم ہے خواہ وہ اصول میں ہو یا فروع میں، کیوں کہ قرآن وسنت میں ہمہ جہتی اختلاف کی ممانعت ہے اور اس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اختلاف کے رونما ہونے کے بعد ہر مسلمان کے لیے امرِ الٰہی ہے: ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾ [النساء: ٥٩]

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١)

اہلِ سنت کے مذکورہ بالا تینوں گروہوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد حقیقی ہے، وہ اپنا کوئی شریک، ضد، ند، شبیہ اور مثل نہیں رکھتا ہے، کیونکہ ان چیزوں کی گنجایش واحد عددی میں متصور ہوتی ہے نہ کہ واحد حقیقی میں۔ اللہ تعالیٰ جسم نہیں ہے، کیونکہ جسم دو یا دو سے زیادہ چیزوں سے بنتا ہے۔ وہ جوہر بھی نہیں ہے، کیونکہ جوہر کسی چیز میں متحیز ہوتا ہے۔ وہ عرض بھی نہیں ہے کیونکہ عرض دو زمان تک باقی نہیں رہتا۔ عبارات واشارات حق تعالیٰ کی کنہ کے بیان کو نہیں پہنچتے اور افکار وابصار اسے نہیں پا سکتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وجود زمان ومکان سے پہلے ہے اور صفتِ کیفیت وکمیت سے منزہ، ان میں جو چیز آ سکتی ہے وہ واحد عددی ہوتی ہے نہ کہ واحد حقیقی۔ اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات بھی جسم، جوہر اور عرض نہیں ہیں بلکہ ویسی ہیں جیسے اس کی ذات۔[1] ائمہ کشف اور اساطینِ مشاہدہ کے سامنے اسما وصفات ایک معنی میں دو مترادف لفظ ہیں۔[2] ساداتِ طریقت اور خزنۂ اسرارِ وحدت، جنھوں نے مشکات نبوت سے اقتباس کیا ہے، انھوں نے یہ بات دیکھی اور جانی ہے کہ صفاتِ حق ایک وجہ سے عینِ ذات ہیں اور دوسری وجہ سے غیرِ ذات۔ عینِ ذات تو اس وجہ سے ہیں کہ کوئی دوسرا موجود نہیں ہے جو مغائر ذات ہے اور غیرِ ذات اس وجہ سے ہیں کہ اس کے مفہومات علی الاطلاق مختلف ہیں۔ حی، عالم، مرید اور قادر ایسے اسما ہیں کہ ان کے معانی ذاتِ قدیم کے ساتھ قائم ہیں۔ اہلِ بصیرت کے سامنے اسما علی الحقیقت وہی معنی قدیم ہیں۔

یہ اسما کے الفاظ اسما ہیں۔ اس طرح کے اسما کو صفات ثبوتی کہتے ہیں۔ یہ چاروں نام الوہیت کے چار رکن ہیں۔ رہے معز، مذل، محی، ممیت، معطی، مانع، ضار اور نافع تو یہ نام نسبت سے اٹھتے ہیں اور اس نوع کو صفات اضافی کہتے ہیں۔ سلام، قدوس اور غنی میں عیوب، نقائص اور احتیاج کا سلب

---

[1] اس بات سے دل نہایت قلق میں ہے کہ اہلِ علم کے یہ بیان کردہ الفاظ ایسے عام ہو گئے ہیں جو اکثر علما، صوفیہ اور فقہا کی زبان وقلم سے بے تکلف نکل جاتے ہیں۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ ان الفاظ کا مضمون ومدلول خلافِ تنزیہ ہے، تاہم یہ کہتے ہیں کہ تقدیس کے وہ الفاظ جو کتاب وسنت میں منصوص ہیں جو برکت، قوت اور بیان ان میں ہے وہ متکلمین کے ان تراشیدہ الفاظ میں نہیں ہے۔ ہمارے لیے یہی مناسب ہے کہ باری تعالیٰ کی تنزیہ وتقدیس انھی الفاظ سے کریں جو قرآن وحدیث میں آئے ہیں، ہم اسی میں اپنی عافیت جانتے ہیں۔ [مولف رحمہ اللہ]

[2] یعنی صفت عین اسم ہے، حالانکہ ہمیں اس معنی میں خوض کرنے کی کچھ حاجت نہیں ہے اور نہ ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ صفات ایک وجہ سے عین اور دوسری وجہ سے غیر ہیں۔ [مولف رحمہ اللہ]

ہے، چنانچہ اس نوع کو صفات سلبی کہتے ہیں۔ سارے اسما وصفات انھیں تین قسموں میں منحصر ہیں، لیکن صفات اضافی میں، جو اول، آخر، ظاہر اور باطن ہیں، یوں کہا ہے کہ اول عینِ آخریت میں ہے اور آخر عینِ اولیت میں، ظاہر عینِ باطنیت میں ہے اور باطن عینِ ظاہریت میں ہے۔

اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں وجہ، ید، نفس، سمع اور بصر کا ذکر کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اسے صحیح رکھا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے لیے بلا تمثیل وتعطیل ثابت ہے۔ صفتِ استوا علی العرش معلوم ہے، اس کی کیفیت مجہول ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس سے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔ صفت نزول میں ان (صوفیہ) کا مذہب بھی اسی طریق پر ہے۔

قرآن غیر مخلوق اور بہشت میں دیدارِ الٰہی برحق ہے:

اس پر بھی اجماع ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس کا کلام قدیم ہے، مخلوق نہیں ہے، مصاحف میں لکھا ہے، زبانوں پر پڑھا گیا ہے اور دلوں میں محفوظ ہے، لیکن ان چیزوں میں حلول کرنے والا نہیں ہے۔ اسی طرح بہشت میں سر کی آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رویت کے جواز پر اجماع ہے۔ اس مسئلے میں معتزلہ، زیدیہ اور خوارج مخالف ہیں اور وہ رویت کے منکر ہیں۔

کتاب اللہ اور حدیث مصطفیٰ کی خبر پر ایمان لانا واجب ہے:

اس پر اجماع ہے کہ ان سب امور کا اقرار کرنا اور ان پر ایمان لانا واجب ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کی خبر دی ہے، جیسے بہشت، دوزخ، لوح، قلم، حوض، صراط، شفاعت، میزان، حور، قصور، عذابِ قبر، سوال منکر ونکیر اور بعث بعد الموت۔ اس پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ بہشت اور دوزخ باقی اور پایندہ رہیں گی اور بہشتی ہمیشہ منعم اور دوزخی ہمیشہ معذب ہوں گے۔

افعالِ عباد اللہ کی مخلوق ہیں:

اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق ہے، جس طرح وہ ان کی ذات کا خالق ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ [الصافات: ٩٦]

[حالانکہ اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا اور اسے بھی جو تم کرتے ہو]

لیکن بندہ کاسب ہے۔ ساری مخلوق اپنی اجل اور موت سے مرتی ہیں۔ اطاعت، معصیت، ایمان اور کفر سب اللہ تعالیٰ کی قضا وقدر سے ہے، مگر اللہ تعالیٰ بندوں کے کفر اور معصیت سے راضی نہیں ہے۔ اس کے بارے میں کسی شخص کے لیے اللہ تعالیٰ پر کوئی حجت نہیں ہے۔

کسی کو قطعی جنتی اور جہنمی مت کہو:

ہر مسلمان، خواہ وہ نیکو کار ہو یا بدکار، اس کے پیچھے نماز ادا کرنا جائز ہے۔ کسی شخص کی صفات اور خیرات کے سبب، خواہ وہ کتنی زیادہ ہوں، اس کے قطعی طور پر بہشتی ہونے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ اسی طرح کسی شخص کی شرور وسیئات کی بنا پر، گو کتنی زیادہ ہوں، اس کے قطعی دوزخی ہونے کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔

محمد ﷺ افضل انبیا اور خاتم الرسل ہیں:

وہ ساری کتب منزلہ اور سارے پیغمبروں پر ایمان لاتے ہیں اور اس بات کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ انبیا ورسل تمام بشروں سے افضل ہیں اور محمد ﷺ جملہ انبیا ورسل سے افضل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر نبوت ورسالت کا سلسلہ ختم کر دیا۔

زبانِ نبوت سے جنت کی بشارت پانے والے خوش نصیب:

اس پر اجماع ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد تمام لوگوں سے افضل خلیفہ اول ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ، پھر عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ، پھر علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد عشرہ مبشرہ میں سے باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دس اشخاص کے متعلق دخولِ جنت کی خبر دی ہے اور قطعی طور پر حکم فرمایا ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ جنت میں ہیں، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید، عبدالرحمٰن بن عوف اور ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم جنت میں ہیں۔

شرح عقائد میں لکھا ہے کہ تین شخص اور ہیں جن کے لیے رسول اللہ ﷺ نے دخولِ جنت اور خیریتِ خاتمہ کی قطعی خبر دی ہے۔ ایک فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا جن کو بہشت کی عورتوں کا سردار فرمایا ہے۔ دوسرے حسن اور تیسرے حسین، رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو جنت کے نوجوانوں کے سردار قرار دیا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے میری امت کے ستر ہزار آدمی بغیر حساب جنت میں جائیں گے۔ عکاشہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: میرے لیے دعا کریں کہ میں بھی ان لوگوں میں شامل ہو جاؤں۔ آپ ﷺ

نے فرمایا: تو ان میں سے ہے۔ پھر ایک دوسرے صحابی نے کھڑے ہو کر یہی درخواست کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: «سَبَقَكَ بِهَا عُكَّاشَةُ»[1] [اس میں عکاشہ تم سے سبقت لے گیا ہے]

دوسری روایت میں آیا ہے کہ ان ستر ہزار میں سے ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار آدمی ہوں گے، یعنی جو بغیر حساب جنت میں جائیں گے۔[2]

پیغمبر فرشتوں سے افضل ہیں:

ان کا اس پر اجماع ہے کہ سارے پیغمبر فرشتوں سے افضل ہیں اور فرشتوں کے درمیان اسی طرح تفاضل ہے جس طرح پیغمبروں اور مومنوں کے درمیان تفاضل ہے۔

ایمان کی حقیقت کیا ہے؟

اس پر اجماع ہے کہ کمالِ ایمان زبان سے اقرار کرنا، دل سے تصدیق کرنا اور ارکان سے عمل کرنا ہے۔ جو ایمان کا اقرار نہیں کرتا وہ کافر ہے اور جو اس کی تصدیق نہیں کرتا وہ منافق ہے اور جو ارکان سے عمل نہیں کرتا وہ فاسق ہے۔ زبان سے اقرار کیے بغیر دل سے اللہ تعالیٰ کو پہچاننا کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ جو ایمان زبان کے اقرار سے مستحق وثابت ہوتا ہے اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی ہے۔ ہاں عمل بالارکان کرنے میں زیادتی اور نقصان ہوتا ہے اور دل کی تصدیق میں کچھ نقصان نہیں ہوتا ہاں زیادتی ہوتی ہے۔

اباحتِ کسب، تجارات اور صناعات پر نیکی اور تقوے میں تعاون کے طریق پر اجماع کیا گیا ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ مکاسب کو استجلابِ رزق کا سبب نہ جانے۔ اس پر بھی اجماع ہے کہ طلبِ حلال فرض ہے اور دنیا جہان رزقِ حلال سے خالی نہیں ہے۔ جس طرح حلال رزق ہے، اسی طرح حرام بھی رزق ہے۔ اس مسئلے میں معتزلہ مخالف ہیں، چنانچہ وہ حرام کو رزق شمار نہیں کرتے ہیں۔

مشتریِ ایمان ہوشیار باش:

اللہ تعالیٰ کے لیے دوستی اور دشمنی ایمان کا استوار تر رشتہ ہے۔ اس پر اجماع ہے کہ اولیا کی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٨)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٣٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٨٦)

کرامات پیغمبروں کے زمانے میں اور پیغمبروں کے غیر زمانے میں جائز ہیں۔ مذہب اہلِ سنت و جماعت کے علما، جو اصحابِ حدیث، طائفۂ فقہا اور جماعتِ صوفیہ ہیں، ان عقائد مرقومہ پر ایمان رکھتے ہیں۔

اے سچے سنی! تجھے اکثر امور میں ایمان بالغیب لانا چاہیے، کیونکہ تو اللہ تعالیٰ کو دیکھتا ہے نہ فرشتے تجھے ان سر کی آنکھوں سے دکھائی ہی دیتے ہیں۔ خود انبیا و رسل گزر چکے اور مرقدِ رحمت میں جا سوئے۔ آخرت کے امور اور قیامت کے احوال واقع ہونے والے ہیں، لٰہذا تو اب ان سب کو بغیر دیکھے ایمان کے ساتھ قبول کر۔ یہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی تعلیم وتلقین پر موقوف ہے۔ شریعت محمدی اور دین احمدی ایک طریق سلیم اور جادہ مستقیم ہے۔ خاتم النبیین ﷺ اولیا، اصفیا، شہدا اور صدیقین سے ہزارہا افواج امت کے ساتھ اسی راہ پر چل چکے ہیں۔ انھوں نے اس راستے کو خار وخاشاک اور شکوک وشبہات سے خوب پاک صاف کر دیا ہے، اس راہ کے اعلام ومنازل معین اور مبین کر دیے ہیں اور ہر قدم کا ایک نشان بتا دیا ہے۔

ہر منزل میں ایک مہمانی مہیا کر دی ہے۔ راہزن سے بچاؤ کے لیے بدرقہ ہمت ساتھ کر دیا ہے۔ اگر کوئی مبتدع کسی اور راہ کی طرف بلائے تو اس کی بات نہ سننا چاہیے، بلکہ دین حق کی نصرت کے لیے اس کا دفع کرنا منجملہ فرائض کے ہے۔ اہلِ بدعت وضلالت ایک ایسا گروہ ہے جو آپ کو اسلام کے لباس میں تلبیس کر کے ظاہر کرتا ہے اور اپنے عقائد فاسدہ کو باطن میں پوشیدہ رکھتا ہے، ظاہر میں مسلمانوں سے ملتا جلتا رہتا ہے، اپنے آپ کو مخلوق کے سامنے محقق علما کی صورت میں دکھاتا ہے، جس جگہ اس کا داؤ چل جاتا ہے، وہاں ایمانی عقائد کے افساد کے ساتھ قواعد مسلمانی کو ویران وبرباد کر دیتا ہے، سادہ اور پاک دلوں کو طہارتِ فطرت سے پھیر دیتا ہے، اپنے آپ کو اسلام کی سپر کے پیچھے چھپاتا ہے اور مخلوق کی نظر سے پوشیدہ طور پر لوگوں کو بدعت وضلالت کی طرف بلاتا ہے۔ سادہ دل مسلمان، جو نیک کو بد سے اور سنت کو بدعت سے نہیں پہچانتے، ان کو فصیح عبارتوں اور صحیح کلمات کے ساتھ دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔ لٰہذا یہ جماعت اور گروہ دین کے دشمن اور شیاطین کے بھائی ہیں۔ جب علماے دین اور مشائخ اسلام کے نور سے ان کی بدعت کے ظلمات مکشوف ہوتے ہیں تو ناچار یہ لوگ علماے شریعت کے دشمن بن جاتے ہیں۔

لیکن علماے ربانی، جو آسمانِ اسلام کے نجوم اور ستارے ہیں، لوگوں کو ان کے شر سے محفوظ رکھتے ہیں اور ان کے انفاس نورانی، جو روشن ستاروں کے مانند ہیں، ان شریعت کے لٹیروں کو ہر

جانب سے ہانکتے اور بھگاتے ہیں اور رجم وقذف کے ساتھ انھیں پراگندہ کر دیتے ہیں۔ اے بھائیو! اسرارِ سنت کے غوامض کا جاننا اور آثارِ بدعت کے دقائق کا معلوم کرنا نورِ ایمان وتسلیم اور بدرقۂ محبت وتعظیم کے بغیر محال ہے اور اس کا ادراک عقل کی حد میں نہیں ہے، کیونکہ عقل کا تصرف عالم حکمت سے آگے بڑھ کر نہیں ہے اور عالم قدرت میں اسے اصلاً اور قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔ جب عقل عالم قدرت کی کوئی بات سنتی ہے تو اس کے مستحیل ہونے کا حکم لگاتی ہے اور کہتی ہے کہ جو امر معقول نہیں ہے، وہ مقدور بھی نہیں ہے، یا وہ اس کی تاویل اور تحریف کی طرف جلدی کرتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَ نَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ﴾ [المائدۃ: ۱۳]

[وہ کلام کو اس کی جگہوں سے پھیر دیتے ہیں اور وہ اس میں سے ایک حصہ بھول گئے جس کی انھیں نصیحت کی گئی تھی]

اگر عقل اپنی حد پر ٹھہرتی اور عجز کے ساتھ عالم قدرت کا اقرار کرتی تو ہرگز غلطی میں نہ پڑتی۔

ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہ کی دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر فضیلت:

امام اعظم رحمہ اللہ سے پوچھا گیا تھا کہ اہلِ سنت وجماعت کا مذہب کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا: شیخین (ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما) کو فضیلت دے، ختنین (عثمان وعلی رضی اللہ عنہما) سے محبت رکھ، خفین پر مسح کر۔ ختنین کی فضیلت نقصان وقصور کے بغیر شیخین سے کم تر ہے۔ شیخین کے ساتھ محبت تفاوت وفتور کے بغیر ختنین کی محبت کے برابر ہے۔ سارے اصحاب رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین اور سائر علماے امت کا اسی عقیدے پر اجماع ہے۔ یہ اجماع متقدمین اور متاخرین کی کتابوں میں شائع اور عام ہے۔

قاضی شہاب الدین نے ”تیسیر الأحکام“ میں لکھا ہے کہ کوئی ولی کسی پیغمبر کے درجے کو نہیں پہنچتا ہے، اس لیے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پیغمبر کے بعد تمام اولیا سے برتر ہیں، مگر اس کے باوجود وہ کسی پیغمبر کے درجے کو نہیں پہنچے، پھر عمر، پھر عثمان اور پھر علی رضی اللہ عنہم ہیں۔ جو شخص علی مرتضی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نہ جانے وہ خارجی ہے اور جو کوئی انھیں شیخین پر فضیلت دے وہ رافضی ہے۔ انتھیٰ.

غرض کہ اہلِ سنت وجماعت کا مذہب یہی ہے کہ شیخین کو ختنین پر اور جملہ اصحاب پر فضیلت حاصل ہے۔ خلفاے راشدین کے فضائل، جن میں نادان لوگ اپنی عقل وفکر سے باتیں بناتے ہیں، اگر وہ ان فضائل کی حقیقت وماہیت جان لیں تو وہ اور حیران وششدر رہ جائیں اور مقدر ومعین نہ کر سکیں۔

آسمانوں وزمینوں کی وسعتوں کا بیان:

آفتاب کی وسعت کو آسمان کی وسعت کے مقابلے میں قیاس کرو کہ وہ کتنی ہو گی، آفتاب آسمان میں دریا میں کشتی کی مانند تیرتا پھرتا ہے۔ آسمان اول کی فراخی، آسمان دوم کی فراخی کے مقابلے میں بہت مختصر ہے۔ اسی طرح آسمان دوم کا حال آسمان سوم کی نسبت آسمان ہفتم تک ہے۔

زمین سے آسمان تک پانچ سو برس کا فاصلہ ہے۔ اسی طرح ایک آسمان کا دوسرے آسمان تک۔ پھر یہ ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں کرسی کی وسعت کے سامنے آسمان کے مقابلے میں ایک قبے کی مانند ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ﴾ [البقرۃ: ٢٥٥]

[اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو سمائے ہوئے ہے]

پھر کرسی عرش عظیم کی فراخی کی نسبت یہی حکم رکھتی ہے۔

مفضلہ فرقے کی گمراہی کا بیان:

پس جب شیخین کی فضیلت پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع واقع ہو چکا اور اس اجماع کے ساتھ علی مرتضی رضی اللہ عنہ بھی متفق تھے تو مفضلہ اپنے اعتقاد میں غلطی پر ہیں۔ وہ کون سا ازلی بدبخت ہو گا جسے علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے ساتھ محبت نہ ہو گی، یہ تو مفضلہ کا محض گمان ہے کہ علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے ساتھ محبت کا ثمر ان کی موافقت کرنا ہے نہ کہ ان کی مخالفت، جب کہ خود علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے شیخین اور عثمان رضی اللہ عنہم کو اپنے اوپر فضیلت دی ہے۔ وہ ان کے مقتدی رہے اور ان کے عہدِ خلافت کے احکام بجا لائے۔ علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ محبت کی شرط تو یہ ہے کہ بندہ راہ وروش میں علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے موافق ہو نہ کہ ان کے مخالف۔

کیا مفضلہ یہ خیال کرتے ہیں کہ سائر اصحاب رضی اللہ عنہم نے چشم پوشی کی اور اظہارِ حق سے سکوت کیا اور شیخین وذوالنورین رضی اللہ عنہم بغیر کسی استحقاق وتقدم کے خلیفہ بن بیٹھے اور متغلب وخائن ہو گئے؟ ان سے یہ امر محال ہے۔ اگر ان سے ذرہ برابر بھی تفاوت ہوتا تو اللہ عزوجل قرآن مجید میں ان کی صفت ہرگز بیان نہ کرتا اور اگر یہ رائی کے دانے کے برابر بھی عہدِ نبوی کو توڑتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم امت کو ان کی اقتدا کا حکم ہرگز نہ دیتے۔ اللہ جل وعلا ان کے حق میں یہ نہ کہتا:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ

الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ [المائدة: ٣]

[آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا]

یہ روسیاہ اصحاب، حدیث اور کتاب کے اجماع کے برخلاف مبادرت کرتے ہیں، کتنے احمق ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت کو محبت تصور کرتے ہیں۔ جو روایات و مسائل اجماعِ اصحاب کے مخالف اور مزاحم ہیں وہ سراسر نا قابلِ سماعت ہیں۔

تقویٰ والے ہی اللہ کے نزدیک عزت والے ہیں:

سادات کا ایک گروہ، جنھیں کتاب وخبر کی طرف کوئی رجوع نہیں ہے، یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ جس طرح عشرہ مبشرہ قطعی جنتی ہیں، اسی طرح خاص وعام سارے سادات کے لیے، خواہ وہ مرتکب کبائر ہوں یا مبتلائے حرام یا تارکِ صلات وصیام وغیرہ، جنت کا داخلہ اور خاتمہ بالخیر قطعی طور پر ثابت ہے۔ فقیر بھی من جملہ سادات کے ہے لیکن جو بات اپنے ساتھ اور ان کے ساتھ کہی جائے گی وہ بجز اخلاص اور نیکو خواہی کے نہ ہو گی۔ بہر حال ان کا یہ عقیدہ بالکل کتاب وسنت کے خلاف اور جمہور علمائے ملت وسلفِ امت کی تحقیق کے خلاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا:

«لَا أُغْنِي عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا»[1] [میں تیرے کسی کام نہیں آ سکتا]

قرآنِ مجید میں ازواجِ مطہرات کے بارے میں آیا ہے:

﴿ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا﴾ [الأحزاب: ٣٠]

[نبی کی بیویو! تم میں سے جو کھلی بے حیائی (عمل میں) لائے گی اس کے لیے عذاب دوگنا بڑھایا جائے گا اور یہ بات اللہ پر ہمیشہ سے آسان ہے]

سادات کو تو فضلِ مرتضوی اور شرفِ مصطفوی کے سبب عظیم خطرہ درپیش ہے، کیونکہ گناہوں کے ارتکاب اور سیادت کی حرمت کے ہتک کی صورت میں اشتغالِ معاصی کے وقت ان کا عقاب اوروں کی نسبت زیادہ متصور ہوتا ہے اور جس بندے سے اللہ ذوالجلال والاکرام راضی نہ ہوں، اگر سارے انبیا ورسل اس کی شفاعت کریں تو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٩٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٦)

اگر خدائے نباشد زبندہ خوشنود
شفاعت ہمہ پیغمبراں ندارد سود

[اگر اللہ تعالیٰ بندے سے راضی نہ ہو تو سارے پیغمبروں کی شفاعت بھی بے سود ہے]

قیامت کا وہ دن جس جگہ سارے انبیا دہشت میں ہوں گے وہاں یہ نسبت کیا کام آ سکتی ہے۔

در آندم کہ از فعل پرسند وقول
اولو العزم را تن بلرزد زہول

[اس وقت جب قول وفعل کی باز پرس ہوگی، اولو العزم پیغمبر بھی اس کی ہولنا کی سے لرزہ براندام ہوں گے]

بجائے کہ دہشت خورند انبیا
تو عذر گنہ را چہ داری بیا

[وہ جگہ جہاں انبیا بھی دہشت زدہ ہوں گے، اس جگہ اپنے گناہ کا جو بھی عذر ہے تو اسے پیش کر دے]

سادات کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جو پیدایشی نسبت ہے، وہ اگر آج انھیں شرعی منہیات سے باز نہیں رکھتی تو کل وہ مہلکات ودرکاتِ آخرت سے کیا ان کو بچا سکے گی۔ جب وہ اس آتشِ دنیا میں جل جاتے ہیں تو اس آتشِ دوزخ سے کس طرح بچ سکیں گے۔ ایک شخص اگر سید اور عالم ہے تو اسے طاعت ومعصیت کا ثواب وعقاب دو چند ہوگا۔ مخدوم جہانیان جہان گشت، جن کے ثبوتِ سیادت میں کچھ گفتگو نہیں ہے، ہمیشہ ایمان کی سلامتی کی دعا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کے بیٹے کے حق میں فرمایا ہے:

﴿إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ﴾ [هود: ٤٦]

[بے شک وہ تیرے گھر والوں سے نہیں، بے شک یہ ایسا کام ہے جو اچھا نہیں]

صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ کے والدین کے کفر پر مرنے کا ذکر آیا ہے۔[1] امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی کتاب ''فقہ اکبر'' میں بھی لکھا ہے۔[2] عشرہ مبشرہ ہر چند بالقطع خیریتِ خاتمہ رکھتے تھے لیکن حسنِ خاتمہ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٣)

[2] دیکھیں: أدلة معتقد أبي حنيفة في أبوي الرسول ﷺ للملا علي القاري رحمہ اللہ۔

کا دعویٰ نہیں کرتے تھے، بلکہ ہمیشہ حق تعالیٰ کی بے پروائی کے خوف وہیبت سے ترساں، لرزاں، گریاں اور بریاں رہتے تھے۔ خیریت خاتمہ کی یہی علامت ہے نہ یہ کہ نسبِ سیادت پر فخر اور حسنِ خاتمہ پر مباہات کرے، کیونکہ یہ شیطان کی طرف سے ایک غرور ہے، حالانکہ مخلصین خطرِ عظیم پر ہیں تو پھر اوروں کی وہاں کیا ہستی ہے۔ کتاب وسنت اور اجماع نے ہر مومن کی عاقبت و خاتمت کو مبہم رکھا ہے، وہ سادات ہوں یا غیر سادات۔ اب جو کوئی اپنی خیریتِ اختتام کا دعویٰ کرے تو اسے گویا شریعت کے ساتھ خصومت اور دشمنی ہے۔ مگر جو بات شرع میں ثابت نہیں ہے، کوئی مومن اسے قبول نہیں کرے گا۔ ابراہیم خلیل علیہ السلام نے باپ کے مسلمان ہونے کے لیے بہت سعی کی اور بڑا اہتمام فرمایا لیکن کچھ نہ ہوا۔ حدیث میں آیا ہے:

«اَلْمُؤمِنُ یَرٰی ذَنْبَهٗ کَالْجَبَلِ یَقَعُ عَلَیْهِ وَالْمُنَافِقُ یَرٰی ذَنْبَهٗ کَالذُّبَابِ یَطِیْرُ مِنْهُ»[1] أَوْ کَمَا قَالَ ﷺ.

[مومن اپنے گناہ کو یوں سمجھتا ہے جیسے پہاڑ اس پر گرا چاہتا ہے اور منافق اپنے گناہ کو مکھی کی طرح سمجھتا ہے جو اس پر سے اڑ جاتی ہے یا جیسے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا]

کسی نے کیا خوب کہا ہے:

"وجودك ذنب لا یقاس به ذنب"

[تیرا وجود ہی گناہ کا پیکر ہے جس پر کسی گناہ کو قیاس نہیں کیا جا سکتا]

انساب تو صرف دنیاوی تعارف کے لیے ہیں اور آخرت کی کرامت وعزت تو صرف تقویٰ و طہارت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ [الحجرات: ۱۳]

[بے شک تم میں سب سے عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے]

نیز فرمایا:

﴿فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی﴾ [البقرۃ: ۱۹۷]

[بے شک زادِ راہ کی سب سے بہتر خوبی (سوال سے) بچنا ہے]

مزید فرمایا:

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۹۴۹) الفاظ مختلف ہیں۔

﴿اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ﴾ [الأنفال: ٣٤]

[اس کے متولی نہیں ہیں مگر جو متقی ہیں]

ایک جگہ فرمایا:

﴿اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ [المائدة: ٢٧]

[بے شک اللہ متقی لوگوں ہی سے قبول کرتا ہے]

غرض کہ حق تعالیٰ کی بندے کے ساتھ دوستی تقوی میں منحصر ہے نہ کہ انساب میں۔ رسالہ مکیہ میں لکھا ہے:

''یہ نظم وترتیب وغیرہ حصر کا فائدہ دیتی ہے، ابلیس، بلعام اور برحیصا جیسے متدرجین کو دیکھو کہ جب انھوں نے اپنے کمالِ حالات اور کرامات کے باوجود تقوی کو نظر انداز کیا اور خواہش کا اتباع کیا تو کس طرح وہ اپنے درجات سے گر گئے۔''

لو كان في العلم من دون التقى شرف
لكان أشرف خلق الله إبليس

[اگر تقوے کے سوا علم میں کوئی شرف ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے ابلیس سب سے زیادہ باشرف ہوتا]

بالجملہ سادات واہلِ علم کو آخرت میں جتنا عظیم خطرہ ہے اتنا خطرہ عوام مومنین اور کم نسب مسلمین کو نہیں ہے۔ علماے سو کی مذمت میں کئی ایک صحیح احادیث مروی ہیں، انھیں عامۂ خلق کی نسبت ترکِ عمل پر مزید عقاب ہوگا اور سادات کو حرمت نبوی کی عدمِ حفاظت کے سبب عذاب مضاعف کیا جائے گا، کیونکہ تعزیر بقدر بزرگی ہوتی ہے۔ عوام کا گناہ جہل کی وجہ سے ہوا کرتا ہے اور علما کا گناہ براہِ جرأت اور سادات کا گناہ براہِ غرورِ نسب، والعياذ بالله. نجات اسی کو ملے گی جو اللہ عزوجل سے ڈرتا ہے اور کثرتِ حسنات کے باوجود خائف رہتا ہے۔ آلِ نبی میں نجاتِ آخرت کے لیے تقوی وطہارت شرط ہے اور خیریتِ خاتمہ اور حسنِ عاقبت تقوی پر موقوف ہے، جیسے فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ [الأعراف: ١٢٨] [اور اچھا انجام متقی لوگوں کے لیے ہے]

اٹھارویں فصل

شیخ رحمہ اللہ کی تالیف رسالہ ''أعلام الہدیٰ''[1] کے مطابق شیخ کامل شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ کے عقیدے کا بیان

① عقیدہ صحیحہ وہ ہے جو خواہشات سے سالم ہو۔ زندہ اور اللہ کا ذکر کرنے والے دل نے اس کا انتخاب کیا ہو اور یہ وہ دل ہوتا ہے جو تقوے سے مزین اور ہدایت سے موید ہوتا ہے۔ اس میں نورِ ایقان چمکتا ہے اور اس کے نور کا اثر جوارح اور ارکان پر پڑتا ہے۔ ایسا دل اس شخص کا ہوتا ہے جو دنیا میں بے رغبت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جب دل میں نور پڑتا ہے تو دل کشادہ ہو جاتا ہے۔ پوچھا گیا اس کی نشانی کیا ہے؟ فرمایا:

«اَلتَّجَافِي عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ، وَالْإِنَابَةُ إِلٰى دَارِ الْخُلُوْدِ، وَالِاسْتِعْدَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ نُزُوْلِهِ»[2]

[دھوکے کے گھر (دنیا) سے علاحدہ رہنا، ہمیشگی کے گھر (آخرت) کی طرف رجوع کرنا اور موت کے آنے سے پہلے اس کی تیاری کرنا]

اکثر مسلمانوں نے وہ عقیدہ اختیار کیا جس کے دلائل ان کے نزدیک قوی ہیں اور وہ اسے کمالِ توحید سمجھتے ہیں، لیکن جب کوئی عالم و زاہد انھیں جانچتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ ان کا تمسک تقلید کے ساتھ ہے اور وہ محض مقلد ہیں۔ جن مشائخ اور ائمہ کے حق میں انھیں قوت علم اور وصولِ حق کا حسن ظن ہے، ان سے انھوں نے ان عقائد کو لیا ہے۔ جسے علما کے ساتھ کوئی میل ملاپ نہیں ہے، اس نے اپنے محلے والوں اور شہر والوں سے عقائد حاصل کیے ہیں، بلکہ بہت سے لوگ جنھیں یہ گمان

---

[1] اس مراد شیخ شہاب الدین عمر بن محمد سہروردی کی کتاب ''أعلام الہدیٰ وعقیدۃ أرباب التقیٰ'' ہے، جو تا حال غیر مطبوع ہے۔ اس کتاب کے مخطوطات مرکز المخطوطات کویت اور مکتبہ اسکندریہ وغیرہ میں موجود ہیں۔

[2] شعب الإیمان للبیہقي (۱۰۰۵۲) اس کی سند میں عدی بن فضل، راوی متروک ہے، لہٰذا یہ روایت سخت ضعیف ہے۔ نیز دیکھیں: سلسلۃ الأحادیث الضعیفۃ للألباني رحمہ اللہ (۲/۳۸۳)

ہے کہ ہمارے پاس دلیل موجود ہے، وہ انھی عامیوں کے ساتھ ملحق ۔ یہاں تک کہ یہ فتنہ عام لوگوں پر محیط ہو گیا ہے۔ نجات کا راستہ یہ ہے کہ بندۂ مومن اللہ تعالیٰ کی طرف سچا احتیاج ظاہر کرے اور آثارِ سلف کی اقتدا کرے۔

② قلبِ صحیح، عقلِ سلیم اور علمِ راسخ اس بات پر شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ، ملائکہ اور علم والوں نے انصاف سے کھڑے ہو کر جس بات کی گواہی دی ہے، وہ بات یہ ہے: "لا إله إلا اللّٰه" [اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے] اس کا کوئی ضد وند اور شبہ و مثل نہیں۔ کوئی اس کا بیٹا اور باپ ہے نہ کوئی اس کا وزیر اور نظیر۔ تصورات اس کے کنہ کی عظمت کو پاتے ہیں نہ افہام اس کی کبریائی تک پہنچتے ہیں۔ اس کی ذات مقدس کو تغیر، آلام، اسقام، اونگھ، منام، افتراق اور المام نہیں پہنچ سکتے۔ وہ وسواس، حواس، قیاس، خیال، مثال، زوال، انتقال، لحوقِ فکر اور حصرِ ذکر سے جلیل و عظیم ہے۔ وہ ازلی قیوم اور سرمدی دیموم ہے۔ "متیٰ" کے ساتھ اس کی ازلیت محدود ہو سکے نہ "حتیٰ" کے ساتھ اس کی ابدیت متقید ہو سکے۔ اس پر تعیین کا انطباق درست نہ تائین کو اس تک راہ ہے۔ وہ زمان و مکان سے بری ہے۔ اس کی عظمت کی نسبت سارے عوالم بنسبت سارے عالم کے رائی کے ایک دانے سے بھی کم تر اور حقیر ہیں۔ اب دل کو اس قیاس سے خالی کرنا چاہیے کہ وہ داخل عالم ہے یا خارج عالم۔ تو کیا اور تیرا علم کیا۔ اگر تیری بصیرت کی آنکھ کھلے تو تجھے اپنے اس قیاس، فکر، وہم اور خیال سے شرم دامن گیر حال ہو۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
و ز ہر چہ گفتہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم

[اے وہ ذات جو خیال، قیاس، گمان اور وہم سے برتر ہے اور ہر اس چیز سے بھی جو ہم نے کہی ہے، لکھی ہے اور پڑھی ہے]

مجلس تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر
ما ہمچنا در اول وصف تو ماندہ ایم

[مجلس برخاست ہو گئی، عمر انتہا کو پہنچ گئی اور ہم ابھی تک تیرے پہلے وصف میں پڑے ہوئے ہیں]

صفاتِ الٰہیہ اور اسماے حسنی کا تذکرہ:

اللہ تعالیٰ کے لیے اسماے حسنی اور صفات علیا ثابت ہیں۔ ہم اس کا صرف وہی نام رکھتے ہیں جو خود اس نے اپنا نام رکھا ہے اور ہم اس کا کچھ وصف بیان نہیں کرتے، مگر وہی جس کے ساتھ اس نے اپنا وصف بیان کیا ہے۔ اسماے حسنی میں سے ہر نام اس کی صفات میں سے ایک صفت کی خبر دیتا ہے اور اس کی ہر صفت اس کے آثارِ ربوبیت سے ایک اثر ہے جس کے مناسب عبودیت مطلوب ہے۔ یہ ذاتی صفاتِ کمال ذاتِ مقدس کے لوازم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان صفات کا اس لیے ذکر کیا ہے، تاکہ ہم اسے جانیں اور سمجھیں۔ اگر وہ ان کا علم نہ دیتا اور نہ سمجھاتا تو زبان کی کیا ہستی تھی کہ وہ ان کو بیان کر سکتی؟

صفتِ حیات و قدرت:

اس کی ایک صفت حیات ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ [المؤمن: ٦٥] [وہی زندہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں]

یہ حیات سرمدی، دائمی اور ازل سے ابد تک مستمر ہے، وہ مددِ عناصر اور معونتِ باطن وظاہر سے بزرگ تر ہے، کیونکہ وہ صمد اور قیوم ہے۔ غایات ونہایات سب اسی کی مخلوق ہیں۔

اس کی دوسری صفت قدرت ہے۔ ساری کائنات اسی کے مقدورات ہیں۔ کوئی چیز اسے عاجز نہیں کرتی ہے۔ کوئی کَون اس کی قدرت کے بغیر متکون نہیں ہو سکتا ہے۔ وہ چاہے تو سارے کون کو عدم کر دے اور اس طرح کا دوسرا کون ایجاد کرے۔ زمین و آسمان اور بر و بحر میں جو کچھ ہے، ان سب کی پیشانی اس کے ہاتھ میں ہے۔ سارے مقدورات اسی کی قدرت سے قائم ہیں اور اسی کے قبضے میں مسخر ہیں۔ ایک حرف ''کُنْ'' کے ساتھ اس نے ان کو ایجاد کیا ہے۔ اگر وہ چاہے تو ان سب کو فنا کر دے۔

صفتِ علم:

اس کی تیسری صفت علم ہے۔ اس کا علم، علم واحد قدیم ازلی کے ساتھ جمیع معلومات کو محیط ہے۔ آسمانوں اور زمینوں میں ایک ذرہ بھی اس کے علم سے غائب نہیں ہے۔

بر و علم یک ذرہ پوشیدہ نیست
کہ پیدا و پنہاں بہ نزدش یکے ست

[اس پر ایک ذرے کا علم بھی پوشیدہ نہیں ہے، کیونکہ اس کے نزدیک ظاہر و پوشیدہ ایک ہی چیز ہے]

اسے ریت اور اس کے ذرات کا علم بھی حاصل ہے۔ پہاڑوں کی گنتی ان کے موجود ہونے سے پہلے اسے معلوم تھی۔ جو کچھ ہونے والا ہے وہ اسے جانتا ہے۔ وہ اپنے علم میں علی الاطلاق اولاً، آخراً، ظاہراً اور باطناً مستقل ہے۔ جس طرح وہ جزئیات کو جانتا ہے اسی طرح وہ کلیات کا بھی عالم ہے۔ غرض کہ ساری معلومات جزئیہ اور کلیہ اس کے علمِ بسیط میں ہیں۔ وہ سب کو ایک علم واحد کے ساتھ جانتا ہے، جو ہو چکا اور جو کچھ ہو گا، وہ علی الاطلاق عالم اور سائر علوم کا واہب و خالق ہے۔ اس نے اپنا جو نام رکھا ہے ہم بھی اسی نام سے اس کو کہتے ہیں کہ وہ عالم الغیب والشھادۃ، وہ راز و نیاز آنکھ کی حرکات اور سینے کی مخفی باتوں کو بھی جانتا ہے۔ اسے خیالاتِ ضمیر، ذراتِ غبار اور لوحِ ہجیر معلوم ہیں۔

صفتِ ارادہ:

اس کی چوتھی صفت ارادہ ہے۔ وہ علی الاطلاق مرید ہے۔ مخلوق جن ہو یا انس یا ملائکہ یا شیاطین ان کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ سب کے ارادے کو پیدا کرنے والا وہی ہے۔ جو اس نے چاہا ہوا اور جو اس نے نہ چاہا وہ نہ ہو سکا۔ کفر و ایمان، طاعت و عصیان، عطا و حرمان، عمد و خطا و نسیان اس کے ملک میں ہیں۔ جو کچھ جاری ہوتا ہے سب اسی کی مشیت سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے تمام فیصلوں میں عادل ہے۔ وہ اپنی خلق اور موجودات میں ظلم کے ساتھ موصوف نہیں ہے۔ اس کے حکم کو کوئی پھیر سکے نہ اس کی قضا کو کوئی روک سکے۔ فرمانِ خداوندی ہے:

﴿ وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ وَ اِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ﴾ [یونس: ۱۰۷]

[اور اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اسے کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ کر لے تو کوئی اس کے فضل کو ہٹانے والا نہیں]

اس نے اس ارادے کے ساتھ اپنے نفس مقدس کا وصف بیان کیا ہے، ہم بھی اسے اسی وصف کے ساتھ بولتے ہیں:

﴿ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ [النحل: ٤٠]

[ہمارا کہنا کسی چیز کو، جب ہم اس کا ارادہ کرلیں، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ ہم اسے کہتے ہیں ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے]

نیز اس نے فرمایا:

﴿ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا﴾ [الكهف: ٨٢]

[تو تیرے رب نے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچ جائیں]

صفتِ سماعت و بصر:

اس کی پانچویں صفت سمع ہے۔ وہ سمیع الندا اور مجیب الدعا ہے۔ وہ ضمیر کی ندا کو تعبیر بیان اور تفسیر جنان کے بغیر سنتا ہے۔ ایک کا سننا اسے دوسرے کے سننے سے باز نہیں رکھتا۔ آوازیں اس پر مشتبہ ہوتی ہیں نہ مسائل اسے مغالطے میں ڈالتے ہیں اور نہ لغات اس پر مختلف ہوتے ہیں۔ وہ پرندوں کے پر کی آواز، پتھروں کے شکم میں کیڑوں کے چلنے کی آہٹ اور قعرِ دریا میں مچھلیوں کی ندا سنتا ہے۔

اس کی چھٹی صفت بصر ہے۔ وہ کالی راتوں کے اندھیرے میں سیاہ پتھر پر سیاہ چیونٹی کے چلنے کو دیکھتا ہے۔ تاریک شب میں حشرات کی حرکات کو جوش و خروش کی حالت میں نظر میں رکھتا ہے۔

اس نے سمع و بصر کے ساتھ اپنے نفس کا وصف بیان کیا ہے۔ چنانچہ اس کا فرمان ہے:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ [الشورى: ١١]

[اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے]

صفتِ کلام:

اس کی ساتویں صفت کلام ہے۔ وہ کلامِ قدیم کے ساتھ متکلم ہے۔ فصحا اس طرح کے کلام لانے سے عاجز و قاصر رہے۔ کیا مجال ہے کہ بلغا ویسی ایک آیت بھی لا سکیں۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ﴾ [فصلت: ٤٢]

[اس کے پاس باطل نہ اس کے آگے سے آتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے، ایک کمال حکمت والے، تمام خوبیوں والے کی طرف سے اتاری ہوئی ہے]

افعالِ عباد کی حقیقت:

مخلوق کو صرف اتنی ہی طاقت ہے جتنی اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کی ہے۔ اللہ جل وعلا نے مرد قادر اور اس کی قدرت کو پیدا کیا ہے اور فعل وفاعل دونوں کو بنایا ہے، جیسے دھوپ کا اثر کہ سورج اور اس کی دھوپ دونوں اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ موثر حقیقی وہی ذات پاک ہے۔ جب مخلوق کا موثر وہ ہوا تو اس کا اثر بھی خلق ہوگا۔ جب وہ فاعلِ مخلوق ٹھہرا تو اس کا فعل بھی مخلوق ہوگا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ جب خالقِ فعل اللہ تعالیٰ ہے تو پھر وہ کسی چیز کے فعل پر عذاب کیوں کرتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح وہ اپنی خلق کو یہ عقاب کرتا ہے جس کو اس نے بنایا ہے، اسی طرح اس خلق کے فعل پر بھی عقاب کرتا ہے، اس کا اپنی مخلوق کو یہ عقوبت دینا عقوبتِ فاعل سے کچھ بعید تر نہیں ہے۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ﴾ [آل عمران: ٤٠] [وہ (اللہ) جو چاہے کرتا ہے]

نیز اس کا ارشاد ہے:

﴿يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ﴾ [المائدة: ١] [وہ (اللہ) فیصلہ کرتا ہے جو چاہتا ہے]

مزید فرمایا:

﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾ [الأنبياء: ٢٣]

[اس سے نہیں پوچھا جاتا اس کے متعلق جو وہ کرے اور ان سے پوچھا جاتا ہے]

اللہ تعالیٰ نے کافر اور اس کے کفر کو اور فاسق اور اس کے فسق کو پیدا کیا۔ پھر کافر کو ایمان لانے کا حکم دیا، مگر اس کے لیے ایمان پیدا نہ کیا تو ایمان لانے کے ساتھ یہ حکم کرنا قہر محض ہے۔ اسی طرح اس کے لیے ایمان کا پیدا نہ کرنا یہ بھی قہر محض ہے، کیونکہ وہ قہار ہے، قہر اس کی صفت ہے اور اس نے یہی اقتضا کیا۔ اسی طرح اس نے مومن کو بنایا اور اس کے لیے ایمان کو پیدا کیا، طائع کو مخلوق کیا اور اس کے لیے طاعت پیدا کی، حالانکہ طائع اور مومن کی اس میں کچھ مشیت نہیں ہے۔ پھر عمل کو اس کی طرف اضافت کیا، یہ اس کا تکرم محض ہے، حالانکہ اس کی طاعت صرف اللہ کی مخلوق ہے۔ پھر

محض اپنی رحمت وفضل سے اسے جنت میں ٹھہرایا، کیونکہ وہ رحمن، رحیم، غفور اور ودود ہے۔ تو دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کو مال دار بنایا، پھر فرمایا:

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ [البقرة: ٢٤٥]

[کون ہے وہ جو اللہ کو قرض دے، اچھا قرض؟]

حالانکہ مال اور ملکیت دونوں اللہ کی مِلک اور مُلک ہیں۔ اب تیرا یہ قیاس کرنا کہ یہ کس لیے اور کیوں کر ہے اور اس کا یہ حکم ظلم ہے تو یہ سب تیری تنگیِ ظرف اور قصورِ فہم کے سبب سے ہے، کیونکہ تجھ پر یہ راز افشا نہیں ہوا۔ تو نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے کام کو مخلوق کے کام پر قیاس کیا۔ اللہ تعالیٰ ایسے قیاس سے بہت بلند ہے اور وہ اس سے برتر ہے کہ لوگوں کی عقول اس کی حقیقت کا احاطہ کر سکیں۔

چونکہ تقدیر کا راز مخلوق پر مشتبہ ہے، اس لیے مخلوق کو اشکال کے سبب اس میں خوض اور بحث کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ارادہ دل میں ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس ارادے کو دل میں پیدا کرتا ہے، اس لیے وہ فعل دل کے ارادے سے ظاہر ہوتا ہے اور دل کا ارادہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو فعل بھی اللہ تعالیٰ کے ارادے سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس فعل کا خالق ہے اور بندہ کاسب ہے۔ اس لیے تلف شدہ اشیا کا تاوان، جرائم کی سزا اور اقامتِ حدود کی اضافت بندے کی طرف ہوتی ہے۔

کلامِ الٰہی:

اللہ تعالیٰ کا کلام عظیم ہے۔ کلام کی عظمت متکلم کی عظمت کے مطابق ہوتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کا کلام اس کی عظمت سے عظیم، اس کے جلال سے جلیل، اس کی کبریائی سے کبیر اور اس کے وعد، وعید، حدود، احکام اور اخبار سے قریب ہے اور کنہ، غایت، عظمِ شان، قہرِ سلطان اور سطوعِ نور کے اعتبار سے بعید ہے۔ اس کلام پاک کا رتبہ بڑا عالی اور اس کی قدر ومنزلت بڑی عظیم ہے۔ اس کے عظمِ شان کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہی قول کافی ہے:

﴿ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا﴾ [بني إسرائیل: ٨٨]

[کہہ دے اگر سب انسان اور جن جمع ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا بنا لائیں تو اس جیسا نہیں لائیں گے، اگرچہ ان کا بعض بعض کا مددگار ہو]

عالمِ شہادت میں اس کی مثال ایسی ہے جیسے سورج کہ مخلوق اس کی شعاع سے فائدہ اٹھاتی ہے، لیکن کسی مخلوق میں یہ قدرت نہیں ہے کہ اس کے نزدیک ہو سکے، اگرچہ اس تک راہ پائے۔

کسی نے کہا ہے کہ یہ کلام حرف وصوت کے بغیر ہے، اس لیے کہ اس پر حصر مشکل ہوا۔ کسی نے کہا: حرف وصوت کے ساتھ ہے، کیونکہ اس پر اس کا غائب ہونا دشوار ہوا۔ لیکن سبیل امثل اور طریق اعدل یہ ہے کہ وہ اس میں نزاع کرنا ترک کر دے۔ بندے نے جب یہ کہا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، تو یہ اعتقاد رکھا کہ اس کی نہی واجب الاتباع ہے، اس کے احکامِ حلال وحرام کا التزام کرنا، اس کے وعد وعید کا سننا اور اس کے حقوق وحدود کے ساتھ قیام کرنا لازم ہے تو اگر اس نے اس کے بعد اس بات کا تعرض نہ کیا کہ وہ قدم، حدث، تلاوت، متلو، حرف اور صوت سے بحث کرے تو یہ اس کے لیے ضرر رساں ہے نہ اس سے کوئی واجب فوت ہوا ہے۔ اب اگر وہ سو برس زندہ رہے اور اس کے دل میں اس بات کا خطرہ تک نہ ہو تو بھی کچھ ڈر نہیں ہے۔ یہی طریق قویم اور منہج مستقیم ہے۔

اس امر میں نزاع کرنا ایسا ہے کہ کسی شخص کے پاس بادشاہِ وقت کا واجب الاذعان فرمان آئے اور اس فرمان میں امر ونہی ہو، یہ شخص اس بات میں مشاجرہ کرنے لگے کہ اس فرمان کا خط کیا ہے اور اس کی عبارت کیسی ہے اور اس کی فصاحت وبلاغت کس قسم کی ہے، لیکن اس کے معانی سمجھنے اور اسے عمل میں لانے سے ذاہل وغافل رہے۔

اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا:

اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ عرش پر مستوی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ وہ آخر شب میں نزول فرماتا ہے۔ اس کے سوا ید، قدم، تعجب اور تردد کے بارے میں اس قسم کی بہت سی حدیثیں آئی ہیں، جو توحید کے دلائل ہیں۔ چنانچہ تشبیہ اور تعطیل کے ساتھ ان میں تصرف کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر اللہ ورسول ﷺ ان صفات کی خبر نہ دیتے تو عقل کو یہ جسارت ہرگز نہ ہوتی کہ وہ اس چراگاہ کے اردگرد پھرتی، بلکہ عقلِ عقلا اس کے سامنے متلاشی بن جاتی۔ اللہ عزوجل اپنے بندوں سے قریب ہے جس طرح اس نے خبر دی۔ اور جو کچھ اس نے ظاہر کیا ہے وہ اس کے نفس پر دلیل ہے۔ اس نے کبریا کے چہرے سے حجاب وپردہ اٹھا دیا اور عظمت وعلی کے کچھ انوار کو کھول دیا ہے۔ یہ ساری اخبارِ صفات تجلیاتِ الٰہیہ اور الطافِ جلیہ ہیں۔ جس نے انھیں سمجھا، سمجھ لیا اور جس نے نہ سمجھا

وہ نادان رہا۔ اب تو مشبہ بن کر اللہ تعالیٰ سے دور نہ ہو، کیونکہ وہ تو تجھ سے قریب ہے اور نہ معطل بن کر اس سے بھاگ، کیونکہ وہ تیرے نزدیک ہے۔ استوا کو مطلق تسلیم کر لو اور اس کی کیفیت سے اعراض کرو۔ اسی طرح بقیہ تمام صفات کے ساتھ بھی عمل کرو۔

اللہ تعالیٰ نے ان اخبار کے ساتھ بندوں کے لیے تجلی کی، اس لیے وہ ظاہر ہے۔ عقول اس کے ادراک وکنہ سے قاصر رہے، اس لیے وہ باطن ہے۔ جن لوگوں نے ان صفات کے بیان میں تصرف کیا، وہ اس اعتبار سے ماجور ہیں کہ اس سے ان کا قصد وارادہ توحید ہے، لیکن اس اعتبار سے وہ ماخوذ ہیں کہ منہج قدیم سے انھوں نے عدول و اعراض کیا ہے اور تشبیہ یا تعطیل کی طرف گئے ہیں۔ اس لیے تو خواہش اور عصبیت کو چھوڑ کر ترشی کے بغیر اپنے فکر کی طرف رجوع کرو اور اپنے نفس و دین سے متعلق اللہ جل وعلا سے ڈرو۔

حنبلی بھائی! تیرا جو اشعری بھائی تاویل کی طرف گیا ہے وہ تشبیہ اور تمثیل کے وہم کے سبب اس طرف گیا ہے کہ مبادا کہیں تشبیہ وغیرہ اس کے باطن میں مل جائے۔ اگر وہ مجرد استوا کو تسلیم کر لیتا تو اسے اس تاویل کی کچھ حاجت نہ ہوتی۔ اس نے تشبیہ کے خوف سے یہ کام کیا ہے۔

اے اشعری بھائی! تیرا یہ حنبلی بھائی نفی اور تعطیل سے ڈر گیا ہے، اس لیے اس نے اتنا مبالغہ و اصرار کیا اور استقرار کا ایک مخامرہ خفیہ ہو گیا، لہٰذا تم دونوں کو آپس میں صلح کر لینا چاہیے۔ حنبلی اپنے باطن سے مخامرہ خفیہ کو رسول اللہ ﷺ کے ارادے کے مطابق دور کر دے، اس سے ایمان بالاستوا فوت نہ ہو گا۔ اشعری تشبیہ کا خوف دور کر کے تاویل پر نہ ڈٹا رہے۔ مجرد استوا کا اعتراف کرنا اسے کچھ نقصان نہ دے گا۔ پھر یہ دونوں اثبات، غیر تشبیہ اور نفی بلا تعطیل کے قائل ہو جائیں اور یوں کہیں:

"آمنا بما قال الله تعالیٰ علی ما أراد الله ویلیق بالله، وآمنا بما قال رسول الله صلی الله علیه وآله وبارك وسلم"

[ہم اس پر ایمان لائے جو اللہ تعالیٰ نے کہا اور اس طرح ایمان لائے جو اللہ نے ارادہ کیا اور جو اللہ تعالیٰ کے لائق ہے۔ نیز ہم اس پر ایمان لائے جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور اس طرز پر ایمان لائے جس کا رسول اللہ ﷺ نے ارادہ کیا]

کیونکہ ان اسرار کا علم اللہ و رسول کے سپرد ہے۔ کسی نے کیا اچھی بات کہی ہے:

”الاستواء معلوم، و الكيفية مجهولة، والإيمان به واجب، والسؤال عنه بدعة“

[استوا معلوم ہے، اس کی کیفیت مجہول ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے]

وضاحت اور صلح کی تمہید کے لیے میں یہ بات کہتا ہوں اور اللہ جانتا ہے کہ میرا قصد وارادہ اصلاح ہے اور اکمل عبادات یہی آپس کی اصلاح ہوتی ہے۔ اس کے ایضاح کے لیے سلف سے نقل کرنے کی کوئی حاجت وضرورت نہیں ہے۔ سلف نے تفسیرِ استوا میں استقرار کی تصریح کی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ زمن نبوی اور زمانہ رسالت کے بعد لوگوں کے باطنی حالات ایک صفت پر قائم نہ تھے، بلکہ ایک دوسرے کی نسبت کچھ لوگ علم وفہم اور استعداد میں اکمل تھے۔ اسی اختلافِ استعدادات کی وجہ سے دعوت کے مراتب بھی متنوع ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ [النحل: ١٢٥]

[اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ، اور ان سے اس طریقے کے ساتھ بحث کرو جو سب سے اچھا ہے]

لسانِ حکمت صالح باطن والوں کے لیے دعوت کا ایک رتبہ ہے، لسانِ موعظت دوسرے بواطن صالحہ کے لیے ایک رتبہ ہے اور مجادلہ اوروں کے لیے ایک رتبہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق بات چیت فرماتے۔ آپ ﷺ نور باطن صافی سے ان کے بواطن پر اشراف رکھتے تھے۔ ہر برتن میں وہی چیز ڈالتے جس کے لائق وہ برتن ہوتا۔ تو اب یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ جہاں کہیں رسول اللہ ﷺ نے نزول کے متعلق قول کا اطلاق کیا ہے، آپ ﷺ پر استوا والی آیت اتری ہے، اس وقت آپ ﷺ کے پاس جتنے بھی سننے والے تھے وہ سب فہم میں برابر نہ تھے، بلکہ بحسب تفاوت وہ متفاوت الفہم تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے تنوع فہوم باطن پر مطلع ہو کر ہر ذی عقل کو اس کی عقل اور ہر ذی فہم کو اس کے فہم پر مقرر رکھا۔ ایک لونڈی نے آسمان کی طرف اشارہ کیا تھا، رسول اللہ ﷺ نے اس کے ایمان وتوحید میں اسی قدر پر اکتفا فرمایا، کیونکہ اس وقت سارے بواطن قبابِ عصمت کے سائے میں تھے۔

وقار نبوت و رسالت انھیں ڈھانپے ہوئے تھا۔ اس لیے ان میں کوئی نزاع ظاہر ہوا اور نہ خلاف نے شہرت پکڑی۔ نفوس استعجال، طیش اور سرعتِ نفور سے امن میں رہے۔ پھر جس قدر وقت دراز ہوا، آفتابِ عصمت نبویہ کی شعائیں عہدِ رسالت کی دوری کے سبب مخفی ہوتی گئی، امت میں خلاف واختلاف چلنے پھرنے لگا، یہاں تک کہ وہ خوب مکشوف ہو گیا اور نوبت تکفیر وسباب تک جا پہنچی۔ نفوس سانپ کی مثل جست کرنے لگے اور صافی عقائد کو متکدر کرنے پر شیطان ظفر منداور کامیاب ہوا۔ اس راز کے معلوم ہونے سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ غرائز وطبائع اختلاف وتنوع کے باوجود صفائے فہم پر بواطن کے ساتھ موافق ہو سکتے ہیں نہ سب کے سب حقِ خالص کی راہ پا سکتے ہیں، جیسے فرمایا کہ وہ ہمیشہ اختلاف میں رہیں گے، سوائے اس کے جس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو اور اسی کے لیے انھیں پیدا کیا ہے۔ اس لیے مقاصد کی طرف نظر کرنا چاہیے، کیونکہ ہر کوئی تلاشِ حق کے لیے اجتہاد کرتا ہے۔ پس وہ جس شخص کو زیرِ عصمت اسلام، ملتزمِ احکام، معترفِ حلال وحرام بیت اللہ الحرام کی طرف متوجہ پائے، اسے اپنا برادر مسلمان اعتقاد کرے۔ بہت سے اہلِ علم ایسے ہیں کہ ان پر قول مخالف کی صحت ظاہر ہو جاتی ہے لیکن وہ دیکھتے ہیں کہ بہت سے ان کے متبعین عوام ان کے عقیدے کے ملتزم ہیں، اس لیے مافی الضمیر کے اظہار کو مکروہ رکھتے ہیں کہ ب کہیں ان کا بازار سرد ہو جائے۔ اب اس فتنے کو دیکھنا چاہیے کہ عالم عامی کے تابع ہو جاتا ہے۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیے تھا۔

دیدارِ الٰہی کا بیان:

رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ستر نور کے حجاب اور پردے ہیں۔ اگر وہ ان میں سے ایک حجاب کو بھی اٹھا دے تو اس کے چہرے کے انوار جس چیز تک پہنچیں اسے جلا کر رکھ دیں۔ اس لیے اس گھر میں، جو دارِ ناپائیدار ہے، رویتِ عیاں ناممکن ہے۔ آخرت دار القرار ہے، اس لیے وہاں پر یہ رویت ہوگی۔ یہ مشترک الدلالۃ حدیث منکرِ رویت کی اس حیثیت سے دلیل ہے کہ کشف موجب حرق ہے اور یہی حدیث مثبتِ رویت کی اس حیثیت سے دلیل ہے کہ کشف کو احراق وفنا اور اہلاک کے ساتھ لگایا ہے جب کہ یہ رویت قابلِ فنا و ہلاک محل پر وارد ہوا، لیکن جب بندہ دار القرار میں جاے گیر ہوا اور اسے بقا واستقرار کی خلعت پہنائی گئی اور وہ بحرِ انوار میں غوطہ لگانے لگا اور مقعد صدق میں بیٹھا، خلوت خانۂ وصال میں جالس ہوا، اس نے فنا وزوال سے رہائی پائی

تو اس وقت وہ حجاب اٹھ جائیں گے اور سبحات متجلی ہوں گی۔ اسے ایک ایسی جگہ ہاتھ آئے گی جو زوال، احراق اور آفات سے مامون ہے۔ یہ صفات ان صفات کی طبیعت پر باقی نہ رہیں گی، بلکہ تجلی بھر بھر کر جس قدر ساغر سامنے آئیں گے، اتنی ہی اس کی طلبِ فریاد زیادہ ہوگی۔ اس پاک ذات کی شان کتنی بڑی ہے۔ آج دنیا میں دل اللہ تعالیٰ کو نظر ایمان سے دیکھتے ہیں۔ کل آخرت میں اسے آنکھیں دیکھیں گی۔ رویتِ باری تعالیٰ کے متعلق مندرجہ ذیل حدیث صحیح ہے:

«إِنَّكُمْ لَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَمَا تَرَوْنَ الْقَمَرَ لَيْلَةَ الْبَدْرِ لَا تُضَامُّوْنَ فِيْ رُؤْيَتِهِ»[1]

[یقیناً تم قیامت کے دن اپنے رب تعالیٰ کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح تم چودھویں رات کے چاند کو دیکھتے ہو، اس کے دیدار میں تم تکلیف محسوس نہ کرو گے]

اس جگہ نظر کو نظر کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے نہ کہ منظور کو منظور کے ساتھ۔ علما کی ایک جماعت کو دنیا میں علم یقین کا نصیب اور حصہ ملا ہے اور ایک دوسری ان سے اعلا رتبے والی جماعت کو عین الیقین سے نصیب اور حصہ حاصل ہے۔ جس طرح فرمایا ہے:

"رَأَى قَلْبِي رَبِّي"[2] [میرے دل نے اپنے رب کو دیکھا ہے]

حارثہ رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: "أصبحت مؤمنا حقا"[3] [میں نے حق سچ مومن بن کر صبح کی ہے]

یہ اس لیے کہ ان کو ایمان میں ایک ایسا رتبہ مکشوف ہوا جو علم کے رتبے کے سوا تھا۔ اسی مطالعے کی وجہ سے معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

"تعالوا حتى نؤمن ساعة"[4] [آؤ! ہم ایک گھڑی ایمان لائیں]

یہ ایمان کے تفاوت مراتب اور زیادت ونقصان پر دلیل ہے جس طرح بعض علما کا مذہب ہے۔ بعض کا مذہب یہ ہے کہ ایمان کم ہوتا ہے نہ زیادہ، ہر قائل کی کوئی نہ کوئی دلیل موجود ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٩٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٣٣)

[2] إحياء علوم الدين (١٥/٣) یہ قول سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔

[3] المعجم الكبير (٢٦٦/٣) شعب الإيمان (٣٢٦/٧) اس کی سند ضعیف ہے۔ امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه ابن لهيعة، وفيه من يحتاج إلى الكشف عنه" (مجمع الزوائد: ٢٢٠/١) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "قال البيهقي: هذا منكر، وقد خبط فيه يوسف فقال مرة: الحارث، وقال مرة: حارثة" نیز نقل فرماتے ہیں: "هذا الحديث لايثبت موصولا" (الإصابة: ٥٩٨/١)

[4] مصنف ابن أبي شيبة (١٦٤/٦)

علمائے متقین کی ایک جماعت کا عین الیقین میں کچھ اس طرح کا رتبہ ہو جاتا ہے گویا ان کا ایمان محسوس ہے، جس طرح کہا گیا ہے:

"لو کشف الغطا ما ازددت یقینا"

[اگر (غیب کا) پردہ اٹھا دیا جائے تو میرے یقین میں اضافہ نہیں ہو گا]

ان کے سامنے غیب عین کے مانند ہو جاتا ہے۔ قیامت کے دن ان کی رویت کا رتبہ اور بھی زیادہ ہو جائے گا، اس رتبے سے کہیں بڑھ کر جو انھیں دنیا میں حاصل تھا۔

اے رویت کے منکر میرے بھائی! جو بات تیری سمجھ میں آئی ہے وہ اس طرح نہیں ہے جہاں تیرا فہم پہنچا ہے، کیونکہ تو نے یہی سمجھا ہے کہ جب رویت ہوتی ہے تو وہ لمعاتِ شعاع کے واسطے سے ہوتی ہے جو نظر سے اٹھتے ہیں اور اس میں اعتدالِ مسافت اور ہوائے شفاف کا ہونا شرط ہے۔ حالانکہ یہ فن جسے تو نے سمجھا ہے عالم شہادات وملک سے ہے۔ قیامت کے دن عین وحدقہ اس طبیعتِ دنیا پر باقی نہ رہے گا، بلکہ قدرت حکمت کی طرف، حکمت قدرت کی طرف، قلب عین کی طرف اور عین قلب کی طرف متحرک ہوگی۔ اسی طرح ہوا وشعاع اور الوان و اکوان تیری فہم مالوف اور معہود کے خلاف ہوں گے۔ زمین آسمان سب بدل جائے گا۔ واحد قہار بارز ہو گا۔

اے ملک وشہادت کے عالم میں محصور! تو ملکوت اور غیب کی طرف بارز ہو اور منقعر جہات اور ادوات وآلات سے اوپر کو چڑھ۔ میں اس پر ایمان لایا ہوں کہ مومن اللہ جل وعلا کو دیکھیں گے۔ کفار اس کی رویت سے محجوب ہوں گے۔ جس طرح قرآن مجید نے خبر دی ہے۔ اس کی صحت پر دلیل واضح اور برہان ساطع قائم ہے۔ مخلوق رویت میں مراتبِ عبودیت اور منازلِ قرب کے تفاوت کے مطابق متفاوت ہوگی۔ رویت میں انبیا کا رتبہ اور ہو گا، اولیا کا اور عوام مومنوں کا اور۔ وہاں بصر وبصیرت کی رویت دونوں شریک ہوں گی۔ ایک طبیعت اور صفت ہو جائیں گی۔ آخرت میں اولیا اس طرح دیکھیں گے جس طرح انبیا دنیا میں دیکھتے ہیں۔ پھر اسی نہج پر نبوت ورسالت کے مراتب رویت میں متفاوت ہوں گے۔ خواص انبیا اس طرح دیکھیں گے جس طرح ہمارے رسول اللہ ﷺ نے شبِ معراج میں دیکھا تھا۔[1] رویت میں آپ ﷺ کا رتبہ سب سے زیادہ ہو گا۔ یوں لگتا ہے جیسے اسی رتبے کا نام مقام

[1] شبِ معراج میں نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی ضروری تفصیل اور مختصر دلائل گذشتہ صفحات میں بیان ہو چکے ہیں۔

محمود ہے جس کا آپ ﷺ سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی غیر آپ ﷺ کا شریک نہ ہوگا۔

آپ ﷺ کی رسالت اور معجزات کا بیان:

ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ اللہ رب العزت نے انھیں ہدایت اور دین حق دیکر بھیجا ہے، تاکہ یہ دین تمام دینوں پر غالب آجائے، اگرچہ مشرک برا مانا کریں۔ معجزات باہرہ اور براہین ظاہرہ سے آپ ﷺ کی مدد کی گئی، جیسے چاند پھٹ گیا اور پتھر نے آپ ﷺ کو سلام کیا۔ متمرد جنوں نے آپ ﷺ کی بیعت کی، سرکش شیاطین آپ ﷺ کی رسالت کے سامنے زیر ہو گئے، زہر آلود ذراع اور دستی بول اٹھی، آپ ﷺ کی دعا سے بارش کے ساتھ بادل کے دھانے اور دروازے کھل گئے، اونٹ نے بات کی، آپ ﷺ کے تھوک مبارک سے کنویں کا پانی میٹھا ہو گیا، آپ ﷺ کی انگلیوں میں سے پانی کا چشمہ بہ نکلا، فرشتے کھلم کھلا آپ ﷺ کی مدد کے لیے آئے اور اس کے علاوہ بھی بہت سے معجزات اور آیات ہیں۔

آپ ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے، لیکن فرقان کی وجہ اعجاز تو صرف اسی شخص کے سامنے کھل کر واضح ہوتی ہے جو ایمان وعرفان سے سیراب ہو، اس کا دل مورد الہام اور اس کی زبان مصدر احکام ہو، وہ ہویٰ کے ساتھ نطق نہ کرے اور صرف تقوی کا حکم دے۔ رسول اللہ ﷺ کے دین سے تمام ملل وادیان منسوخ ہو گئے۔ آپ ﷺ کی کتاب نے گذشتہ زمانے کی تمام کتب منزلہ کو زائل کر دیا۔

یتیمے کہ ناکردہ قرآن درست
کتب خانہ چند ملت بشست

[وہ یتیم جس نے پڑھنا نہ سیکھا، اس نے ملت کی کتنی ہی کتابیں دھو ڈالیں اور انھیں منسوخ کر دیا]

نگار من کہ بمکتب نرفت وخط ننوشت
بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

[میرا محبوب اسکول گیا اور نہ لکھنا سیکھا، وہ اشاروں ہی سے سیکڑوں مسائل سمجھا کر مدرس بن گیا]

ہم سب انبیا ورسل اور ملائکہ پر ایمان لائے اور اس بات کے معتقد ہیں کہ سب آسمان

فرشتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ پھر ان میں سے کوئی زمین کی طرف اترتا ہے۔ ان میں سے بعض کروبیین ہیں، بعض روحانیین، بعض حاملینِ عرش اور بعض کرام کاتبین۔ یہ بنی آدم پر موکل ہیں، جیسے جبرئیل، میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام۔ عزرائیل علیہ السلام[1] قابض ارواح ہیں۔ ان فرشتوں میں سے بعض جنت کے دربان ہیں اور بعض آگ کے دروغے۔ کوئی ان میں سے مالک اور رضوان ہے۔ ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کی حقیقت کا اقرار کرتے ہیں۔ پھر اس ایمان کے بعد ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے نبی ﷺ خاتم الانبیا ہیں۔ آپ ﷺ کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو گیا اور رسالت کا پردہ ڈال دیا گیا۔ اب آپ ﷺ کی نبوت کے بعد کوئی نبوت نہیں ہے۔ ساری مخلوق اور ملل وادیان پر ہر فعل میں آپ ﷺ ہی کی اطاعت وانقیاد اور ہر اس کام کے ترک میں، جو آپ ﷺ سے پہلے تھا، واجب ہے۔ اب آپ ﷺ کے طریق متابعت کے سوا ہر طریق مسدود ہے۔ آپ ﷺ کی دعوتِ رسالت کے سوا ہر دعوت مردود ہے۔

ہمارا یہی عقیدہ ہے کہ آپ ﷺ کی امت میں سے جو اولیا ہیں ان سے کرامات اور اجابات ظاہر ہوتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی آپ ﷺ کے اتباع سے کرامات اور خوارقِ عادات کا ظہور ہوا تھا۔ اولیا کی کرامات انبیا کے معجزات کا تکملہ ہیں۔ جس کے ہاتھ پر کچھ اشیا مخرقات ظاہر ہوں اور وہ احکام شریعت کا ملتزم نہ ہو تو ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ زندیق ہے اور جو کچھ اس سے ظاہر ہوا ہے وہ مکر واستدراج ہے۔ اولیا کی کرامات کئی قسموں کی ہوتی ہیں، جیسے ہوا سے ہواتف کا سماع ہونا، بواطن سے ندا کا سماع ہونا، زمین کا طے ہو جانا، اعیان کا تقلب کہ پتھر سونا ہو جائے، کشف ضمیر اور اسی طرح بعض حوادث کا ان کے وقوع سے پہلے علم؛ یہ سب رسول اللہ ﷺ کی متابعت کی برکات ہیں۔ لوگوں میں سے سب سے زیادہ صحت وقرب وعبودیت کے ساتھ زیادہ حصے والا وہ شخص ہوتا ہے جو نبی ﷺ کی متابعت سے زیادہ حصے والا ہے۔ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ [آل عمران: ۳۱]

[کہہ دے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا]

مزید ارشاد ہے:

---

[1] یہ نام قرآن مجید اور کسی صحیح حدیث میں مروی نہیں ہے۔

﴿ وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ [الحشر: ۷]

[اور رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے تو رک جاؤ]

کرامات کا ظہور صحتِ حال کی علامت اور نشانی نہیں ہے کہ اگر یہ کرامت نہ ہو تو حال صحیح نہ ٹھہرے، بلکہ کبھی وہ شخص جس سے کوئی کرامت نہیں ہوتی، صاحبِ کشف وکرامات سے افضل ہوتا ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے، کیونکہ جس شخص کو کسی قدرت وخرق عادات کا کشف ہوتا ہے تو وہ ضعفِ یقین کے سبب ہوتا ہے کہ اس کا ایمان قوی ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کے لیے ایک رحمت ہے کہ وہ انھیں جلد ثواب دیتا ہے، ان سے اوپر وہ لوگ ہیں جن کے دلوں سے پردے اٹھ گئے، ان کے بواطن روحِ یقین اور خالص معرفت کے مباشر ہو گئے۔ انھیں مخرقات اور رویت قدرت اور آیات کی حاجت نہیں ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب سے بہت کم کرامات کا ظہور منقول ہے، جبکہ متاخرین مشائخ وصادقین سے کثرت سے منقول ہوئی ہیں، کیونکہ ان کے بواطن برکتِ صحبت، مجاورتِ نبوی، نزولِ وحی اور تردد وہبوطِ ملائکہ کے سبب درخشاں تھے۔ انھوں نے آخرت کا معاینہ کر لیا تھا، اس لیے وہ دنیا میں زاہد تھے۔ ان کے نفوس متزکی، عادات منخلع اور قلوب مصقل ہو گئے تھے۔ وہ رویتِ کرامات اور استماعِ آثارِ قدرت سے بے نیاز تھے۔

پھر جس شخص کا یقین اس درجے تک پہنچ جاتا ہے تو وہ اجزاے عالمِ حکمت میں وہ چیز دیکھتا ہے جو دوسرا قدرت میں دیکھتا ہے اور قدرت کو پردہ حکمت میں پوشیدہ پاتا ہے۔ اگر اس کے لیے قدرت متجرد ہو کر منکشف ہو جائے تو بھی اسے کچھ استغراب نہیں ہوتا۔ جو شخص قدرت پر تعجب کرتا ہے، اس کا یقین اس قدرت سے قوی ہوتا ہے، کیونکہ وہ حکمت کے سبب محجوب عن القدرۃ ہے۔

ہمارا ایک اعتقاد یہ ہے کہ رویا صالحہ نبوت کے چھیالیس اجزا میں سے ایک جز ہے۔ اولیا وصلحاے مومنین کو ان کے خوابوں میں لوائح اور لوامعِ ملکوت منکشف ہوتے ہیں۔ پس اگر تو خواب کا اعتبار کرے تو تجھ کو آیاتِ ظاہرہ اور قدرتِ باہرہ الٰہی کے عجائب نظر آئیں، کیونکہ خواب میں کبھی وہ چیز منکشف ہوتی ہے جو ایک ماہ یا ایک سال کے بعد ہونے والی ہے۔ پس معدوم چیز جو اب تک موجود نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ایجاد سے پہلے تجھے اس پر اطلاع دیتا ہے، تاکہ تجھے یہ بات بتائے کہ کوئی تیرا خالق ومعبود ہے جو علام الغیوب ہے۔ تمھیں ابراہیم خلیل علیہ السلام کے خواب کا قصہ تو معلوم ہی

ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

﴿ إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا ﴾ [الأنفال: ٤٣]

[جب اللہ تجھے تیرے خواب میں دکھا رہا تھا کہ وہ تھوڑے ہیں]

تم حسنِ اقتدا کو لازم پکڑو، یقیناً ہدایت یافتہ بن جاؤ گے۔

صحابہ اور اہلِ بیت کی محبت:

نبوت کی میراث علم ہے، اس علم کے وارث اصحاب واہلِ بیت رسالت ہیں، تجھ پر ان سب کی محبت واجب ہے، تو ایک جہت کی طرف مائل ہو کر دوسری جہت کو نہ چھوڑ کہ یہ ہوئی ہے۔ صحابہ اور عترت کے بارے میں عصبیت وخوض کے ساتھ اشتغال اہلِ باطل کا شیوہ ہے۔ ایک قوم نے گمراہی کے ساتھ قرار پکڑا اور شرعی مخالفات اور ممنوعات کے ارتکاب پر جرات کی۔ انھوں نے اپنے اس زعم وگمان کو محبت سمجھا اور ان کے دل نے ان سے یہ کہہ دیا کہ یہ محبت تمھارے کام آئے گی، حالانکہ بات یہ نہیں ہے، بلکہ جب تک وہ جادہ مستقیم پر قائم نہ ہوں گے تب تک یہ محبت تقوے کے بغیر کار آمد نہ ہو گی۔ جب نماز فوت ہوئی، اوقات ضائع ہوئے، گناہ کا ارتکاب ہوا اور محارم مباح ہوئے تو اب یہ محبت کس طرح یہ نقصان پورا کرے گی۔ فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ سے محبت رکھنا واجب ہے اور یہی بات ہر مومن کے دل میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا قول سنا ہے کہ آپ ﷺ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حق میں کیا کہا تھا: «فَاطِمَةُ بُضْعَةٌ مِّنِّيْ»[1] [فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے] پھر بھی یہ فرمایا تھا:

«اِعْمَلِيْ لَا أُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئاً»[2]

[عمل کرو، میں اللہ کے ہاں تمھیں کچھ کفایت نہیں کر سکتا]

پھر یہ بھی سنا ہو گا کہ فاطمہ کا دنیا میں زہد، ان کا علم، عمل، تجرع، مرارتِ فقر، قلت، حسنِ صبر اور احتساب کیسا تھا تو یہی امور دل میں ان کی محبت کے موجب ہیں۔ اگر ان میں یہ صفات ظاہرہ نہ ہوتی تو مجرد رسول اللہ ﷺ کی ان کے ساتھ باہمی نسبت محبت کی موجب نہ ہوتی۔ پھر جب کہ یہ سب اوصاف جمع ہو گئے تو اب ان کی محبت کس طرح واجب نہ ہو گی۔ حسن وحسین رضی اللہ عنہما، فاطمہ رضی اللہ عنہا کی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٥٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٤٩)

[2] دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٠٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٤)

اولاد نہیں اور ان کی اولاد خود فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد ہے، تو یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ٹھہری۔ پس جس کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہوگی، اسے اولادِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی محبت ہونا لازمی اور ضروری ہے۔

باقی رہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب تو ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے فضائل شمار نہیں ہو سکتے ہیں۔ علی مرتضی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی کہنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کی نسبت اکمل ہے، کیونکہ قرابت کی نسبت صوری ہے اور صحبت کی نسبت معنوی ہے۔ اب کسی مومن کے دل میں اس امر کی کب گنجایش ہو سکتی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں قدح و جرح کرے، حالانکہ وہ سب ایک جان وتن کی مانند آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ انھوں نے اپنے اموال و ارواح صرف کر دیے، اوطان سے ہجرت کر گئے، اپنے ہم سروں، یاروں اور ہم عمروں کو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں چھوڑ دیا، لیکن اس امت میں سے جس کسی پر شیطان نے غلبہ پایا ہے اور اس کے عقائد میں وسوسۂ ابلیس کا میل جول ہو گیا، وہ ناپاک ہے۔ ان کے ضمائر میں ان کی باہمی مشاجرات کے سبب کینہ وعداوت نے قدم جمایا اور یہ احقاد وضغائن ایسے مستحکم ہو گئے کہ لوگوں نے اسے متوارث کر لیا اور وہ اہوا کی جانب متجسد اور منجذب ہو گئے۔

جن کے اصول مضبوط اور شاخیں پھیلی ہوئی ہیں، تو اے ہوا وعصبیت سے مبرا شخص! تو اس بات کو جان لے کہ اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزاہتِ بواطن اور طہارتِ قلوب کے باوجود بشر تھے۔ وہ بھی نفوس رکھتے تھے اور نفوس کے لیے صفات ہوتی ہیں۔ جب ان کے نفوس قلوبِ منکرہ کی صفت کے ساتھ ظاہر ہوتے تو وہ اپنے دلوں کی طرف رجوع کر کے امور نفسانیہ کا انکار کرتے تھے۔ ان کے آثارِ نفوس سے تھوڑا سا اثر ان نفوس کی طرف پہنچا ہے جو عادمِ قلوب تھے۔ اس لیے انھیں ان کے نفوس کے قضایا دریافت نہ ہوئے، بلکہ انھوں نے اسی جنسیتِ نفسیت کا ادراک کیا۔ ان کے نزدیک ظاہر میں جو نفوس کا مفہوم تھا اسی کی بنیاد پر تصرف کر کے شبہات میں گرفتار ہو گئے اور ہر مورد میں وارد ہوئے۔ ہر آبِ غیر سائغ کو نوش کیا، ان پر صفائے قلب دشوار ہو گیا، وہ انصاف کی طرف رجوع نہ کر سکے، حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نفوس بہت کم صفاتِ نفسانیہ رکھتے تھے، کیونکہ وہ انوارِ قلوب کے ساتھ محفوظ تھے۔ لیکن جب برے نفوس والوں نے اس امر کو متوارث کر لیا تو ان میں ان کے ساتھ بغض

وعداوت کا حدوث ہوا۔ اگر تجھے نصیحت قبول ہے تو تو اس تصرف سے باز رہ اور سب سے یکساں محبت اور الفت رکھ۔ ان میں سے کسی کی محبت کو کسی کی محبت پر ترجیح نہ دے۔ تفضیل وغلو سے بھی باز رہ، کیونکہ ان کا مقدمہ خوض کرنے سے بھی بڑا ہے۔ تجھے عقیدۂ سلیمہ اختیار کرنے میں اسی قدر کافی ہے جو کہا گیا۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ تو ایک سے دوسرے کی نسبت زیادہ محبت رکھے۔ ایک کے فضل کا دوسرے کے فضل سے زیادہ تر معتقد ہو۔ بلکہ تو سب کا محبّ اور برابری کے ساتھ سب کے فضل کا معترف رہ۔ خلفاے اربعہ کی خلافت کا اعتقاد کر۔ علی ومعاویہ رضی اللہ عنہما جب باہم قتال وخصام کرتے تھے تو دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے کو برا کہتے، لیکن ایک نے دوسرے کو کافر نہ کہا۔ پس تو بھی کسی جاہل سابّ کو کافر نہ کہہ۔ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ اپنی خلافت میں مجتہد مصیب تھے اور سب سے زیادہ خلافت کے حقدار تھے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کا خلافت کی بابت اجتہاد خطا تھا، کیونکہ معاویہ رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں، خلافت کا استحقاق نہ رکھتے تھے، واللہ ینفعنا بمحبتھم ویحشرنا في زمرتھم آمین.

احوالِ برزخ وآخرت:

ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ موت کے بعد میت کے پاس جو کچھ کہا جاتا ہے یا جو کچھ اس میت سے کہا جاتا ہے، وہ اسے ویسے ہی سنتا ہے جس طرح وہ اپنی زندگی میں سنتا تھا اور وہ نہلانے والے کی سختی ونرمی سے متاثر ہوتا ہے۔ جو کوئی اس کے بدن کو ہاتھ لگاتا ہے، وہ اسے جانتا ہے۔ وہ حواس جو منعدم ہو گئے ہیں وہ اس میں چھپے ہوتے ہیں۔ ہمیں امرِ میت، سماع اور رویتِ میت میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، اخبار اسی پر دلیل ہیں۔ جب تو تفتیش کرے گا تو پالے گا۔ اہل وخاصہ خدا نے اس امر کو اپنے ذوق سے پایا ہے اور جان کر یقین کیا ہے۔ اللہ نے ان پر یہ بات ظاہر کر دی ہے اور انھیں اس حال پر مطلع فرما دیا ہے۔[1] دو فرشتے منکر ونکیر آ کر سوال کرتے ہیں۔ یہ سوال مدفون ہی سے ہوتا ہے۔ ظاہر امر یہ ہے کہ جلے ہوئے اور غرق شدہ سے بھی ہوتا ہے اور اس شخص سے بھی جسے کسی درندے نے کھا لیا ہے، غرض کہ کوئی کسی طرح پر مرے باوجود اختلافِ احوال کے مسئول ہوتا ہے۔ یہ سوالات اللہ کی طرف سے بندوں کے لیے ایک ابتلا وآزمایش ہے۔ یہ من جملہ منازلِ آخرت اور مواقفِ آخرت

[1] لیکن قرآن وسنت کی نصوص میں ان تمام امور کا ثبوت نہیں ہے اور "اھل اللہ" کی کوئی بات بھی اس وقت تک مقبول نہیں ہوتی، جب تک کتاب وحکمت قرآن وسنت کی تائید اس کے ساتھ شامل نہ ہو، جیسا کہ ائمہ تصوف کا یہ قول گزر چکا ہے کہ "طریقتنا مشیدۃ بالکتاب والسنۃ"

کے ایک منزل ہے۔ ہم ضغطہ قبر کا بھی اعتقاد رکھتے ہیں۔ قبر بہشت کے چمنوں میں سے ایک چمن ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ ارواح واجساد نعیمِ مقیم اور عذابِ الیم میں مشترک ہیں۔ قالب خاک ہو جانے اور سفال وخشت بننے کے بعد اپنی روح کے ہمراہ نعیم وعذاب میں شریک حال رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ عرض ونشور کے دن ہر قالب اور اس کی روح کو جمع کرے گا۔ چار پرندوں کے بارے میں ابراہیم علیہ السلام کا قصہ اسی راز کا اظہار ہے۔ اس غطا کا کشف موت کے بعد ہو گا۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ﴾ [ق: ۲۲]

[سو ہم نے تجھ سے تیرا پردہ دور کر دیا، تو تیری نگاہ آج بہت تیز ہے]

اس وقت آنکھ کھلے گی اور انسان خوابِ غفلت اور جہل سے جاگے گا اور ایک اور ہی عالم دیکھے گا جو اس نے کبھی نہ دیکھا تھا، نیز وہ جنت وجہنم کو دیکھے گا۔

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ بہشت ودوزخ اس وقت موجود اور مخلوق ہیں۔ امر جنت کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے جیسے حور وقصور، ولدان وغلمان اور انہار واشجار وہ سب حق ہے۔ جنت کے تمام امر کو اسی پر قیاس کرنا چاہیے کہ جب کوئی بندہ ''لا إلہ إلا اللہ'' کہتا ہے تو اسے جنت میں ایک درخت دیا جاتا ہے جس کے سائے میں سوار سو سال تک چلے، اس کا سایہ ختم نہیں ہوتا۔ سو یہ حق ہے، بلکہ وہاں اس سے بھی بڑھ کر ہے جو کسی آنکھ نے دیکھا، کسی کان نے سنا اور نہ کسی کے دل میں یہ خیال گزرا۔ یہاں میں نے تمھاری فکر وخیال کی بنا پر بہت زیادہ امور سے تھوڑے سے بیان کیے ہیں۔ اس لیے جب تک آدمی اس جہاں میں ہے تب تک اس عالم کی تنگی کے مطابق اس کے فہم کا برتن تنگ ہوتا ہے۔ جو لوگ اپنی عقلوں کے مقید ہیں وہ صرف وہی چیز قبول کرتے ہیں جس پر برہان دلالت کرتی ہے۔ جو امر برہان عقلی کے بغیر ہے وہ ان کے نزدیک ہذیان ہے۔

ایسے لوگ ملاحدہ اور زنادقہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے اللہ کی بابت سب سے زیادہ جاہل ہیں، چنانچہ آخرت میں ان کا کچھ حصہ نہیں ہے۔ ان کی آرا کا اختلاف ہی ان کے فسادِ امر پر دلیل ہے۔ انبیا کا اصول غیر مختلف الفروع پر اتفاق ان کے صحتِ امر پر دلیل ہے۔ ہم یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حساب کے دن ساری مخلوق کو مبعوث اور تمام خلق کو صعید واحد میں جمع کر کے نقیر وقطمیر

کا حساب کتاب لے گا۔ ایک فریق جنت میں ابد الآباد تک رہے گا اور دوسرا فریق سعیر میں مخلد ہو گا۔
ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُورٍ لَّهُ بَابٌ﴾ [الحديد: ١٣]

[پھر ان کے درمیان ایک دیوار بنادی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہو گا]

جس نے یہ کہا کہ وہ آگ میں ہمیشہ نہیں رہے گا وہ خطا کار ہے۔ ایک قوم صرف عذاب کا مزا چکھنے کو ہی آگ میں وارد ہو گی اور دوسری قوم قدرے قلیل آگ میں رہے گی۔ کچھ لوگ بقدر ذنوب آگ میں ٹھہریں گے۔ اہلِ بدع کا حال اہلِ کبائر کے حال کی طرح ہو گا، وہ آگ میں ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ حدیث میں آیا ہے کہ یہ امت تہتر (۷۳) فرقے ہو جائے گی، بہتر (۷۲) فرقے آگ میں جائیں گے اور ایک جنت میں۔[1] یہ جزوِ واحد اہلِ سنت و جماعت ہیں۔ اس حدیث میں اہلِ بدعت کا اس امت سے ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ آگ میں داخل ہونے سے اس میں ہمیشہ رہنا لازم نہیں آتا۔ رہا فرقہ ناجیہ تو وہ بالکل عذاب نہیں چکھے گا۔ ان کا آگ میں داخلہ صرف قسم پوری کرنے کے لیے ہو گا، جب کہ باقی لوگ آگ میں جا کر پھر نکلیں گے۔ اس لیے ہم اس امر کے معتقد نہیں ہیں کہ نمازی، روزے دار، حج کرنے والا اور زکات دینے والا آگ میں ہمیشہ رہے گا خواہ وہ گناہ کبیرہ اور بدعت کا مرتکب ہو۔

ہمارا ایک اعتقاد یہ ہے کہ انبیا قیامت کے دن شفاعت کریں گے۔ ان کی سفارش سے ایک خلق آگ سے باہر آئے گی۔ اولیا اور مومنین کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے مراتب کے مطابق شفاعت وجاہ ہو گی۔ ہم اس کے بھی معتقد ہیں کہ پل صراط حق ہے، جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ ترازو بھی حق ہے، اس کے دو پلڑے اور ایک لسان ہے۔ میزان میں اعمال کا وزن ہونا اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ تجھے بس یہی جواہر و اعراض معلوم ہیں، اس لیے تو وزن اعراض سے تعجب کرتا ہے، اور وزن کے قائل پر ہنستا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جسے اقدار کے اسرار و عجائب پر اطلاع بخشی ہے، وہ تیرے اس قصورِ عقل پر خندہ زن ہے اور تیری رکاکتِ فہم پر عیب گیر ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ﴾ [المطففين: ٣٤]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١)

[سو آج وہ لوگ جو ایمان لائے، کافروں پر ہنس رہے ہیں]

جو شخص عاقل ہونے کے باوجود امورِ آخرت کا منکر ہے وہ اس فن والے کے سامنے بچے سے بھی زیادہ کم عقل ہے۔ ہمارا یہ بھی اعتقاد ہے کہ حوض مورود، جو نبی ﷺ کے ساتھ مخصوص ہے، حق ہے۔ ہم اس کے معتقد نہیں ہیں کہ اہلِ کبائر کا آگ پر وارد ہونا ضروری ہے، ہم قطعاً یہ بات نہیں کہتے بلکہ یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے تجاوز کرے اور ان کی سیئات کا کفارہ کر دے۔ ہم اعمالِ صالحہ اور طرائق حمیدہ کے سبب کسی کے جنتی ہونے کا بھی یقین نہیں کرتے، بلکہ ہم اس کے لیے جنت کی امید رکھتے ہیں۔ یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے آگ پر وارد کرے، مگر وہ لوگ جن کے رضوان پر قرآن نے نص کی ہے۔ چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ [الفتح: ۱۸]

[بلاشبہ یقیناً اللہ ایمان والوں سے راضی ہوگیا، جب وہ اس درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کر رہے تھے]

ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے زمین پر اتریں گے، دجال بر آمد ہو گا اور سورج مغرب کی طرف سے نکلے گا۔ یہ سب کچھ بلا شک وشبہہ حق ہے۔ ایک ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ قیامت تک خلافت قریش میں ہے، کوئی غیر ان سے اس بارے میں مجادلہ اور جھگڑا نہیں کر سکتا۔ ہم بنو عباس رضی اللہ عنہم میں سے امام وقت کے لیے وجوبِ انقیاد کا اعتقاد کرتے ہیں۔ نیز ان سارے ولات کے لیے بھی جو ان سے پہلے تھے۔ جو کوئی امام کے خلاف خروج کرے، اس سے قتال کرنا درست ہے۔ ہم جمعہ، جماعات اور حقوق مسلمین کے لازماً پورا کرنے اور ان کی باہمی رضا مندی سے متفقہ فرائض کو ادا کرنے کے معتقد ہیں۔ ہمیں ان کے اجماع کرنے کا بھی اعتقاد ہے۔ ہم اجماع مسلمین کو چھوڑ کر اپنی رائے پر نہیں قائم رہ سکتے، وكل ذلك بتوفيق الله تعالىٰ.

انتهىٰ كلام الشيخ رحمه الله ملخصاً وما أحسنه وأتقنه وأوفقه بالكتاب والسنة!

شیخ رحمہ اللہ نے اس عقیدے کو مکے ۔حرسها الله تعالىٰ۔ کی مجاورت کی حالت میں بعض اخوان مسلمین کی فرمائش پر استخارہ کرنے، ملتزم ومستجار میں دعا کرنے اور ارکان واستار کے ساتھ تمسک کرنے کے بعد تالیف کیا اور اس کا نام "أعلام الهدىٰ وعقيدة أرباب التقىٰ" رکھا ہے۔ یہ

رسالہ دس فصلوں پر مشتمل ہے اور ہر فصل جواہر و زواہر اور عبائر حسنہ پر مشتمل ہے۔ میں نے اسی وجہ سے اس تحریر کی ساری تقریر نہیں لکھی اس لیے کہ وہ اہلِ علم کامل وعرفان صادق کے لائق تھی۔ صرف ہر فصل سے تھوڑے تھوڑے مسائلِ اعتقاد کو لے لیا ہے، وباللہ التوفیق.

انیسویں فصل

کتاب "قطف الثمر في بیان عقیدة أهل الأثر"[1] کے مطابق اہلِ حدیث کے عقائد کا بیان

اصحابِ حدیث وسنت اس کے قائل ہیں کہ آدمی اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، کتابوں پر اور رسولوں پر ایمان لائے۔ ایمان باللہ میں ان اوصافِ الٰہیہ پر تحریف، تعطیل، تکییف، تمثیل اور تاویل کے بغیر ایمان لانا ہے جو کتاب وسنت میں بیان ہوئے ہیں۔ اہلِ حدیث اللہ پر، اس کے اسماے حسنیٰ اور صفاتِ علیا پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی نفی نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ نے اپنے نفس کا جو وصف بیان کیا ہے کلمات کی ان کی جگہوں سے تحریف نہیں کرتے اور نہ اس کے اسما وصفات میں الحاد کرتے ہیں، نہ اس کی صفات کو مخلوق کی صفات کی طرح کہتے ہیں اور نہ اس کی تعطیل کرتے ہیں، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کوئی ہمنام ہے نہ کفو، اس کا ہمسر ہے نہ اسے اس کی مخلوق پر قیاس کیا جا سکتا ہے، اس کی شان تو یہ ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ [الشوریٰ: ۱۱]

[اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے]

اللہ تعالیٰ اپنے نفس کا اور اپنے غیر کا عالم ہے اور وہ اصدق القیل اور اصدق الحدیث ہے۔ اس کے رسول صادق مصدوق ہیں۔ وہ اور لوگ ہیں جو جانے بوجھے بغیر اس کے حق میں کچھ کہہ دیتے ہیں۔ اسی لیے اس نے فرمایا ہے:

﴿سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الصافات: ۱۸۰]

[پاک ہے تیرا رب، عزت کا رب، ان باتوں سے جو وہ بیان کرتے ہیں۔ اور سلام ان پر

[1] یہ مولف رحمہ اللہ کی عقیدہ سلف سے متعلق عربی تصنیف ہے۔

جو بھیجے گئے۔ اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مخالفینِ رسل کے وصف سے اپنے نفس کی تسبیح اور تنزیہ کی ہے اور مرسلین پر سلام کہا ہے، اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے نقص، عیب، خلل وزلل کرنے سے سلامتی میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے وصف میں نفی واثبات کو جمع کیا ہے، اس لیے اہلِ سنت وجماعت اس چیز سے عدول نہیں کرتے جو مرسلین لائے ہیں، کیونکہ نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحین کا صراطِ مستقیم یہی تھا۔ منجملہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے وہ صفات ہیں جو اس نے سورۃ الاخلاص میں بیان فرمائی ہیں۔ سورۃ الاخلاص ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔[1] نیز اللہ تعالیٰ کے وہ اوصاف جو اعظم آیات یعنی آیۃ الکرسی میں ارشاد فرمائے ہیں، ان پر ایمان لاتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص اس آیت، آیۃ الکرسی کو رات کے وقت پڑھ کر سوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر ایک نگران مقرر ہو جاتا ہے اور صبح تک شیطان اس کے قریب نہیں جاتا۔[2]

وہی اللہ اول وآخر، ظاہر وباطن، ہر چیز کا علم رکھنے والا اور حی لا یموت ہے۔ وہ رزاق اور صاحب قوت متین ہے۔ وہ سمیع، بصیر، صاحبِ مشیت اور حاکم بالا رادہ ہے۔ وہ ہادی ومضل ہے۔ محسنین، مقسطین، توابین اور متطہرین سے محبت کرنے والا ہے۔ وہ غفور و ودود، رحمٰن ورحیم اور ہر چیز پر رحمت کے ساتھ واسع ہے۔ وہ مومنین پر رحیم اور ہر چیز پر صاحبِ رحمت واسعہ ہے۔ وہ غفور وحافظ، ارحم الراحمین، راضی عن العباد، غاضب، لاعنِ اعدا، ساخط، منتقم اور کارہ ہے۔ وہ صاحبِ اتیان فی الغمام اور صاحبِ مجی بروز قیامت ہے۔ وہ باقی الوجہ، آدم علیہ السلام کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنانے والا، مبسوط الیدین اور منفق ہے۔ وہ صاحبِ اعین، سامع، رائی، مرئی، شدید المحال، صاحبِ مکر وکید وعفو اور قدیر ہے۔ وہ صاحبِ عزت، بے ہمنام، بے ندو انداد، بے ولد وشریک، صاحبِ ملک وحمد اور منزل فرقان ہے۔ وہ صاحب سموات وارض، ہر چیز کا خالق، عالمِ غیب وشہادت اور متعال عن الشرک ہے۔

اس نے سورۃ الاعراف میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دن میں بنایا اور پھر وہ عرش پر مستوی ہوا۔[3] اس آیت سمیت سات آیتوں میں استوا کا ذکر آیا ہے۔ پھر اس نے

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٥/ ٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨١٢)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٤/ ٤٨٧)

[3] الأعراف [٥٤]

ہمارے ساتھ اپنی معیت کا ذکر کیا ہے اور اس مسئلے کے دلائل سنت و آثار میں بہت زیادہ ہیں۔ اب جو شخص ان آیات اور احادیث کے بعد اللہ تعالیٰ کے جہتِ علو میں ہونے کا انکار کرے گا وہ کتاب وسنت کا مخالف ہے۔ صحیح دلائل سے یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کے اوپر سات آسمان بنائے ہیں اور ایک دوسری کے نیچے سات زمینیں بنائی ہیں۔ زمینِ علیا اور آسمانِ دنیا کے درمیان پانچ سو برس کا راستہ ہے۔ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک اتنا ہی فاصلہ ہے۔ پانی ساتویں آسمان کے اوپر ہے، رحمٰن کا عرش پانی پر ہے، اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہے اور کرسی اس کے دونوں قدموں کی جگہ ہے۔[1]

جو کچھ آسمانوں اور ساتوں زمینوں کے اندر ہے اور جو کچھ تحت الثریٰ، دریا کی تہ، بال اور درخت کی جڑ اور جو کچھ کشت وروئیدگی کے اندر ہے اور جہاں پتا گرتا ہے اور جو بات زبان سے نکلتی ہے، ریت اور خاک کی گنتی، پہاڑوں کا وزن، بندوں کے اعمال، ان کے قدموں کے نشانات، ان کا کلام، ان کے سانس اور ان چیزوں کے علاوہ ہر چیز کو وہ جانتا ہے، ان میں سے کوئی چیز اس پر مخفی نہیں ہے۔

وہ اپنی ذات کے اعتبار سے ساتویں آسمان کے اوپر عرش پر ہے۔ اس کے سامنے نار، نور اور ظلمت کے حجاب اور پردے ہیں۔[2] اگر کوئی مبتدع اور مخالف آیتِ قرب ومعیت یا اس کی مانند کسی اور متشابہ آیت سے حجت لائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ مراد علم ہے۔[3] کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ساتویں آسمان کے اوپر ہے، اسے وہیں سے سب کچھ معلوم ہے۔ وہ خلق سے الگ اور جدا ہے، لیکن کوئی جگہ اس کے علم سے خالی نہیں ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ جوفِ آسمان میں ہے

---

[1] یہ اثر سیدنا ابن مسعود اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما سے موقوفاً مروی ہے۔ دیکھیں: المعجم الكبير للطبراني (٨٧) تاريخ بغداد (٢/٨)

[2] سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس معنی میں ایک موقوف اثر مروی ہے۔ دیکھیں: المستدرك للحاكم (٢/٣١٩)

[3] یہ کہنا کہ احاطے سے مراد قرب ومعیت ذاتی ہے، یہ ائمہ سلف کے بالکل خلاف ہے اور دوسرا عقیدہ کہ قرب ومعیت سے مراد علم ہے، اس میں اختلاف ہے۔ ائمہ سلف متقدمین اور عامہ محدثین ومفسرین آیات کے سیاق کے مطابق معیت، قرب اور احاطے کی تفسیر علم ومعونت وغیرہ سے کرتے ہیں، لیکن بعض محققین متاخرین نے تحقیق کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ قرب اور معیت وغیرہ آیات کی علم، معونت اور نصر وغیرہ سے تاویل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، فقط ان پر ایمان لانا ہی کافی ہے۔ رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ ذات کے اعتبار سے قریب وہمراہ ہے یا صفت کے اعتبار سے تو اس کا علم اسی ذاتِ باری تعالیٰ کو ہے۔ والله أعلم. [مولف رحمہ اللہ]

اور آسمان اس پر حاوی ہے، کیونکہ سلفِ امت اور ائمہ ملت میں سے کسی نے یہ بات نہیں کہی ہے، بلکہ وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کے اوپر عرش پر ہے اور اپنی خلق سے جدا ہے، اس کی مخلوقات میں اس کی ذات کا کوئی جز اور حصہ نہیں ہے اور نہ اس کی ذات میں مخلوقات میں سے کوئی چیز ہے۔

امام مالک بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے اور اس کا علم ہر مکان میں ہے۔[1] عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ ہم اپنے رب تعالیٰ کو کس طرح پہچانیں گے؟ انھوں نے جواب دیا: اس طرح کہ وہ آسمانوں کے اوپر عرش پر ہے، خلق سے جدا ہے اور یہی قول امام احمد رحمہ اللہ کا بھی ہے۔[2] امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا: ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت حق ہے، اللہ تعالیٰ نے آسمان پر سے حکم جاری کیا اور اپنے اولیا کے دل ان کی خلافت پر جمع اور مطمئن کر دیے۔[3]

اب جو شخص یہ اعتقاد کرے کہ اللہ تعالیٰ جوف سماوات میں محصور و محاط ہے یا وہ عرش یا غیر عرش کا محتاج ہے یا عرش پر اس کا استوا مخلوق کے کرسی پر استوا کی مانند ہے تو ایسا شخص گمراہ اور مبتدع ہے اور جس کا یہ عقیدہ ہے کہ آسمانوں میں کوئی الہ و معبود ہے اور نہ عرش پر کوئی اللہ ہے، جس کے لیے نماز پڑھی جاتی ہے اور اسے سجدہ کیا جاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معراج میں اپنے رب تعالیٰ کے پاس نہیں گئے اور نہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے اترا ہے تو وہ شخص فرعونی معطل ہے، کیونکہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کی اس بات میں تکذیب کی تھی کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کے اوپر ہے:

﴿ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ﴾ [المؤمن: ٣٦، ٣٧]

[اے ہامان! میرے لیے ایک بلند عمارت بنا، تاکہ میں راستوں پر پہنچ جاؤں۔ آسمانوں کے راستوں پر، پس موسیٰ کے معبود کی طرف جھانکوں اور بے شک میں اسے یقیناً جھوٹا گمان کرتا ہوں]

---

[1] كتاب السنة للإمام عبدالله بن أحمد (ص: ٥)

[2] الرد على المريسي (ص: ٢٤) اجتماع الجيوش الإسلامية (ص: ٧٧)

[3] اجتماع الجيوش الإسلامية (ص: ٥٩)

ہمارے رسول ﷺ نے موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی اور اس بات کا اقرار کیا کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کے اوپر ہے۔ پھر آپ ﷺ شبِ معراج اللہ تعالیٰ کے پاس چڑھ کر گئے، اللہ تعالیٰ نے اس وقت آپ ﷺ پر پچاس نمازیں فرض کیں، پھر آپ ﷺ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا: تم دوبارہ اپنے رب تعالیٰ کے پاس جاؤ اور نمازوں میں کمی کی درخواست کرو۔ یہ لمبی حدیث صحاح میں موجود ہے۔[1] پس جو شخص فرعون کے موافق اور موسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ کے مخالف ہوگا وہ گمراہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نفس کا جو وصف بیان کیا ہے اس کا منکر کافر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنا جو وصف بیان کیا ہے یا رسول اللہ ﷺ نے اس کا وصف بیان کیا ہے، اس میں کوئی تشبیہ نہیں ہے، جیسے کلم طیب اور عمل صالح کا اس کی طرف مرفوع ہونا یا عیسیٰ علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھا لینا یا قرآن مجید کا نازل فرمانا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے قریب ہیں، اگرچہ ساری کائنات اس کی قدرت کے نیچے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عرب وعجم کے سارے عباد کی فطرت اسی پر رکھی ہے کہ دعا کے وقت ان کے دل اوپر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور وہ نیچے کی جانب اللہ تعالیٰ کا قصد نہیں کرتے۔ گمراہ لوگوں کا منشا یہ ہے کہ گمان کرنے والا یہ گمان کرتا ہے کہ رب تعالیٰ کی صفات مخلوق کی صفات کی مانند ہیں، گویا جس طرح کوئی بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا استوا عرش پر ہے۔ پس یہ تمثیل ہے جو گمراہی ہے، کیونکہ بادشاہ تخت کا محتاج ہے، اگر تخت الگ کر لیا جائے تو وہ گر جائے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ عرش سے اور اس کے سوا ہر چیز سے بے نیاز ہے، وہ تو خود حاملِ عرش ہے۔ اس کا عرش پر علو عرش کی طرف افتقار کا موجب نہیں ہے۔ اس بات میں اصل یہ ہے کہ جو چیز کتاب وسنت میں ثابت ہے، اس کی تصدیق کرنا واجب ہے، جیسے رب تعالیٰ کا علو اور رحمن کا عرش پر استوا وغیرہ۔

رہے نفی واثبات کے وہ الفاظ جو ابتداع اور احداث کیے گئے ہیں جیسے یہ کہ وہ جہت میں نہیں ہے، یا متحیز یا غیر متحیز نہیں ہے، یا نہ وہ جسم ہے نہ جوہر نہ عرض نہ متصل اور نہ منفصل وغیرہ پس اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ یا صحابہ یا تابعین یا ائمہ مسلمین سے کوئی نص نہیں آئی ہے۔ ان میں سے کسی نے یہ بات نہیں کہی ہے کہ اللہ تعالیٰ جہت میں ہے یا بے جہت ہے، متحیز ہے یا نہیں، یا نہ جسم ہے

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٤٥٩/١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢)

نہ جوہر، کیونکہ یہ الفاظ کتاب وسنت میں منصوص نہیں ہیں اور نہ اس پر اجماع ہوا ہے۔ پھر جو لوگ یہ الفاظ بولتے ہیں، کبھی ان سے صحیح معنی کا ارادہ کرتے ہیں اور کبھی فاسد معنی مراد لیتے ہیں۔ اہلِ حلول واتحاد اسی جگہ سے داخل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ میں ہے اور مخلوقات کا وجود ہی خالق کا وجود ہے۔

غرض کہ اس معاملے میں لوگ تین طرح کے ہیں: ایک اہلِ حلول واتحاد، دوسرے اہلِ نفی وجحود اور تیسرے اہلِ ایمان وتوحید۔ حلولیہ کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مکان میں ہے اور وہ عین مخلوق ہے۔ اہلِ نفی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ داخل عالم ہے نہ خارج عالم، نہ مبائن خلق نہ فوق عالم، اس کی طرف سے کوئی چیز نازل ہوتی ہے نہ اس کی طرف کوئی چیز صاعد ہے، نہ وہ کسی کے قریب ہے اور نہ وہ کسی پر تجلی کرے اور نہ کوئی اسے دیکھے، چنانچہ متکلمہ، جہمیہ اور معطلہ کا یہی قول ہے، جس طرح کہ پہلا قول عباد جہمیہ کا تھا۔ جہمیہ متکلمہ تو کسی چیز کے عابد نہیں ہیں اور عباد جہمیہ ہر چیز کے عابد ہیں، ان کے کلام کا مرجع تعطیل وجحود کی طرف ہے جو فرعون کا قول تھا۔ الحاصل جو شخص اللہ تعالیٰ کے اسما وصفات میں کتاب وسنت کے خلاف کلام کرتا ہے وہ باطل خوص وبحث کرنے والا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ﴾ [الأنعام: ٦٨]

[اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات کے بارے میں (فضول) بحث کرتے ہیں تو ان سے کنارہ کر، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ بات میں مشغول ہو جائیں]

پھر ان میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے باطل اعتقادات کو ائمہ اربعہ مجتہدین اور سلف مسلمین کی طرف غلط نسبت کرتے ہیں، حالانکہ وہ اقوال ان ائمہ اور سلف سے ثابت نہیں ہیں اور نہ انھوں نے وہ بات کہی ہے جو یہ کہتے ہیں۔ لہٰذا جب ان سے اس دعوے کی دلیل کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو یہ ان سے کوئی صحیح دلیل نقل نہیں کر پاتے تو ان کا جھوٹ کھل جاتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اہلِ کلام کے حق میں فرمایا ہے کہ چھڑی اور جوتے سے ان کی پٹائی کرو اور قبائل وعشائر میں ان کی تشہیر کرو اور یہ بات کہو:

"هذا جزاء من ترك الكتاب والسنة وأقبل على الكلام"[1]

[کتاب وسنت کو چھوڑ کر کلام کی طرف متوجہ اور مائل ہونے والے کی یہی سزا ہے]

اسی طرح قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ نے کہا ہے:

"من طلب الدين بالكلام تزندق"[2]

[جس نے علم کلام کے ذریعے دین کو طلب وحاصل کیا وہ زندیق ہو گیا]

امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

"ما ارتدى أحد بالكلام فأفلح"[3]

[جس نے بھی علم کلام کی چادر اوڑھی وہ کامیاب نہیں ہوا]

نیز انھوں نے علمائے کلام کو زندقہ کہا ہے۔[4] بہر حال معطل عابدِ عدم ہے اور ممثل عابدِ صنم ہے۔ یا یوں کہیے کہ معطل اندھا ہے اور ممثل ضعیف البصر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا دین تو غالی اور جافی کے درمیان ہے۔ جس طرح اس کی ذات پاک مخلوقات کی ذوات کی طرح نہیں ہے، اسی طرح اس کی صفات مخلوقات کی صفات کی طرح نہیں ہیں، بلکہ وہ جملہ صفاتِ کمال کے ساتھ موصوف اور ہر نقص، عیب اور زوال سے منزہ اور پاک ہے، صفاتِ کمال میں کوئی چیز اس کی مثل نہیں ہے۔ ہمارا مذہب وہی سلف کا مذہب اثبات بلا تشبیہ اور تنزیہ بلا تعطیل ہے، چنانچہ ائمہ اسلام اسی عقیدے پر گزرے ہیں، جیسے مالک، شافعی، ثوری، اوزاعی، ابن مبارک، امام احمد اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ۔ سارے مشائخ کا بھی یہی اعتقاد تھا جیسے فضیل بن عیاض، ابو سلیمان دارانی اور سہل تستری وغیرہ۔ اصولِ دین کی بابت ان ائمہ کے درمیان کوئی نزاع نہیں تھا۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے جو اعتقاد ثابت ہے، وہ بھی مذکورہ ائمہ کے اعتقاد کے موافق ہے اور کتاب وسنت بھی اسی کے ساتھ ناطق ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

---

[1] حلية الأولياء (ص: ٦/١١٦) تاريخ جرجان للسحمي (ص: ١٣٦)

[2] ذم الكلام (ص: ٢٣١)

[3] درء التعارض لابن تيمية رحمہ اللہ (٧/١٤٧) نیز حلية الأولياء لأبي نعيم (٩/١١١) میں یہ قول امام شافعی رحمہ اللہ کے حوالے سے بھی مروی ہے۔

[4] إحياء علوم الدين (١/١٦٤)

”لا یوصف الله إلا بما وصف به نفسه أو وصفه به رسولهﷺ ولا نتجاوز القرآن والحدیث“

[اللہ تعالیٰ کا وصف صرف اسی چیز کے ساتھ بیان کیا جائے جس کے ساتھ اس نے خود اپنے آپ کا وصف بیان کیا ہے یا اس کے رسول ﷺ نے اس کا وصف بیان کیا ہے اور ہم قرآن وحدیث سے تجاوز نہیں کرتے]

تمام ائمہ کا یہی مذہب تھا، وللہ الحمد۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا نام حی، علیم، سمیع، بصیر، رؤف اور رحیم بتایا ہے، پھر ان الفاظ کے ساتھ بعض مخلوقات کو بھی ذکر کیا ہے، لیکن خالق ومخلوق کی صفت میں صرف اسم ہی میں مشابہت ہے۔ اول تا آخر قرآن مجید، مکمل طور پر سنتِ رسول ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور تمام ائمہ دین کا کلام موجود ہے۔ ان کو دیکھو، نصاً یا ظاہراً سب اس بات پر دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے، عرش آسمانوں کے اوپر ہے، وہ اپنی ذات سے عرش پر مستوی ہے، خلق سے بائن ہے، وہ سمیع ہے، اسے شک نہیں ہوتا، وہ بلا ریب بصیر ہے، بلا جہل علیم ہے، بلا بخل جواد ہے، بلا نسیان وسہو حفیظ ہے، بلا غفلت ولہو قریب ہے۔ وہ متکلم، ناظر، ضاحک، فرح، محب، کارہ، مبغض، راضی، ساخط، رحیم، عفو، غافر، معطی اور مانع ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے، ہر رات آسمانِ دنیا پر آتا ہے، لوگ جہاں کہیں بھی ہوں، وہ سب کے ساتھ ہے اور یہ معیت علم کے معنی میں ہے، جیسا کہ ائمہ سلف سے منقول ہے یا اس کی تاویل بھی کچھ ضرور اور لازم نہیں ہے، جیسا کہ بعض محققین کا مذہب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق یہ خبر دی ہے کہ وہ ذو المعارج ہے۔ فرشتے اور روح اس کی طرف عروج کرتے ہیں۔ وہ اپنے بندوں پر قاہر ہے۔ فرشتے اس سے ڈرتے ہیں۔ ان کا یہ ڈر فوق کی طرف سے ہے۔ ان آیتوں کے یہ معانی حق ہیں، ان میں تحریف کی حاجت وضرورت نہیں ہے۔ بس اتنا کافی ہے کہ ان معانی کو جھوٹے گمانوں سے محفوظ رکھا جائے۔ کتاب وسنت میں قرب ومعیت کے جتنے بھی دلائل ذکر ہوئے ہیں، وہ علو وفوقیت کے منافی نہیں ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے قرب میں عالی اور اپنے علو میں قریب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے آخری عمر میں حجۃ الوداع کے سال بہت بڑے مجمع میں آسمان کی طرف انگلی کے ساتھ اشارہ کرکے فرمایا تھا:

«اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ»[1] [اے اللہ! گواہ رہنا] معراج کے واقع میں جو صحیحین وغیرہ میں تواتر کے

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٢١٨)

ساتھ ثابت ہے[1] حق تعالیٰ کے علو وفوق پر بہت بڑی دلالت ہے۔ رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ عرش پر کیسے مستوی ہوا اور وہ کیسے نازل ہوتا ہے تو یہ بدعت ہے۔ اور جس کسی شخص کو یہ گمان ہے کہ نصوصِ صفات معقول المعنی نہیں ہیں اور اللہ جانے کہ ان سے کیا مراد ہے، ظاہر ان نصوص وظواہر کا تشبیہ وتمثیل ہے، ان کے ظواہر کے مطابق ایمان لانا کفر وضلال ہے، ان کی کوئی تاویل وتوجیہ ہے جسے اللہ ہی جانتا ہے اور یہ کھیعص کی مثل ہیں۔ وہ یہ خیال کرے کہ سلف کا طریقہ اسی طرح پر تھا، وہ مذکورہ الفاظ کے حقائق کو جاننے والے نہ تھے چنانچہ یہ گمان کرنے والا لوگوں میں سے سب سے زیادہ سلف کے عقیدے سے جاہل ہے اور راہِ ہدایت سے سخت گمراہ ہے۔ اس کا گمان اس بات کو متضمن ہے کہ سارے سابقین اولین یعنی مہاجرین وانصار اور سارے کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جاہل بے علم تھے، حالانکہ وہ اعلم ملت، افقہ ملت، احسن العمل اور اتبع للسنن تھے۔ اس گمان سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلام کرتے اور اس کے معنی نہ سمجھتے، حالانکہ یہ بہت بڑی خطا وجرأت اور نہایت قبیح جسارت ہے، عیاذاً باللہ منه.

صفاتِ الٰہیہ کا بیان:

من جملہ صفاتِ الٰہیہ کے، جو کتاب وسنت سے ثابت ہیں، صفات ذیل ہیں: ید، یمین، کف، اصبع، شمال، قدم، رجل، وجہ، نفس، عین، نزول، اتیان، مجی، قول، ساق، حقو، جنب، فوق، استوا، قوت، قرب، بعد، ضحک، تعجب، حب، کراہت، مقت، رضا، غضب، سخط، علم، حیات، قدرت، ارادہ، مشیت، سمع، بصر، فوق، معیت، فرح اور اس کے علاوہ دیگر صفات۔ رسالہ ”القائد إلى العقائد“ میں استقراءِ صفات کے جملہ الفاظ مرقوم ہیں اور کتاب ”الجوائز والصلات من جمع الأسامي والصفات“ میں صفات مذکورہ کے دلائل تفصیل کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ ہماری کتاب ”الانتقاد الرجیح بشرح الاعتقاد الصحیح“ میں اللہ تعالیٰ کے علو کے دلائل مذکور ہیں۔ ان ساری صفات کو ایک طرز پر رکھ کر ان سب پر ایمان لانا واجب ہے۔ یہ سب حقیقی صفات ہیں جو صفاتِ مخلوقہ کے ساتھ مشابہ نہیں ہیں۔ ان صفات کے ظاہر کی تاویل، تعطیل، رد اور جحد درست نہیں ہے۔ فرقہ ناجیہ اہلِ سنت وجماعت تحریف، تمثیل اور تکییف کے بغیر ان سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ فرقہ امتِ اسلام کے تمام فرقوں میں سے فرقہ وسط ہے جس طرح یہ امت ساری امتوں میں امت

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤)

وسط ہے۔ صفات کے بارے میں یہ فرقہ اہلِ تعطیل جہمیہ اور اہلِ تمثیل مشبہہ کے درمیان میں ہے۔ جس طرح یہ فرقہ حق تعالیٰ کے افعال کے بارے میں حروریہ اور قدریہ کے درمیان فرقہ وسط ہے۔ اسمائے حسنیٰ، ایمان اور دین کے بارے میں معتزلہ اور مرجیہ کے درمیان وسط ہے اور رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں رافضہ اور خوارج کے درمیان فرقہ وسط ہے، وللہ الحمد.

صفتِ کلام:

اہلِ حق کا وہ مذہب، جس پر سارے اہلِ توحید وصدق کا اتفاق ہے، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے مسموع، مفہوم اور مکتوب کلام کے ساتھ متکلم ہے۔ اس کا یہ پاک کلام سینوں میں محفوظ ہے، جیسے ارشادِ الٰہی ہے:

﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ [العنكبوت: ٤٩]

[بلکہ یہ تو واضح آیات ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جنھیں علم دیا گیا ہے]

یہ مصاحف میں لکھا ہوا ہے اور آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ﴾ [الطور: ٢-٣]

[اور ایک کتاب کی (قسم) جو لکھی ہوئی ہے، ایسے ورق میں جو کھلا ہوا ہے]

خلف کے مقتدا سلف نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ اللہ کا کلام مخلوق نہیں ہے۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"القرآن ليس بمخلوق، ولكنه كلام الله، منه بدأ وإليه يعود"[1]

[قرآن مجید مخلوق نہیں ہے، لیکن وہ اللہ کا کلام ہے، اسی سے اس کی ابتدا ہوئی اور اسی کی طرف یہ لوٹے گا]

سیدنا عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، عمرو بن دینار اور سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہم وغیرہ کا بھی یہی قول ہے۔[2] اللہ عزوجل نے واقعی اس کے ساتھ کلام کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ پر اسے نازل فرمایا ہے۔ اسے اللہ جل وعلا کے کلام کی حکایت کہنا درست نہیں ہے۔ قراءت اور کتابت اسے کلام اللہ

① اعتقاد أهل السنة للالكائي (٢/ ٢٣٠)

② دیکھیں: شرح أصول اعتقاد أهل السنة للالكائي (٢/ ٢٢٧)

ہونے سے خارج نہیں کرتی۔ جو شخص قرآن مجید کو مخلوق کہے، وہ جہمی اور کافر ہے۔

جو شخص کلام اللہ کہہ کر قرآن مجید کی عدم مخلوقیت میں توقف کرے وہ قول اول سے بھی ناپاک تر ہے اور جو شخص تلفظ و تلاوت کو مخلوق ٹھہرائے وہ بھی جہمی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تھا اپنے ہاتھ سے ان کے ہاتھ میں تورات دی تھی، تورات کو اپنے ہاتھ سے لکھا تھا جس طرح آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ اس نے جنت عدن کی بنیاد اپنے ہاتھ سے رکھی ہے۔ وہ ہمیشہ متکلم ہے۔ اس کلام کے حروف و معانی سب اللہ جل وعلا کا کلام ہے، نہ یہ کہ حروف کلام ہوں اور معانی کلام نہ ہوں یا اس کے برعکس۔

حرف و صوت:

حروفِ مکتوبہ اور اصواتِ مسموعہ عین کلامِ الٰہی ہیں۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿الٓمٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ [البقرة: ١، ٢]

[الٓمٓ۔ یہ کتاب، اس میں کوئی شک نہیں]

نیز اس نے مختلف سورتوں کے شروع میں یہ حروف مقطعات ارشاد فرمائے ہیں:

﴿المص﴾، ﴿الر﴾، ﴿كهيعص﴾ اور ﴿حمعسق﴾

جو شخص ان حروف کو اللہ تعالیٰ کا کلام نہ کہے، وہ دین سے الگ اور جماعتِ مسلمین سے خارج ہے۔ ان کے حروف ہونے کا منکر مکابر اور بہتان باندھنے والا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں بیان ہوا ہے:

«مَنْ قَرَأَ حَرْفاً مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ فَلَهُ عَشْرُ حَسَنَاتٍ»[1]

[جس نے اللہ عزوجل کی کتاب سے ایک حرف پڑھا اسے دس نیکیاں حاصل ہوں گی]

حشر کے بیان والی حدیث میں ہے:

«فَيُنَادِيهِمْ سُبْحَانَهُ وَ تَعَالىٰ بِصَوْتٍ يَسْمَعُهُ مَنْ بَعُدَ كَمَا يَسْمَعُهُ مَنْ قَرُبَ»[2]

[اللہ سبحانہ و تعالیٰ انھیں ایسی آواز کے ساتھ پکارے گا جسے دور والا بھی اس طرح سن لے گا جس طرح قریب والے کو وہ آواز سنائی دے گی]

(رواه أحمد والجماعة من الأئمة، واستشهد به البخاري إلى غير ذلك من الأدلة الدالة على ثبوت

[1] سنن الترمذي (٢٩١٠) ولفظه: «من قرأ حرفا من كتاب الله فله به حسنة، والحسنة بعشر أمثالها»

[2] مسند أحمد (٣/٤٩٥) صحيح البخاري مع الفتح (١٣/٤٥٢)

الحرف والصوت وهي كثيرة جدا)

بالجملہ قرآن عظیم اور فرقان کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب مبین اور حبل متین ہے جو سید المرسلین پر عربی زبان میں نازل ہوئی ہے۔ یہ کتاب سورتوں، آیات، اصوات، حروف، کلمات، اقوال اور اول و آخر پر متضمن ہے۔ یہ زبانوں پر متلو، سینوں میں محفوظ، مصاحف میں مکتوب، الواح میں مرقوم اور آذان میں مسموع ہے، ولله الحمد.

علم و قدرت:

اللہ تعالیٰ ساری مخلوقات کا خالق ہے۔ ساری معلومات کیا جزئیات اور کیا کلیات، کا عالم ہے، وہ جمیع ممکنات پر قادر ہے اور اس بات پر بھی قادر ہے کہ اگر وہ چاہے تو اس خلق کی مانند دوسری خلق پیدا کرے۔ ساری کائنات اسی کے ارادے سے قائم ہے۔ وہ سمیع و بصیر ہے، کوئی اس کا شبہ، مثل، ضد اور ند ہے نہ وجوب وجود میں شریک۔ نہ استحقاقِ عبادت، خلق، امر، تدبیر سماوات وارض میں کوئی اس کا شریک ہے۔ وہی بیمار کو شفا دے، رزق دے اور مصیبت دور کرے۔ وہ اپنے غیر میں حلول نہیں کرتا اور نہ غیر اس میں حلول کرے۔ وہ غیر کے ساتھ متحد ہے نہ غیر اس کے ساتھ۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ [الزخرف: ١٥]

[اور انھوں نے اس کے لیے اس کے بعض بندوں کو جز بنا ڈالا، بے شک انسان یقیناً صریح ناشکرا ہے]

وہ جہل و کذب سے بری ہے، کوئی اس پر حاکم ہے نہ کوئی چیز اس پر واجب ہے۔ وہ وعدے کے خلاف نہیں کرتا، اس کے سارے افعال متضمنِ حکمت ہیں۔ اس کے فعل میں جور و ظلم متصور نہیں ہے۔ اشیا کے حسن و قبح میں عقل کا کوئی حکم نہیں چلتا، اس کے سوا کوئی حاکم ہے نہ کوئی معبود، وہ الوہیت و ربوبیت کے ساتھ مختص ہے اور اس کی الوہیت کا منکر کافر ہے۔

ایمان کی وضاحت:

کتاب و سنت اور نیت کے مطابق ایمان قلب و لسان کا قول اور قلب و لسان اور جوارح کا عمل ہے۔ اطاعت سے ایمان میں زیادتی اور معصیت سے اس میں کمی ہوتی ہے۔ حدیثِ نبوی

«الإيمان بضع ... الخ»[1] میں قول وعمل دونوں کو ایمان ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ معاصی اور کبائر کے ارتکاب پر اہلِ قبلہ کو کافر نہ کہنا چاہیے، بلکہ معاصی کے باوجود اخوتِ ایمانی اور اتحادِ اسلامی ہنوز باقی ہے۔ فاسق سے مطلق ایمان کا نام سلب ہوتا ہے نہ وہ ہمیشہ آگ میں رہے گا، بلکہ وہ ناقص الایمان مومن ہے یا مومن بالایمان اور فاسق بالکبیرہ ہے۔ اسی لیے کسی اہلِ قبلہ پر کسی گناہ یا کبیرہ کے سبب خلودِ نار کا حکم لگایا جا سکتا ہے نہ وہ کسی عمل کے سبب دائرۂ اسلام سے خارج ہی ہوتا ہے الا یہ کہ کسی حدیث میں اسے کافر فرمایا گیا ہو یا اس میں کفریہ صفات پائی جائیں یا وہ قطعیات وضروریاتِ دین کا منکر ہو یا ایسی بدعت ایجاد کرے جو اسے کفر تک پہنچا دے۔ بہتر (۷۲) فرقوں میں سے اکثر فرقے ایسے ہیں جنھیں ائمہ سنت نے کافر ٹھہرایا ہے، اگرچہ وہ اہلِ قبلہ ہیں، جیسے روافض، خوارج، جہمیہ اور معتزلہ وغیرہ۔

ایمان واسلام کا بیان:

اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: کلمہ طیبہ کی شہادت، نماز، زکات، روزہ اور حج۔ یہ حقیقتِ اسلام ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کے ایمان کے بارے میں سوال کرنے پر فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ آدمی اللہ پر، اس کے فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر، آخرت کے دن پر اور اس بات پر کہ تقدیر کا خیر وشر اللہ کی طرف سے ہے، ایمان لائے۔ جبریل علیہ السلام نے پوچھا میں ان چیزوں پر ایمان لے آؤں گا تو کیا میں مومن بن جاؤں گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ ہاں! (رواہ مسلم وأبو داود وغیرھما)[2]

امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کلمہ ہے اور ایمان عمل صالح کا نام اور احسان اخلاص فی العمل ہے۔

تقدیر پر ایمان:

تقدیر پر اور اس کے خیر وشر پر ایمان لانا واجب ہے۔ جہاں میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٩٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٩٩١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٤)

اللہ جل وعلا کی تقدیر سے باہر ہو یا اس کی تقدیر کے بغیر صادر ہو یا اس کی قضا کے بغیر جاری ہو۔ کسی بشر کو اس کی قدر مقدر سے گریز نہیں ہے۔ اس نے جو بھی خیر وشر لوحِ محفوظ میں لکھ رکھا ہے، کوئی اس سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ اس نے جسے چاہا سعادت کے لیے بنا کر اس سے عملِ صالح کرایا، یہ اس کا فضل ہے اور جسے چاہا شقاوت کے لیے بنا کر اسے گمراہ کیا، یہ اس کا عدل ہے۔ ہر ایک کو جس کام کے لیے بنایا ہے وہ شخص وہی کام کرتا ہے۔

خلق وعباد کے افعال کا خالق، رزق واجل کا مقدر اور بندوں کا ہادی ومضل وہی ہے۔ یہ اس کا ایک بھید ہے جس کا ماوشما کو نہیں، بس اسی کو علم ہے۔ اس نے جہنم کے لیے بہت سے جن وانس پیدا کیے ہیں۔ وہ چاہتا تو ہر نفس کو ہدایت یافتہ بنا دیتا، لیکن اسے جہنم کا بھرنا مقصود ہے۔ اس نے ہر چیز کو ایک انداز پر پیدا کیا ہے۔ زمین یا نفس پر جو مصیبت بھی آتی ہے وہ پہلے سے کتاب میں لکھ دی گئی ہے۔ بعثتِ رسل کے بعد اللہ تعالیٰ کی قضا وقدر سے حجت پکڑنا جائز نہیں ہے، بلکہ انزالِ کتب، بعثت رسل اور ورودِ امر ونہی کے ساتھ اللہ ہی کی حجت بالغہ ہم پر قائم ہے۔ جسے فعل وترک کی استطاعت ہے، اسی کو امر ونہی کیا گیا ہے۔ اس نے کسی کو معصیت پر مجبور کیا ہے نہ ترکِ طاعت پر مضطر بنایا ہے۔

اس کا فرمان ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَ اغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

[اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجایش کے مطابق، اسی کے لیے ہے جو اس نے (نیکی) کمائی اور اسی پر ہے جو اس نے (گناہ) کمایا، اے ہمارے رب! ہم سے مواخذہ نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر جائیں، اے ہمارے رب! اور ہم پر کوئی بھاری بوجھ نہ ڈال، جیسے تو نے اسے ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے تھے، اے ہمارے رب! اور ہم سے وہ چیز نہ اٹھوا جس (کے اٹھانے) کی ہم میں طاقت نہ ہو اور ہم سے درگزر کر اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر، تو ہی ہمارا مالک ہے، سو کافر لوگوں کے مقابلے میں

ہماری مدد فرما]

مزید فرمایا: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ [پس تم اللہ سے ڈر جاؤ]

نیز فرمایا: ﴿اَلْيَوْمَ تُجْزٰى﴾ [آج بدلہ دیا جائے گا]

اس سے معلوم ہوا کہ کسب بندے کے لیے ہے، نیکی پر ثواب اور گناہ پر عقاب ہے۔ اس کا وقوع اللہ تعالیٰ کی قدر وقضا سے ہوتا ہے۔

تقدیر پر ایمان کے درجات:

ایمان بالقدر کے دو درجے ہیں۔ ایک اس بات پر ایمان لانا کہ اللہ تعالیٰ اپنے قدیم علم کے ساتھ وہ سب کچھ جانتا ہے جو اس کی مخلوق کرتی ہے۔ اسے ساری طاعات، معاصی اور ارزاق و آجال کے احوال معلوم ہیں۔ اس نے لوحِ محفوظ میں مقادیرِ خلق کو لکھ رکھا ہے۔ اس نے پہلے قلم کو بنا کر اسے حکم دیا کہ قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے وہ سب کچھ لکھ۔[1] یہ تقدیر، جو اس کے علم کی تابع ہے، متعدد جگہوں میں اجمالاً اور تفصیلاً ہوتی ہے۔ خلق روح سے پہلے شکم مادر میں ایک فرشتہ جنین کی طرف بھیجا جاتا ہے اور وہ چار باتیں لکھ دیتا ہے: رزق، اجل، عمل اور یہ کہ وہ سعید ہے یا شقی۔[2] غالی قدریہ اسی قدر کے منکر ہیں، اس فرقے کے لوگ پہلے بہت زیادہ تھے، اب وہ تھوڑے ہیں۔

دوسرے اللہ تعالیٰ کی مشیت نافذہ اور قدرت شاملہ پر ایمان لانا ہے کہ وہ جو کچھ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔ سارے آسمانوں اور ساری زمینوں میں جو حرکت اور سکون ہوتا ہے، وہ اسی کی مشیت سے ہوتا ہے۔ وہ جس امر کا ارادہ نہیں کرتا، وہ امر اس کے ملک میں نہیں ہوتا۔ موجودات ہوں یا معدومات، وہ ہر چیز پر قدیر ہے۔ غرض کہ آسمان وزمین میں جو بھی مخلوق ہے، اس کا خالق اللہ جل وعلا ہی ہے۔ اس کے سوا کوئی خالق ہے نہ کوئی معبود ورب اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی اور اپنے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور اپنی اور اپنے رسول ﷺ کی معصیت سے منع فرمایا ہے۔ وہ متقین، محسنین اور مقسطین سے محبت کرتا ہے اور ایمان دار اور نیکو کار لوگوں سے راضی ہوتا ہے۔ وہ کافروں سے محبت نہیں رکھتا اور نہ قوم فاسقین سے راضی ہوتا ہے۔ وہ

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٥٥)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١٠/٤٧٧)

فواحش کا حکم نہیں دیتا۔ وہ بندوں سے کفر کو پسند کرتا ہے نہ فساد ہی کو پسند کرتا ہے۔

بندے حقیقت میں فاعل افعال ہیں، لیکن ان کے افعال کا خالق اللہ عزوجل ہے۔ بندے دو طرح کے ہوتے ہیں: مومن و کافر اور بر و فاجر۔ بندے کو اپنے فعل پر قدرت حاصل ہے اور وہ ارادہ کرتا ہے، لیکن اس قدرت و ارادے کا خالق اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہے نہ کہ بندہ۔ عامہ قدریہ اس درجے کی تکذیب کرتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کا نام رسول اللہ ﷺ نے «مَجُوسُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ» [اس امت کے مجوسی] رکھا ہے۔[1] اہلِ اثبات سے ایک دوسری قوم نے اس باب میں اتنا غلو کیا ہے کہ بندے سے بالکل قدرت و اختیار سلب کر لیا اور اسے اللہ کے افعال و احکام اور حکم و مصالح سے باہر کر دیا۔

بالجملہ حق یہ ہے کہ تقدیر کا ظاہر و باطن، محبوب و مکروہ، حسن و سیئ، قلیل و کثیر اور اول و آخر سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور یہ اسی کی قضا و قدر ہے۔ بندوں میں سے کوئی فرد و بشر اللہ عزوجل کی مشیت و قضا سے تجاوز نہیں کرتا، بلکہ سب اسی کی طرف رواں دواں ہیں جس کے لیے وہ پیدا کیے گئے ہیں۔ سب اسی کام میں مصروف ہوتے ہیں جو ان پر مقدر کیا گیا ہے، یہ اللہ ذوالجلال والاکرام کا عدل و انصاف ہے۔ سارے کبائر و صغائر اللہ جل جلالہ کی قضا و قدر سے ہوتے ہیں، کسی کے لیے اللہ تعالیٰ پر کوئی حجت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے علم سابق میں جانتا تھا کہ ابلیس قیامت تک نافرمانی کرے گا۔ اس نے اہلِ طاعت سے طاعت اور اہلِ معصیت سے معصیت معلوم کر کے ان کو پیدا کیا۔ جو مصیبت انھیں پہنچی ہے وہ اس سے چوکنے والے نہ تھے اور جو انھیں نہیں پہنچی وہ انھیں پہنچنے والی نہ تھی۔

شفاعت کا بیان:

محمد مصطفیٰ ﷺ، احمد مجتبیٰ ﷺ خیر خلائق، افضل بشر، اکرم علی اللہ، اعلی درجات کے حامل اور اللہ کی طرف سب سے قریبی ذریعہ ہیں۔ اللہ جل وعلا نے انھیں رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین اور شفیع المذنبین بنا کر بھیجا۔ ہر نبی ایک خاص قوم کے لیے ہوتا تھا، مگر آپ ﷺ ساری مخلوق کے نبی ہیں۔ جنت میں سب سے پہلے آپ ﷺ اور امتوں سے پہلے آپ ﷺ کی امت جائے گی۔ آپ ﷺ کی ایک شفاعت تو وہ ہوگی کہ لوگ سب انبیا کے پاس سے ہو کر پھر آپ ﷺ سے طالبِ شفاعت ہوں گے۔ دوسری وہ شفاعت ہوگی کہ آپ ﷺ اہلِ جہنم کی شفاعت کر کے انھیں جنت میں داخل کرائیں گے،

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٩١)

یہ دونوں شفاعتیں آپ ﷺ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ تیسری شفاعت ان لوگوں کی ہوگی جو نارِ جہنم کے مستحق ٹھہر چکے ہوں گے، پھر آپ ﷺ کی شفاعت کی بنا پر ایک قوم آگ میں نہیں جائے گی۔ اس شفاعت میں خود رسول اللہ ﷺ، صدیقین، شہدا، صالحین، تمام مومنین، ملائکہ، علما اور اطفال وغیرہ شریک ہوں گے۔ لیکن یہ شفاعت انھیں کے لیے ہوگی جنھیں اللہ عزوجل پسند فرمائے گا اور وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوں گے۔ البتہ کافروں کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کچھ نفع نہ دے گی، وہ ابد الآباد تک جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ اس جگہ کفار سے مراد اہلِ شرک و کفر، اصحابِ تکذیب، اصحابِ بدع مکفرہ اور صفاتِ کفر سے متصف لوگ ہیں، عیاذاً باللہ منھم.

ایک قوم جو دوزخ میں جا چکی ہوگی اور جل بھن کر کوئلہ بن گئی ہوگی، وہ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت سے باہر نکلے گی۔ کچھ لوگ محض اللہ تعالیٰ کے فضلِ کثیر اور رحمتِ واسعہ سے نجات پائیں گے۔ جنت میں کچھ جگہ خالی رہے گی، اللہ تعالیٰ اس کے لیے کچھ لوگوں کو پیدا کر کے جنت میں داخل کرے گا۔ رسول اللہ ﷺ کی یہ شفاعت اللہ تعالیٰ کے اذن واجازت سے ہوگی، چنانچہ قرآن مجید میں اس اذن کی صراحت کی گئی ہے، فرمایا:

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ [البقرة: ٢٥٥]

[کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے]

پس سارے سفارشی اس اذن کے نیچے داخل ہیں۔ کوئی شخص اذنِ الٰہی کے بغیر کسی شخص کی شفاعت کر سکتا ہے نہ کسی شخص کو دنیا میں یہ بات معلوم ہے کہ میری شفاعت ہوگی، کیونکہ اس علمِ غیب کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے، کسی دوسرے کو اس کی خبر نہیں ہو سکتی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عزت وحرمت:

عقیدہ اہلِ سنت و جماعت کی ایک بنیاد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی طرف سے دل سلامت اور ان کی جانب سے سینہ صاف ہو، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ﴾

[الحشر: ١٠]

[اور (ان کے لیے) جو ان کے بعد آئے، وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان لانے میں ہم سے پہل کی اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ جو ایمان لائے، اے ہمارے رب! یقیناً تو بے حد شفقت کرنے والا، نہایت رحم والا ہے]

حدیث میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سب وشتم کرنے سے منع کیا گیا ہے[1] اور تمام امت پر ان کی فضیلت کو بیان کیا گیا ہے۔ اہلِ دین کا ان کے فضائل ومزایا پر اجماع ہے۔ صلح حدیبیہ میں شرکت کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بعد والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے افضل ہیں، مہاجرین انصار پر مقدم ہیں۔ اہلِ بدر، حدیبیہ میں درخت کے نیچے بیعت کرنے والے، عشرہ مبشرہ، ثابت بن قیس، اہلِ بیت اور ازواجِ مطہرات بنقل تواتر امت کے افضل افراد اور جنت کی بشارت پانے والے ہیں۔ خلفاے اربعہ کے فضائل کی ترتیب اللہ کی طرف سے مقرر کردہ خلافت کی ترتیب کے مطابق ہے۔ خلافت کا زمانہ تیس برس تھا۔ پھر سلطنت آگئی۔ جس طرح ولایت کے سارے یا اکثر سلسلے علی مرتضی رضی اللہ عنہ کی طرف منتہی ہوتے ہیں، اسی طرح اشاعتِ دین، شریعت کے سارے طرائق و ذرائع خلفاے ثلاثہ کی طرف منتہی ہوتے ہیں، جس میں اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت طریقت پر مقدم ہے اور علم کو عبادت پر فضیلت کاملہ حاصل ہے اور علما کا مرتبہ اولیاء اللہ سے زیادہ ہے۔ ان علما سے مراد علماے آخرت ہیں جو صاحبِ عمل تھے نہ کہ دنیا طلب علماے سو، بلکہ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر علما باللہ اولیاء اللہ نہیں ہیں، تو پھر کوئی اللہ کا ولی نہیں ہے۔

اہلِ بیت سے محبت:

اہلِ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت سے محبت رکھتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کے حق میں کی گئی وصیت کو یاد رکھتے ہیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خم غدیر میں دو مرتبہ یہ وصیت فرمائی تھی:

«أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِيْ أَهْلِ بَيْتِيْ»[2] [میں اپنے اہلِ بیت کے بارے میں تمھیں اللہ کی یاد دلاتا ہوں]

دوسری حدیث میں عباس رضی اللہ عنہ کو سامنے رکھتے ہوئے فرمایا ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤٠)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٨)

«وَ الَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحِبُّوْكُمْ لِلّٰهِ وَلِقَرَابَتِي» [1]

[قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! وہ لوگ تب تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک اللہ کے لیے اور میری قرابت داری کے ناطے تم (اہلِ بیت) سے محبت نہ کریں]

اسی طرح اہلِ حدیث اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ ازواجِ مطہرات نص قرآن کے ساتھ امہات المومنین ہیں اور وہ آخرت میں رسول اللہ ﷺ کی بیویاں ہوں گی، خصوصاً خدیجہ رضی اللہ عنہا جو آپ ﷺ کی اولاد کی ماں ہیں اور بیویوں میں سے سب سے پہلے آپ ﷺ پر ایمان لائی ہیں۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، جن کی براءت اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمائی ہے، ان پر تہمت لگانے والا اللہ کے ساتھ کفر اور اس کی کتاب کی تکذیب کرنے والا ہے۔

روافض، جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض رکھنے والے اور صحابہ کرام و امہات المومنین کو گالیاں دینے والے ہیں اور نواصب وخوارج جو اہلِ بیت رسالت کو ایذا پہنچانے والے ہیں، اہلِ حدیث ان سے بے زار ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان جو مشاجرات، خصومات، منازعات، مخالفات اور مکالمات ہوئے ہیں وہ ان میں خوض و بحث نہیں کرتے، بلکہ وہ اس کے ذکر سے امساک کرتے ہیں، نیز ان آثار مرویہ میں کثرت سے زیادت ونقص اور تغییر وتحریف واقع ہو چکی ہے۔

درست بات تو یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان معاملات میں معذور تھے یا مجتہد مصیب یا مخطی۔ اس کے ساتھ ساتھ اہلِ حدیث کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر صحابی کبائر و صغائر سے معصوم نہ تھا، بلکہ ان پر ذنوب کا جریان جائز ہے۔ ان کے لیے سبقتِ اسلام اور متعدد فضائل ہیں جو ان کے گناہوں کی بخشش کے موجب ہیں، یہاں تک کہ ان کے لیے جو گناہ بخش دیے جائیں گے وہ ان کے مابعد کے لیے مغفور نہ ہوں گے۔ ان کے گناہوں کو مٹانے والی حسنات بھی اتنی ہیں کہ وہ مابعد کے لیے نہیں ہیں۔ وہ سب عدول ہیں۔ ان کی تعدیل خود رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے جبکہ دوسروں کی تعدیل امت نے کی ہے، بنا بریں ان کا کیا مقابلہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں خیر قرون فرمایا ہے اور ان کے ایک مد صدقے کو ہمارے احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرنے سے افضل ٹھہرایا

---

[1] مسند أحمد (۱۷۷۳) اس کی سند میں ''یزید بن ابی زیاد'' ضعیف ہے۔ یہ روایت ایک اور سند سے سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۱۴۰) میں بھی مروی ہے، لیکن اس کی سند منقطع ہے۔

ہے۔[1] ان میں سے اگر کسی سے گناہ سرزد ہو گیا تھا تو اس نے توبہ کر لی تھی یا اس سے گناہ کو مٹانے والی کوئی نیکی عمل میں آ گئی تھی یا اس کے سابقہ فضل کی وجہ سے وہ قصور معاف ہو گیا ہے یا آپ ﷺ کی شفاعت سے مغفور ہو جائے گا، کیونکہ آپ ﷺ کی شفاعت کے سب سے زیادہ مستحق یہی گروہِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہے یا دین میں کسی بلا و آزمایش میں مبتلا ہو کر ان کے گناہ کا کفارہ ہو چکا۔ پس جب ان کے ثابت شدہ گناہوں کی یہ بات ہے تو پھر ان امور کا کیا ذکر جن میں وہ مجتہد تھے؟ اگر وہ درست ہو گا تو دو اجر ملیں گے اور اگر ان سے خطا ہو گئی ہو گی تو انھیں ایک اجر ملے گا۔ ان کے گناہ کی تھوڑی سی مقدار ان کے حسنات اور فضائل کثیرہ کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ یقیناً وہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے بعد ساری مخلوق میں سے بہتر اور افضل ہیں، ان کی مثل کوئی نہیں ہو سکتا۔

وہ صفوہ امت اور خیر امم تھے۔ وہ اللہ جل وعلا کے ہاں مکرم ہیں۔ ان میں سے جس کسی کے لیے رسول اللہ ﷺ نے جنت کی گواہی دی ہے، یقیناً وہ بہشتی ہے۔ ہم لوگ کسی غیر کے لیے یہ گواہی نہیں دیں گے، بلکہ ہم محسن کے لیے امیدوار اور گناہ گار کے لیے خائف رہیں گے اور مخلوق کے متعلق علم کو خالق کے حوالے کریں گے، ہم کسی موحد کے لیے بعینہٖ جنتی ہونے کا حکم نہ لگائیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انھیں جہاں چاہے لے جائے، ہاں ہم ان کے متعلق یوں کہیں گے کہ ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے، اگر وہ چاہے تو معاصی کے ارتکاب پر انھیں عذاب میں مبتلا کرے اور اگر چاہے تو انھیں بخش دے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ہم یہ ایمان رکھتے ہیں کہ موحدین کی ایک قوم سنتِ صحیحہ کے مطابق آگ سے باہر نکلے گی، إن شاء اللہ تعالیٰ

کراماتِ اولیا:

ہم کراماتِ اولیا اور ان خوارقِ عادات امور کی تصدیق کرتے ہیں جو انواعِ علوم، مکاشفات اور تاثیرات کی صورت میں ان کے ہاتھ پر جاری ہوتے ہیں جس طرح کہ امم سالفہ سے ایسے امور کا ذکر سورۃ الکہف اور سورت مریم وغیرہ میں آیا ہے اور اس امت کے علما اور اولیا سے ان کا صدور ہوا ہے۔ یہ کرامت تا قیامِ قیامت صلحائے امت کے ہاتھ پر پائی جائے گی، لیکن یہ کرامت و کشف احکامِ شریعت خصوصاً اس امر میں جو ظاہر کتاب و سنت کے مخالف ہے، حجت نہیں ہے اور صاحبِ کرامت و ولایت

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤٠)

اپنے حلیے، عمل اور قول میں سے کسی چیز میں عام مسلمانوں سے ممتاز نہیں ہوتا ہے اور نہ نذر وتقلید کے ساتھ مختص ہے، کیونکہ نذر اللہ کے لیے خاص ہے اور پیغمبر کے سوا کسی کی تقلید درست نہیں ہے۔

جو اولیا قرآن وحدیث کے متبع ہوں، ان سے محبت رکھے، ان کی توقیر وتکریم کرے، ان کے لیے دعا واستغفار بجا لائے، محاسنِ اقوال وافعال میں ان کا پیرو بنے۔ انھیں عالم الغیب، متصرف فی الامور، قاضی حاجات اور واجب الاتباع نہ جانے۔ ان کے لیے افعالِ الٰہیہ اور نبویہ کو ثابت نہ کرے، ان سے تکلیف کو ساقط نہ سمجھے۔ ان کے مقابلے میں حقِ ربوبیت والوہیت اور مرتبہ نبوت ورسالت کو ساقط کرنا فاسد اور شرکیہ عقیدہ ہے۔

جاہل صوفیوں کے ہاتھوں دین کی جو بربادی ہوئی ہے، اسلام کی وہ تباہی علماے سو کے ہاتھ سے نہیں ہوئی۔ عالم جب دنیا دار ہوتا ہے تو اس کا حال وقال اکثر مخلوق پر پوشیدہ نہیں رہتا ہے، بہت کم لوگ اس کے معتقد ہوتے ہیں۔ جبکہ مکار فقیر صوفی کا حال اکثر لوگوں پر نہیں کھلتا، اس لیے عوام بلکہ خواص نا فرجام اس کے معتقد ہو کر دین سے تہی دست ہو جاتے ہیں، اسی لیے کتب سنت میں علم کو عبادت پر نمایاں فضیلت دی گئی ہے۔ محققین صوفیہ نے کہا ہے کہ ہمارا طریقہ کتاب وسنت سے تائید شدہ ہے۔ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جس کسی مسئلے میں صوفیہ اور علما کا اختلاف ہوتا ہے وہاں حق عالم ہی کی طرف ہوا کرتا ہے، اس لیے کہ صوفیہ کے معارف مرتبہ ولایت سے ماخوذ ہوتے ہیں اور علما کے علوم شریعت حقہ سے لیے جاتے ہیں۔ کوئی ولی نبی کے مرتبے کو نہیں پہنچتا اور نہ ولایت مرتبہ نبوت سے افضل ہو سکتی ہے۔

وسیلے کی حقیقت کا بیان:

گزشتہ مبحث سے متعلق ایک مسئلہ اولیا اور صلحا کے ساتھ توسل کرنا ہے۔ اصل میں وسیلہ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کی طرف تقرب وتوسل پیدا کریں۔ حدیث شریف میں آیا ہے:

«آتِ مُحَمَّدَاً الْوَسِيلَةَ»[1] [محمد ﷺ کو وسیلہ عطا فرما]

اس وسیلے سے مراد اللہ تعالیٰ کا قرب، یا شفاعت، یا جنت میں کوئی مقام ومنزلت یا مقامِ محمود ہے۔ توسل میں اختلاف ہے اور حق یہ ہے کہ جو کچھ رسول اللہ ﷺ سے صحیح ثابت ہوا ہے اس کا اتباع اور اس پر

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٤٢)

عمل کرنا واجب ہے، جیسے ایک نابینے کی حدیث سنن میں وارد ہوئی ہے، جس میں یہ الفاظ منقول ہیں:

«يَا مُحَمَّدُ إِنِّي أَتَوَجَّهُ بِكَ إِلَى رَبِّي»[1]

[اے محمد! میں آپ کے وسیلے سے اپنے رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں]

بعض اہلِ علم نے اسے ضعیف کہا ہے اور بعض نے حسن کہا ہے۔ یا جیسے حدیث:

«بِحَقِّ السَّائِلِينَ عَلَيْكَ»[2] [رواه أحمد والحاكم]

[تجھ پر سوالیوں کا جو حق ہے، اس کے وسیلے سے]

اسے بھی ائمہ حدیث ضعیف کہتے ہیں۔ اس لیے شریعت میں وارد امر پر اقتصار و اکتفا کرنا احوط ہے، قیاس کو اس جگہ کوئی دخل نہ دے۔ یا جیسے اس چیز سے تبرک کرنا جسے صلحا نے ہاتھ لگایا یا استعمال کیا ہے، مگر اس جگہ تامل ہے، کیونکہ یہ محض قیاس ہے۔ جو بات رسول اللہ ﷺ سے صحت کو نہیں پہنچی، گو قیاس کی نظر میں وہ مستحسن معلوم ہو، اس جگہ یہ دروازہ بند کرنا لازم ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

"من استحسن فقد ابتدع"

[جو اپنی رائے سے کسی چیز کو مستحسن سمجھے گا وہ مبتدع بن جائے گا]

توحید کے مذہب میں جنابِ امام کی حمایت کے لیے سد ذرائع میں امام مالک کا مذہب اقوی المذاہب ہے، تا کہ ﴿يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ﴾ [البقرة: ١٦٥] کے مصداق نہ ہو، بلکہ ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾ [البقرة: ١٦٥] کا مصداق ٹھہرے۔ مومنوں نے اللہ وحدہ لاشریک کو انداد و اضداد سے منزہ پہچانا ہے اور اسی کو منعم، رحیم، رؤوف، ودود، کریم، لطیف، خالق اور رازق سمجھا ہے۔ انھیں صفات کمال کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ دوست رکھتے ہیں۔ اللهم اجعل حبك أحب إلي من نفسي وأهلي و مالي ومن الماء البارد. مدعیان علم و عقل کو بے فائدہ اور بے ضرر لوگوں کی محبت پر اور ان کے ساتھ توسل کرنے پر ابھارنے والی چیز اہلِ علم کے ساتھ حسن ظن کا اتباع ہے۔ ابلیس نے تھوڑا تھوڑا درجہ بدرجہ انھیں اس کام پر لگایا، یہاں تک کہ انھیں اس توسل کی عادت ہو

---

[1] مسند أحمد (٤/١٣٨) سنن الترمذي (٣٥٧٨) سنن ابن ماجه (١٣٨٥) اس حدیث کو امام ترمذی، حاکم، ابو اسحاق، ابن خزیمہ، ذہبی اور البانی رحمہم اللہ نے صحیح کہا ہے۔

[2] مسند أحمد (٢١/٣) سنن ابن ماجه (٧٧٨) اس کی سند میں "عطیہ العوفی" ضعیف ہے۔

گئی اور اس تقلید کی وجہ سے انھوں نے کتاب وسنت میں نظر کرنا ترک کر دیا، لیکن اگر کوئی شخص انصاف کے ساتھ قرآن وحدیث میں نظر کرتا ہے تو حق صراح اس پر مخفی نہیں رہتا۔ مدائن اسلام اور بلادِ ایمان میں شدائد ومصائب کے وقت ہمیشہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کے ساتھ استغاثہ اور استعانت ہوتی تھی، مگر اب ایک جہان نے مشائخ واولیا کا دامن پکڑ رکھا ہے، إنا لله وإنا إليه راجعون.

غیر اللہ کی نذر ونیاز:

من جملہ اس باب کے متعلقہ مسائل میں ایک مسئلہ اولیا، قباب، مشاہد، قبور اور ضرائحِ صلحا کے واسطے نذر ونیاز کرنا ہے، حالانکہ صحیح احادیث میں نذر سے صریح ممانعت آئی ہے[1] اور اس میں اللہ تعالیٰ کی بے ادبی اور رب رحیم کے ساتھ بدگمانی ہے، اسی لیے مذکورہ نہی کو تحریم پر محمول کرنا موکد ہے۔ نذر قضا کو پھیرتی ہے نہ کچھ نفع دیتی ہے، وہ ضرر کو دور کرتی ہے نہ کسی خیر کو کھینچتی ہے۔ ہاں بخیل کے مال کو برآمد کرتی ہے۔ صحیح اور صریح دلائل کے ساتھ قبوں پر نذریں ماننے کی تحریم ثابت ہے اور یہ وہ عمل ہے جس کا رسول اللہ ﷺ نے اذن نہیں دیا ہے۔ صحیحین میں آیا ہے:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»[2]

[جس شخص نے کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہمارا امر وحکم نہ ہو تو وہ مردود ہے]

یہ حدیث غیر شرعی معاملات کے بطلان اور ان پر ثمراتِ خیر کے نہ ملنے کی دلیل ہے۔ خواہ وہ شخص جہل سے یہ کام کرنے یا معرفتِ حق کے بعد ایسے فعل کا مرتکب ہو پس یہ سب نذور محرم اور باطل ہیں۔ اسی طرح وہ اموال جو کعبہ مکرمہ اور مسجدِ نبوی پر وقف کیے جاتے ہیں، ان کو یہاں وقف کرنے کے بجائے مصالح مسلمین پر خرچ کرنا بہتر ہے۔ جو لوگ انبیا کی قبروں کو مسجد ٹھہراتے ہیں اور اس طرف یا ان کے قریب نماز پڑھتے ہیں، حدیث میں ان پر لعنت آئی ہے۔[3] پھر قبورِ صلحا، مشاہدِ اولیا اور ضرائحِ اصفیا کا کیا ذکر ہے۔ وہ شخص جو قبر کو نافع یا ضار یا متصرف یا فیاض جانتا ہے وہ تو پکا مشرک ہے۔ حدیث میں قبر کا حکم یہ آیا ہے کہ جس قبر کو اونچا پائے اسے زمین کے برابر کر دے۔[4] رسول اللہ ﷺ

---

1. صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٣٩)
2. صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٨) نیز دیکھیں: صحيح البخاري (٢٥٥٠)
3. صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٠)
4. صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٦٩)

کی قبر شریف جو مسنم اور ایک بالشت اونچی ہے وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل تھا، مرفوع حکم نہیں ہے۔ مشاہد اور قبوں کا بنانا حرام ہے، نیز قبور سے استعانت اور استغاثہ کرنا، اموات کے ساتھ شرک اور نذر و نیاز کرنا باطل وحرام اور زیارتِ قبور کے لیے سفر کرنا منع ہے۔

خواب کی حقیقت:

اگر خواب پراگندہ نہ ہو اور کوئی عالم اس کی تاویل وتعبیر صحیح بیان کر دے تو خواب اللہ کی طرف سے سچی وحی ہے۔ انبیا کے خواب یقیناً وحی ہوتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے:

«رُؤْيَا الْمُؤْمِنِ كَلَامٌ يُكَلِّمُ بِهِ الرَّبُّ عَبْدَهُ»[1]

[مومن کا خواب ایک ایسا کلام ہے جس کے ذریعے سے رب تعالیٰ اپنے بندے سے ہم کلام ہوتا ہے]

خواب کا ثبوت قرآن وحدیث اور آثار صحابہ سے ہوتا ہے۔ ہاں جو خواب احکام شریعت کے ظاہر کے مخالف یا مثبتِ بدعت ہو، وہ انکار کے لائق ہے۔ ایک شخص نے خواب میں عمل مولد کی تحسین رسول اللہ ﷺ سے سنی تھی مجدد رحمہ اللہ نے مکتوبات میں اس پر انکار کیا۔ خواب کشف کی مثل حجت نہیں ہوتا ہے، یہ خواب دیکھنے والے کے لیے محض بشارت ہے۔

چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم
نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

[جب میں آفتاب کا غلام ہوں تو سب کچھ آفتاب ہی سے کہتا ہوں، نہ میں شب ہوں نہ شب پرست میں تو خواب کی بات کرتا ہوں]

معراجِ نبوی کا تذکرہ:

عاملین بالحدیث اور مومنین بالآثار کا اس پر اجماع ہے کہ رسول اللہ ﷺ نص قرآن کے مطابق ایک رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ گئے۔ پھر وہاں سے آسمان کی طرف چڑھے، یہاں تک کہ ایک آسمان سے دوسرے، پھر تیسرے، پھر چوتھے، پھر پانچویں، پھر چھٹے، پھر ساتویں، پھر جسد و روح

[1] السنة لابن أبي عاصم (٤٨٦) اس کی سند میں "حمزہ بن زبیر" اور "جنید بن میمون" مجہول ہیں: امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه من لم أعرفه" (مجمع الزوائد: ١٧٤/٧)

کے ساتھ سدرۃ المنتہی تک پہنچے اور پھر صبح سے پہلے مکہ واپس آ گئے۔ جو شخص اس معراج کا منکر ہے وہ کافر ہے۔ اسرا و معراج کا یہ قصہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے، ہاں رب تعالیٰ کی رویت میں اختلاف ہے، صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کا ایک گروہ دونوں طرف گیا ہے۔ راجح یہی ہے کہ آپ ﷺ نے رب تعالیٰ شانہ کو دیکھا ہے۔ امام احمد اور اہلِ حدیث اسی کے قائل ہیں۔ اس کے متعلق جو حدیث آئی ہے وہ اپنے ظاہر پر ہے، مؤول نہیں ہے۔[1]

امور غائبہ پر ایمان:

رسول اللہ ﷺ نے جن امور غائبہ کی خبر دی ہے اور وہ صحیح حدیث سے ثابت ہیں، خواہ ہم ان کے حقائق پر مطلع ہوں یا نہ ہوں، ان پر ایمان لانا واجب ہے، جیسے اشراطِ ساعت، خروجِ دجال، نزولِ عیسیٰ علیہ السلام، ظہورِ مہدی منتظر، خروجِ یاجوج ماجوج، سورج کا مغرب کی جانب سے طلوع ہونا، دابۃ الارض کا خروج، نفخِ صور، قیامِ قیامت، بعثِ موتی، حشر و نشر اور اس طرح کی دیگر علامات۔ ان علامات کا منکر کافر ہے۔

حشر و نشر کا بیان:

موت حق ہے۔ اسی طرح فتنۂ قبر، عذابِ قبر، نعیمِ قبر، ضغطۂ قبر، سوالِ منکر و نکیر، نصبِ میزان، اچھے برے اعمال کا وزن، صحائفِ اعمال کو کھولنا، بندوں کا حساب اور رب تعالیٰ کا بندۂ مومن کے ساتھ اقرار ذنوب کے لیے تخلیہ حق ہے، ان کی تفصیل کتاب و سنت میں بیان ہوئی ہے۔ کفار کا حساب نہ ہوگا، مگر انھیں ان کے اعمال سے آگاہ کر کے ان کے افعال کا اقرار کرا کر خلودِ نار کی جزا دی جائے گی۔ نفخ صور دو بار ہوگا، ایک بار مارنے کے لیے اور دوسری بار زندہ کرنے کے لیے۔ لوح محفوظ، قلم، قضا و قدر اور لوگوں کے جنت اور دوزخ میں چلے جانے کے بعد موت کو ذبح کر دینا حق ہے۔ جنت اور جہنم اس وقت موجود ہیں اور ہمیشہ باقی رہیں گی، انھیں فنا ہوگی نہ ان کے اہل و اشیا ختم ہوں گی۔

احوالِ قیامت کا بیان:

عرصۂ قیامت میں ایک حوض ہوگا جس کا طول و عرض سو سال کی مسافت ہے۔ اس کے آب خورے آسمان کے ستاروں کی تعداد کے برابر ہوں گے۔ جو کوئی اس کا پانی پیے گا وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا۔

[1] اس موضوع پر تفصیلی کلام گزر چکا ہے۔ دیکھیں (ص: ۱۱۱)

وہ پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہوگا۔ فجار وابرار کا پل صراط پر سے گزر ہوگا، یہ پل جہنم کی پشت پر رکھا جائے گا، جو کوئی اس سے پار ہو جائے گا وہ جنت میں جائے گا۔ کوئی اس پل سے بجلی کی طرح گزر جائے گا، کوئی ہوا کی طرح، کوئی تیز رفتار گھوڑے کی طرح، کوئی دوڑتا ہوا، کوئی چلتا ہوا، کوئی سرین کے بل گزر کرے گا اور کوئی جہنم میں گر جائے گا۔ جنت کا دروازہ پہلے رسول اللہ ﷺ کے لیے کھلے گا اور سب سے پہلے آپ ﷺ کی امت جنت میں جائے گی۔ جنت آسمان پر ہے اور جہنم زیر زمین، اگرچہ تعیین مکان کی تصریح نہیں آئی ہے، بلکہ جہاں کہیں اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے، وہاں پر یہ دونوں موجود ہیں۔ جنت اولیاء اللہ کا گھر ہے اور جہنم اعداء اللہ کا مکان ہے۔ اہلِ جنت بہشت میں اور مجرمین عذاب نار میں ہمیشہ رہیں گے۔ جہنم کی آگ فنا ہوگی نہ اہلِ نار کا عذاب منقطع ہوگا، یہی راجح اور اصح بات ہے۔

دیدارِ الٰہی:

ایمان دار لوگ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو سر کی آنکھوں سے دیکھیں گے جس طرح وہ چاند کو یا سورج کو صاف دن میں دیکھتے ہیں، وہ اس کے دیدار میں کچھ شک نہ کریں گے۔ پھر جنت میں داخل ہونے کے بعد بھی گاہے گاہے اسے دیکھا کریں گے۔ کافروں کو اللہ تعالیٰ کا دیدار نہ ہو گا۔ اہلِ کلام نے اس مسئلے میں جو جہت ومقابلہ، اتصالِ شعاع اور قرب وبعد وغیرہ کی نفی کا ذکر کیا ہے، اس میں شارع سے کوئی نص آئی ہے نہ سلف امت اور ائمہ ملت میں سے کسی شخص نے اس کے بارے میں کلام کیا ہے، بلکہ کم عقل متکلمین نے یہ الفاظ و براہین فلاسفہ سے مستعار لیے ہیں۔

فرشتوں کا تذکرہ اور ان کی ذمے داری:

اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں جو کتابتِ اعمال اور مصائب سے حفاظتِ عباد کی ذمے داری پر مقرر ہیں۔ وہ خیرات وحسنات کی طرف بلاتے ہیں اور بندے کو خیر ورشد پر برانگیخت کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک مقام معلوم ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتا، چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ [التحریم: ٦]

[اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے جو وہ انھیں حکم دے اور وہ کرتے ہیں جو حکم دیے جاتے ہیں]

اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے ایک مخلوق شیاطین ہیں۔ وہ بنی آدم کو شر پر ابھارتے ہیں، وہ ان میں

خون کی طرح رگوں میں دوڑتے ہیں۔ جنات کا وجود خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ ملائکہ، جن اور شیاطین کے وجود کا منکر کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کا منکر ہے، وہ اسلام سے خارج اور کفر میں داخل ہے۔

ہمارے رسول ﷺ خاتم النبیین ہیں:

کبیرہ گناہ کا مرتکب مسلمان آگ میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کا کبائر سے عفو اور درگزر کرنا جائز ہے۔ اسی طرح اس شخص سے بھی جو توبہ کیے بغیر مر گیا ہے، لیکن یہ بطور خرقِ عادت کے ہو گا۔ انبیا کا مبعوث ہونا اور اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو رسولوں کی زبان پر امر و نہی کے ساتھ مکلف ٹھہرانا حق ہے۔ انبیا کفر اور کبائر پر اصرار کرنے سے معصوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں محفوظ رکھتا ہے۔ ہمارے رسول ﷺ کی دعوت تمام جن وانس کی طرف عام ہے، کیونکہ اللہ عزوجل کا فرمان ہے:

﴿لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا﴾ [الفرقان: ۲۵] [تاکہ وہ جہانوں کے لیے ڈرانے والا ہو] اس کی ایک اور دلیل وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں منقول ہے:

«أُرْسِلْتُ إِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً»[1] [میں تمام مخلوق کی طرف بھیجا گیا ہوں]

اس لفظ ''خلق'' میں جو عموم ہے یہ محدود نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد صور میں پھونکے جانے تک دنیا میں کوئی نبی نہیں ہو گا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر:

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ کسی فتنے میں مبتلا کرنے والا نہ ہو اور اس کے قبول کا گمان حاصل ہو۔ اگر اس امر و نہی کا مفسدہ ان کی مصلحت سے زیادہ ہو تو سکوت اختیار کرنا چاہیے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کی مصلحت کا کوئی راستہ کھول دے۔

خلافت اور اس کی ذمے داریاں:

رسول اللہ ﷺ کے بعد خلافت قریش میں ہے جب تک قریش کے دو آدمی بھی دنیا میں باقی ہوں۔ کوئی شخص اپنی طرف سے کسی غیر قریش کو امام نہ بنائے اور خلافت کی بابت قریش سے منازعت اور جھگڑا نہ کرے، ان کے خلاف خروج نہ کرے اور قیامت تک غیر قریش کے لیے امامت کا اقرار نہ کرے۔ ہاں اگر غیر قریش مسلط ہو جائے اور اس کے صرف وعدل میں فتنہ برپا ہوتا ہو تو اس کی

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۲۳)

اطاعت کرے، جب تک کہ وہ نماز پر قائم ہو۔ فرمانِ مصطفیٰ ﷺ ہے:

«لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ»[1]

[خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت کرنا جائز نہیں ہے]

جب سے رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے ہیں تب سے ائمہ ابرار و فجار کے ساتھ مل کر جہاد کرنا جاری ہے اور یہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اس امتِ اسلام کا آخری حصہ دجال سے قتال کرے، کسی ظالم کا ظلم یا کسی عادل کا عدل جہاد کو باطل نہیں کر سکتا ہے۔ جمعہ، عیدین اور حج ائمہ کے ہمراہ ادا کرنا چاہیے، اگرچہ وہ ملوکِ اسلام ابرار واتقیا اور عدول واخیار نہ ہوں۔ وہ صدقات، خراج، اعشار اور غنائم کو سلاطین کے حوالے کرے، خواہ وہ ان میں عدل کریں یا ظلم۔ جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے امر کا والی بنایا ہے، یہ اس کا مطیع رہے، اس کی اطاعت سے ہاتھ کھینچے اور نہ تلوار لے کر اس کے خلاف خروج کرے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کوئی راستہ پیدا کر دے۔ ائمہ کی سمع وطاعت واجب ہے۔ ان کی بیعت نہ توڑے۔ جو کوئی اس کی خلاف ورزی کرے گا، وہ مبتدع، اہلِ سنت کا مخالف اور مفارق جماعت ہے۔ امام کے حق میں ہرگز مانع نہ ہو۔

خلیفہ کے خلاف خروج کرنا منع ہے:

فتنے کے وقت اپنے آپ کو روک کر رکھنا سنت ماضیہ ہے جس کا لزوم واجب ہے اور اگر اس میں مبتلا ہو جائے تو جان کو مقدم کرے نہ کہ دین وایمان کو۔ وہ فتنے پر ہاتھ وزبان سے مددگار نہ بنے، بلکہ ہاتھ، زبان اور اپنی خواہش کو روکے۔ جو شخص خلافت کا والی بنا، لوگوں نے اس پر اجماع کیا، اس سے راضی ہوئے یا اس نے لوگوں پر تلوار سے غلبہ پایا تھا، یہاں تک کہ خلیفہ یا امیر المومنین یا امام یا بادشاہ اسلام ٹھہر گیا تو اس کی اطاعت واجب اور اس کی مخالفت حرام ہے، مگر اللہ ورسول ﷺ کی معصیت میں اس کی طاعت روا نہیں۔ اس پر خروج کرنا اور مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنا ممنوع ہے۔ سلطان جب معصیت کا حکم دے تو اس کی اطاعت نہ کرے، مگر اس پر خروج بھی نہ کرے۔

ایمان میں استثنا:

ایمان میں استثنا ["أنا مؤمن إن شاء الله" کہنا] جائز ہے۔ چنانچہ سلف اسی طریقے پر

[1] المعجم الكبير للطبراني (١٨/ ١٧٠) نیز دیکھیں: صحيح البخاري (٦٨٣٠) صحيح مسلم (١٨٤٠)

تھے۔ یہ استثنا کسی شک کی بنا پر نہیں ہوتا ہے، بلکہ یہ تبرک اور امر ایمان کو اللہ کے سپرد کرنے کے لیے ہے۔ علما کے نزدیک یہ ایک سنت ماضیہ ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴾ [الفتح: ۲۷]

[تم مسجد حرام میں ضرور بالضرور داخل ہو گے، اگر اللہ نے چاہا، امن کی حالت میں]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین عظام رحمہم اللہ اور صوفیہ وغیرہ کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔

تنازع کی صورت میں اہلِ حدیث کا رویہ:

اہلِ حدیث دین اور قدر میں جدل و مرا اور خصومت و مکابرت کے منکر ہیں اور وہ ثقات و عدول کی روایاتِ صحیحہ اور آثارِ مرویہ کو تسلیم کرتے ہیں جب کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل سند کے ساتھ پہنچ جائیں۔ وہ "کیف" اور "لِمَ" کہنا بدعت جانتے ہیں۔ ان کا قول یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے شر کا حکم نہیں دیا، بلکہ خیر کا حکم کیا ہے۔ وہ شرک، کفر اور معاصی سے ناراض ہے، اگرچہ یہ امور اسی کے ارادے سے ہوتے ہیں۔ اہلِ حدیث رب تعالیٰ کے نزول والی حدیث کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ کتاب وسنت کے ساتھ معتصم اور متمسک ہیں، کیونکہ اللہ عزوجل کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ﴾ [النساء: ۵۹]

[پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ]

اللہ تعالیٰ کی طرف کسی چیز کے رد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ قرآن کی طرف رجوع کرے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رد یہ ہے کہ وہ سنت وحدیث کی طرف آئے۔ یہ لوگ تقلیدِ رجال اور اشتغال بالقیل والقال کو ناجائز جانتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جس شخص کا قول یا فعل یا عمل یا چال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر اور سنت سے بال برابر بھی مخالف ہو وہ رد کر دینے کے لائق ہے۔ ہاں وہ اتباعِ سلف اور ائمہ دین کی اقتدا کو ان امور میں پسند رکھتے ہیں جو کتاب وسنت کے موافق ہیں۔ جس چیز کا اللہ تعالیٰ نے اذن نہیں دیا ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم نہیں فرمایا ہے، اپنے دین میں وہ اس کا اتباع نہیں کرتے۔ وہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ فرشتے صف باندھ کر کھڑے ہوں گے۔ وہ جس طرح چاہے گا اپنی مخلوق سے قریب ہو گا، جیسے اس کا ارشاد ہے:

﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾ [ق: ١٦]
[اور ہم اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں]

مشرکین کے خلاف جہاد کی فرضیت:

اہلِ حدیث ہر سنی امام کے، خواہ وہ نیک ہو یا بد، پیچھے عید، جمعہ اور جماعات کو جائز رکھتے ہیں اور وہ سفر وحضر میں موزوں پر مسح کرنے کو جائز بتاتے ہیں۔ وہ مشرکین کے خلاف جہاد کرنے کو فرض جانتے ہیں جس طرح کہ سنتِ صحیحہ میں آیا ہے۔ وہ مشرکین خواہ کوئی ہوں اور کہیں ہوں۔ ہر زمانے میں فتنے سے بچنا ضروری ہے۔

وہ ائمہ مسلمین اور عوام مومنین کے لیے دعا، صلاح، سداد اور نصیحت کرتے ہیں۔ فتنے میں باہم لڑائی کرنے سے روکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے فوت شدگان کو موت کے بعد دعا اور صدقہ پہنچتا ہے۔ جادوگر کافر ہے۔ اہلِ قبلہ کی نمازِ جنازہ درست ہے، جب تک وہ حدِ کفر کو نہ پہنچے ہوں۔ وہ رزق کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جانتے ہیں خواہ حلال ہو یا حرام۔ وہ کہتے ہیں کہ شیطان انسان کے دل میں وسوسہ اور شک ڈالتا ہے اور اسے خبطی بنا دیتا ہے۔ یہ بات جائز ہے کہ اللہ عزوجل بعض صالحین کو بعض آیات کے ساتھ خاص کرے۔

اخلاق حسنہ اور اخلاق رذیلہ:

بچوں کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، چاہے انھیں بخشے، چاہے عذاب کرے۔ یہ اس کے علم وارادے پر موقوف ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے اطفال کا حال دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ»[1] [اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ کیا عمل کریں گے] اللہ تعالیٰ کو اجمالاً اور تفصیلاً بندوں کے اعمال کا علم ہے۔ اس نے پہلے ہی سے یہ لکھ رکھا ہے کہ بندہ یہ کام کرے گا۔ غرض کہ ہر امر میں اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے۔ اللہ جل وعلا کے حکم پر صبر کرنا، اس کے امر و نہی کو بجا لانا، عمل میں اخلاص کرنا، مسلمانوں کا خیر خواہ رہنا، عبادت میں اتباع کرنا، جماعت مسلمین کا ناصح ہونا، ہر مسلمان کو نصیحت کرنا اور کبائر ذنوب سے بچنا واجب ہے، جیسے زنا، خمر، سرقہ، جھوٹی بات اور گواہی، معصیت، فخر، کبر، خود پسندی نسب پر فخر اور کسی کے حسب میں طعن کرنا ہیں۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٢٦)

اہلِ بدعت سے اجتناب کرنا:

ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اصحابِ بدعت سے بچے اور معانیِ قرآن کی قراءت و تدبر، کتابتِ آثار اور درسِ سنن میں مشغول رہے۔ غضب ورضا ہر حال میں تبع قرآن وحدیث ہو۔ سنت میں تواضع سے نظر کرے۔ اچھے اخلاق کا حامل ہو۔ نیکی کی اشاعت، دوسروں سے تکلیف دور کرنے اور غیبت ونمیمہ سے اجتناب کرنے میں کوشش کرے۔ اشیاے خور ونوش کی جانچ پڑتال کرے کہ وہ حلال ہیں یا حرام۔

کمائی کرنا جائز ہے:

مکاسب، تجارات اور مال طیب کو حرام کہنے والا جاہل اور غلط کار ہے، بلکہ حلال ذریعے سے سارے مکاسب جائز ہیں۔ اللہ ورسول ﷺ نے مکاسب کو حلال کیا ہے، بلکہ یہ سننِ انبیا وصلحا میں داخل ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے لیے اور اپنے اہل وعیال کے لیے اللہ تعالیٰ کے فضل ورزق کو تلاش کرے۔ عدمِ جواز کے خیال سے کسب کا ترک کرنا سنت کے خلاف ہے۔

تقلید جامد کی مذمت:

دین کتاب، آثار، سنن، روایاتِ صحاح اور اخبارِ صحیحہ سے عبارت ہے جو ثقات کے ذریعے آئے ہیں۔ بعض احادیث بعض کی تصدیق کرتی ہیں، یہاں تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ، خیر القرون اور ائمہ سلف صلحا کی طرف پہنچ جاتی ہیں۔ وہ ائمہ کرام بدعت و تجریح اور انکارِ حق سے عاری تھے۔ جس شخص میں ادنا درجے کی بھی تمیز ہے، اس پر واضحاتِ کتاب اور صرائح سنت کی طرف رجوع کرنا واجب ہے۔ کبھی ایک شخص کی تصنیف سے ساری دنیا بھر جاتی ہے اور ظاہر میں وہ تالیف علومِ سنت وکتاب پر مشتمل ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ شخص رجال کی جامد تقلید پر قائم ہوتا ہے، اپنے مذہب کے امام کی نصرت میں رہتا ہے، گو تعسف وتعصب کے ساتھ ہو، وہ اللہ ورسول ﷺ کے قول وحکم کو گرا دیتا ہے، اپنے سلف کو جس پر پاتا ہے یا اپنے شیخ واستاد کو جیسا دیکھتا ہے اسی بات کو اختیار کرتا ہے، پس ایسا شخص غفلت وجہل میں مغمور ہے یا معاند حق ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کا محاکمہ ہوگا۔ اگر اخلاص کی ذرا سی بھی چمک یا خوف آخرت کا ذرہ یا ایمانِ کامل کا لمعہ اسے نصیب ہوتا تو وہ انصاف کرتا اور عارف حق ہو جاتا، ولکن قدر الله وما شاء فعل.

جن فرقوں کو اللہ ورسول کے کلام سے جتنا بُعد ہوتا گیا، اتنا ہی ان کا جہل وضلال زیادہ ہوا، یہاں تک کہ بہتر (۷۲) ناری فرقے ظاہر ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے اسی ایک فرقے کو اس بلا سے عافیت میں رکھا، وللہ الحمد. یہ فرقہ اہلِ حدیث، طائفہ ظاہریہ، صوفیہ صافیہ اور اہلِ مذاہب اربعہ سے عبارت ہے، لیکن ان میں سے پہلے تین فرقوں میں اصولِ دین اور فروعِ اعمال کی بابت زیادہ اختلاف نہیں ہے إلا ماشاء اللہ. اسی طرح فروعِ مسائل میں مذاہب اربعہ کا باہمی اختلاف چار سو مسئلوں سے زیادہ نہیں ہے۔

شعرانی رحمہ اللہ نے اس اختلاف کو میزان تشدید وتخفیف میں وزن کر کے ایک طرح کی تطبیق وتوفیق دی ہے، لیکن بہتر طریقہ، جو سراپا خیر وبرکت، صراط مستقیم، طریق قویم اور جادہ سلامت ہے، وہ یہی ہے کہ سب اہلِ فرقہ ناجیہ اس اختلاف کو طاق نسیان پر رکھ کر سنی خالص، محض متبع محمدی اور صرف مخلص احمدی ہو جائیں۔ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب وسنت کے سوا کسی کو واجب الاتباع نہ سمجھیں، فقط قرآن وحدیث کو اپنا امام جانیں۔

مصلحت دید من آنست کہ یارانِ ہمہ کار
بگذارند وسرطرۂ یاری گیرند

[میں تو اسی میں مصلحت سمجھتا ہوں کہ وہ ہرجائی اور بے وفا دوستوں کو چھوڑ دیں اور ایک (کام کے) دوست کی پگڑی کا کنارہ پکڑ لیں (اس کے دامن سے وابستہ ہو جائیں)]

اتباعِ سنت:

ایک سنت اہلِ بدعت سے دور رہنا اور ان سے دین میں بحث مباحثہ ترک کرنا ہے۔ ہر محدث بدعت ہے، ہر بدعت گمراہی ہے۔ کوئی بدعت حسنہ نہیں ہوتی۔ لہٰذا بندہ مومن اہلِ بدعت کی کتابوں کو مت پڑھے اور اصول وفروع میں ان کی بات نہ سنے، جیسے رافضی، خارجی، جہمی، قدری، مرجی، کرامی اور معتزلی ہیں، کیونکہ یہ سب فرقے گمراہ ہیں۔ اصول وفروعِ مذہب میں ان کا اختلاف اور ان کی بدعت شائع اور عام ہے۔ برخلاف طوائف مذاہب اربعہ کے کہ یہ لوگ اصول میں نصوص کے مخالف نہیں ہیں۔ رہی فروع تو ان کا ان فروع میں اختلاف اجتہادات پر مبنی ہے۔ ابتدا میں یہ اجتہاد اس جگہ ہوا تھا جہاں کتاب وسنت کی کوئی دلیل ان کے ہاتھ نہ لگی تھی۔ کسی جگہ یہ اجتہاد قرآن وحدیث کے

دلائل کی وضاحت کے لیے تھا۔ جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ بھی باہم مختلف ہو جاتے تھے۔ وہی اس امت کے لیے نمونہ ہیں اور ان کا اجماع سب کے نزدیک حجت ہے۔

اہلِ سنت کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ظاہراً اور باطناً ہر قول، فعل، عمل اور حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار کا اتباع کرتے ہیں۔ ظاہر سنت اور واضح کتاب پر چلتے ہیں۔ وہ سابقین اولین مہاجرین انصار کی راہ پر چلنے والے ہیں۔ وہ رسولِ مختار صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کا اتباع کرتے ہیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

«عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ، عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ، وَ إِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُوْرِ، فَإِنَّ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»

[میری سنت اور ہدایت یافتہ اور نیک خلیفوں کی سنت کو لازم پکڑو، اسے دانتوں کے ساتھ خوب مضبوطی سے تھام لو اور بدعات سے بچو، بلاشبہ ہر بدعت گمراہی ہے]

اسی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرتِ اختلاف کی بھی خبر دی ہے۔ فرمایا:

«وَ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِي فَسَيَرَى اخْتِلَافاً كَثِيْراً»[1]

[تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا، وہ بہت سا اختلاف دیکھے گا]

یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسا فرمایا تھا ویسا ہی ہمیں پیش آیا۔ اس تجربے کے بعد ہم پر وصیت نبوی پر عمل کرنا واجب ہوا۔ اہلِ حدیث یہ بات بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کسی کا کلام اللہ عزوجل کے کلام سے زیادہ راست اور سچا نہیں ہے، کیونکہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا﴾ [النساء: ١٢٢]

[اور اللہ سے زیادہ بات میں کون سچا ہے]

پھر اب اس کلام کے بعد وہ کس کی بات پر ایمان لائے گا؟۔

﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ﴾ [الأعراف: ١٨٥]

[پھر اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے؟]

سب سے بہتر طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔ محدثاتِ دین سب سے برے امور

[1] سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٦٠٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٧٦) سنن ابن ماجه (٤٣) سنن ابو داؤد میں «عضوا عليها ... الخ» سے پہلے کے الفاظ کا اضافہ بھی موجود ہے۔

ہیں۔ اسی لیے اس گروہ صدق اور متبع حقِ جماعت کا نام اہلِ حدیث، اہلِ اثر، اہلِ سنت، اہلِ کتاب اور اصحابِ اتباع ہے۔

اجماع کی حقیقت:

اجماع یہ ہے کہ اہلِ علم کے اقوال واعمال ظاہرہ و باطنہ کا کسی امر دین پر اجتماع ہو، اس اتفاق کو اجماع کہتے ہیں۔ اجماع منضبط وہ کہلاتا ہے جس پر سلف صالح گامزن تھے۔ سلف سے مراد صرف عصرِ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین ہے۔ سلف کے بعد بہت سا اختلاف رونما ہوا جس کے نتیجے میں امت منتشر ہو گئی، اجماع جداگانہ نہ پایا گیا۔ اسی لیے امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ محققین نے اجماع کے امکان کے باوجود اجماع کے وجود کا انکار کیا ہے۔

مومنوں کے باہمی تعلقات اور اخلاق حسنہ کا بیان:

اہلِ حدیث ان اصول کے باوجود شریعت کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عامل ہیں اور جمعہ و جماعات کی مکمل پابندی کرتے ہیں۔ وہ امرا اور امت کے ناصح ہیں اور حدیثِ ذیل کے معتقد ہیں:

«اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضاً»[1]

[مومن، مومن کے لیے ایک عمارت ہے جس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے]

وہ اس حدیث کے بھی قائل ہیں:

«مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ الْوَاحِدِ إِذَا اشْتَكىٰ مِنْهُ عُضْوٌ، تَدَاعىٰ لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالْحُمّٰى وَالسَّهَرِ»[2]

[مومن بندوں کی مثال ان کی آپس میں محبت اور اتحاد و شفقت میں ایک جسم کی طرح ہے کہ جب جسم کے اعضا میں سے کسی ایک عضو کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو اس کے سارے جسم کو نیند نہیں آتی اور بخار اور رت جگے میں اس کا شریک ہوتا ہے]

وہ مصیبت پر صابر، آسانی پر شاکر، تلخی پر راضی، مکارمِ اخلاق کی طرف داعی اور محاسنِ اعمال

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٨٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٦)

کی جانب منادی رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایمان میں اکمل المومنین وہ ہے جو خلق میں احسن مسلمین ہو۔ قطع رحمی کرنے والے سے صلہ رحمی کرے۔ نہ دینے والے کو دے، ظالم کو معاف کرے، والدین کے ساتھ نیکوکار ہو۔ صلہ ارحام، حسنِ جوار اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ احسان کرے، مسافر اور مملوک غلام کے ساتھ رفق ونرمی سے پیش آئے۔ فخر وتکبر اور مخلوق پر دست درازی سے بچے، کسی کو ناحق نہ ستائے، معالی اخلاق حاصل کرے، گندی عادات سے منع کرے اور ان سب امور میں کتاب وسنت کا تابع بنے۔

اہلِ حدیث کا طریقہ وہی دین اسلام ہے جس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تھے۔ حدیث میں یہ خبر دی گئی ہے کہ یہ امت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی، بہتر (۷۲) فرقے آگ میں جائیں گے اور ایک فرقہ ناجی ہوگا، جسے جماعت کہتے ہیں اور اس فرقے کی پہچان یہ ہے:

«مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي الْيَوْمَ»[1]

[جس طریقے پر آج میں اور میرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گامزن ہیں]

تو یہ لوگ خالص اسلام اور ملاوٹ سے پاک ایمان کے ساتھ متمسک ہوئے۔ ان کا نام اہلِ سنت وجماعت ٹھہرا۔ ان میں صدیقین، شہدا اور صالحین ہوئے ہیں۔ یہ اعلامِ ہدی، مصابیح دجی، اصحابِ مناقب ماثورہ اور فضائل مذکورہ ہیں۔ انھیں کو رسول اللہ ﷺ نے فرقہ منصورہ قرار دیا، قیامت تک ان کا بول بالا رہے گا۔ انھیں کوئی رسوا نہ کر سکے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں سرسبزی وشادابی کی دعا دی ہے اور ان کی تعدیل فرمائی ہے، وللہ الحمد.

یہاں پر کتاب "قطف الثمر في عقيدة أهلِ الأثر" کا خلاصہ اختتام کو پہنچا۔ اس ترجمے میں مذکورہ کتاب کے الفاظ کے ترجمے اور اس پر عدمِ زیادت ونقصان کی قید کو ملحوظ نہیں رکھا گیا، صرف مطالب ومقاصد کا بیان احاطۂ تحریر میں لایا گیا ہے، والحمد للہ أولاً وآخراً.

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١)

خاتمة الرسالہ

شرک، کلماتِ کفر اور ریا کا بیان

اس رسالے کو فرقہ ناجیہ کے عقائد تحریر کرنے کے بعد اس بیان پر اس لیے ختم کیا ہے کہ صغیرہ و کبیرہ جتنے بھی گناہ ہیں، ان پر عذابِ موقت ہو یا نہ ہو، ان کے مرتکبین کا انجام جنت ہو گا، ان شاء اللہ تعالیٰ، شرک و کفر کے بر خلاف، کیونکہ اس کی جزا دائمی اور ہمیشہ کا عذاب ہے۔ ایمان وعقیدے کی درستی اسی وقت نفع دے گی جب مومن شرک و کفر کی خفی وجلی تمام انواع واقسام سے محفوظ رہا ہو گا، ورنہ کفر وشرک سے فسادِ عقیدہ کے ہمراہ محض کلمہ پڑھ لینے سے وہ نجات یافتہ نہیں ہوتا ہے۔

پھر اہلِ علم نے کبائر کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے: ایک کبائر باطن، یہ کل چھیاسٹھ (٦٦) ہیں اور دوسرے کبائرِ ظاہر جو چار سو ایک (٤٠١) ہیں۔ کبائر باطنہ کبائر ظاہرہ سے بدتر ہیں، اگرچہ معصیت میں دونوں برابر ہیں۔ شرک بھی من جملہ کبائر باطنہ کے ہے۔ ایسے شخص کے لیے اس سے بچنا ضروری ہے جسے ایمان پر مرنا منظور ہو۔ زواجر میں کبائر کے حق میں کہا ہے:

"إنها أخطر، ومرتكبها أذل العصاة وأحقر، ولأن معظمها أعمم وقوعا، وأسهل ارتكاباً، وأمر ينبوعا، فقلما ينفك إنسان عن بعضها للتهاون في أداء فرضها، فلذلك كانت العناية بهذا القسم أولى ... ولقد قال بعض الأئمة: كبائر القلوب أعظم من كبائر الجوارح، لأنها كلها توجب الفسق والظلم، وتزيد كبائر القلوب بأنها تأكل الحسنات، وتوالي شدائد العقوبات۔ ولما ذكر [بعض الأئمة الكبائر الباطنة و] أوصلها إلى أكثر من ستين، قال: والذم على هذه الكبائر أعظم من الذم على الزنا والسرقة والقتل وشرب الخمر، لعظم مفسدتها وسوء أثرها ودوامه، فإن

آثارها تدوم بحيث تصير حالا للشخص وهيئة راسخة في قلبه، بخلاف آثار معاصي الجوارح، فإنها سريعة الزوال بمجرد الإقلاع مع التوبة والاستغفار والحسنات الماحية والمصائب المكفرة، ﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ﴾[1]"

[یقیناً کبائر بہت خطرناک گناہ ہیں اور ان کا مرتکب گناہ گاروں میں سب سے زیادہ ذلیل اور حقیر ہے، کیونکہ ان میں سے اکثر گناہ وقوع کے اعتبار سے عام، ارتکاب کے اعتبار سے آسان اور پھیلنے کے اعتبار سے بہت عام ہیں۔ فرائض کو ادا کرنے میں سستی کرنے کی وجہ سے ان میں سے بعض کا مرتکب ہونے سے کوئی انسان کم ہی بچا ہوگا، اسی لیے ان کی طرف توجہ دینا اور ان سے خبردار رہنا اولیٰ ہے۔ ائمہ میں سے کسی نے کہا ہے۔ کبائرِ قلوب کبائرِ جوارح سے بڑے ہیں۔ کیونکہ کبائرِ جوارح فسق و ظلم کو واجب کرتے ہیں، اور کبائرِ قلوب اس لحاظ سے بڑے ہیں کہ وہ نیکیوں کو کھا جاتے ہیں اور سخت سزاؤں کے موجب بنتے ہیں۔ اس نے کہا: ائمہ میں سے کسی نے کبائر باطنہ کو بیان کیا انھیں شمار کیا تو وہ ساٹھ سے زیادہ بنے۔ اس نے کہا: ان کبائرِ باطنہ کے ارتکاب پر مذمت کرنا، زنا، چوری، قتل اور شراب نوشی پر مذمت سے بڑی ہے، کیونکہ ان کا بگاڑ بڑا اور ان کا اثر برا اور دائمی ہے، کیونکہ وہ کسی شخص کی مستقل حالت بن کر رہ جاتے ہیں اور اس کے دل میں راسخ ہو جاتے ہیں، برخلاف جوارح کے گناہوں کے، کیوں کہ بلاشبہہ وہ جلد زائل ہو جاتے ہیں اور محض توبہ، استغفار، حسنات ماحیہ اور مصائب مکفرہ کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ "یقیناً نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں، یہ نصیحت و یاد دہانی ہے نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے"]

ان کبائر باطنہ کے ضمن میں یہ شرک سب سے بڑا گناہ ہے۔ اس لیے اس کے مراتب پر آگاہ کرنا ضروری ٹھہرا۔ جب آدمی شرک سے بچ جاتا ہے اور صفاتِ کفر سے محفوظ رہتا ہے تو اس کی نجات کی امید یقینی ہوتی ہے اگرچہ عذاب جھیلنے کے بعد ہو۔ اگر عیاذاً باللہ عقیدے میں یا عمل میں یا دونوں میں مشرک اور اوصافِ کفر کے ساتھ متصف تھا تو پھر نجات کی کوئی امید باقی نہیں ہے، واللہ أعلم.

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

[1] الزواجر عن اقتراف الكبائر للهيتمي (١/ ٤٤)

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [النساء: ٤٨]
[بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور وہ بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا]

نیز فرمایا:

﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ [لقمان: ١٣] [بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے]

مزید فرمایا:

﴿اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴾ [المائدة: ٧٢]
[بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو بھی اللہ کے ساتھ شریک بنائے، سو یقیناً اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں]

صحیح میں مرفوعاً مروی ہے:

«اَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِأَكْبَرِ الْكَبَائِرِ؟ اَلْإِشْرَاكُ بِاللّٰهِ ... إِلٰى قَوْلِهٖ: فَمَا زَالَ يُكَرِّرُهَا حَتّٰى قُلْنَا لَيْتَهٗ سَكَتَ»[1]
[کیا میں تمھیں کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ نہ بتاؤں (سنو!) وہ گناہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے،... آپ جھوٹی بات کو بھی اس کبیرہ گناہوں کی فہرست میں ذکر کر کے بار بار اس کو دہرا رہے تھے حتی کہ ہم نے کہا: کاش! آپ ﷺ اب خاموش ہو جائیں]

دوسری حدیث میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے کو سات ہلاک کر دینے والے اعمال میں شمار کیا گیا ہے۔[2] امام احمد، بخاری، ترمذی، نسائی، ابو داود، طبرانی، ابن حبان، حاکم، بیہقی رحمہم اللہ وغیرہ کی کتب میں شرک کا اکبر کبائر ہونا بہت سی احادیث میں آیا ہے۔ بعض احادیث میں شرک کو اعظم کبائر بھی فرمایا ہے۔ اسی طرح اس کی جزا بھی اعظم عذاب اور اشد عقاب ہے۔

شرک کی بہت سی انواع و اقسام ہیں، اور اکثر لوگ اس شرک میں گرفتار ہیں۔ عام لوگوں کی زبان پر شرک و کفر کے الفاظ اکثر جاری رہتے ہیں اور وہ اس کو نہیں جانتے، حالانکہ اس کی شناخت

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥١١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٧)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٩)

ایک ضروری امر ہے، کیونکہ کفریہ عمل کے ارتکاب سے سارے اعمال برباد ہو جاتے ہیں۔ علما کی ایک جماعت کے نزدیک ان ضائع شدہ اعمال کی قضاے واجب لازم ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے۔ ان کے اصحاب نے مکفرات کے بیان میں بہت توسیع کی ہے اور بہت سے جملے لکھے ہیں اور باقی ائمہ کی نسبت اس میں زیادہ مبالغہ کیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ رِدّت محبط اعمال ہے۔ ارتداد سے منکوحہ بائن ہو جاتی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اگرچہ ردت محبط عمل تو نہیں ہے لیکن محبط ثواب ہے۔ اس صورت میں ان دونوں اماموں کے درمیان قضاے واجب کے سوا کوئی اختلاف باقی نہ رہا۔ اگرچہ اس بارے میں اکثر اہلِ علم نے ان کی تقلید نہیں کی ہے، لیکن جہاں تک بن سکے احتیاط و مراعاتِ خلاف کو واجب کرتا ہے۔ خصوصاً اس تنگ باب میں، بلکہ اس سے زیادہ کوئی امر سخت تر نہیں ہے۔ اس لیے ہم اس جگہ معتمد وغیر معتمد خاص مذہب کی قید کے بغیر سب کو لکھتے ہیں، تاکہ مومن ان سب سے محتاط رہے۔

قاضی ثنا اللہ پانی پتی رحمہ اللہ کی کتاب ''مالا بد منہ'' سے کلماتِ کفر کا بیان:

① اگر ایک مسئلے میں کفر کی چند وجہیں ہوں اور ایک وجہ کفر کی نہ ہو تو کفر کا فتویٰ نہ دینا چاہیے۔
قاضی ثناء اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کسی ایسی چیز کو نہ اپنایا جائے جس میں ایک وجہ کفر بھی موجود ہو۔

② سبِّ شیخین (ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو گالی دینا) اور تفضیلِ علی سے انسان کافر نہیں ہوتا ہے، کیونکہ یہ کام بدعت ہے۔ انتہیٰ

میں کہتا ہوں: آیتِ کریمہ: ﴿لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ [الفتح: ٢٩] [تاکہ وہ ان کے ذریعے کافروں کو غصہ دلائے] شیخین پر سب و شتم کرنے والے کے کفر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

③ اللہ تعالیٰ کے دیدار کو محال جاننا کفر ہے۔

④ مجسمہ اور مشبہہ کفار ہیں۔

⑤ اگر کسی نے اپنے اختیار سے کلمۂ کفر کہا اور یہ نہ جانا کہ یہ کفر کا کلمہ ہے تو اکثر علما کا یہ موقف ہے کہ وہ کافر ہو جائے گا، معذور نہ ہوگا۔ اگر بلا قصد کلمۂ کفر زبان سے نکل جائے تو کافر نہ ہوگا۔

میں کہتا ہوں: جب ایسا اتفاق ہو جائے تو بندہ فی الفور تائب اور مستغفر ہو کر کلمۂ طیبہ پڑھ لے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اس کا کفارہ ہو جائے گا۔

⑥ اگر کفر کا ارادہ کیا اور اس پر عمل اگرچہ مدت مدید کے بعد ہو، لیکن وہ فی الفور کافر ہو جائے گا۔

⑦ اگر قطعی حرام کو حلال یا قطعی حلال کو حرام کہا اور فرض کو فرض نہ جانا تو کافر ہو گیا۔

⑧ ایک شخص نے دوسرے شخص سے کہا کہ تو اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا؟ اس نے کہا نہیں تو وہ کافر ہوا۔ محمد بن فضیل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر معصیت کی بات کرنے کے دوران اس سے یہ کہا گیا تو کافر ہو گا ورنہ نہیں۔

میں کہتا ہوں: اول قول راجح ہے۔

⑨ اگر یوں کہا: فلاں اگر خدا بھی ہو جائے گا، پھر بھی میں اس سے اپنا حق واپس لوں گا، کافر ہو گیا۔ اسی طرح اگر یہ کہا: خدا تو تیرے بس میں نہیں آتا میں کس طرح تیرے قابو میں آ جاؤں تو بھی وہ کافر ہو گیا۔

⑩ اگر یوں کہا: میرے لیے آسمان پر خدا اور زمین پر تو ہے تو کافر ہو گیا۔

⑪ اگر کسی کا بچہ مر جائے اور وہ کہے کہ خدا کو اس کی ضرورت تھی تو کافر ہو جائے گا۔ یا دوسرے نے کہا: خدا نے تجھ پر ظلم کیا تو [کہنے والا] کافر ہو گیا۔

⑫ اگر مظلوم نے کہا: اے خدا! تو ظالم کی توبہ قبول نہ کر، اگر تو اس کی توبہ قبول کرے گا تو میں نہیں کروں گا تو وہ کافر ہو جائے گا۔

⑬ اگر کہے کہ میں ثواب وعذاب سے بیزار ہوں تو کافر ہو جائے گا۔

⑭ اگر کسی نے گواہوں کے بغیر نکاح کیا اور کہا: میں نے اللہ ورسول ﷺ کو گواہ کر لیا ہے یا فرشتے کو گواہ بنا لیا ہے تو [رسول اللہ ﷺ اور فرشتے کو غیب دان سمجھنے کی بنا پر] کافر ہو جائے گا۔

⑮ ”مجمع النوازل“ سے منقول ہے کہ اگر یوں کہا کہ میں نے دائیں جانب اور بائیں جانب کے فرشتے کو گواہ بنا لیا ہے تو کافر نہ ہو گا، اگرچہ یہ نکاح صحیح نہ ہو گا۔

⑯ اگر کسی جانور کی آواز پر کہا کہ بیمار مر جائے گا یا غلہ گراں ہو گا یا [فلاں] سفر سے لوٹ آئے گا تو اس کے کفر میں اختلاف ہے۔

میں کہتا ہوں: حدیث میں طیرہ [فال گیری] کو شرک فرمایا ہے۔ شرک کفر کی سب سے بدتر صورت ہے۔

⑰ اگر کہا کہ اللہ جانتا ہے کہ میں ہمیشہ تجھے یاد کرتا ہوں، بعض نے کہا کہ یہ کفر ہے۔ اسی طرح اگر یوں

کہا کہ میں تیری غمی وخوشی میں ویسا ہی ہوں جیسے اپنی غمی اور خوشی میں تو بعض کے نزدیک کفر ہے۔

میں کہتا ہوں: اس کی تاویل مبالغے کے ساتھ ممکن ہے، لیکن اگر یہ عقیدے میں کاذب ہے تو کفر ہو گا۔

⑱ اگر کہا کہ رزق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، لیکن بندے سے اس کی جستجو کرنا چاہیے تو کافر ہو جائے گا۔ اس لیے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے فعل کو بندے کے فعل پر موقوف اعتقاد کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: سعدی رحمہ اللہ کا یہ شعر اس بات سے نہیں ہے:

رزق ہر چند بیگماں برسد
شرط عقل ست جستن از درہا

[بلا شبہہ رزق تو ہر چند پہنچتا ہی ہے، لیکن اس کے دروازوں سے اسے طلب کرنا اور ڈھونڈنا شرط عقل ہے]

⑲ اگر کہا کہ اللہ تعالیٰ نماز کا کہے تو بھی نہ پڑھوں گا، اگر اس طرف قبلہ ہو تو بھی نماز ادا نہ کروں گا اور اگر فلاں نبی ہو تو بھی ایمان نہ لاؤں گا تو یہ کفر ہے۔

میں کہتا ہوں: آخری قول کے کفر میں اس بنیاد پر تاویل کی گنجایش ہے کہ ہمارے رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین ہیں۔ اب جو کوئی مدعی نبوت ہو گا وہ قطعاً کاذب ہے اور اس کا منکر صادق ہو گا۔

⑳ کسی پیغمبر کی اہانت کرنا کفر ہے۔

㉑ ایک شخص نے کہا: آدم علیہ السلام کپڑا بنتے تھے۔ دوسرے نے کہا: تو پھر ہم سب جولا ہے ٹھہرے تو یہ دوسرے شخص کے حق میں کفر ہوا۔

㉒ اگر کہا کہ آدم علیہ السلام گیہوں نہ کھاتے تو ہم بدبخت نہ ہوتے تو وہ کافر ہو جائے گا۔

㉓ ایک شخص نے کہا: رسول اللہ ﷺ اس طرح کرتے تھے، دوسرے نے کہا یہ بے ادبی ہے تو یہ کافر ہو گیا۔ ایک شخص نے کہا: ناخن تراشنا سنت ہے۔ دوسرے نے کہا: گو سنت ہو، میں نہیں کرتا وہ کافر ہو جائے گا۔ یا یوں کہا کہ سنت کس کام کی ہے [پھر بھی کافر ہو جائے گا]

㉔ ایک شخص نے امر بالمعروف کیا اور دوسرے نے کہا کہ یہ تو نے کیا شور وغوغا مچا رکھا ہے؟ اگر تردید کی خاطر کہا ہے تو یہ کافر ہو گیا۔

(۲۵) فتاویٰ سراجی میں ہے کہ اگر قرض خواہ نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ مقروض ہو تو بھی قرض واپس لوں گا تو یہ کافر ہوا۔ اگر پیغمبر کے حق میں ایسا کہا تو کافر نہ ہوگا۔

(۲۶) ایک نے کہا: اللہ تعالیٰ کا حکم یوں ہے۔ دوسرے نے کہا: میں اللہ کے حکم کو کیا جانتا ہوں؟ یہ کافر ہو گیا۔

(۲۷) اگر فتوے کو دیکھ کر کہا: یہ کیا بارنامہ یعنی پروانہ فرمان تو لایا ہے؟ اگر یہ بات استخفافِ شریعت کی وجہ سے کہی ہے تو کافر ہو جائے گا۔

(۲۸) ایک نے کہا: فلاں سے صلح کر لے، اس نے جواب دیا: بت کو سجدہ کر لوں گا مگر فلاں سے صلح نہ کروں گا تو کافر نہ ہوگا، اس لیے کہ اس میں صلح کو بعید جاننے کا ارادہ ہے۔ اگر کوئی فاسق کسی صالح سے کہے: آؤ مسلمان دیکھو اور اس سے مجلس فسق کی طرف اشارہ کرے تو کافر ہو جائے گا۔

(۲۹) اگر شراب خور نے کہا: جو ہماری خوشی پر خوش ہو وہ خوش رہے۔ ابو بکر طرخان کہتے ہیں کہ وہ کافر ہو جائے گا۔

(۳۰) اگر عورت نے کہا عقل مند خاوند پر لعنت ہے تو کافر ہو گئی۔

(۳۱) بیماری میں یہ کہنا کہ (اے اللہ!) چاہے تو مجھے مسلمان مار چاہے کافر، کفر ہے۔

(۳۲) فتاویٰ سراجی میں ہے کہ اگر یہ کہا: (اے اللہ!) مجھ پر رزق فراخ کر اور ظلم نہ کر۔ ابو نصر نے اس کے کفر میں توقف کیا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ وہ کافر ہو جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ظلم کا اعتقاد کفر ہے۔

(۳۳) ایک شخص نے اذان دی اور دوسرے نے کہا: تو جھوٹا ہے تو یہ کافر ہو گیا۔

(۳۴) رسول اللہ ﷺ پر عیب لگایا یا آپ ﷺ کے موئے مبارک کو مویک [معمولی بال] کہا تو یہ کافر ہو گیا۔

(۳۵) اگر ظالم بادشاہ کو کہا کہ تو عادل ہے تو امام ابو منصور رحمہ اللہ کے نزدیک کافر ہو گیا۔ ابو القاسم نے کہا: کافر نہیں ہوا، اس لیے کہ شاید اس نے کبھی عدل کیا ہو۔

(۳۶) اگر کوئی یہ اعتقاد کرے کہ خزانۂ بادشاہی بادشاہ کی ملکیت ہے تو کافر ہو جائے گا۔ جیسا کہ حمادیہ اور سراجی میں ہے۔

(۳۷) اگر کہا: مجھے علم غیب ہے تو کافر ہو گیا۔

(۳۸) ایک نے کہا: میں مسلمان ہوں۔ دوسرے نے کہا: تجھ پر اور تیری مسلمانی پر لعنت ہے تو یہ کافر ہو گیا۔

(۳۹) اگر کہا: فرشتے اور پیغمبر گواہی دیں کہ تیرے پاس سیم وزر نہیں ہے تو بھی میں نہ مانوں گا، یہ کافر ہو گیا۔

(۴۰) ایک نے کہا: او کافر! دوسرے نے کہا: اگر میں ایسا نہ ہوتا تو تجھے کیوں ملتا؟ بعض کے نزدیک یہ کافر ہو گیا۔

(۴۱) اگر کہا: تیرے پاس رہنے سے کافر ہونا بہتر ہے تو کافر نہ ہو گا، اس لیے کہ مراد اس سے دور رہنا ہے۔

(۴۲) اگر کسی نے کہا: نماز پڑھ اس نے کہا: تو نے اتنی نماز پڑھی تجھے کیا مل گیا؟ تو یہ کافر ہو جائے گا۔

(۴۳) اگر کسی نے کہا: تو کافر ہو گیا ہے۔ اس نے کہا: تو مجھے کافر ہی سمجھ لے تو کافر ہو جائے گا۔

(۴۴) اگر کہا کہ مجھے عورت اللہ تعالیٰ سے زیادہ محبوب ہے تو وہ کافر ہو گیا، چنانچہ وہ توبہ کرے اور نئے سرے سے نکاح کرے۔

(۴۵) اگر ایک شخص نے کہا کہ مجھے مسلمان کر، واعظ نے کہا: فلاں روز میری مجلس میں آ کر مسلمان ہونا تو کافر ہو جائے گا۔

(۴۶) اگر کہا کہ تو چند روز نماز ادا نہ کر، تا کہ تمھیں بے نمازی ہونے کی حلاوت محسوس ہو تو کافر ہو جائے گا۔

(۴۷) اگر دعا میں کہا: اے اللہ! تو مجھ سے اپنی رحمت کو بچا کر نہ رکھ تو کافر ہو گیا۔

(۴۸) اگر کسی عورت سے کہا: تو مرتد ہو جا، اپنے شوہر سے جدا ہو جائے گی۔ کہنے والا کافر ہو گیا۔

(۴۹) اپنے لیے یا غیر کے لیے کفر پر رضا کفر ہے۔ لیکن اگر کفر کو برا جان کر اپنے دشمن کا کافر ہونا چاہا تو کافر نہ ہو گا۔

(۵۰) اگر شراب خوری کی ایک مجلس میں کسی واعظ کی طرح اونچی جگہ بیٹھ کر ہنسی کی باتیں کرے اور اہلِ مجلس ہنسیں تو سب کے سب کافر ہو جائیں گے۔

(۵۱) اگر یہ آرزو کی کہ کاش زنا یا قتلِ ناحق حلال ہوتا تو کافر ہو جائے گا۔

(۵۲) اگر کہا: اللہ جانتا ہے کہ میں نے یہ کام نہیں کیا ہے، حالانکہ اس نے وہ کام کیا ہے تو دو قولوں میں سے اصح قول کے مطابق وہ کافر ہو جائے گا۔ امام سرخسی رحمہ اللہ نے کہا ہے: اگر اس جھوٹ

بولنے کو کفر جانتا ہے تو کافر ہو گا ورنہ نہیں۔ حسام الدین کا بھی یہی فتویٰ ہے، مگر طحاوی نے کہا ہے جس چیز کا ارتداد ہونا یقینی ہے، اس کے ظاہر ہونے سے ردت کا حکم دیا جائے گا اور جس میں شک ہے اس پر حکم نہ دیا جائے گا۔ بحکم: «اَلْإِسْلَامُ يَعْلُو وَلَا يُعْلٰى عَلَيْهِ»[1] [اسلام سر بلند ہے، اس پر کوئی سر بلند نہیں ہوتا] مسلمان کو کافر کہنے میں جلدی نہ کرنا چاہیے، کیونکہ علما نے مجبور ومکرہ کے اسلام کو صحیح کہا ہے۔

53. فتاویٰ تاتارخانی میں ''ینابیع'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کفر اس وقت تک کفر نہیں ہے جب تک اس کفر کے مطابق اعتقاد نہ بنائے۔ محیط و ذخیرہ میں کہا ہے کہ جب تک مسلمان قصداً کفر نہ کرے، وہ کافر نہیں ہوتا ہے۔ مضمرات میں ''نصاب'' اور ''جامع اصغر'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر ایک شخص نے عمداً کلمۂ کفر کہا، لیکن کفر کا اعتقاد نہ کیا تو بعض علما کے نزدیک کافر نہ ہو گا، کیونکہ کفر کا تعلق اعتقاد سے ہے۔ بعض نے کہا کہ کافر ہو جائے گا، اس لیے کہ یہ کفر پر رضا ہے۔

54. ایک جاہل نے کلمۂ کفر کہا اور وہ نہیں جانتا کہ یہ کفر کا کلمہ ہے تو بعض علما کے نزدیک کافر نہ ہو گا، کیونکہ جہل عذر ہے۔ بعض نے کہا کہ جہل عذر نہیں ہے، وہ کافر ہو گیا ہے۔

55. میاں بیوی میں سے کسی ایک کے کافر ہونے سے فوراً نکاح باطل ہو جاتا ہے، قاضی کے حکم پر موقوف نہیں ہے۔ یہ منتقی کی روایت ہے۔

56. اگر کوئی شخص پارسیوں جیسی ٹوپی اور ہنود جیسا جامہ پہنے تو بعض علما کے نزدیک کافر ہو جائے گا اور بعض کے نزدیک نہیں ہو گا۔ بعض متاخرین نے کہا ہے کہ اگر ضرورت سے پہنے گا تو کافر نہ ہو گا۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول راجح ہے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

«مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ»[2]

[جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی تو وہ انھی میں سے ہے]

نیز اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

---

1. شرح معاني الآثار للطحاوي (٣/٢٥٧)
2. سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٣١)

﴿وَ مَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ﴾ [المائدة: ٥١]

[اور تم میں سے جو انھیں دوست بنائے گا تو یقیناً وہ ان میں سے ہے]

جملہ اقوامِ کفریہ کے ساتھ مشابہ ہونے کا یہی حکم ہے۔

(۵۷) اگر زنار [ہندوؤں کا مخصوص دھاگا] باندھے تو قاضی ابو حفص کہتے ہیں کہ اگر کفار کے ہاتھ سے خلاصی پانے کے لیے یہ باندھا ہے تو کافر نہ ہوگا اور اگر تجارتی مفاد کے لیے باندھا ہے تو کافر ہو جائے گا۔

(۵۸) مجوسی نو روز کے دن جمع ہوں یا ہولی دیوالی کے دن ہنود خوشی کریں اور کوئی مسلمان کہے کیا خوب رسم نکالی ہے! تو وہ کافر ہو جائے گا۔

(۵۹) ایک شخص نے صغیرہ گناہ کیا۔ دوسرے نے کہا: توبہ کر۔ اس نے پوچھا میں نے کیا کیا ہے جو میں توبہ کروں؟ تو وہ کافر ہو جائے گا۔

(۶۰) حرام مال صدقہ کر کے ثواب کا امیدوار ہوا تو کافر ہو جائے گا۔

(۶۱) فقیر نے جانا کہ یہ مال حرام ہے اور دعا دی اور صدقہ دینے والے نے آمین کہی تو کافر ہو جائے گا۔

(۶۲) فاسق شراب پیتا تھا، اگر اقربا نے اس پر روپے نثار کیے یا اسے مبارک باد دی تو دونوں صورتوں میں وہ سب کافر ہو گئے۔

(۶۳) اپنی بیوی کے ساتھ لواطت کرنے کو حلال جاننے سے کافر نہیں ہوتا ہے اور دوسری عورت کے ساتھ ایسا کرنے سے کافر ہو جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس جگہ کفر راجح ہے، کیونکہ اس میں حرام کو حلال جاننا لازم آتا ہے۔

(۶۴) حالتِ حیض میں جماع کو حلال جاننا کفر ہے اور حالت استبرا میں بدعت ہے۔

(۶۵) خسروانی میں لکھا ہے کہ ایک شخص اونچی جگہ پر بیٹھے اور لوگ از روئے مذاق اس سے مسائل پوچھیں اور وہ بطور استہزا جواب دے تو وہ کافر ہو جائے گا۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں: اونچی جگہ پر بیٹھنا شرط نہیں ہے۔ علومِ دینیہ کے ساتھ استہزا بہر طور کفر ہے۔

(۶۶) اگر کہا: مجھے مجلسِ علم سے کیا کام ہے اور جو کچھ علما کہتے ہیں وہ کون کر سکتا ہے تو کافر ہو جائے گا۔

(۶۷) اگر کہا کہ مجھے زر چاہیے، علم کس کام آتا ہے؟ تو کافر ہو گیا۔

(68) اگر کہا کہ یہ لوگ جو علم سیکھتے ہیں بے اصل کہانیاں یا جھوٹ ہے تو کافر ہو جائے گا۔

(69) اگر کہا: میرے ساتھ شریعت پر عمل پیرا ہو کر آ وہ کہے سپاہی لے آ [یعنی بہ خوشی عمل کا منکر ہو] تو کافر ہو گیا۔

(70) اگر کہا: با جماعت نماز ادا کر اور اس نے کہا: ﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى﴾ [العنکبوت: ٤٥] [بے شک نماز روکتی ہے] تو کافر ہو گیا یعنی یہ کہنے پر کہ میں تنہا نماز ادا کروں گا۔

(71) بسم اللہ پڑھ کر حرام کھانا کفر ہے۔

(72) اگر رمضان آیا اور کسی نے کہا: سر پر رنج آیا تو کافر ہو جائے گا۔

(73) اگر بادشاہ کو سجدۂ عبادت کیا تو بالاتفاق کافر ہو گیا اور اگر سلام کی طرح تحیت کے قصد و ارادے سے کیا تو اس میں علما کا اختلاف ہے۔ "ظهيرية" میں کہا ہے کہ کافر نہ ہو گا۔ "مؤيد الدراية شرح هداية" میں کہا ہے کہ بالاجماع یہ سجدہ جائز نہیں ہے۔ دوسری طرح خدمت کرنا جیسے بادشاہ کے سامنے کھڑا رہنا یا ہاتھ چومنا یا جھک جانا جائز ہے، انتہیٰ۔

میں کہتا ہوں: کسی مخلوق کو کوئی سا سجدہ کرنا بھی جائز نہیں ہے، بلکہ کفر ہے اور جھکنا بھی حرام ہے۔ ہاں ہاتھ چومنا جائز ہے اور سامنے کھڑا رہنا حرام ہے۔

(74) بتوں کے نام پر یا کنویں یا دریا یا نہر یا گھر یا ندی نالے یا چشمے وغیرہ پر ذبح کرنا کفر ہے۔ ذبح کرنے والا مشرک ہے اور اس کی بیوی اس سے جدا ہو جاتی ہے اور ایسا ذبیحہ حرام ہے۔ انتہیٰ

میں کہتا ہوں: حدیث میں آیا ہے:

«مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ أَشْرَكَ»

[جس نے غیر اللہ کے لیے ذبح کیا اس نے شرک کیا]

غیر اللہ کے الفاظ اللہ کے سوا ہر چیز کو بلا استثنا شامل ہیں۔ اسی طرح یہ آیتِ کریمہ عام ہے:

﴿وَ مَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ [البقرة: ١٧٣]

[اور ہر وہ چیز حرام کی ہے جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے]

''اِہلال'' رفعِ صوت کو کہتے ہیں جیسے یہ بکرا شیخ سدو کا یا یہ گائے سید احمد کبیر کی ہے۔ یہ سب

حرام ذبیحے ہیں اور ان کا قائل وفاعل مشرک ہے۔

(75) کفار کی عیدیں جیسے نوروز، دیوالی اور دسہرہ میں کافروں کے ساتھ کھیل تماشے میں موافقت کرنا کفر ہے۔

(76) ایمانِ یاس [نزع کے وقت ایمان لانا] مقبول نہیں ہوتا ہے:

﴿فَلَمْ يَكُ يَنفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا﴾ [المؤمن: ٨٥]

[پھر یہ نہ تھا کہ ان کا ایمان انھیں فائدہ دیتا، جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا]

فرمانِ الٰہی میں "باس" سے مراد "غرغرہ" ہے۔ اس سے پہلے پہلے توبہ قبول ہو سکتی ہے۔

"شرح مقاصد" میں کہا ہے کہ جو شخص حدوثِ عالم یا حشرِ اجساد یا جزئیات کے علمِ الٰہی یا ضروریاتِ دین سے کسی اور چیز کا انکار کرے گا تو وہ بالاتفاق کافر ہے۔ اگر ان مسائلِ اعتقاد میں، جن میں روافض، خوارج اور معتزلہ وغیرہ بدعی فرقے خلاف رکھتے ہیں، اہلِ سنت کے برخلاف اعتقاد رکھے گا تو اسے کافر کہنے میں علما کا اختلاف ہے۔ منتقیٰ میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ہم کسی اہلِ قبلہ کو کافر نہیں کہتے ہیں۔ ابو اسحاق اسفرائنی نے کہا ہے کہ جو کوئی اہلِ سنت کو کافر کہتا ہے، ہم اسے کافر جانتے ہیں اور جو اسے کافر نہیں کہتا، اسے ہم بھی کافر نہیں کہتے۔ انتہیٰ۔

میں کہتا ہوں: بہتر (۷۲) گمراہ فرقوں کے احوال و عقائد ملاحظہ کرنے سے کتاب و سنت پر پیش کرنے کے وقت، بلکہ خود اہلِ سنت کے عقائد سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کون سا فرقہ کفر کی حد تک پہنچ گیا ہے اور کون صرف مبتدع اور گمراہ ہے۔ اسلام کے بہتر (۷۲) فرقوں کا ناری اور جہنمی ہونا تو خود خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ثابت ہے،[1] اگرچہ وہ سب اہلِ قبلہ ہیں، لیکن بحث خلود اور عدمِ خلود نار میں ہے نہ کہ دخولِ نار میں، کیوں کہ وہ تو نصِ سنت کے ساتھ متعین ہے۔ ورود علی النار میں بھی اختلاف نہیں ہے کہ وہ نصِ قرآن کی رو سے ساری مخلوق کے لیے ثابت ہے، خواہ فرقہ ناجیہ ہو یا فرقہ ہالکہ، واللہ أعلم۔

(77) جو ملعون جناب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں دشنام دے یا اہانت کرے یا امورِ دین سے کسی امر

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١)

میں یا آپ ﷺ کی صورت شریف میں آپ ﷺ کے اوصاف میں سے کسی وصف میں عیب لگائے، خواہ مسلمان ہو یا ذمی یا حربی اگرچہ دل لگی کے طور پر کیوں نہ ہو، وہ کافر اور واجب القتل ہے، اس کی توبہ قبول نہیں ہے۔ امت کا اس پر اجماع ہے کہ ہر نبی کی بے ادبی اور استخفاف کفر ہے، خواہ اس کا فاعل اسے حلال جان کر اس کا مرتکب ہو یا حرام جان کر۔

۷۸ روافض کا یہ قول کہ رسول اللہ ﷺ نے دشمنوں کے ڈر سے بعض احکامِ الٰہیہ کو نہیں پہنچایا ہے، کفر ہے۔ انتھیٰ کلام "ما لا بد منه" للقاضي رحمہ اللہ۔

امام شعرانی رحمہ اللہ کی کتاب "المنن الکبریٰ" سے الفاظِ ممنوعہ کا بیان:

شعرانی رحمہ اللہ نے منن کبریٰ میں لکھا ہے:

"قد وضع بعض العلماء من السلف كتابا جمع فيه كثيرا من الكلمات التي ينطق بها العوام مما يؤدي إلى الكفر، وحذر فيه من النظر في جملة من الكتب، نصيحة للمسلمين، وقد حبب لي أن أذكر لك طرفا من ذلك لتجتنب النطق به أو النظر فيه فأقول، وبالله التوفيق"[1]

[علمائے سلف میں سے بعض نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں انھوں نے بہت سے ایسے کلمات جمع کیے ہیں جو عوام الناس بولتے ہیں، حالانکہ وہ کلمات کفر تک پہنچا دیتے ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں مسلمانوں کی خیر خواہی کرتے ہوئے بعض کتابوں پر نظر کرنے سے خبردار کیا ہے۔ مجھے یہ بات پسند آئی کہ میں اس کا کچھ حصہ تمھارے سامنے ذکر کروں، تاکہ تم وہ کلمات بولنے اور دیکھنے سے اجتناب کرو۔ پس میں اللہ کی توفیق سے کہتا ہوں]

پھر شعرانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ چیز جس میں اکثر لوگ گرفتار ہو جاتے ہیں، ایک یہ قول ہے:

"يا من يرانا ولا نراه" [اے وہ ذات! جو ہمیں دیکھتی ہے اور ہم اسے نہیں دیکھتے] نیز یہ قول ہے:

"يا ساكن هذه القبة الخضراء" [اے اس گنبد خضرا کے رہنے والے!] پھر یہ قول ہے:

"سبحان من كان العلا مكانه، ونحو ذلك، ومثل ذلك لا يجوز التلفظ به، لما يورث من الإبهام عند العوام أن الله تعالىٰ في مكان خاص، وإن

[1] المنن الکبریٰ للشعراني (ص: ۳۹۰)

قال هذا القائل: أردت بقولي ولا نراه عدم رؤيتنا له في الدنيا، قلنا له: قد أطلقت القول، والإطلاق في محل التفصيل خطأ، وقد أجمع أهل السنة على منع كل إطلاق لم يرد به الشريعة سواء كان في حق الله أو في حق أنبيائه أو في حق دينه"

["سبحانه من كان العلا مكانه" [پاک ہے وہ ذات جس کا مکان و مقام بلند ہے] اس جیسے اور اس کے مثل الفاظ بولنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ کلمات عوام الناس میں یہ ابہام پیدا کرتے ہیں کہ یقیناً اللہ تعالیٰ کسی خاص مکان میں ہے اور اگر اس قول کا قائل یہ کہے کہ میرے اس قول "ولا نراہ" [اور ہم اسے نہیں دیکھتے] سے مراد ہمارا اسے دنیا میں نہ دیکھنا ہے تو ہم اسے کہیں گے تو نے تو مطلق طور پر یہ بات کہی ہے اور تفصیل کے محل ومقام میں مطلقاً بات کرنا غلطی ہے۔ اہلِ سنت کا اس پر اجماع ہے کہ ہر اس چیز کا اطلاق ممنوع ہے جس پر شریعت وارد نہیں ہوئی ہے خواہ وہ اطلاق اللہ کے حق میں ہو یا اس کے انبیا کے حق میں یا اس کے دین کے حق میں]

شیخ ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ فرماتے تھے:

"ما أطلق الشرع في حقه تعالىٰ أو في حق أنبيائه أو في حق دينه أطلقناه، وما منع منعناه، وما لم يرد فيه إذن و لا منع، ألحقناه بالممنوع حتى يرد الإذن في إطلاقه" انتهىٰ.

[شریعت نے اللہ تعالیٰ کے حق میں یا اس کے انبیا کے حق میں یا اس کے دین کے حق میں جس چیز کا اطلاق کیا ہے، ہم بھی اس کا اطلاق کریں گے اور جس کا اطلاق منع فرمایا ہے ہم اس کے اطلاق سے رک جائیں گے اور جس چیز کے متعلق اجازت یا ممانعت وارد نہیں ہوئی، تو ہم اسے ممنوع کے ساتھ ہی شامل کر دیں گے حتی کہ اس اطلاق کے متعلق شریعت کی اذن واجازت مل جائے]

قاضی ابو بکر باقلانی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"ما لم يرد لنا فيه إذن ولا منع، نظرنا فيه، فإن أوهم ما يمتنع في حقه

تعالیٰ منعناه وإن لم يوهم شيئا من ذلك رددناه إلى البراءة الأصلية، ولم نحكم فيه بمنع ولا إباحة" انتهى.

[اور جس چیز کے اطلاق کے بارے میں ہمارے لیے اجازت اور ممانعت وارد نہ ہوئی ہو تو ہم اس میں نظر وفکر کریں گے، پس اگر وہ ایسی چیز کا وہم ڈالے جو اللہ تعالیٰ کے حق میں ممنوع ہو تو ہم اسے ممنوع قرار دیں گے اور اگر وہ ان میں سے کسی چیز کا بھی وہم نہ ڈالے تو ہم اسے براءتِ اصلیہ کی طرف لوٹائیں گے اور اس میں ممانعت یا جواز کا کوئی حکم نہ لگائیں گے]

شعرانی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"فقد اتفق الإمامان على منع كل إطلاق يوهم محظورا في حق الله تعالىٰ، وتبعهما العلماء على ذلك قاطبة، ونقلوا فيه الإجماع، فعلم من هذه القاعدة أن كل من لا يفرق بين ما يوهم إطلاق محظور وبين غيره فلا يجوز له أن يطلق في حق الله تعالىٰ إلا ما ورد به التوقيف والإذن الشرعي، حذرا أن يقع فيما لا يجوز إطلاقه على الله تعالىٰ فيأثم أو يكفر، والعياذ بالله تعالىٰ" انتهى.

[یقیناً دونوں اماموں نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں ہر اس چیز کا اطلاق منع ہے جو ممنوع ہونے کا وہم ڈالتی ہو۔ اس موقف پر تمام علما نے ان کی پیروی اختیار کی ہے اور اس میں اجماع نقل کیا ہے۔ پس اس قاعدے سے معلوم ہوا کہ ہر وہ شخص جو اس چیز کے درمیان، جو ممنوع ہونے کا وہم ڈالتی ہو اور اس کے غیر کے درمیان فرق نہیں کرتا تو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حق میں کسی چیز کا اطلاق کرے، مگر اسی چیز کا جس کے متعلق شرعی اجازت وارد ہوئی ہو، اس چیز سے بچتے ہوئے کہ مبادا وہ ایسی چیز میں واقع ہو جائے جس کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے حق میں جائز ہی نہیں ہے۔ پس وہ گناہ گار یا کافر ہو جائے، والعياذ بالله تعالىٰ]

یا جیسے یہ قول ہے:

"يا دليل الحائرين! يا من ليس له دليل! يا دليل الدليل ونحوذلك، وكله

لم يرد به شرع ولا ينبغي أن يقال"

[اے بھٹکے ہوئے لوگوں کے راہنما، اے وہ ذات جس کا کوئی راہنما نہیں، اے راہنماؤں کے راہنما اور اسی طرح کے دیگر اقوال، ان تمام اقوال کے متعلق شریعت میں کچھ وارد نہیں ہوا، لہٰذا یہ بولنے جائز نہیں ہیں]

یا جیسے یہ قول ہے: "یا من لا یوصف ولا یعرف" [اے وہ جس کا وصف بیان ہو سکے اور نہ اس کی معرفت ہی حاصل ہو سکے] یہ قول اس لیے غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ تکییف کے بغیر موصوف ومعروف ہے۔ یا جیسے یہ قول ہے: "یا من هو في عرشه یرانا" [اے وہ ہستی! جو اپنے عرش میں ہے اور ہمیں دیکھتی ہے] یہ قول اس لیے جائز نہیں کہ اس میں استقرار کا ایہام ہے، اس کے بجائے یوں کہنا چاہیے:

"يا من استوى على عرشه كما ينبغي بجلاله، ومما يمتنع شرعا إطلاق بعضهم على الله تعالىٰ: الخمار والساقي وراهب الدير وصاحب الدير والقسيس وليلى ولُبنا و دَعْد وأسماء ووَعْد وهند والكنز الأكبر ونحو ذلك"

[اے وہ جو اپنے عرش پر مستوی ہے جیسے اس کے جلال وعظمت کے لائق ہے۔ اللہ تعالیٰ پر بعض لوگوں کی طرف سے اطلاق کردہ مندرجہ ذیل الفاظ شرعاً ممنوع ہے: خمار، ساقی، راہب الدیر، صاحب الدیر، قیس، لیلی، لبنا، سعدیٰ، اسماء، دَعد، ہند، کنز اکبر اور اس طرح کے دیگر الفاظ]

میں کہتا ہوں: اسی طرح وہ الفاظ ہیں جن کو گمراہ شاعروں نے رسول اللہ ﷺ کے حق میں استعمال کیا ہے۔ جیسے ترکِ ستمگار، ظالم، عیار، جفا پیشہ یارِ شوخ چشم اور اسی طرح کے دیگر الفاظ جو فساق وفجار معشوقوں کے حق میں بولے جاتے ہیں۔ اسی طرح بعض ایسے اقوال کا اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق ارادہ کرنا اجماعاً جائز نہیں ہے، جیسے بعض نے کہا ہے:

أنا من أهوى ومن أهوى أنا
نحن روحان حللنا بدنا

[میں ہی محبت کرتا ہوں اور جس سے محبت کرتا ہوں وہ بھی میں ہی ہوں۔ ہم دو روحیں ہیں جو ایک بدن میں گھسی ہوئی ہیں]

بعض نے کہا ہے۔

تمازجت الحقائق بالمعاني
فصرنا واحدا روحاً ومعنىً

[حقائق معانی کے ساتھ مل کر یک جان ہو گئے، پس ہم روحاً اور معناً ایک ہو گئے]

پس مذکورہ بالا اقوال اور اس جیسے دیگر اقوال بولنا اہلِ سنت کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ ہم نے علی خواص رحمہ اللہ سے پوچھا تھا کہ قوم کے کلام میں جو تغزلات ہوتے ہیں، کیا ان سے اللہ تعالیٰ مراد ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: نہیں، اس سے مراد مخلوق ہے، لیکن سمجھنے والا ان الفاظ سے حق تعالیٰ کے حق میں وہ بات سمجھتا ہے جو سماع کے وقت اسے باعث حضور مع الحق ہوتی ہے، کیونکہ اولیاء اللہ انبیا و رسل کے بعد مخلوق میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھنے والے ہوتے ہیں۔ وہ حق تعالیٰ کو اس امر سے بالا تر سمجھتے ہیں کہ اسے اپنے تغزلات کا محل ٹھہرائیں۔ اس لیے وہ محبین اور محبوبین کے ساتھ ضربِ مثل کرتے ہیں، جیسے قیس، لبنا اور غیلان وغیرہ کے ساتھ، انتہیٰ۔ اس میں غور وفکر کرنا چاہیے۔

اسی طرح ان اشعار کا سماع بھی ممتنع ہے جو متنبّی کے قول کی طرز پر ہوں۔ جیسے اس نے محمد بن زریق کے حق میں کہا ہے:

لو كان ذو القرنين أعمل رأيه
لما أتى الظلمات صرن شموسا

[اگر ذوالقرنین اپنی رائے پر عمل کرنے والا ہوتا تو وہ جن اندھیروں میں پھنسا ہے، وہ سورج بن جاتے]

أو كان لج البحر مثل يمينه
ما انشق حتى جاز فيه موسى

[یا سمندر کی چوڑائی اس کے دائیں ہاتھ کی مانند ہوتی تو وہ نہ پھٹتا یہاں تک کہ موسیٰ اس میں سے گزر جاتا]

أو كان للنيران ضوء جبينه
عبدت فصار العالمون مجوسا

[یا آگ کی طرح اس کے نورِ پیشانی کی پرستش کی جاتی تو سارے جہان کے لوگ مجوسی بن جاتے]

میں کہتا ہوں: اسی طرح وہ اشعار جو ان اشعار کی مثل ہوں جیسے کسی شاعر کا قول ہے:

دل از عشق محمد ریش دارم
رقابت با خدائے خویش دارم

[میرا دل محمد ﷺ کے عشق میں زخمی ہے، اور میں اپنے خدا کے ساتھ رقابت رکھتا ہوں]

یا عرفی شیرازی کا یہ قول ہے:

تا مجمع امکان و وجوبت ننوشتند
مورد متعین نشد اطلاق اعم را

[جب تک وہ امکان و وجوب کی مطابقت کو نہ لکھتے تو اطلاق اعم کا مورد متعین نہ ہوتا]

یا جیسے قصیدہ بردہ کا یہ شعر ہے:

يا أكرم الخلق ما لي من ألوذ به
سواك عند حدوث الحادث العمم

[اے ساری مخلوق میں سے سب سے زیادہ عزت والے! عام حوادث کے وقت تیرے سوا میرا کوئی نہیں ہے جس کی میں پناہ حاصل کرسکوں]

یا یہ مصرع ہے: "ومن علومك علم اللوح والقلم" [لوح وقلم کا علم تیرے علم سے ہے]

یا میر آزاد کا یہ شعر ہے:

ما كان يعرف ألواحا ولا قلما
وكان يعرف ما في اللوح والقلم

[وہ الواح وقلم کو تو نہیں پہچانتا تھا، البتہ وہ لوح وقلم میں جو کچھ ہے اسے جانتا تھا]

اگرچہ اس مصرع یا شعر میں تاویل کی گنجایش ہے۔ یا جیسے جامی رحمہ اللہ کا یہ شعر ہے:

بقلم گر نرسید انگشتش
بود لوح وقلم اندر مشتش

[اگرچہ قلم تک اس کی انگلی نہ پہنچی، لیکن لوح وقلم اس کی مٹھی میں ہیں]

یا جیسے درود کے بعض وہ الفاظ جو "دلائل الخیرات" میں ہیں، کیونکہ یہ معانی شرع میں نہیں آئے اور نہ شرع نے ان مبانی کی اجازت دی ہے۔

شعرانی نے کہا ہے کہ مندرجہ ذیل قول بھی اسی قبیل سے ہے:

"أنا في أمة ـتداركها اللهـ غريب كصالح في ثمود، فكل هذه وأمثاله يفهم التهاون بمعجزات الله تعالى للأنبياء فلا يجوز"

[میں اس امت ـاس پر اللہ رحم فرمائے۔ کا غریب ہوں، جیسے صالح علیہ السلام قوم ثمود میں تھے۔ پس ایسے تمام اقوال اور اسی طرح کے دیگر اقوال جن سے اللہ تعالیٰ اور انبیا کے معجزات میں حقارت سمجھی جاتی ہے، جائز نہیں ہیں]

اس طرح کے کلمات معری، ابونواس اور ابن ہانی کے اشعار میں اکثر واقع ہوتے ہیں، مومن کو ان کے سماع سے بچنا چاہیے۔ جو شخص اس طرح کے کلمات بولے اسے ڈانٹ ڈپٹ کرنا چاہیے، کیونکہ اس بات پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ انبیا کے سوا کوئی بشر مقامِ انبیا تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا، لہٰذا مذکورہ اشعار میں جو اشارات ہیں وہ امت کے اجماع کے ساتھ خطا اور غلطی ہیں۔

حکایت:

ابو العتاہیہ نے اس لیے شعر گوئی سے توبہ کی تھی کہ اس نے ایک دفعہ یہ شعر کہا:

الله بيني وبين مولاتي
أبدت لي الصد والملالات

[اللہ ہی میرے اور میری لونڈی کے درمیان ہے جس نے مجھے جدائی اور بے چینیوں سے دو چار کیا]

کسی نے خواب میں ان سے کہا:

"أما وجدت من تجعل بينك وبين امرأة في الحرام إلا الله تعالىٰ"

[تجھے حرام کام میں اپنے اور ایک عورت کے درمیان ٹھہرانے کے لیے صرف اللہ تعالیٰ ہی ملا ہے؟]

وہ نیند سے بیدار ہوئے تو انھوں نے شعر گوئی سے توبہ کی اور پھر کبھی زہد اور ترغیبِ طاعات کے سوا کسی موضوع پر شعر نہ کہا۔

اسی طرح محظور الفاظ میں یہ قول بھی ہے: "فلان حجة الله في أرضه على عباده" [فلاں شخص اللہ کی زمین میں اس کے بندوں پر اس کی حجت ہے] کیونکہ یہ بات نبوت کے مقام و مرتبے

کے ساتھ خاص ہے، اس کے سوا کسی غیر پر اس کا اطلاق نہیں ہونا چاہیے۔ اسی طرح وہ الفاظ جو حق تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لائق نہیں ہیں، ان سے دوسروں کے حق میں اجتناب کا وجوب بطریق اولیٰ ہے۔ جیسے کتب مراسلات میں بعض لوگوں کا اعظمی، اقربی اور اعلوی وغیرہ الفاظ استعمال کرنا، کیونکہ لغوی استعمال میں ان الفاظ کے معانی حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں۔ اگر کوئی یہ بات کہے کہ میری مراد اس سے مخلوق ہے تو ہم کہیں گے کہ یہ بات گزر چکی ہے کہ تفصیل کے محل میں اطلاق کرنا غلط ہوتا ہے اور تیرا یہ کلام حق تعالیٰ اور مخلوق دونوں کے درمیان اطلاق وعموم کا وہم ڈالتا ہے جو ممتنع ہے۔

اسی طرح یہ قول: "ما في الوجود إلا الله" [وجود میں صرف اللہ ہے] میں کہتا ہوں: اسی طرح یہ قول: "لا موجود إلا الله" [صرف اللہ تعالیٰ ہی موجود ہے] کیونکہ وحدتِ وجود کے قائلین اسے کلمہ طیبہ "لا إله إلا الله" کا ترجمہ قرار دیتے ہیں اور شارع کے خلاف مقصود مراد لیتے ہیں۔ اسی طرح یہ قول: "إن الله في قلوب العارفين" [بلا شبہ اللہ تعالیٰ عارفین کے دلوں میں ہے] میں کہتا ہوں: اسی طرح یہ قول: "ليس في جبتي إلا الله" [میرے جبے میں صرف اللہ تعالیٰ ہے] یا: "سبحاني ما أعظم شأني" [میں پاک ہوں میں کتنا عظیم الشان ہوں] کیونکہ یہ کلمات شطحاتِ فقرا ہیں، لہٰذا ان سے قطع نظر کرنا اور ان کے تلفظ وتکلم کے درپے نہ ہونا ضروری ہے گو یہ کسی وجہ سے تاویل کی گنجایش رکھتے ہوں۔

اسی طرح یہ قول: "ما يسمع الله من ساكت" [اللہ تعالیٰ ساکت سے نہیں سنتا ہے] اس سے مراد یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم اسرار نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿ أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ بَلَىٰ ﴾ [الزخرف: ۸۰] [یا وہ گمان کرتے ہیں کہ بے شک ہم ان کا راز اور ان کی سرگوشی نہیں سنتے، کیوں نہیں] کے مخالف ومتضاد ہونے کے سبب اللہ تعالیٰ پر مذکورہ قول کا اطلاق جائز نہیں ہے، حالانکہ براہینِ عقول اور صحیح نقول اس بات پر قائم ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر موجود کا سامع ہے۔

اسی طرح یہ قول: "هذا زمان سوء" [یہ برا زمانہ ہے] اور زمانے سے مراد "دہر" ہو، حالانکہ قدسی حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: «أَنَا الدَّهْرُ»[1] [میں ہی زمانہ ہوں] پس اللہ تعالیٰ نے جس لفظ کا اطلاق اپنے نفسِ مقدس پر کیا ہے، اس کے ساتھ کسی مخلوق کا وصف کرنا جائز نہیں ہے۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٤٦)

حدیث میں آیا ہے:

«لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَإِنَّ الدَّهْرَ هُوَ اللّٰهُ»[1]

[دہر (زمانے) کو گالی نہ دو، کیوں کہ دہر اللہ تعالیٰ ہی ہے]

میں کہتا ہوں: گمراہ شعرا چرخ، فلک، سپہر [آسماں]، زمان، روزگار اور دہر کی شکایت میں رات دن بسر کرتے ہیں، حالانکہ یہ نسبت حق تعالیٰ کی طرف جاتی ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کا شاکی ہو اور معاذ اللہ اسے ظالم، ستم گار، سفلہ پرور، ناہموار اور بدکردار کہے وہ اجماعاً کافر ہو جاتا ہے۔ مگر یہ قوم کسی طرح سے اس حکایت و شکایت سے باز نہیں آتی، إلا من رحمه الله تعالىٰ وعصمه بمنه.

اسی طرح بعض خطبا کا یہ کہنا:

"سبحان من لم يزل معبودا عند من لم يعلم كونه معبودا بالقوة أي أهلا لأن يعبد"

[پاک ہے وہ جو ہمیشہ اس شخص کے نزدیک بھی معبود رہا جو اس کا بھی معبود ہونا نہیں جانتا تھا۔ یعنی اسے اس بات کا اہل سمجھتا تھا کہ اس کی عبادت کی جائے]

کیونکہ اس میں قِدمِ عالم کا وہم ہے اور یہ عقیدہ کفر ہے۔ اسی طرح یہ قول: "يا قديم الأزمان" [اے قدیم الازمان!] اس لیے کہ رب تعالیٰ متقید بزمان نہیں ہے، بلکہ یہ کلام باطل ہے۔ اسی طرح یہ قول: "كل ما يفعله الله خير" [ہر وہ کام جو اللہ تعالیٰ کرتا ہے بہتر ہے] اس لیے کہ اس میں عالم سے وجودِ شر کی نفی کا ایہام ہے۔ نیز اس میں اس امر کا ایہام بھی ہے کہ بندہ جو معاصی کرتا ہے، وہ سب خیر ہے۔ اسی طرح یہ قول: "لا تسافر حتى يطلع القمر" [سفر نہ کر حتی کہ چاند طلوع ہو جائے] کیونکہ یہ قول بعینہ اس قول کی مانند ہے: "مطرنا بنوء كذا" [ہمیں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش دی گئی ہے]۔

حکایت:

ایک نجومی نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ایک بار کہا: "لا تقاتل أعدائك حتى يطلع لك القمر" [آپ اس وقت تک اپنے دشمن سے جنگ نہ کریں جب تک آپ کے سامنے چاند نہ طلوع ہو

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٤٦)

جائے] عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "وهو قمرهم أيضاً أي كما يكون لنا بطلوعه سعد كذلك يكون لهم لأن طلوعه على الجيشين واحد" [اور وہ چاند، ان کا بھی چاند ہے۔ یعنی جیسے اس کا طلوع ہونا ہمارے لیے باعث سعادت ہوگا، ایسے ہی ان کے لیے بھی ہوگا، کیونکہ اس کا دونوں لشکروں پر طلوع ہونا ایک جیسا ہے]

اسی طرح مریض کے پاس حاضر ہو کر یہ کہنا: "الله يحمل عنك" [اللہ تعالیٰ یہ مرض تجھ سے اٹھالے] اس لیے کہ یہ موہم لفظ ہے۔ ادب کا تقاضا یہ ہے کہ یوں کہے: "الله يدفع عنك أو يصرف" [اللہ تعالیٰ تجھ سے دور کرے یا پھیر دے] اسی طرح یہ کہنا:

"فلان يطلع على الغيب وله كشف أو اطلاع على الغيب"

[فلاں شخص غیب پر مطلع ہے اور اسے غیب پر کشف یا اطلاع حاصل ہے]

کیونکہ یہ باطل عقیدے کا وہم پیدا کرتا ہے۔ ادب کا تقاضا ہے کہ یوں کہے:

"فلان له فراسة صادقة أو كشف أو اطلاع فقط"

[فلاں شخص میں اس کی سچی فراست ہے یا صرف کشف یا اطلاع ہے]

تاکہ علم و قطع میں مقامِ رسل سے مزاحمت نہ ہو کیوں کہ اولیا کے پاس تو، ان میں سے بعض کے برخلاف، صرف ظنِ صادق ہوتا ہے، اور یہی وہ ظن ہے جس کا نام وہ الہام، فتح اور کشف رکھتے ہیں۔

اسی طرح بیع اور اقالہ کے سوال کے وقت یہ قول: "باعك الله أو أقالك الله" [اللہ تعالیٰ تجھ سے بیع کرے یا اللہ تعالیٰ تجھ سے اقالہ کرے] کیونکہ یہ قول اہلِ اتحاد کے مذہب کا وہم ڈالتا ہے جو کفر ہے: اسی طرح شعائرِ الٰہی میں سے کسی چیز کی تصغیر جیسے مسیجد اور لویح وغیرہ ہے، کیونکہ بعض علما کے نزدیک یہ کفر ہے۔ اسی طرح کتب مولفہ کا قرآن اور وحی کے مشابہ نام رکھنا شرعاً جائز نہیں ہے، جیسے کتاب الاسراء والمعاریج یا جیسے مفاتح الغیب یا آیات بینات۔ کیونکہ اس میں نبی ﷺ کے ساتھ اسراء و عروج میں مزاحمت کا ایہام ہے یا علم غیب میں حق تعالیٰ کے ساتھ مشارکت کا ایہام ہے۔ انتهى كلام الشعراني رحمہ اللہ۔[1]

امام ابن حجر مکی رحمہ اللہ کی کتاب "الزواجر" سے انواع شرک و کفر کا بیان:

ابن حجر مکی رحمہ اللہ نے کتاب "الزواجر" میں لکھا ہے کہ کفر و شرک کی انواع میں سے ایک یہ بات

[1] المنن الكبرى (ص: ٣٩١)

ہے کہ انسان زمانہ بعید یا قریب میں کفر کا عزم کرے یا زبان اور دل پر کفر کی کوئی چیز گزار لے، اگرچہ وہ محال عقلی کیوں نہ ہو تو وہ فوراً کافر ہو جائے گا۔ یا وہ کسی موجبِ کفر امر کا معتقد یا فاعل ہو یا کفر کے ساتھ تلفظ کرے خواہ یہ اصدار اعتقاد کی راہ سے ہو یا عناد سے یا استہزا سے، مثلاً عالم کو قدیم اعتقاد کرے اگرچہ نوع کی راہ سے ہو۔ یا جو بات اجماع اور ضرورتِ دینیہ کے ساتھ اللہ کے لیے ثابت ہے، اس کی نفی کرے، جیسے اللہ تعالیٰ کے علم وقدرت یا جزئیات سے متعلق اس کے علم کا انکار۔ یا جو امر اللہ تعالیٰ سے منفی ہے، اسے ثابت کرے، جیسے رنگ اور جسم وغیرہ۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے صریحاً یا لازماً کسی نقص کا اعتقاد کرنا کفر ہوتا ہے۔ صریحاً ایسا اعتقاد کرنا اجماعاً کفر ہے اور لازماً میں خلاف ہے۔ ہمارے نزدیک عدمِ کفر اصح ہے، مثلاً مجسم یا جوہری اپنے لازمِ کلام کی وجہ سے کافر نہیں ہوتا، مگر اسی صورت میں کہ وہ اس نقص کا معتقد یا اس کا مصرح ہو، یا مثلاً کسی مخلوق کو، جیسے سورج ہے، سجدہ کرے، اگر کوئی قرینہ ظاہرہ اس کے عذر پر دلیل نہ ہو۔ آیندہ اکثر مسائل میں یہ قید آئے گی۔ اس حکم میں یہ بات بھی ہے کہ کوئی ایسا فعل کرے جس پر مسلمین کا اجماع ہے کہ وہ فعل صرف کافر سے صادر ہوتا ہے۔

اگرچہ وہ مصرح باسلام ہو، جیسے اہلِ کنیسہ کے ہمراہ زنار وغیرہ پہن کر کنیسہ میں جانا، یا کسی ورق کو، جس میں قرآن یا علم شرعی یا اللہ تعالیٰ کا نام یا نبی ﷺ کا نام یا فرشتے کا نام لکھا ہوا ہے، نجاست میں پھینک دینا یا منی، یا آب بنی یا آب دہن میں ڈال دینا، یا ان اشیا کو یا مسجد کو نجاست سے آلودہ کرنا اگرچہ وہ نجاست معفو عنہ ہو، یا کسی ایسے نبی میں شک کرنا جس کی نبوت پر اجماع ہے نہ کہ غیر اجماعی نبی پر جیسے خضر اور خالد بن سنان۔ یا کسی مجمع علیہ کتاب کے انزال میں شک کرنا جیسے تورات، انجیل، زبور اور صحف ابراہیم علیہ السلام۔ یا قرآن مجید کی کسی مجمع علیہ سورت میں شک کرنا جیسے معوذتین۔

یا ایسے قول کے قائل کی تکفیر میں جس قول کے ساتھ وہ امت کی تضلیل کرتا ہے، یا تکفیر صحابہ میں یا مکہ یا کعبہ یا مسجد حرام یا صفتِ حج یا صوم وصلات کی ہیئت معروفہ میں یا کسی مجمع علیہ حکم میں جو بالضروۃ دین اسلام سے معلوم ہے، جیسے تحریم بھتہ یا مشروعیتِ سنن میں جیسے نماز عید میں شک کرنا یا کسی حرام کو حلال کر لینا جیسے بے وضو نماز ادا کرنا یا حالتِ نجاست میں نماز پڑھنا یا کسی مسلمان کو ایذا دینا یا بلا کسی شرعی جواز کے اس کے اعتقاد کے سبب کسی ذمی کو ستانا یا کسی حلال کو حرام ٹھہرا لینا جیسے بیع

یا نکاح۔ یا رسول اللہ ﷺ کو اسود کہنا یا ان کے قریشی یا عربی یا اِنس سے ہونے کا انکار کرنا، کیونکہ آپ ﷺ کی کسی صفتِ ثابتہ کے بغیر آپ ﷺ کا وصف کرنا آپ ﷺ کی تکذیب ہے۔

یہاں سے یہ بھی ماخوذ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی جس کسی صفت کے ثبوت پر اجماع ہے اس کا انکار بھی کفر ہوگا، جیسے آپ ﷺ کے بعد کسی نبی کی بعثت تجویز کرنا۔ یا یوں کہنا کہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ وہی نبی ہیں جو مکہ میں مبعوث ہوئے تھے اور مدینہ میں فوت ہوئے یا کوئی اور ہیں۔ یا نبوت مکتسب ہے یا رتبۂ نبوت تک وصول صفا قلب کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ یا ولی نبی سے افضل ہے۔ یا مجھے وحی آتی ہے، اگرچہ وہ نبوت کا دعوے دار نہ ہو۔ یا میں مرنے سے پہلے جنت میں داخل ہوں گا۔ یا رسول اللہ ﷺ کو یا کسی اور نبی یا ملائکہ کو عیب لگائے یا لعنت کرے یا دشنام دے یا استخفاف کرے یا استہزا کرے یا آپ ﷺ کے کسی فعل پر استہزا کرے جیسے [کھانے کے بعد] انگلیاں چاٹنا۔ یا ان کے نفس، یا نسب، یا دین یا فعل میں کسی نقص کو ملحق کرے یا ان امور کے ساتھ تعریض کرے یا بطور عیب یا تصغیرِ شان کسی چیز سے تشبیہ دے یا ان سے چشم پوشی کرے۔ یا ان کے لیے کسی مضرت کا متمنی ہو یا کسی چیز کو، جو ان کے منصب کے لائق نہیں ہے، بطریق ذم ان کی طرف منسوب کرے، یا بے ہودہ، فحش اور منکر کلام اور قولِ زور کے ساتھ آپ ﷺ کے حق میں عبث کرے۔ یا ان پر جو محن اور بلایا گزری ہیں انھیں اس کی عار دلائے۔ یا بعض عوارض بشریہ، جائزہ اور معہودہ کے ساتھ حقارت کرے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک امر پر بالاجماع وہ کافر اور واجب القتل ہو جاتا ہے اور اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اکثر علما کا یہی قول ہے۔

ایک شخص نے سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے کہا: "عند صاحبکم"[1] [تمھارے صاحب کے پاس] خالد رضی اللہ عنہ نے اس کلمہ کو تنقیص سمجھ کر اس شخص کو قتل کر ڈالا۔ اسی طرح کفر پر رضا، اگرچہ ضمناً ہو، کفر ہے۔ جس طرح کسی کافر کو اشارہ کرے کہ وہ مسلمان نہ ہو، اگرچہ اسے مشورہ نہ دے۔ یا کافر نے کہا کہ مجھے کلمۂ اسلام سکھا دو، خطیب نے کہا ذرا ٹھہر میں خطبے سے فارغ ہو جاؤں، کیونکہ یہ تاخیر کفر ہے۔ یا بلا تاویل کسی مسلمان کو "او! کافر" کہہ دیا، کیونکہ اس میں اسلام کا نام کفر رکھا گیا ہے۔

یا اللہ کے نام یا نبی ﷺ سے مسخرا پن کیا، یا امر یا نہی یا وعد یا وعیدِ رسول سے متعلق مثلاً یوں

---

[1] البداية والنهاية (٣٢٢/٦)

کہا کہ اگر مجھے اس بات کا حکم دیں گے تو میں اس پر عمل نہ کروں گا۔ اگر بیماری کی اس شدت میں ترکِ نماز پر اللہ تعالیٰ مجھے پکڑے گا تو یہ مجھ پر ظلم ہو گا اور اگر نبی ﷺ کا یہ قول سچ ہوتا تو میں نجات پاتا، کیونکہ اس میں مرتبۂ نبوت کی تنقیص ہے۔ یا کہا کہ "لا حول ولا قوة إلا بالله" بھوک سے بے نیاز نہیں کرتا ہے اور یہی تمام اذکار کا حکم ہے۔ یا موذن کی آواز کو گھنٹی کی آواز کی مانند کہا۔ یا اذان کے ساتھ ناقوسِ کفر کی تشبیہ کا ارادہ کیا۔ یا یہ کہا کہ میں قیامت سے نہیں ڈرتا۔ یا کہا یہود مسلمانوں سے بہتر ہیں۔ یا کسی نے پوچھا کہ ایمان کیا ہے تو اس نے استخفافاً جواب دیا کہ میں نہیں جانتا۔ یا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی صحبت کا انکار کیا، یا عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی۔ یا کہا کہ میں اپنے فعل کا خالق ہوں۔ یا بطور مزاح کہا: "أنا الله" [میں اللہ ہوں] یا استخفافاً کہا: محشر یا جہنم کیا چیز ہے؟ یا کہا: ہر عالم پر اللہ کی لعنت، اگرچہ استغراق کا ارادہ نہ کرے۔ یا کہا کہ روح قدیم ہے۔ یا کہا کہ جب ربوبیت ظاہر ہوئی تو الوہیت جاتی رہی اور اس سے مراد رفع احکام ہو، یا اس کی صفاتِ ناسوتیہ لاہوتیہ میں فنا ہو گئیں۔ یا اس کی صفات، صفاتِ حق سے بدل گئی ہیں۔ یا میں اللہ کو دنیا میں دیکھتا ہوں اور دو بدو اس سے باتیں کرتا ہوں۔ یا اللہ تعالیٰ صورتِ حسنہ میں حلول کرتا ہے، یا اس نے شرعی تکلیف مجھ سے ساقط کر دی ہے۔ یا غیر سے کہا کہ تو عملِ اسرار میں ظاہرۃ الشان عبادات کو چھوڑ دے۔ یا کہا کہ سماعِ غنا امورِ دین سے ہے یا قرآن سے زیادہ دل میں موثر ہے، طریقِ عبودیت کے بغیر بھی بندے کا اللہ تعالیٰ کی طرف وصول ہو سکتا ہے، یا روح اللہ تعالیٰ کا نور ہے، جب نور سے نور جا ملا تو متحد ہو گیا۔

میں نے مذاہب اربعہ کی بنیاد پر اس باب کی فروع کثیرہ کو کتاب "الإعلام بما يقطع الإسلام" میں استقراً لکھا ہے، اگرچہ ان میں بعض ضعیف اقوال بھی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے:

جس کسی نے اپنے بھائی کو کافر کہا تو اگر وہ کافر نہیں ہے تو یہی کہنے والا کافر ہو جاتا ہے۔ (رواه الطبراني وغيره)[1]

دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"(مسلمان) بھائی کو کافر کہنا یا لعنت کرنا، اس کے قتل کرنے کے برابر ہے۔"[2]

تیسری حدیث میں ہے:

---

[1] المعجم الكبير (۱۰/۲۲۴) نیز دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (۵۷۵۳) صحيح مسلم (۶۰)

[2] المعجم الكبير (۱۸/۱۹۳) نیز دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (۵۷۰۰)

"جس نے کہا: میں اسلام سے بری ہوں، اگر وہ کاذب ہے تو درست ہے، لیکن اگر وہ صادق ہے تو پھر اسلام کی طرف صحیح وسالم نہیں لوٹتا۔"[1]

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں:

«إِذَا قَالَ الرَّجُلُ لِأَخِيهِ: يَا كَافِرُ! فَقَدْ بَاءَ بِهَا أَحَدُهُمَا»[2]

[جب کوئی شخص اپنے بھائی کو اے کافر کہہ کر بلاتا ہے تو ان دونوں میں سے ایک اس کفر کے ساتھ ضرور لوٹے گا]

طبرانی کے الفاظ یہ ہیں:

«كُفُّوا عَنْ أَهْلِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ لَا تُكَفِّرُوْهُمْ بِذَنْبٍ فَمَنْ كَفَّرَ أَهْلَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ فَهُوَ إِلَى الْكُفْرِ أَقْرَبُ»[3]

[لا الہ الا اللہ پڑھنے والوں سے رک جاؤ، ان کو کسی گناہ کے سبب کافر نہ کہو، جس نے لا الہ الا اللہ پڑھنے والوں کو کفر کی طرف منسوب کیا تو وہ خود کفر کے زیادہ قریب ہے]

مغفرت اور توبہ کی قبولیت:

آیتِ کریمہ: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [النساء: ٤٨] [بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور وہ بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا] سے اس آیتِ کریمہ کا عموم: ﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ [الزمر: ٥٣] [کہہ دے اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی! اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہو جاؤ، بے شک اللہ سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے۔ بے شک وہی تو بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے] مخصوص ہے۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ اس کے بارے میں حق وہی ہے جو اہلِ سنت وجماعت کا مذہب ہے کہ فوت شدہ فاسق مومن مشیتِ الٰہی کے تحت ہے، وہ چاہے تو اسے جس طرح چاہے

[1] سنن أبي داود (٣٢٥٨) سنن النسائي (٣٨٧٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١٠٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٠)

[3] المعجم الكبير (١٢/٢٧٢)

عذاب کرے، پھر اس کا انجام بخشش ہے، وہ آگ سے باہر نکلے گا اس حال میں کہ وہ جلنے کی وجہ سے سیاہ ہو چکا ہوگا۔ اسے نہرِ حیات میں ایک غوطہ دیا جائے گا اور پھر اسے جمال، نضارت اور حسنِ عظیم عطا فرما کر بہشت میں لے جایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے سابقہ ایمان اور اعمال صالحات کے بدلے میں اس کے لیے جو کچھ تیار کر رکھا ہے، وہ اسے ملے گا۔ جیسا کہ اس بارے صحیح بخاری وغیرہ میں صحیح احادیث مروی ہیں۔[1]

اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اسے ابتدا ہی میں معاف کر دے، اس سے مسامحت فرمائے اور اس کے مخالفین کو راضی کر دے اور پھر نجات پانے والوں کے ہمراہ جنت میں لے جائے۔ خوارج کا یہ قول کہ مرتکبِ کبیرہ کافر ہے اور معتزلہ کا یہ قول، کہ وہ حتمی طور پر آگ میں ہمیشہ رہنے والا ہے اور اس سے عفو اور بخشش جائز نہیں ہے، جس طرح اطاعت گزار کو عذاب جائز نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ پر محض بہتان ہے۔ تعالیٰ اللہ عما یقول الظالمون والجاحدون علوا کبیرا۔

آیتِ کریمہ: ﴿وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا﴾ [النساء: ۹۳]

[اور جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے، اس میں ہمیشہ رہنے والا ہے اور اللہ اس پر غصے ہوگیا اور اس نے اس پر لعنت کی اور اس کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کیا ہے]

اس شخص پر محمول ہے جو قتلِ مسلم کو حلال جان کر اسے قتل کرتا ہے، کیونکہ قتل کا یہ استحلال کفر ہے۔ اس صورت میں خلود سے مراد تمام کفار کی مثل جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہنا ہے۔ یا پھر یہ آیت اس شخص پر محمول ہے جو قتلِ مسلم کو حلال نہیں جانتا، ایسی صورت میں اس آیت میں لفظ خلود مستلزم دوام نہیں ٹھہرے گا، جیسا کہ شرعی نصوص اور لغوی قواعد اس پر دلالت کرتے ہیں۔ یعنی اگر اسے عذاب کیا جائے تو اس کی یہ (خلود) جزا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے گا، جیسا کہ ان آیات ﴿وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [النساء: ۴۸] اور ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا﴾ [الزمر: ۵۳] سے معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۲) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۸٤)

جس نے یہ کہا ہے کہ قاتل کی توبہ قبول نہیں ہے تو اس کی مراد قتل سے زجر وتنفیر ہے، ورنہ اس بارے میں کتاب وسنت کی نصوص صریح اور واضح ہیں کہ اس کے لیے کافر کی مثل توبہ مقبول ہے، بلکہ زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ مرجیہ کا قول ہے:

”لا يضر مع الإيمان ذنب كما لا ينفع مع الكفر طاعة“

[ایمان کے ساتھ گناہ اسی طرح ضرر رساں نہیں ہے جس طرح کفر کے ساتھ اطاعت نفع مند نہیں ہے]

یہ اللہ تعالیٰ پر محض افترا اور بہتان ہے۔ جو دلائل اس کی تائید میں وہ ذکر کرتے ہیں تو نصوصِ قطعیہ کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دلائل سے ان کا ظاہری مفہوم مراد نہیں ہے۔ اس لیے ہر مسلمان پر واجب ہے کہ یہ اعتقاد رکھے کہ نافرمان مومنوں کی ایک جماعت آگ میں داخل ہو گی۔ اس کا انکار کرنا کفر ہے، کیونکہ اس میں قطعی الدلالۃ نصوص کی تکذیب ہے۔

کلمہ کفر بولنے کا انجام:

امام الحرمین نے اہلِ اصول سے نقل کیا ہے کہ جس نے کلمہ کفر کہا اور یہ گمان کیا کہ یہ توریہ ہے تو وہ ظاہراً اور باطناً کافر ہو گیا۔ لیکن جس شخص کو کوئی وسوسہ لاحق ہوا اور وہ ایمان میں یا خالق تعالیٰ میں متردد ہوا یا اس کے دل کو نقص یا سب عارض ہوا اور وہ کراہت شدیدہ کے ساتھ اسے ناپسند کرنے والا ہے اور اس کے دفع پر قادر نہیں ہے تو اس پر کچھ ضرر اور گناہ نہیں ہے، بلکہ یہ شیطان کی طرف سے ہے، لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ سے اس کو دور کرنے پر استعانت طلب کرے۔ اسے امام ابن عبدالسلام وغیرہ نے ذکر کیا ہے، ولله الحمد.

شہادتین کا اقرار:

اصلی کافر یا مرتد اگرچہ ایک شہادت کا اقرار کرنے والا کیوں نہ ہو، مگر جب تک وہ دونوں شہادتوں کا اقرار نہیں کرے گا، اس کا اسلام معتبر نہیں ہو گا۔ شہادتین ادا کرنے میں ترتیب شرط ہے۔ اگر پہلے ”أشهد أن محمداً رسول الله“ کہے گا اور پھر ”أشهد أن لا إله إلا الله“ کہے گا تو مسلمان نہ ہو گا۔ پھر جس شخص کا کفر اصل رسالت کے انکار کے سبب ہے، اسے شہادتین کہنا کافی ہو گا اور جس کا کفر عرب کے ساتھ تخصیص رسالت کے سبب سے ہے جیسے عیسائی تو وہاں یوں کہنا شرط ہے:

"أشهد أن محمداً رسول الله إلى كافة الناس والجن"۔

گونگے کا اشارہ کرنا نطق کے قائم مقام ہے۔غرض کہ مذکورہ بالا امور کے بغیر اسلام حاصل نہیں ہوتا۔ جیسے یہ کہنا: "آمنت" یا یہ کہنا: "آمنت بالذي لا إله غيره" یا "أنا مسلم" یا "أنا من أمة محمدﷺ" یا "أنا أحبه" یا "أنا من المسلمين" یا اس جیسے دیگر کلمات بولنا۔ یا یہ کہنا: ''مسلمانوں کا دین حق ہے'' برخلاف اس شخص کے جو کوئی دین ہی نہ رکھتا تھا، وہ اگر "آمنت بالله" یا "أسلمت لله" یا "الله خالقي أو ربي" کہہ کر پھر آخری شہادت ادا کرے گا تو وہ مسلمان ہو جائے گا۔

جو شخص اسلام قبول کرے اسے ایمان بالبعث کا حکم دینا مندوب ہے۔آخرت میں اسلام کے فوائد کے حصول کے لیے مذکورہ امور کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ وہ دل سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی کتابوں، رسولوں اور آخرت کے دن کی تصدیق کرے۔ پھر اگر وہ ان باتوں پر ایمان لایا اور دل سے تصدیق کی اور باوجود قدرت کے زبان سے شہادتین کا تلفظ نہ کیا تو ابھی تک وہ اپنے کفر پر باقی ہے اور ہمیشہ کے لیے آگ میں رہے گا جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔

لیکن اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کے بارے میں ائمہ اربعہ کا ایک قول یہ ہے کہ اسے اس کا ایمان نفع دے گا۔ اس کی غایت یہ ہے کہ وہ عاصی مومن ہے۔ اگر اس نے زبان سے شہادتین کا تلفظ کیا ہے اور دل سے مومن نہیں ہوا تو وہ آخرت میں بالاجماع کافر ہے۔ رہی دنیا تو دنیا میں ہم اس پر ظاہراً مسلمانوں والے احکام جاری کریں گے۔ پھر اگر ایک مسلمان عورت سے اس نے نکاح کر لیا ہے، پھر دل سے تصدیق کی تو وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں ہے، جب تک کہ وہ اسلام کے بعد تجدیدِ نکاح نہ کرے۔

نزع اور عذاب کے وقت ایمان لانا:

اہلِ حق کا مذہب یہ ہے کہ غرغرے کے وقت ایمان لانا اور عذابِ استیصال کے معاینے کے وقت کا ایمان نفع نہیں دیتا ہے، کیونکہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَأْسَنَا سُنَّتَ اللهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ﴾ [المؤمن: ٨٥]

[پھر یہ نہ تھا کہ ان کا ایمان انھیں فائدہ دیتا، جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔ یہ اللہ کا طریقہ ہے جو اس کے بندوں میں گزر چکا اور اس موقع پر کافر خسارے میں رہے]

ہاں صرف یونس علیہ السلام کی قوم اس سے مستثنیٰ ہو چکی ہے، کیونکہ ان کے متعلق اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

﴿اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ﴾ [یونس: ۹۸]

[یونس کی قوم کے سوا، جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے ان سے ذلت کا عذاب دنیا کی زندگی میں ہٹا دیا اور انھیں ایک وقت تک فائدہ دیا]

یہ اس بنیاد پر ہے کہ یہ استثنا متصل ہے اور ان کا ایمان عذابِ استیصال کے معاینے کے وقت تھا۔ بعض مفسرین کا یہی قول ہے اور اسی پر ان کا استثنا موجہ ہے۔ اس امر کا وقوع ان کے نبی کی کرامت اور خصوصیت کے لیے تھا، لہٰذا اس پر قیاس نہیں ہو سکتا ہے۔ علما اور امت کے معتمد مجتہدین نے ''آیتِ باس'' سے فرعون کے کفر پر اجماع اخذ کیا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے تفسیر سورت یونس میں اسے دو طرح سے روایت کیا ہے اور ایک حدیث کو حسن اور دوسری حدیث کو حسن غریب صحیح کہا ہے۔[1] ابن عدی اور طبرانی کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«خَلَقَ اللّٰهُ يَحْيٰى بْنَ زَكَرِيَّا فِيْ بَطْنِ أُمِّهٖ مُؤْمِناً وَخَلَقَ فِرْعَوْنَ فِيْ بَطْنِ أُمِّهٖ كَافِراً»[2]

[اللہ تعالیٰ نے یحییٰ بن زکریا کو ان کی ماں کے پیٹ میں مومن اور فرعون کو اس کی ماں کے پیٹ میں کافر پیدا کیا تھا]

فرعون نے غرق ہوتے وقت کہا تھا:

﴿اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ [یونس: ۹۰]

[میں ایمان لے آیا کہ بے شک حق یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں فرماں برداروں سے ہوں]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۱۰۷، ۳۱۰۸)

[2] المعجم الكبير (۱۰/۲۲۴) السلسلة الصحيحة (۱۸۳۱)

یہ قول اس کے لیے نفع مند نہیں، اس لیے کہ اس کے بعد اللہ جل وعلا نے فرمایا ہے:

﴿آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ﴾ [یونس: ۹۱]

[کیا اب؟ حالانکہ بے شک تو نے اس سے پہلے نافرمانی کی اور تو فساد کرنے والوں سے تھا]

نزولِ عذاب کے وقت ایمان نفع مند نہیں ہوتا:

قاضی عبد الصمد حنفی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ صوفیہ کا مذہب یہ ہے کہ ایمان اگرچہ عذاب کے معاینے کے وقت ہو اس سے فائدہ ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہب قدیم ہے، کیونکہ قاضی مذکور ۵۰۰ھ کے اوائل ۴۳۰ھ میں تھے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علماے متقدمین اور علماے متاخرین کے درمیان حد فاصل ۳۰۰ھ ہے۔ قاضی صاحب متقدمین کے زمانے کے بعد تھے۔ لہٰذا یہ صوفیہ کا مذہب قدیم نہ ٹھہرا۔ اگر فرض کریں کہ ان کا یہ مذہب اس وجہ سے حجت نہیں ہے کہ فرعون کے کفر پر اجماعِ امت ایمان عند الباس پر نہیں ہوا، بلکہ وہ شروع ہی سے اللہ تعالیٰ، موسیٰ علیہ السلام اور ان کی کتاب پر ایمان نہ لایا تھا اور جو ابن عربی رحمہ اللہ نے فتوحات مکیہ میں ایمانِ فرعون کی صحت کے دلائل لکھے ہیں، وہ سب مخدوش اور مدفوع ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان دلائل کا ضعف بیان کیا ہے، یہاں اس کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: جب کفرِ فرعون کے حق میں حدیث آچکی تو پھر اس کے ایمان لانے میں بحث کرنا سنتِ مطہرہ کے ساتھ مصادمت ہے۔ إذا جاء نهر الله بطل نهر معقل.

کفار کے لیے دائمی اور ابدی عذاب ہے:

یہ آیت اور حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ جہنم میں کفار کا عذاب دائمی اور ابدی ہے اور جو کچھ اس کے خلاف آیا ہے وہ واجب التاویل ہے، جیسے فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ [هود: ۱۰۷]

[ہمیشہ اس میں رہنے والے، جب تک سارے آسمان اور زمین قائم ہیں مگر جو تیرا رب چاہے۔ بے شک تیرا رب کر گزرنے والا ہے جو چاہتا ہے]

اس آیتِ کریمہ کا ظاہری مفہوم یہ بتاتا ہے کہ ان کے عقاب کی مدت ارض و سما کی بقا کی

مدت کے برابر ہے۔ پھر اس مدت میں جتنا اللہ تعالیٰ چاہے وہ مخلد نہ رہیں۔ علما نے اس آیت کی بیس تاویلیں کی ہیں۔ کوئی تاویل حکمتِ تقیید کی طرف راجع ہے، کوئی ارض وسما کے دوام کی مدت کی طرف راجع ہے اور اس میں سے کوئی حکمت استثنا اور معنی استثنا کی طرف راجع ہے۔ پھر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تاویل کی ان وجوہ کو نقل کیا ہے۔ اس مقام کی عمدہ تفسیر "فتح البیان" اور تفسیر فتح القدیر میں ہے۔[1] پھر کہا ہے کہ ایک قوم کہتی ہے کہ کفار کا عذاب منقطع ہو جائے گا، اس عذاب کی ایک نہایت ہے۔ ان کی دلیل یہی آیتِ باب اور مندرجہ ذیل آیت ہے:

﴿لٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا﴾ [النبأ: ٢٣] [وہ مدتوں اسی میں رہنے والے ہیں]

کیونکہ معصیت ظلم متناہی ہے تو اس پر غیر متناہی عقاب ظلم ہوگا۔ امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں بڑی تفصیل کے ساتھ اس کا رد کیا ہے۔[2] ابو نعیم کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ يُعَذِّبُ الْمُوَحِّدِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ بِقَدْرِ نُقْصَانِ أَعْمَالِهِمْ ثُمَّ يَرُدُّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ خُلُوْداً دَائِماً أَبَداً بِإِيْمَانِهِمْ»[3]

[بلاشبہہ اللہ تعالیٰ موحدین کو ان کے اعمال کے نقص کے پیش نظر انھیں جہنم میں عذاب دے گا، پھر ان کے ایمان کے سبب انھیں جنت کی طرف لے جائے گا جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے]

الحاصل یہ عقیدہ کہ آگ کو فنا ہے، کتاب وسنت کے ظاہر، جمہور علماے امت اور ائمہ ملت کے اجماع کے خلاف ہے۔ بعض اکابر جو اس طرف گئے ہیں یا بعض سلف جو اس کے قائل ہیں۔ ان کا قول مؤول ہے یا یہ ان کی اجتہادی خطا ہے، واللہ أعلم.

ریا کاری:

ریا شرکِ اصغر ہے۔ کتاب وسنت اس کی تحریم پر شاہد ہیں اور اس پر امت کا اجماع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

---

(1) فتح القدير (٢/ ٧٥٨) فتح البيان (٦/ ٢٤٦)

(2) التفسير الكبير (١٨/ ٤٠٤)

(3) حلية الأوليا لأبي نعيم (٨/ ٥٤) اس کی سند میں "قطن بن صالح دمشقی" راوی کذاب ہے، لہٰذا یہ روایت موضوع ہے۔ دیکھیں: لسان الميزان (٤/ ٤٧٤)

﴿الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ﴾ [الماعون: ٦] [وہ جو دکھاوا کرتے ہیں]

نیز فرمایا:

﴿وَ الَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ﴾ [الفاطر: ١٠]

[اور جو لوگ برائیوں کی خفیہ تدبیر کرتے ہیں، ان کے لیے بہت سخت عذاب ہے]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان سے مراد اہلِ ریا ہیں۔ مزید فرمایا:

﴿وَ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾ [الكهف: ١١٠]

[اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے]

یعنی عمل میں ریا نہ کرے۔ یہ آیت اس شخص کے حق میں اتری ہے جو عبادات و اعمال سے اجر و حمد کا طالب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا﴾ [الدهر: ٩]

[(اور کہتے ہیں) ہم تو صرف اللہ کے چہرے کی خاطر تمھیں کھلاتے ہیں، نہ تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ]

ایک حدیث میں آیا ہے:

«إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمُ الشِّرْكُ الْأَصْغَرُ، قَالُوا: وَمَا الشِّرْكُ الْأَصْغَرُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: اَلرِّيَاءُ يَقُولُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِذَا جُزِيَ النَّاسُ بِأَعْمَالِهِمْ: اِذْهَبُوا إِلَى الَّذِينَ كُنْتُمْ تُرَاءُونَ فِي الدُّنْيَا، فَانْظُرُوا هَلْ تَجِدُونَ عِنْدَهُمْ جَزَاءً» [1] (رواه أحمد)

[مجھے تمہارے اوپر سب سے زیادہ شرک اصغر کا خوف ہے۔ لوگوں نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! شرک اصغر سے کیا مراد ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ریا کاری۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ریا کاروں سے فرمائے گا، جبکہ لوگوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا کہ جنھیں دکھانے کے لیے دنیا میں تم اعمال کرتے تھے، ان کے پاس جاؤ اور دیکھو کہ کیا ان کے پاس اس کا کوئی بدلہ ہے؟]

طبرانی میں مرفوعاً مروی ہے:

[1] مسند أحمد (٥/٤٢٨)

«أَدْنَى الرِّيَاءِ شِرْكٌ»[1] [کم ترین ریا بھی شرک ہے]

دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

«اَلشَّهْوَةُ الْخَفِيَّةُ وَالرِّيَاءُ شِرْكٌ»[2] [در پردہ خواہش پرستی اور ریا کاری شرک ہے]

حاکم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

«اَلشِّرْكُ الْخَفِيُّ أَنْ يَّعْمَلَ الرَّجُلُ لِمَكَانِ الرَّجُلِ»[3]

[شرک خفی یہ ہے کہ آدمی کسی آدمی کے ہاں مقام ومرتبہ پیدا کرنے کے لیے عمل کرے]

ابونعیم اور حاکم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

«اَلشِّرْكُ أَخْفیٰ فِي أُمَّتِي مِنْ دَبِيْبِ النَّمْلِ عَلَى الصَّفَا فِي اللَّيْلَةِ الظَّلْمَاءِ وَأَدْنَاهُ أَنْ تُحِبَّ عَلٰى شَيْءٍ مِنَ الْجَوْرِ أَوْ تُبْغِضَ عَلٰى شَيْءٍ مِنَ الْعَدْلِ وَهَلِ الدِّيْنُ إِلَّا الْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ قَالَ اللّٰهُ تَعَالیٰ: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾»[4]

[میری امت میں شرک اندھیری رات میں صاف پتھر پر رینگنے والی چیونٹی سے بھی زیادہ مخفی ہے اور اس کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ تو کسی ظلم کو پسند کرے یا کسی عدل کو ناپسند کرے، جبکہ دین تو صرف اللہ کے لیے محبت کرنے اور اللہ ہی کے لیے بغض رکھنے کا نام ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: کہہ دے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا]

ریا کاری کی مذمت:

ریا کاری کی مذمت، اس کے شرک ہونے اور ریا کاروں کے عقاب وعاقبت کے بیان میں

[1] المعجم الكبير (٣٦/٢٠) مستدرك الحاكم (٣٠٣/٣) نیز سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٨٩) وغیرہ میں یہ روایت «إن يسير الرياء شرك» کے الفاظ سے مروی ہے۔

[2] كنز العمال (٨٥٢/٣)

[3] مستدرك الحاكم (٣٦٥/٤) صحيح الجامع (٣٧٢٩)

[4] مستدرك الحاكم (٢٩٠/٢) حلية الأولياء (٣٢٨/٨) اس کی سند میں "عبدالأعلی بن أعین" راوی ضعیف ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٣٧٥٥)

بہت سی احادیث مروی ہیں۔

احمد اور طبرانی کی روایت میں آیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أَيُّهَا النَّاسُ! اِتَّقُوا الشِّرْكَ فَإِنَّهُ أَخْفٰى مِنْ دَبِيْبِ النَّمْلِ»

[اے لوگو! شرک سے بچو، کیوں کہ وہ چیونٹی کے رینگنے سے بھی زیادہ مخفی ہے]

تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ہم کیسے بچیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: کہو:

«اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَعُوْذُ بِكَ أَنْ نُشْرِكَ بِكَ شَيْئاً نَعْلَمُهٗ وَنَسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا نَعْلَمُ»[1]

[اے اللہ! ہم تیری پناہ میں آتے ہیں کہ تیرے ساتھ وہ شرک کریں جو ہم جانتے ہیں اور اس شرک سے بخشش مانگتے ہیں جسے ہم نہیں جانتے]

دوسری روایت میں آیا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ان کلمات کو تین بار پڑھا کرو:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ أَنْ أُشْرِكَ بِكَ وَ أَنَا أَعْلَمُ وَ أَسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا أَعْلَمُ"[2]

[اے اللہ! میں تیری پناہ پکڑتا ہوں کہ میں جانتے ہوئے تیرے ساتھ شرک کروں، اور تجھ سے اس شرک کی بخشش مانگتا ہوں جسے میں نہیں جانتا]

علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے مرفوعاً یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: کل (آخرت) کو نجات کیوں کر ہو گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تو اللہ تعالیٰ کو فریب نہ دے۔ اس نے کہا: کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو کیسے فریب دے سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تو عمل تو اللہ و رسول کے امر و حکم کے مطابق کرے، لیکن اس میں اخلاص نہ ہو۔ پس تم ریا سے بچو، کیونکہ وہ اللہ کے ساتھ شرک ہے۔ ریا کار کو قیامت کے دن ساری مخلوقات کے سامنے چار ناموں سے پکاریں گے: اے کافر! اے فاجر! اے غادر اور اے خاسر! تیرا عمل برباد ہو گیا، تیرا اجر باطل ہو گیا، آج کے دن تیرے لیے کوئی حصہ نہیں ہے۔ اے فریبی مکار! جا تو اپنا اجر اس شخص سے طلب کر جس کے لیے تو عمل کرتا تھا۔[3]

ریا کاری شرک ہے:

انھی نصوص قطعیہ اور احادیث سنیہ کے موجب شرک کے ریا ہونے پر علمائے امت کا سلفاً

[1] مسند أحمد (۴/۴۰۳) المعجم الأوسط (۴/۱۰)

[2] مسند أبي يعلیٰ (۱/۶۰) اس کی سند میں "ليث بن أبي سليم" ضعیف ہے۔

[3] المطالب العالية لابن حجر (۳/۱۸۴) السلسلة الضعيفة (۶۴۱۲) اس کی سند ضعیف ہے۔

وخلفاً اجماع ہو چکا ہے، لہٰذا ریا کاری کی مذمت پر ائمہ رحمہم اللہ کے کلمات باہم موافق اور متواتر ہیں۔ امت کا ریا کاری کے گناہ کی تحریم و تعظیم پر اطباق و اتفاق ہے۔

ایک حکایت: عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ گردن جھکائے بیٹھا ہے۔ انھوں نے کہا: اے گردن والے! گردن اونچی کر، خشوع گردنوں (کے جھکائے) میں نہیں ہے وہ تو دلوں میں ہوتا ہے۔

حکایت:

ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو مسجد کے اندر سجدے کی حالت میں روتا ہوا دیکھ کر کہا:

"أنت أنت لو كان هذا في بيتك"[1]

[تم تم ہی ہو، کاش! تمھارا یہ رونا تیرے گھر کے اندر ہوتا]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے:

جب بندہ ریا کاری کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "عبدي يستهزئ بي"[2] [میرا بندہ میرے ساتھ استہزا کرتا ہے]

امام فضیل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ریا کار کو دیکھنا چاہے تو مجھے دیکھے۔ نیز انھوں نے یہ بھی کہا ہے:

"ترك العمل لأجل الناس رياء، والعمل لأجل الناس شرك، والإخلاص أن يعافيك الله منهما"[3]

[لوگوں کے لیے کسی عمل سے کنارہ کش ہونا ریا کاری ہے، لوگوں کے لیے کسی کام پر عمل پیرا ہونا شرک ہے اور اخلاص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں ان دونوں سے محفوظ رکھے]

اللہ رب العزت نے فرمایا:

﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾ [الفرقان: ٢٣]

[اور ہم اس کی طرف آئیں گے جو انھوں نے کوئی بھی عمل کیا ہوگا تو اسے بکھرا ہوا غبار بنا دیں گے]

---

[1] الزهد لابن المبارك (١٥٥)

[2] إحياء علوم الدين للغزالي (٥/٤٢)

[3] سير أعلام النبلاء (٨/٤٢٧)

ان سے وہ اعمال مراد ہیں جن سے غیر اللہ کا قصد کیا گیا تھا تو ان کا ثواب برباد گیا اور وہ ﴿هَبَآءً مَّنثُورًا﴾ کی طرح ہو گئے۔ ﴿هَبَآءً﴾ سے مراد وہ غبار ہے جو آفتاب کی شعاع میں نظر آتا ہے۔

ریا کاری کے مختلف انداز:

ریا، رویت سے اور سمعہ، سماع سے ماخوذ ہے۔ ریاے مذموم کی تعریف یہ ہے کہ عامل اپنی عبادت سے غیر اللہ کی رضا کا ارادہ کرے۔ جیسے یہ قصد کرے کہ لوگ اس کی عبادت وکمال پر مطلع ہوں اور اس اطلاع سے اسے مال یا جاہ یا ثنا حاصل ہو۔ وہ اپنی لاغری اور رنگ کی زردی ظاہر کرے۔ یا بکھرے بال، پراگندہ حالت، پست آواز اور آنکھیں بند رکھے جس سے عبادت میں شدتِ اجتہاد کا ایہام ہو۔ یا وہ غمگین، کم خور اور اپنی جان سے بے پروا رہے، تاکہ کسی اہم معاملے میں اس کا اشتغال معلوم ہو۔ یا وہ لگا تار روزے رکھے، اکثر بیدار رہے اور دنیا اور اہلِ دنیا سے روگرداں رہے۔ مگر اس مخذول نے یہ نہ جانا کہ وہ اس وقت لٹیروں اور چوروں کی طرح ذلیل ترین انسان ہے، کیونکہ انھیں تو اپنے گناہوں کا اقرار ہے اور وہ دین میں غرور نہیں کرتے برخلاف اس مخذول ممقوت کے۔ وہ صلحا کا حلیہ ظاہر کرے، چلنے میں سر جھکائے ہوئے چلے، آہستہ چلے، ماتھے پر سجدے کا گٹا سجائے، صوف اور کھر درا لباس زیب تن کرے اور اسی طرح کے دیگر کام کرے، تاکہ اس بات کا ایہام ہو کہ وہ عالم یا صوفی ہے، حالانکہ علم وتصوف کی حقیقت سے وہ بالکل مفلس اور کورا ہے۔

اس دھوکے باز نے یہ نہ جانا کہ اس حیلے سے جو مال اس کے پاس آتا ہے اس کا قبول کرنا اس پر حرام ہے۔ اگر یہ اس مال کو لے لے گا تو فاسق ہو گا، کیونکہ یہ باطل طریقے سے مال کھانا ہے۔ یا وہ نصیحت کرنے والا واعظ بن کر حفظِ سنن، لقاے مشائخ اور اتقانِ علوم کا اظہار کرے، کیونکہ ریا کاری اقوال میں بھی بہت ہوتی ہے اور اس کی انواع غیر محصور ہیں۔ یا وہ ارکانِ نماز میں تطویل وتحسین کرے اور بناوٹی خشوع کا اظہار کرے، یہی حال روزے اور حج وغیرہ کا ہے۔ اعمال میں ریا کاری کی انواع بھی غیر محصور ہیں۔ پھر کبھی ریا کار شدتِ حرص سے خلوت میں بھی یہی مہلک کام کرتا ہے تاکہ اس کی یہ عادت جلوت میں بھی رہے، وہ اللہ تعالیٰ کے خوف وحیا سے یہ کام نہیں کرتا۔ کبھی وہ یوں ریا کاری کا مظاہرہ کرتا ہے کہ کسی امیر یا عالم یا صالح کا اپنے پاس ملاقات کے لیے آنا پسند کرتا ہے تاکہ اس سے شہرہ حاصل کرے اور اس کی رفعتِ مرتبہ ثابت ہو۔ یا وہ ذکر کرتا ہے کہ میں نے اتنے مشائخ دیکھے ہیں اور وہ دوسروں پر افتخار اور رفعت کے طور پر ایسا تذکرہ کرتا ہے۔ یہ سارے ریا کاری کے

دروازے ہیں جو جاہ و منزلت اور شہرت طلب کرنے پر انگیخت کرتے ہیں، تاکہ لوگ اس کی ثنا کریں اور اسے ہر طرف سے مال و دولت حاصل ہو۔

ریا کو شرک اصغر کہنے کا سبب:

اگر ریا کار کی مراد صرف ریا کاری ہے تو اس کی ساری عبادت باطل ہوئی۔ کاش! اتنی ہی برائی اسے حاصل ہوتی۔ مشکل تو یہ ہے کہ اس پر گناہِ عظیم اور ذمِ قبیح ثابت ہوتا ہے۔ ریا کاری کے حرام، کبیرہ گناہ اور شرک ہونے کی یہی وجہ ہے کہ اس میں حق تعالیٰ کے ساتھ استہزا پایا جاتا ہے، لہٰذا ریا کار لعنت کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ ریا کاری ہلاک کرنے والے گناہوں میں سے بڑا گناہ ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اس کا نام ''شرکِ اصغر'' رکھا ہے۔

ریا کاری میں مخلوق پر تلبیس بھی ہوتی ہے، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص واطاعت کا ایہام ہوتا ہے، حالانکہ وہ ریا کار مخلص مطیع نہیں ہے۔ دنیا میں بھی تلبیس کرنا حرام ہے، چہ جائے کہ دین کی تلبیس کی جائے۔ ہاں کبھی ریا کا اطلاق امر مباح پر بھی ہوتا ہے، جیسے عبادت کے بغیر جاہ وتوقیر طلب کرنا یا جیسے اچھا اور پاکیزہ لباس پہننا تاکہ لوگ نظافت و جمالت کی بابت اس کی تعریف کریں۔ اسی طرح ہر تجمل وتزین کا حکم ہے، جیسے اغنیا پر خرچ کرنا عبادت کے طور پر نہیں، بلکہ اس لیے کہ لوگ اسے سخی کہیں۔ پس یہ نوع حرام نہیں ہے، کیوں کہ اس میں تلبیس اور استہزا نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب باہر آتے تو آئینہ دیکھ کر عمامہ، بال اور چہرہ درست فرما کر آتے۔ یہ بات آپ ﷺ کے حق میں عبادت تھی، تاکہ آپ ﷺ لوگوں کی نظروں سے نہ گریں اور مخلوق کے دلوں کو حق کی طرف مائل کریں۔ یہ حکم علما وغیرہ کے حق میں بھی درست ہے، جب تحسینِ ہیئت سے ان کا مقصود محض یہی امور ہوں۔

جب ریا کار ریا کاری اور عبادت دونوں کا قصد کرے:

جس شخص کا اپنے عمل سے ریا کاری اور عبادت دونوں ہی مقصود ہیں۔ اس کے بارے میں امام غزالی اور ابن عبدالسلام رحمہما اللہ کا اختلاف ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر باعثِ دنیا غالب ہے تو اسے کوئی ثواب نہ ملے گا اور اگر باعثِ آخرت غالب ہے تو ثواب ملے گا اور اگر دونوں باعث برابر ہیں تو دونوں ساقط ہیں، اسے کچھ ثواب نہ ہوا۔ ابن عبدالسلام رحمہ اللہ نے کہا کہ مطلقاً کچھ ثواب نہ ہوگا، ان کی دلیل اس طرح کی احادیث ہیں:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلاً أَشْرَكَ فِيهِ مَعِي غَيْرِي فَأَنَا مِنْهُ بَرِيءٌ هُوَ لِلَّذِي أَشْرَكَ»[1]

[جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس میں اس نے کسی غیر کو میرا شریک بنایا تو میں اس سے بری ہوں، وہ اسی کے لیے ہے جسے اس نے شریک بنایا ہے]

امام غزالی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ریا اگرچہ حرام ہے، لیکن اصل ثواب سے مانع نہیں ہوتی ہے، جبکہ باعثِ عبادت اغلب ہو۔ اسی لیے یہ کہا ہے کہ اگر لوگوں کا دیکھنا اس کا غالب مقصد ہو اور اس وجہ سے وہ عبادت میں زیادہ نشاط و ہمت ظاہر کرتا ہے اور ان کی عدمِ موجودگی میں بھی وہ یہ عبادت ترک نہیں کرتا تو اس صورت میں ہمارا گمان یہ ہے ۔و اللہ أعلم۔ کہ ریا اصل ثواب کے لیے محبط نہ ہو، لیکن ریا کے قصد کی مقدار پر عقاب اور ثواب کے قصد کی مقدار پر ثواب ملے، انتہیٰ۔

سعید بن المسیب اور عبادہ بن صامت کے قول اس پر دلیل ہیں کہ اسے اصلاً ثواب نہ ہوگا، بلکہ خود امام غزالی رحمہ اللہ نے اس سے پہلے یہ کہا تھا کہ جب صدقہ و نماز میں اجر اور تعریف کا اکٹھا قصد کرے گا تو یہ وہ شرک ہوگا جو اخلاص کے منافی ہے۔ لہٰذا ابن عبدالسلام رحمہ اللہ کا کلام ہی راجح ٹھہرا۔ کلام کا حاصل یہ ہوا کہ جب ریاے مباح عبادت کے ہمراہ ہوگی تو ثواب کو کلیتاً ساقط نہ کرے گی، بلکہ عبادت کے قصد کی مقدار پر ثواب ملے گا، اگرچہ ضعیف ہو، لیکن اگر ریاے محرم ہمراہ ہوگی تو وہ اصلاً اجر کو ضائع کر دے گی، جیسا کہ کئی احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ آیتِ کریمہ: ﴿ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ﴾ [الزلزال: ۷] [پھر جس نے ذرہ برابر کوئی نیکی کی ہوگی وہ اس کو خود دیکھ لے گا] اس کے منافی نہیں ہے، کیونکہ اس کی تقصیر نے امرِ محرم کے ارادے کی بنا پر اجر کا ضیاع واجب کر دیا ہے۔ اب ایک ذرہ برابر بھی خیر باقی نہیں رہی تو یہ آیت اسے شامل نہ ہوگی۔

ریا اور اخلاص دونوں کے ساتھ عبادت کا حکم:

بندے نے جب اخلاص پر ایک عبادت کا عقد کیا، پھر اس پر ریاکاری وارد ہوئی۔ اگر یہ ریاکاری تمام عمل کے بعد آئی تو کچھ اثر نہ کرے گی، کیونکہ وہ عبادت اخلاص پر تمام اور مکمل ہو چکی ہے، اب اس پر ریاکاری کا اثر طاری نہ ہوگا بشرطیکہ وہ تکلف کے ساتھ اس کا اظہار نہ کرے اور اس کے متعلق ڈینگیں نہ مارے۔ پھر اگر بقصد ریا اس کا تکلف کیا تو امام غزالی رحمہ اللہ نے کہا ہے: "فهذا مخوف" [پس اس کے متعلق ڈر ہی ہے] آثار و اخبار اس پر دلیل ہیں کہ یہ تکلف عمل ضائع کرنے والا ہے۔

[1] المعجم الأوسط (٦/ ٣٢٤) نیز دیکھیں: صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩٨٥)

پھر انھوں نے اس بات کو بعید جانا ہے کہ یہ طاری ریا عمل کے ثواب کو باطل کرے، بلکہ قرین قیاس یہ ہے کہ اسے اخلاص پر مکمل ہونے والے عمل کا ثواب ملے اور اطاعتِ خدا میں ریا کاری کے سبب سزا دی جائے اور اگرچہ یہ ریا کاری اس عبادت سے فراغت کے بعد کیوں نہ ہو۔ برخلاف اس صورت کے کہ دورانِ عمل اس کا عقد ریا کی طرف متغیر ہو گیا تو یہ محبط بلکہ مفسد عبادت ہے اگر خالص ریا آ گئی ہے۔ اور اگر ریائے محض نہیں ہے لیکن اتنی غالب ہوئی ہے کہ قربت کا قصد، جو اس میں موجود تھا، دب گیا تو یہ افسادِ عبادت میں متردد ہے۔ حارث محاسبی کا میلان افساد کی طرف ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک احسن یہ ہے کہ اس قدر ریا، جب کہ اس کا اثر عمل میں ظاہر نہ ہو، بلکہ عمل کا صدور باعثِ دین سے باقی رہے اور فقط اطلاع کا سرور اس کی طرف منضاف ہوا تو عمل فاسد نہ ہو گا، کیونکہ اصل نیت جو باعث علی العمل اور حامل علی الاتمام تھی وہ ہنوز باقی ہے۔ برخلاف اس عارض ریا کے کہ اگر لوگ نہ ہوتے تو نماز کو قطع کر دیتا تو یہ مفسد عبادت ہے، اس عبادت کا پھر اعادہ کرے اگر یہ عبادت فرض ہے۔ وہ احادیث جو ریا کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، اس صورت پر محمول ہیں جس میں صرف مخلوق کی رضا مقصود ہو۔ جو اخبار شرکت کے بارے میں آئی ہیں وہ اس شکل پر محمول ہیں کہ ریا کار کا قصد ثواب کے قصد سے مساوی یا اغلب ہو۔ اگر قصدِ ثواب کی بنسبت ریا کاری کا قصد ضعیف ہے تو عمل کا ثواب بالکلیہ ختم ہو گا اور نہ نماز فساد کے لائق ٹھہرے گی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ عقدِ نماز کی ابتدا میں ریا کاری شامل ہو گئی اور سلام پھیرنے تک ساتھ ہی رہی تو پھر اس کی قضا کرنے میں کچھ اختلاف نہیں ہے، وہ نماز، نماز شمار نہ ہوئی۔ اگر اثنائے نماز میں نادم ہو کر توبہ کر لی تو ایک فرقے نے کہا کہ وہ نماز منعقد نہیں ہوئی اسے دوبارہ نئے سرے سے ادا کرے، جبکہ دوسرے فرقے نے کہا ہے کہ تکبیرِ تحریمہ کے سوا سارا فعل لغو ہوا، لہٰذا وہ اسی تحریمہ پر اسے پورا کرے۔ تیسرے فرقے نے کہا: اس پر کچھ بھی لازم نہیں ہے، لہٰذا وہ نماز مکمل کرے، اس لیے کہ اعتبار خاتمے کا ہے جس طرح کہ اگر اخلاص کے ساتھ عمل کی ابتدا کرتا اور ریا پر ختم کرتا تو اس کا عمل فاسد ہو جاتا۔ آخری دونوں قول قیاس فقہ سے بالکل خارج ہیں، خصوصاً ان دونوں میں سے بھی پہلا قول۔ اسی طرح یہ قول کہ اگر ختم باخلاص کرتا تو نماز صحیح ہوتی، کیوں کہ ریا نیت میں قادح ہوتی ہے۔ قیاس فقہ پر تو یہ بات مستقیم اور درست ہے کہ اگر عمل کا باعث ابتدائے عقد میں مجرد ریا ہے نہ طلبِ ثواب اور امتثالِ امر تو افتتاح ہی منعقد نہ ہوا اس کا مابعد کس طرح صحیح ہو گا؟ کیونکہ اس نے جزم بہ نیت نہیں کیا ہے، اس نے تو تکبیر تحریمہ ہی لوگوں

کے لیے باندھی ہے، اگرچہ اس کا کپڑا ناپاک تھا اور اگر وہ اکیلا ہوتا تو نماز ہی نہ پڑھتا۔ اگر یہ صورت ہے کہ لوگوں کے نہ ہونے پر بھی وہ نماز پڑھتا اور اچھی طرح اور صحیح طور پر پڑھتا، لیکن اسے حصولِ تعریف کی رغبت ظاہر ہوئی تو دو باعث جمع ہو گئے۔ اب اگر یہ شکل صدقہ میں ہے تو اجابت باعثِ ریا پر عاصی ہوا، اور اجابت باعثِ ثواب پر مطیع ٹھہرا۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ﴾ [الزلزال: ۷]

[پھر جس نے ذرہ برابر کوئی نیکی کی ہوگی وہ اس کو خود دیکھ لے گا]

اب اسے قصدِ صحیح کی مقدار میں ثواب ملے گا اور فاسد قصد کی مقدار میں عقاب ہوگا، ان میں سے ایک دوسرے کو حبط نہ کرے گا۔ اس جگہ نفل نماز کا حکم اسی صدقے کی مانند ہے، جس کا ذکر ہو چکا، یہاں یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ اس کی نماز فاسد ہے یا اس کی اقتدا کرنا باطل ہے، اگرچہ یہ بات ظاہر ہو جائے کہ اس کا قصد ریا اور اظہارِ حسنِ قراءت ہے، کیونکہ مسلمان کے ساتھ نیک گمان رکھنا چاہیے کہ اس نے اس تطوع اور نفل سے بھی ثواب کا قصد کیا ہوگا، تو باعتبار اس قصد کے اس کی نماز صحیح ہے، اور اس کی اقتدا بھی درست ہے۔

اگر اس کے ساتھ دوسرا قصد بھی شامل ہو گیا ہے تو اس کے سبب سے وہ عاصی ہے۔ پھر اگر یہ دونوں باعث فرض نماز میں عارض ہوں اور ہر ایک باعث غیر مستقل ہو، اور انبعاث و رغبت ان دونوں سے حاصل ہو تو یہ اس سے واجب کو ساقط نہیں کرتا۔ اگر ہر ایک باعث اس طرح مستقل ہے کہ اگر باعثِ ریا معدوم ہو تو فرض ادا کرے اور اگر باعثِ فرض منعدم ہو تو نماز ریا کاری کے لیے پڑھے تو یہ شکل محلِ نظر ہے اور سخت محتمل ہے۔ اس لیے احتمالاً یہ کہا جائے گا کہ نماز خالص لوجہ اللہ واجب تھی وہ پائی نہ گئی، یا یوں کہا جائے کہ باعث مستقل امتثالِ امر واجب تھا اور وہ پایا گیا تو اس کے ساتھ غیر کا اقتران اس سے فرض کو ساقط نہیں کرتا ہے، جس طرح کہ اگر کسی غصب کے گھر میں نماز ادا کرتا۔ اگر یہ ریا نماز کی طرف مبادرت کرنے میں ہے نہ ذاتِ نماز میں تو یہ نماز قطعاً صحیح ہے، کیونکہ اصلِ صلات کے باعث کو، اس حیثیت سے وہ صلات ہے، اس کا غیر عارض نہیں ہوا۔

یہ بحث اس ریا میں تھی جو کہ عمل پر باعث ہوتی ہے۔ رہا لوگوں کے اس عمل پر مطلع ہونے پر خوش ہونا جب کہ اس کا اثر زبان تک نہ پہنچے کہ عمل میں تاثیر کرے تو فسادِ نماز بعید ہے۔

یہ ہے وہ جسے ہم قانون فقہ کے لائق سمجھتے ہیں۔ یہ مسئلہ اتنا گہرا ہے کہ فقہا فقہ میں اس مسئلے پر بحث کرنے کے درپے نہیں ہوئے۔ جن لوگوں نے اس پر خوض وبحث کی ہے انہوں نے فقہا کے قوانین کو مدنظر نہیں رکھا۔ ان کو تو صرف دلوں کے تصفیے، تھوڑی سی بے احتیاطی کے ذریعے عبادت کو برباد کر لینے سے بچانے اور طلبِ اخلاص نے اس کام پر ابھارا۔ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے ہماری نگاہ میں یہی قصد اور ارادہ ہے، جب کہ حقیقت کا علم تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

ریا کاری کے مختلف درجات:

ریا کاری کے قبیح اور برا ہونے میں مختلف درجات ہیں۔

① سب سے بری ریا وہ ہے جو ایمان میں ہو۔ یہ ریا کاری منافقین کی شان ہے جن کی اللہ تعالیٰ نے کتاب عزیز میں کثرت سے مذمت کی ہے اور انھیں یہ وعید سنائی ہے:

﴿ إِنَّ الْمُنٰفِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ [النساء: ١٤٥]

[بے شک منافق لوگ آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے]

یہ لوگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور کے بعد بہت تھوڑے رہ گئے۔

② ہاں جو لوگ برائی اور خرابی میں ان کی مثل ہیں وہ کثرت سے موجود ہیں، جیسے انکارِ حشر یا اللہ تعالیٰ کے جزئیات کے علم کا انکار یا اباحتِ مطلقہ کا اعتقاد جیسی بدعات کے معتقدین، حالانکہ اس کے خلاف اظہار کرتے ہیں۔ اس سے بری ریا کاری کوئی نہیں ہے۔

③ انھی کے قریب وہ لوگ ہیں جو اصول عباداتِ واجبہ میں ریا کرتے ہیں کہ خلوت میں تارکِ عبادت ہیں اور جلوت میں فاعل۔ وہ یہ کام مذمت کے خوف سے کرتے ہیں، حالانکہ یہ ریا کاری بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا گناہ ہے، کیونکہ یہ غایت جہل پر مبنی اور برائی کی بری قسموں پر منتہی ہوتی ہے۔

④ ان کے قریب وہ لوگ ہیں جو نوافل میں ریا کاری کرتے ہیں، یعنی نوافل کی اتنی عادت رکھتے ہیں کہ کہیں وہ ناقص نہ ٹھہر جائیں اور خلوت میں سہل انگاری اور اس کے ثواب میں عدمِ رغبت ہوتی ہے۔

⑤ اس سے قریب وہ لوگ ہیں جو اوصاف عبادت میں ریا کاری کا مظاہرہ کرتے ہیں، جیسے جلوت میں تحسین نماز، اطالتِ ارکان، اظہارِ تخشع اور استکمالِ سائر مکملات اور خلوت میں ادنا واجبات پر

اقتصار و اکتفا کرنا۔ پس یہ لوگ خطا کار ہیں، کیونکہ اس میں بھی ماقبل کی طرح مخلوق کی خالق پر تقدیم ہے۔ پھر اس کے فاعل کو شیطان کبھی اس مکر میں لاتا ہے کہ یہ کام اسے اس طرح اچھا دکھاتا ہے کہ میں جو یہ کام کرتا ہوں تو لوگوں کے اپنے حق میں واقع ہونے سے بچاؤ اور دفاع کے لیے کرتا ہوں، حالانکہ اگر یہ شخص سچا ہوتا تو فوات کمالات سے اپنے نفس کی صیانت کرتا اور فعل جلوات سے بچتا۔ اس کے احوال کے قرائن تو اس بات پر صاف دلیل ہیں کہ اس کا باعث تو صرف مخلوق کی نظر ہے۔ یہ تو ان کی ستایش کا امیدوار ہے نہ کہ ان کی صیانت کا۔

اپنے لیے کی گئی ریا کاری کے درجات:

جو شخص اپنے لیے ریا کاری کرتا ہے اس کے بھی کئی درجے ہیں۔

① ان میں سے اقبح درجہ یہ ہے کہ ریا کار کسی معصیت پر متمکن ہونا چاہے، مثلاً ورع اور زہد کا اس لیے اظہار کرے کہ لوگ اسے اس صفت کے ساتھ متصف جان کر اسے مناصب، وصایا اور ودائع اموال کا متولی کر دیں۔ یا صدقات کی تقسیم اس کے سپرد کر دیں۔ ان سب امور سے اس کا مقصود یہ ہے کہ وہ ان میں خیانت کرے یا ناصح، واعظ، عالم، اور متعلم بنے تاکہ وہ کسی عورت یا غلام پر ظفر یاب ہو۔ پس اللہ کے نزدیک ریا کاروں میں سے سب سے اقبح اور برے یہی لوگ ہیں، کیونکہ انھوں نے رب تعالیٰ کی اطاعت کو معصیت کے لیے ایک سیڑھی کے طور پر استعمال کیا اور اسے فسق کی طرف ایک وسیلہ ٹھہرایا ہے۔ ان کی عاقبت بری ہوگی۔

② انھیں کے قریب وہ لوگ ہیں جو معصیت یا خیانت کے ساتھ تہمت زدہ ہیں، اور وہ اس تہمت کو اپنے اوپر سے زائل کرنے کے قصد سے طاعت و صدقہ کا اظہار کرتے ہیں۔

③ ان سے قریب وہ لوگ ہیں جن کا قصد و ارادہ یہ ہے کہ کوئی حظ مباح حاصل کریں، جیسے مال یا نکاح وغیرہ حظوظِ دنیا۔

④ ان سے متصل وہ لوگ ہیں جو ورع اور تخشع وغیرہ کا اس لیے اظہار کرتے ہیں کہ لوگ انھیں نظر حقارت اور چشم نقص کے ساتھ نہ دیکھیں یا وہ صلحا میں شمار ہوں، حالانکہ یہ لوگ خلوت میں کوئی کام نہیں کرتے ہیں۔

⑤ اسی قبیل سے یہ ہے کہ جس دن روزہ رکھنا سنت ہے وہ اس دن اپنے بے روزہ ہونے کا اظہار

اس ڈر سے ترک کرے کہ کہیں لوگ یہ گمان نہ کریں کہ اس شخص کو نوافل کے ساتھ کچھ اعتنا اور دلچسپی نہیں ہے۔ یہ ریا کاری کے درجات کے اصول اور ریا کاروں کی قسموں کے مراتب ہیں۔

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ سب لوگ اللہ تعالیٰ کے مقت وغضب کے زیر بار ہیں اور یہ ہلاکتوں میں سے سخت ہلاکت ہے

ریا کاری کے کچھ مزید درجات:

① حدیث میں آیا ہے کہ ریا کاری چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی ہے۔[1] چنانچہ یہ وہ ہی ریا ہے جس میں فحول علما سے لغزش ہو جاتی ہے جاہل عبادت گزاروں کا، جو آفاتِ نفوس اور غوائلِ قلوب سے ناواقف ہیں، کیا ذکر ہے۔ اس ریا کاری کا بیان کچھ یوں ہے کہ ریا دو طرح پر ہے: ایک ریا جلی، یہ ریا عمل پر حامل ہوتی ہے، دوسری ریا خفی، یہ عمل پر باعث تو نہیں ہوتی لیکن مشقت کو سبک کر دیتی ہے۔ جس طرح کسی شخص کو ہر رات نمازِ تہجد پڑھنے کی عادت ہو اور یہ نماز اس پر گراں ہے، لیکن جب کوئی مہمان اس کے گھر آتا ہے یا کوئی شخص اس پر مطلع ہوتا ہے تو اسے ایک طرح کا نشاط حاصل ہوتا ہے اور تہجد پڑھنا آسان ہو جاتا ہے، اس کے باوجود وہ یہ عمل اللہ ہی کے لیے کرتا ہے۔ اگر اسے ثواب کی امید نہ ہوتی تو وہ تہجد کیوں پڑھتا۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ وہ تہجد پڑھے گو اس پر کوئی مطلع نہ ہو۔

② اس سے اخفی وہ ریا ہے جو تسہیل وتخفیف پر حامل بھی نہ ہو، اس کے باوجود اس کے پاس ریا ہے اور اس کے دل میں یوں چھپی ہوئی ہے جیسے آگ پتھر کے اندر۔ مگر علامات کے بغیر اس پر اطلاع ممکن نہیں ہے۔ اس کی علامات سے واضح علامت یہ ہے کہ لوگوں کا اس کی عبادت وطاعت پر مطلع ہونا اسے خوش کرتا ہے۔

③ اس سے خفی تر وہ ریا ہے کہ ریا کار نہ اطلاع چاہے نہ مسرت لائے، لیکن وہ اس بات کو پسند کرے کہ لوگ اسے اسلام کرنے میں پہل کریں اور وہ یہ چاہے کہ لوگ اس کی تعظیم کریں، مزید ثنا کے ساتھ پیش آئیں، اس کی حاجت برآری کی طرف مبادرت کریں، معاملہ میں اس کے ساتھ نرمی بجا لائیں، جب وہ ان کے پاس جائے تو وہ اس کے لیے توسیعِ مکان کریں،

[1] مسند أحمد (٤/ ٤٠٣)

جب کسی شخص کی طرف سے ان امور میں کوتاہی ہو تو اس کے دل پر گراں گزرے، کیونکہ جس طاعت کو اس نے اپنے نفس میں مخفی رکھا ہے وہ اسے عظیم جانتا ہے تو گویا اس کا نفس اس طاعت کے مقابلے میں احترام کا طالب ہے یہاں تک کہ بالفرض وہ یہ طاعات نہ کرتا تو اس احترام کا بھی طالب نہ ہوتا، تو اب اس نے اللہ تعالیٰ کے علم پر قناعت نہ کی اور وہ ریاے خفی کی آمیزش سے خالی نہ ٹھہرا۔ امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قریب ہے کہ اس سارے عمل کا اجر وثواب حبط اور ضائع ہو جائے اور اس (ریا) سے صرف صدیقین ہی بچ سکیں۔

اسی لیے مخلصین ہمیشہ ریاے خفی سے خائف رہتے تھے۔ وہ اپنے اعمالِ صالحہ کو یوں چھپاتے تھے جیسے کسی کو اخفاے فواحش پر حرص ہوتی ہے۔ وہ یہ کام اس امید پر کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کے عمل میں اخلاص عطا فرمائے اور قیامت کے دن ساری مخلوق کے سامنے اخلاص کی جزا عطا فرمائے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اللہ عزوجل اسی عمل کو قبول کرتا ہے جو خالص اس کی رضا وخوشنودی کی خاطر کیا جاتا ہے۔ وہ قیامت کے دن اپنی شدت حاجت اور فاقہ کو بھی جانتے تھے۔

پس جو شخص اپنے نفس میں اپنی عبادات پر صغار، مجانین اور ان کے غیر کی اطلاع کے درمیان فرق پاتا ہے تو اس کے نزدیک ریا کا شائبہ موجود ہے، کیونکہ اگر وہ یہ جانتا کہ نافع وضار اور اللہ وحدہ لاشریک لہ ہر چیز پر قادر ہے اور میں ہر چیز سے عاجز ہوں تو اس کے نزدیک صغار وغیرہ یکساں وبرابر ہوتے۔ اس کا نفس کسی بڑے یا چھوٹے شخص کے حضور سے متاثر نہ ہوتا۔ لیکن یہ بات نہیں ہے کہ ہر شائبہ ریا مفسد ومحبط عمل ہو، بلکہ کبھی سرور محمود ہوتا ہے، اور وہ اس طرح کہ وہ اس امر کا شہود کرے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں میرے اس عمل پر اطلاع دی ہے تاکہ میرے احوالِ جمیل اور اپنا لطف میرے ساتھ ظاہر کرے، کیونکہ اس نے تو بجائے خود اپنی طاعت ومعصیت کو چھپایا تھا مگر اللہ نے اس کی معصیت مستور رکھی اور اس کی طاعت ظاہر کر دی۔ معصیت کی پردہ پوشی اور اچھے کام کے اظہار سے بڑھ کر اللہ کا کوئی فضل نہیں ہے تو اس کی یہ فرحت اللہ تعالیٰ کی نظرِ جمیل اور لطفِ وسیع سے ہوئی نہ کہ لوگوں کی تعریف اور ان کے دلوں میں اپنی قیامِ منزلت سے۔ قل بفضل الله و برحمته فبذلك فليفرحوا۔ یا وہ دل میں یہ بات لائے کہ جس صورت میں اللہ جل وعلا نے اس کے قبیح کو مستور اور اس کی طاعت کو دنیا میں ظاہر کیا تو آخرت میں بھی اسی طرح کرے گا، دلیل یہ حدیث ہے:

«مَا سَتَرَ اللّٰهُ عَلٰى عَبْدٍ ذَنْباً فِي الدُّنْيَا إِلَّا سَتَرَهُ عَلَيْهِ فِي الْآخِرَةِ»[1]

[اللہ تعالیٰ نے جس بندے کے گناہ پر دنیا میں پردہ ڈالا آخرت میں بھی اس پر پردہ ڈال دے گا]

یا یہ گمان کرے کہ جو لوگ میرے حال پر مطلع ہیں وہ میری اقتدا میں رغبت کریں گے اور اس سے میرا اجر وثواب بڑھے گا۔ ایک اجر اس عمل کے آخر کار ظہور کے سبب سے اور ایک اجر سر کا اَولاً اس کا قصد کرنے کے سبب سے ملے گا۔ اس لیے کہ طاعت میں جس کی اقتدا کی جاتی ہے اسے اقتدا کرنے والوں کے برابر اجر وثواب ملتا ہے بغیر اس کے کہ ان کے اجروں میں کچھ کمی ہو۔ یہ توقع اس لائق ہے کہ اس سے سرور وخوشی پیدا ہو۔ فائدے کے آثار کا ظاہر ہونا لذیذ ہے جس پر خوش ہونا ہی چاہیے۔ یا وہ اس بات پر خوش ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایسی توفیق دی جس کے سبب سے لوگ اس کی مدح کرتے ہیں اور اس توفیق کے سبب اس سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ نے ان لوگوں کو اس جماعت کی طرح نہ بنایا جو گناہ گار ہو کر اطاعت گزاروں پر استہزا کرتے اور انھیں ستاتے ہیں۔ اس فرحت کی علامت یہ ہے کہ غیر کی مدح پر بھی ویسا ہی خوش ہو جیسے اپنی مدح پر خوش ہوتا ہے۔

اظہار اور اخفاے اعمال میں بہتر کیا ہے؟:

سرورِ مذموم ومکروہ وہ ہے کہ اس بات پر خوش ہو کہ اس کی قدر ومنزلت لوگوں کے دلوں میں قائم ہے، وہ اس کی تعظیم وتکریم کرتے ہیں اور اس کی قضاے حاجات کے لیے تیار ہیں۔ اس تقریر سے یہ بات معلوم ہوئی کہ عمل کو چھپانے اور مخفی رکھنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے اخلاص ملتا ہے اور ریا کاری سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ اور اظہارِ عمل میں بھلائی کی اقتدا اور ترغیب کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ریا کی آفت لگی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں قسموں کی ثنا کی ہے، فرمان ہوتا ہے:

﴿ إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَ إِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ [البقرة: ٢٧١]

[اگر تم صدقے ظاہر کرو تو یہ اچھی بات ہے اور اگر انھیں چھپاؤ اور انھیں محتاجوں کو دے دو تو یہ تمھارے لیے زیادہ اچھا ہے]

---

[1] مسند أحمد (٦/ ١٦٠)

لیکن اسرار کی مدح کی ہے، کیونکہ اس میں اس آفت سے سلامتی ہے جس سے لوگ کم ہی سلامت رہتے ہیں۔ ہاں جہاں پر اسرار متعذر ہو وہاں اظہار ممدوح ہوتا ہے، جیسے غزوہ، حج، جمعہ اور جماعات، کیونکہ یہاں اظہار کرنا ہی اس کی طرف مبادرت کرنا اور تحریض کے لیے اس میں اظہارِ رغبت کرنا ہے، لیکن اس شرط کیساتھ کہ ریاکاری کا شائبہ نہ ہو۔ حاصل یہ ہے کہ جب عمل ان شوائب سے خالص ہوگا، اس کے اظہار میں کسی کو ایذا اور تکلیف نہ ہوگی، اس میں لوگوں کو اس خیر کے بجا لاتے میں اقتدا اور اتباع پر برانگیختہ کرنا اور اس کی طرف مبادرت کرنا ہوگا۔ کیونکہ یہ شخص من جملہ علما وصلحا کے ہے جس کی اقتدا کی طرف سب لوگ جلدی کرتے ہیں تو اظہار افضل ہے، لیکن یہ انبیا اور ان کے ورثا کا مقام ہے اور یہ لوگ امر اکمل ہی کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں۔ اس اظہار کا نفع متعدی ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَ أَجْرُ مَنْ يَعْمَلُ بِهَا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ»

[جس نے کوئی اچھی سنت جاری کی تو اسے اس سنت اور قیامت تک اس سنت پر عمل کرنے والوں کا اجر عطا کیا جائے گا]

اگر ان میں سے کوئی شرط مختل ہوگئی تو پھر اسرار افضل ہے اور افضلیت اسرار کا اطلاق اسی تفصیل پر محمول ہے۔ ہاں اظہارِ فاضل کا مرتبہ عباد وعلما کے قدموں کو پھسلانے والا ہے، کیونکہ وہ اظہار میں اقویا جیسے ہوتے ہیں اور ان کے دل اخلاص پر قوی نہیں ہوتے اس لیے ان کے اجر ریاکاری کے سبب حبط ہو جاتے ہیں اور انھیں اس کا شعور تک نہیں ہوتا۔ اس جگہ حق کی علامت یہ ہے کہ یہ جس منصب پر فائز ہے اس کے اقران میں سے کوئی دوسرا شخص اگر اس منصب پر ہو تو یہ متاثر نہ ہو بلکہ یہ مخلص رہے۔ اگر وہ اپنے نفس سے یہ بات نہیں جانتا ہے تو وہ ریاکار ہے، کیونکہ اگر اسے مخلوق کی نظر کا ملاحظہ نہ ہوتا تو اپنے نفس کو، باوجود اس علم کے کہ غیر کفایت کر سکتا ہے، غیر پر اختیار نہ کرتا، لہٰذا بندے کو نفس کے دھوکوں سے خبردار رہنا ہوگا، وہ تو محض دھوکے ہی ہیں جب کہ شیطان ان میں پھانسنے کے لیے گھات لگائے بیٹھا ہے۔ اور ادھر دل کی کیفیت یہ ہے کہ اس پر جاہ و اقتدار کی محبت غالب ہے۔ یہ بات بہت کم ہوتی ہے کہ اعمالِ ظاہرہ آفات و اخطار سے سلامت رہیں اس لیے اخفائے اعمال ہی میں سلامتی ہے۔

ریا کاری کی مزید شکلیں:

من جملہ اظہار کے ایک عمل سے فراغ کے بعد تحدث بعمل ہے، بلکہ اس کا خطرہ اس لحاظ سے سخت تر ہے کہ کبھی زبان پر زیادتی یا مبالغہ جاری ہو جاتا ہے اور نفس کو اظہار دعاوی میں لذت ملتی ہے، اور اس لحاظ سے آسان بھی ہے کہ یہ ریا ماضی کے عمل خالص کو حبط نہیں کرتی ہے۔

اکثر لوگ ریا کاری کے خوف سے طاعات کا بجا لانا ترک کر دیتے ہیں یہ مطلقاً محمود نہیں ہے، کیونکہ اعمال دو طرح کے ہیں۔ ایک لازم بدن جنھیں غیر سے کچھ تعلق ہے اور نہ عین ان اعمال میں کوئی لذت ہے، جیسے نماز، روزہ اور حج۔ پس اگر اس میں باعثِ ابتدا صرف رویتِ خلق ہو تو یہ محض معصیت ہے اس کا ترک کرنا واجب ہے، اس معصیت میں اس کیفیت پر رخصت نہیں۔ اگر اس عبادت پر باعث تو تقرب الی اللہ کی نیت ہے، لیکن عقد عبادت کے وقت ریا عارض ہوئی تو اسے شروع کر دے اور اس عارض کے دور کرنے میں مجاہدہ نفس بجا لائے۔ اسی طرح اگر اثنائے عمل میں ریا عارض ہو تو نفس کو قہراً جبراً اخلاص کی طرف پھیرے یہاں تک کہ اس عمل کو مکمل کرے، کیونکہ شیطان پہلے تو ترکِ عمل کی طرف بلاتا ہے، جب اس کی بات نہیں مانی جاتی اور آدمی عزم بالجزم کر کے اس عمل کو شروع کر دیتا ہے تو پھر وہ ریا کاری کی طرف بلاتا ہے۔ جب اس نے اس سے بھی اعراض کیا اور مجاہدہ سے پیش آیا یہاں تک کہ اس عمل سے فارغ ہوا تو اب اسے ندامت دلاتا ہے کہ تو ریا کار ہے، اللہ تعالیٰ تجھے اس عمل کا کوئی اجر وثواب نہ دے گا جب تک کہ تو ایسا عمل کرنا نہ چھوڑ دے گا اور پھر دوبارہ اسے نہ کرے گا۔ الحاصل اس طرح شیطان اپنی غرض حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا تو اس سے بچ کر رہ، کیونکہ اس سے بڑا مکار اور دھوکے باز کوئی نہیں ہے۔ اپنے دل کو اللہ تعالیٰ سے حیا کے ساتھ معمور رکھ، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے اندر دینی عمل پر ایک باعث پیدا کر دیا ہے اب تو عمل کو ترک کیوں کرے، بلکہ تو اخلاص میں مجاہدہ نفس کر اپنے اور اپنے باپ آدم علیہ السلام کے دشمن کی مکاریوں کے دھوکے میں نہ آ۔

اعمال کی دوسری قسم وہ ہے جو مخلوق کے متعلق ہے۔ اس قسم میں آفات و اخطارِ عظیمہ ہیں۔ ان میں سے اعظم بلایا خلافت ہے، پھر قضا، پھر تذکیر، پھر تدریس، پھر افتا اور پھر انفاقِ مال۔ پس جس کو دنیا اپنی طرف مائل نہ کرے اور طمع جنبش نہ دے اور اللہ کی راہ میں اسے لوم لائم نہ پکڑے، اور وہ دنیا اور اہلِ دنیا سے اعراض کرے، وہ صرف حق کے لیے متحرک ہو اور صرف اللہ کے لیے ساکن ہو

تو وہ شخص اس بات کا مستحق ہے کہ وہ ولایتِ دنیویہ اور اخرویہ کا اہل ہو۔ جس شخص میں ان شرائط میں سے کوئی شرط مفقود ہو تو اس کے حق میں مذکورہ بالا تمام ولایات سخت مضر ہیں۔ وہ ان کے اختیار کرنے سے باز رہے اور دھوکے میں نہ آئے۔ اس کا نفس اسے یہ فریب دے گا کہ تو عدل کرے گا اور ولایت کے حقوق بجا لائے گا اور تجھے شوائب ریا وطمع کی طرف میلان نہ ہوگا، کیونکہ اس کا نفس اس فریب کاری میں کاذب ہے، اس سے پرہیز کرنا چاہیے، اس لیے کہ نفس کے نزدیک جاہ وولایات سے لذیذ تر کوئی چیز نہیں ہے، کچھ بعید نہیں کہ ولایات کی محبت ہلاکت پر حامل ہو۔

ایک شخص نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اجازت مانگی کہ میں صبح کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد لوگوں کو وعظ کیا کروں، عمر رضی اللہ عنہ نے اسے منع کر دیا، اس نے کہا: آپ مجھے لوگوں کو نصیحت کرنے سے منع کرتے ہیں، عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "أخشى أن تنتفخ حتى تبلغ الثريا" [مجھے خدشہ اس بات کا ہے کہ تو پھول کر ثریا ستارے تک جا چڑھے گا] لہٰذا انسان کو یہ لائق نہیں ہے کہ وہ تذکیر باللہ اور علم کے فضائل پر دھوکا کھائے، کیونکہ اس کا خطرہ عظیم ہے۔ ہم کسی کو اس کے ترک کا حکم نہیں دیتے، اس لیے کہ نفسِ تذکیر میں کوئی آفت نہیں ہے، اصل خرابی تو وعظ واقرا، افتا و روایت میں اپنی کوششوں اور کاوشوں کا اظہار اور نمود ونمایش ہے۔ لہٰذا جب تک وہ اپنے نفس میں باعثِ دینی پائے تب تک اپنی کاوشیں ترک نہ کرے اگرچہ وہ کسی قدر ریا سے ممزوج ہو، بلکہ ہم تو یہ حکم دیتے ہیں کہ وہ کام کو جاری رکھے اور خطراتِ ریا سے بھی اخلاص وتنزہ میں مجاہدہ نفس بجا لائے، ریا کی خرابیوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

الحاصل امور تین طرح کے ہیں۔ ایک ولایات، ان کا فتنہ اعظم فتن ہے۔ چنانچہ ضعفا سرے سے اس کو ترک کر دیں۔ دوسری صلوات وغیرہ تو اسے ضعفا ترک کریں اور نہ اقویاء، ہاں مگر ریا کی آمیزشوں کو دفع کرنے میں کوشاں رہیں۔ تیسری علوم کے لیے کوششیں کرنا، یہ گذشتہ دو مراتب کے درمیان مرتبہ وسطی ہے، لیکن یہ مرتبہ ولایات کے مشابہ اور آفات سے قریب تر ہے، اس لیے ضعفا کا اس سے بچنا ہی سلامتی والی راہ ہے۔ باقی رہا چوتھا مرتبہ وہ جمع مال اور انفاق مال ہے۔ پس بعض علما نے اسے اشتغال ذکر ونوافل پر فضیلت دی ہے اور بعض نے اس کے برعکس کہا ہے، مگر حق تو یہ ہے کہ اس میں بھی آفاتِ عظیمہ ہیں: جیسے طلبِ ثنا، دلوں کو اپنا گرویدہ بنانا اور عطیات دے کر اپنے آپ کو ممتاز کرنا۔ پس جو شخص ان آفات سے رہائی پائے تو اس کے لیے جمع وانفاق افضل ہے، کیونکہ اس میں وصلِ منقطعین،

کفایتِ مستحقینِ اور تقرب بالبِر طرف رب العالمین کے ہے۔ جو شخص ان آفات سے محفوظ نہ ہو تو اس کے لیے اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ عبادات، استفراغ، سعیِ آداب اور مکملاتِ عبادت میں ملازمت کرے۔

اخلاص کی ایک علامت:

عالم کے علم میں اخلاص کی ایک علامت یہ ہے کہ اگر وعظ میں یا کثرت علم میں کوئی شخص اس سے بہتر اور نیک تر ظاہر ہو اور وہ لوگوں میں بہت مقبول ہو تو یہ اپنے جی میں خوش ہو اور اس پر حسد نہ کرے۔ ہاں اگر اسے رشک آئے تو کچھ ڈر نہیں ہے یعنی وہ اپنے نفس کے لیے یہ تمنا کرے کہ مجھے بھی اس طرح کا علم ہوتا۔ نیز اگر اکابر اس کی مجلس میں آئیں تو اس کے کلام میں تغیر نہ آئے، بلکہ ساری مخلوق کو ایک ہی نظر سے دیکھے اور لوگوں کا راستوں میں اپنے پیچھے چلنا پسند نہ کرے۔

ریا کاری کے نقصانات:

آیات، احادیث اور ائمہ کے کلام سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ ریا کاری محبط اعمال ہوتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی ناراضی کا سبب ہے، لعن وطرد کی موجب ہے اور منجملہ کبائر مہلکات کے ہے۔ اس طرح کا امر اس لائق ہے کہ ہر صاحبِ توفیق اس کے ازالے میں ساق جد سے مجاہدہ کے ساتھ کمرِ ہمت باندھ لے، اور مشاق شدیدہ کا تحمل کرے اور قوتِ شہوات میں مشکلات انگیز کرے، کیوں کہ کوئی شخص اس کا محتاج ہونے سے منفک نہیں ہو سکتا ہے، مگر وہی جسے اللہ تعالیٰ نے ایسا دل عطا کیا ہو جو مفادات کی میل کچیل اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بننے کی آمیزش سے پاک صاف ہو، اور وہ رب العالمین کی یاد میں ہمیشہ مستغرق رہتا ہو۔ ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔ ورنہ غالب اکثریت اسی حال پر مطبوع ہے۔

ریا کاری میں اگر اسی عبادت کو ضائع کرنے کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا تو اس کے شوم اور ضرر کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ لیکن آخرت میں ہر انسان ایسی ایک عبادت کا محتاج ہو گا جس سے اس کی نیکیوں والا پلڑا راجح اور بھاری ہو جائے، ورنہ اسے جہنم کی آگ کی طرف لے جائیں گے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ناراضی کے ساتھ مخلوق کی رضا کا طالب ہوتا ہے اللہ عزوجل ایسے شخص سے بیزار ہو جاتا ہے اور مخلوق کو بھی اس سے ناراض کر دیتا ہے، حالانکہ رضائے خلق ایک ایسی غایت ہے جو میسر نہیں آ سکتی۔ جب یہ شخص ایک قوم کو راضی کرے گا تو دوسری قوم کو ناراض کر لے گا۔ پھر ان کی مدح میں اس کی کیا غرض اور ضرورت ہے کہ اللہ کے ذم اور غضب پر اس نے ان کی مدح کو اپنے حق میں اختیار کیا ہے،

حالانکہ لوگوں کی تعریف کرنے سے اسے نہ کوئی نفع ملتا ہے اور نہ کوئی ضرر دور ہوتا ہے۔ یہ بات تو خاص اللہ وحدہ لا شریک لہ کے لیے ہے کہ وہی اس کا مستحق ہے کہ سب لوگ تنہا اسی کا قصد کریں، کیونکہ منع و اعطا کے ساتھ دلوں کو مسخر کرنے والا وہی ہے۔ رازق، عطا کرنے والا، ضرر پہنچانے والا اور نفع بخشنے والا اللہ عزوجل ہی ہے، جسے مخلوق سے طمع ہوتی ہے وہ ذل وخیبت، یا منت ومہانت سے ہرگز خالی نہیں رہتا۔ تو اب اس رجا کاذب اور وہم فاسد پر اس چیز کو چھوڑنا جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے کیوں کر ہوسکتا ہے، حالانکہ یہ رجا ووہم کبھی مصیب اور کبھی مخطی ہوتا ہے۔ اگر ان لوگوں کو اس ریا پر اطلاع ہو جو ان کے دل میں ہے تو یہ خود مکروہ و مذموم سمجھتے ہوئے اسے ترک کر دیتے۔

جو شخص اس امر کو بعین بصیرت دیکھے گا اس کی مخلوق میں رغبت سست پڑ جائے گی اور وہ صدق کی طرف متوجہ ہوگا۔ یہ تو ہوئی علمی دوا، رہی عملی دوا تو وہ یہ ہے کہ اخفا عبادات کی عادت ڈالے جس طرح کہ خواہش کا اخفا کیا کرتا ہے یہاں تک کہ اس کا دل اللہ کے علم واطلاع پر قانع ہو جائے اور نفس طلب علم غیر اللہ کی طرف اس سے منازعت نہ کرے۔ اس اخفا میں تکلف اختیار کرے اگرچہ ابتدا میں یہ بات شاق ہوگی، لیکن جو کوئی اس پر ایک مدت تک تکلف کے ساتھ صبر کرے گا اس سے اس ثقل کا تکلف ساقط ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کی مدد کرے گا جس سے اس کی ترقی ہوگی۔ ان الله لا يغير ما بقوم حتى يغيروا ما بأنفسهم. بندے کی طرف سے مجاہدہ کرنا اور رب کریم کا دروازہ کھٹکھٹانا ہے اور اللہ کی طرف سے ہدایت وفتح۔ "إن الله لا يضيع أجر المحسنين، وإن تك حسنة يضاعفها ويوت من لدنه أجرا عظيما" انتهىٰ. كلام الشيخ ابن حجر المكي رحمہ اللہ فی كتابه الزواجر ملخصاً۔

وقال رحمہ اللہ:

"لما تكلمنا بحمد الله على هذه الكبيرة العظيمة وما يتعلق بها مما يحتاج الخلق إليه وبسطنا الكلام في ذلك، وإن كان بالنسبة إلى إحياء العلوم مختصرا جدا أردنا أن نختم الكلام فيها بذكر شيئ من الآيات والأحاديث الدالة على مدح الإخلاص و ثواب المخلصين وما أعد الله لهم ليكون ذلك باعثا للخلق على تحري الإخلاص ومباعدة الرياء،

الأشياء لا تعرف كمالا وضدا إلا بأضدادها" انتهى.

[بحمد اللہ جب ہم اس بڑے عظیم مسئلے پر اور ان کے ان متعلقہ مسائل پر کلام کر چکے، جن کی مخلوقِ خدا کو ضرورت تھی، اور ہم نے اس پر بسط و تفصیل کے ساتھ کلام کیا اگرچہ وہ ''احیاء العلوم'' کی نسبت بہت مختصر ہے، تو ہم نے ارادہ کیا کہ اس کلام کا خاتمہ ان آیات اور احادیث کے ذکر پر کریں جو اخلاص کی مدح، مخلصین کے ثواب اور جو کچھ اللہ نے ان مخلصین کے لیے تیار کیا ہوا ہے اس پر دلالت کرتی ہیں تاکہ یہ مخلوق کے لیے اخلاص کی تلاش کا باعث بنیں اور انھیں ریا کاری سے دور کر دیں، کیونکہ اشیا مکمل طور پر اپنے اضداد سے ہی پہچانی جاتی ہیں]

لیکن یہاں پر مذکورہ کلام نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ رسالہ "لسان العرفان"[1] میں ریا کی بحث اس مقام سے زیادہ لکھی گئی ہے اور "قواطع البشر"[2] اور "قوارع الإنسان عن اتباع خطوات الشيطان" میں ظاہرہ اور باطنہ کبائر کا بیان ہو چکا ہے۔ اس جگہ فقط اتنا مقصود تھا کہ فرقہ ناجیہ کے عقائدِ صحیحہ کا ائمہ دین، فقہائے مسلمین، صوفیہ متبعین، زمرہ محدثین اور محققین راسخین فی العلم کے کلمات کے مطابق بیان کیا جائے، کیونکہ نجات کا دارو مدار عقائد پر ہے۔ عقیدے کی درستی اور اخلاص کے ساتھ عمل قلیل کافی ہو جاتا ہے، جس طرح کہ حدیث میں آیا ہے:

«أَخْلِصْ دِيْنَكَ يَكْفِكَ الْقَلِيْلُ مِنَ الْعَمَلِ» (رواه ابن أبي الدنيا والحاكم)[3]

[اپنے دین کو خالص کرو، تمھیں تھوڑا عمل بھی کفایت کرے گا]

جبکہ فسادِ عقیدہ اور اختلاطِ ریا کے ساتھ کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَا يُقْبَلُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَاكَانَ خَالِصاً وَابْتُغِيَ بِهِ وَجْهُهُ» (رواه الطبراني)[4]

---

[1] اس سے مولف رحمہ اللہ کی کتاب "لسان العرفان الناطق بما يهلك الإنسان" مراد ہے۔

[2] اس سے مولف رحمہ اللہ کی کتاب "قواطع البشر عن أنواع الشر" مقصود ہے۔

[3] الإخلاص والنية لابن أبي الدنيا (٧٦/١) مستدرك الحاكم (٣٠٦/٤) اس کی سند میں ''عبید اللہ بن زحر'' ضعیف ہے، نیز معاذ بن جبل سے بیان کرنے والے راوی ''عمرو بن مرہ'' کی ان سے ملاقات ثابت نہیں ہے، کیونکہ ان دونوں کی وفات میں سو سال کا فاصلہ ہے، لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: سلسلة الأحاديث الضعيفة للألباني (٢١٦٠)

[4] المعجم الكبير للطبراني (١٤٠/٨)

[صرف وہی عمل مقبول ہے جو خالص ہو، اور اس کے ساتھ اس (اللہ) کا چہرہ تلاش کیا گیا ہو]

الحاصل طالبِ نجات اور تاجرِ آخرت کے لیے واجب ہے کہ وہ تصحیح عقائد میں کوشش کرے اور قطعی طور پر یہ بات جان لے کہ شرک، کفر اور ریا کے ہوتے ہوئے کوئی عبادت اور نیکی ہرگز نفع نہ دے گی، اگرچہ وہ اسلام اور ایمان کا دعوی کرے۔ اکثر لوگ کلمہ گو ہیں، نماز، روزہ، زکات اور حج ادا کرتے ہیں، لیکن دقائقِ شرک اور حقائقِ ریا کو نہیں جانتے اور کلماتِ کفر سے احتراز نہیں کرتے، اس لیے ان کا اسلام اور ایمان کا ظاہری اقرار نفع نہیں دیتا۔ ان کے حال وقال پر ایمان کا کوئی اثر اور اس کی برکت نہیں پائی جاتی۔ مخلوق میں سے اکثر لوگ یہ جانتے ہیں کہ شرک غیر اللہ کی عبادت کا نام ہے اور ہم تو کسی بت یا چاند یا سورج کو سجدہ نہیں کرتے ہیں اور نہ کفر ہی کی کوئی رسم ہمارے گھر میں ہوتی ہے اور نہ ہم کسی کے دکھانے ستانے کو نماز وروزہ بجا لاتے ہیں تو پھر کس طرح ہم غیر مسلم یا غیر ناجی ہوں گے۔ یہ محض ابلیس لعین کا مغالطہ ہے اور سرکش نفس کا غرور اور دھوکا ہے، کیونکہ شرک و ریا اور بدعات کا حال ظاہری کبیرہ گناہوں جیسا نہیں ہے کہ ہر شخص ان کو معلوم کر سکے، جس طرح ہر عالم اور جاہل مسلمان یہ جانتا ہے کہ زنا کاری، شراب خوری اور قتلِ نفس حرام ہے، بلکہ شرک کے حق میں تو شارع علیہ السلام نے یہ فرمایا ہے کہ شرک تاریک رات میں کالے پتھر پر سیاہ چیونٹی کی رفتار سے بھی مخفی تر ہے اور شرک کے ستر (۷۰) دروازے ہیں اور بدعت کے بہتر (۷۲) دروازے ہیں، جبکہ کلماتِ کفر بے حساب ہیں، تو پھر جب تک انسان تمام عزم وہمت کے ساتھ ان ابواب کثیرہ کو دریافت کرنے پر کمر بستہ نہ ہوگا، تب تک اس کا ان آفات سے ناجی ہونا نہایت مشکل ہے۔

بحمدہ تعالیٰ اس زمانے میں متعدد رسائل میں نصوص اور دلائل کے حوالے سے ان امورِ مذکورہ کی بہ خوبی تنقیح ہوگئی ہے۔ اب تو صرف اہلِ دین کا اشیاے مذکورہ کی دریافت کی طرف توجہ کرنا باقی ہے۔ یہ ایسے دلائل ومسائل ہیں، جن میں علما کو لغزش ہو جاتی ہے وہاں جہلا کا کیا ذکر ہے، لہٰذا کوشش تمام کے ساتھ یہ مسائل کتاب اللہ اور خزائنِ سنت اور ان کے معادن ائمہ اسلام، تحقیقاتِ فحول محدثین اور فقہاے جامعین کے کلام کے ساتھ اردو رسائل میں یکجا جمع کر دیے گئے ہیں۔

دادیم ترا ز گنج مقصود نشان

مختار توئی خواہ رسی یا نرسی

[ہم نے تو تمھیں گنج مقصود کا راستہ بتا دیا ہے، اب تمھاری مرضی اور اختیار ہے کہ تم اس

تک پہنچو یا نہ پہنچو]

اس زمانے کی اکثر تالیفات جدال ومرا سے معمور ہیں اور مخلوق کے اکثر اعمال شرک وریا ہیں۔ حرف شناسوں کی ساری مصروفیت اور شغل اسی میں منحصر ہے کہ وہ مسائل فرعیہ پر باہم بحث کیا کریں۔ پھر اختلافی جگہوں میں ایک دوسرے کی تضلیل وتکفیر رسالوں میں لکھا کریں۔ کسی شخص کو یہ فکر نہیں ہے کہ وہ اپنی عبادات کے ارکان وآداب، مکملات اور متممات کو اچھی طرح سلف صلحا کے ماثورات کے مطابق سیکھ کر عمل میں لائے جس سے اس کی نماز، روزہ، زکات، اور حج صحیح ٹھہرے اور پھر اس کے اندر تحصیلِ اخلاص کے لیے مقدور بھر ساعی ہو اور اوقات فرصت میں دقائق وحقائقِ ریا وشرک کو، جو محبط عمل اور موجب ردت وقتل ہیں، دریافت کر کے ان طرائق سے اپنے آپ کو دور کرے۔ ابوابِ بدعات سے اپنی جان بچائے۔ اس لیے کہ طریقِ حق اور سبیلِ صدق ایک ہے اور ضلالت کے طرق بہت ہیں، جس طرح کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

﴿ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾ [الأنعام: ١٥٣]

[اور یہ کہ بے شک یہی میرا راستہ ہے سیدھا، پس اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کے راستے سے جدا کر دیں گے]

اس باب میں ایک حدیث بھی آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سیدھی لکیر کھینچی، پھر اس کے دائیں بائیں مزید لکیریں کھینچ کر فرمایا کہ یہ سب شیطان کی راہیں ہیں، ہر راہ پر ایک شیطان بیٹھا ہے وہ اسے طریقِ ضلالت کی طرف بلاتا ہے اور یہ ایک سیدھی راہ ہے، پس تم اس سیدھی راہ پر چلو، ہر طرف مت بھک جاؤ۔[1] اس حدیث کے الفاظ مشکات وغیرہ میں لکھے ہیں۔

یہ اسی حدیث کا حاصل مضمون ہے۔ کہ ہمارا یہ زمانہ اختلافِ مذاہب اور انعسافِ مشارب کا زمانہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے پہلے سے ہمیں اس کی خبر دے دی ہے اور ایسے زمانے میں ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم سنتِ نبوی اور خلفاے راشدین مہدیین کے طریقے پر جمے رہیں۔ زمانۂ خیر کے بعد اسلام میں بہتر فرقے بن گئے تھے اور دین میں ایک عجیب ہنگامہ برپا ہوا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کی حجتِ بالغہ

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١)

نے ان سب کو ختم کر دیا سوائے دو تین گمراہ فرقوں کے، جیسے روافض اور خوارج وغیرہ ہیں۔ اب معتزلہ وغیرہ کی مثل کوئی فرقہ بلادِ اسلام میں باقی نہ رہا اور فرقہ ناجیہ اہلِ سنت ہمیشہ اپنے اعدا و مخالفینِ مذہب پر غالب رہا، لیکن اس قربِ زمان میں قربِ ساعت کے سبب اہلِ سنت کے فرقوں میں باہم خانہ جنگی شروع ہو گئی ہے جس کے سبب اکثر مسلمان متزلزل ہو گئے۔ انھیں حق کی باطل سے تمیز نہ رہی۔ ہر فرقے نے عوام کو اپنی طرف کھینچا، جس کی تقدیر میں جو خرابی لکھی تھی وہ اسے پیش آئی، اگرچہ اللہ تعالیٰ کا دین اور رسول اللہ ﷺ کی شرع واضح ہے اور غلو و جفا کے درمیان ہے۔ ان کے مقابل کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جو اہلِ بدع اور فرق ضالہ کے طریقے پر چلتے ہیں اور دینِ اسلام میں طرح طرح کے شکوک پیدا کرتے ہیں اور قرآن و حدیث کے الفاظ و عبارات کی تکذیب اور تحریف کرنا چاہتے ہیں، لیکن ابھی تک ان کو یہ بات حسبِ منشا میسر نہیں آئی۔ حدیثِ نبوی ہے:

«لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي ظَاهِرِينَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَخْذُلُهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ»[1]

[میری امت کی ایک جماعت حق پر غالب رہے گی ان کی مخالفت کرنے والا ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا]

ان شاء اللہ آئندہ بھی انھیں یہ بات میسر نہ ہوگی، گو یہ کتنا ہی سر مارا کریں۔ لیکن اس حیص بیص میں عوام و جہال اور اکثر خاص کالانعام کے حال کے ساتھ اتنی خرابی ضرور لاحق ہو گئی ہے کہ دین و آخرت سے غافل یا اس کے جاحد ہو کر بندۂ درہم و دینار اور طالبِ مال و جاہ بن گئے ہیں اور ایسے اعمال کرنے لگے ہیں جیسے یوم الحساب پر یقین نہ رکھنے والے کرتے ہیں۔ وكان ذلك في الكتاب مسطورا.

ایسے وقت میں عالم کتمانِ علم کے سبب ملعون ٹھہرتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ علم سے اس بات کا عہد و پیمان لیا ہے کہ وہ اس کے بندوں کے سامنے آیاتِ کتاب اور احادیثِ مستطاب کی تبلیغ و تبیین کر دیں۔ وما توفيقي إلا بالله عليه توكلت وإليه أنيب وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

[1] مسند أحمد (١/ ٤٣٥) سنن الدارمي (١/ ٧٨) صحيح ابن حبان (١/ ١٨٠) سنن النسائي الكبرى (٦/ ٣٤٣) مسند البزار (٥/ ٢٥١)

برصغیر میں علومِ اسلامیہ اور عقیدہ سلف کی نصرت واشاعت کے سلسلے میں والا جاہ نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ (۱۲۴۸۔۱۳۰۷ھ) کی مساعیِ جمیلہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ اس سلسلے میں آپ نے خود بھی حسبِ ضرورت متعدد کتب رقم فرمائیں، جن کی تعداد دوصد سے متجاوز ہے، اور دوسرے علما کو بھی تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ کیا، ان کے لیے خصوصی وظائف کا بندوبست کیا اور اسلامی علوم وفنون کے اصل مصادر و مآخذ کی ازسرِنو طباعت واشاعت کا وسیع اہتمام کیا، جو اپنے وقت میں علمائے کرام اور طلبائے دین کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔

نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ نے علومِ اسلامیہ کے تقریباً تمام گوشوں سے متعلق مستقل تالیفات رقم کی ہیں اور شاید ہی کوئی ایسا دینی و علمی موضوع ہو، جس پر نواب صاحب رحمہ اللہ نے کوئی مستقل رسالہ یا کتاب نہ لکھی ہو۔ ان تصانیف کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ ابھی تک ان کی یقینی تعداد اور موضوعات کی تعیین کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکا، جس کی بڑی وجہ ان مولفات کی عدم دستیابی اور فقدان ہے، کیوں کہ مولف رحمہ اللہ کی زندگی میں تو یہ کتب اشاعت پذیر ہوئیں، لیکن بعد میں دوبارہ ان کی ازسرِنو اشاعت کا کوئی معقول بندوبست نہ ہو سکا اور یہ علمی جواہر پارے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

چنانچہ جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی کویت کے ذیلی شعبے لجنۃ القارۃ الہندیہ کے زیر اہتمام فضیلۃ الشیخ ابو خالد فلاح خالد المطیری حفظہ اللہ اور محترم المقام عارف جاوید محمدی حفظہ اللہ کی زیرِ سرپرستی نواب صاحب رحمہ اللہ کی علمی تراث کے احیا کی خاطر یہ علمی مشروع شروع کیا گیا ہے، جس سے نواب صاحب رحمہ اللہ کی مولفات کو حسبِ ضرورت تحقیق و ترجمہ اور تسہیل کے ساتھ مناسب ترتیب سے مجموعات کی شکل میں شائع کرنا مقصود ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے قارئین کی خدمت میں نواب صاحب رحمہ اللہ کی عقیدہ توحید سے متعلق پندرہ کتب کو تحقیق و تسہیل کے بعد پیش کیا جا رہا ہے اور بقیہ کتب بھی موضوعاتی ترتیب کے ساتھ آنے والے دنوں میں شائع کی جائیں گی۔ ان شاء اللہ العزیز

گل روڈ، حمید کالونی گلی نمبر 5 گوجرانوالہ 055-3823990